تاریخ اسلام

عالمی نقطۂ نظر کے آئینے میں

پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد
بی ای ایم ایس، اے ای ای، پی. ایچ.ڈی (کارنل) ایم بی اے
سابق ممبر اسمبلی صوبۂ کرناٹک، ہندوستان

مترجم
منیر احمد، ایم اے
ٹمکور

تمام حقوق بحق مصنف ڈاکٹر نذیر احمد محفوظ ہیں

شائع کردہ:
انگریزی میں
امریکن انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری اینڈ کلچر
1160، رڈچ ماؤنٹ پیالیس، کانکارڈ، سی.اے-94521

اردو میں ہندوستانی ایڈیشن شائع کردہ
پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد
غوث بلڈنگ ہور پیٹ مین روڈ، ٹمکور–572101

اس کتاب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔اس کتاب کا کوئی حصہ بھی کسی بھی ذریعہ سے بغیر اجازت کے نقل نہیں کیا جاسکتا۔ چاہئے وہ مواصلاتی ذریعہ ہو یا میکانیکل، فوٹو گرافی کے ذریعہ ہو یا ریکارڈنگ کے ذریعہ، یا کسی بھی اور جدید طریقہ سے ہو اسکو منتقل نہیں کیا جاسکتا۔کسی بھی طریقۂ کار کے لئے اجازت لازمی ہے۔

انتساب

آنے والی نسلوں کے
بچوں کے نام

فہرست موضوعات

۱- اعتراف

۲- دیباچہ

۳- اپنی بات

عقائد کا زمانہ

۱- رسول اللہ ﷺ کا پرملال انتقال مبارک

۲- حضرت عمر بن الخطابؓ اور اسلامی تہذیب کی بنیاد

۳- خانہ جنگیاں

فوجی امراء کا دور

۴- حضرت معاویہؓ پہلے فوجی امیر

۵- کربلا-عقیدے کے دور کی آخری سانس

۶- حضرت عمر بن عبدالعزیز احیائے اسلام کے پہلے امیر

۷-اسپین کی فتح

۸-سندھ کی فتح

۹-جنگ طورس

۱۰-بنوعباسیہ کا انقلاب

عقل ودانائی کا سرسبز وشاداب چمن زار

۱۱-فقہ کی نشوونما

۱۲-استدلال کا دور-خلیفہ ہارون ومامون

۱۳-کلاسیکی دور میں فلسفہ اور سائنس

ترکوں کا عروج

۱۴- ترک اثر آفرینی کے مرکزی کردار

۱۵- جنگِ منزی کرٹ

۱۶- فدائی خنجر

۱۷- محمود غزنوی

۱۷-صلیبیوں کی یورش

۱۹-یروشلم پر صلیبیوں کا قبضہ

۲۰-صلاح الدین اور جنگ حطین

۲۱- دہلی کی فتح

۲۲- چوتھی صلیبی جنگ، قسطنطنیہ کی بربادی

۲۳- سلطنت عثمانیہ کا آغاز

مغرب اور اسپین

۲۴- بنو فاطمہ کا مصر فتح کرنا

۲۵- اسپین اور عبدالرحمٰن سوم

۲۶- مرابطون انقلاب

۲۷-اور قرطبہ جاتا رہا

۲۸- غرناطہ کی شکست

افریقہ میں اسلام

۲۹-افریقہ میں اسلام کا داخلہ

۳۰- مانسا موسیٰ کا حج

۳۱- المغیلی اور عسقیہ محمدؒ

مرد کی دنیا میں خواتین

۳۲- حجاب اور آزاد فرمارواعورتیں

۳۳- دہلی کی رضیہ سلطانہ

۳۴- مصر کی ملکہ شجرۃ الدر

منگول سیلاب

۳۵- چنگیز خان کی تباہیاں

۳۶- بغداد کی شکست

۳۷- عین جلوت کی جنگ

۳۸- غزان اعظم کا قبول اسلام

تلوار پر روح کی فتح

۳۹- اولیائے کرام کی کامرانیاں

۴۰- ہندوستان اور پاکستان کے صوفیائے کرام

۴۱- ابن بطوطہ کی رحلہ

۴۲- اصفہان پر ہلال

ترک اور تاتار

۴۳- سمرقند کا امیر تیمور

۴۴- انقرہ کی جنگ

۴۵- تیموری حملوں کے اثرات

جزائر کے جھرمٹ میں اسلام

۴۶- انڈونیشیاء میں اسلام

۴۷- سلطان اسکندر شاہ کا قبول اسلام

نقشہ جات کی تفصیل

۱- رسول اکرم ﷺ کی وفات کے وقت عرب
۲- حضرت عمر بن الخطابؓ کے دورِ حکومت میں اسلامی سلطنت
۳- امیہ حکومت کی آخری سرحدیں
۴-محمود غزنوی کی سلطنت
۵- بنو عباس، بنی فاطمہ اور اموی خلافت کے اثرات کے دائرے
۶- 1030ء کے آس پاس اموی خلافت
۷- 1150 کے آس پاس اسپین میں مرابطون
۸- 1212 کے آس پاس اسپین میں المحد ث
۹- 1492ء میں غرناطہ
۱۰- 1325ء میں مالی کی شہنشاہیت
۱۱- 1590ء میں سونگھے شہنشاہیت
۱۲- 1236ء میں رضیہ سلطانہ کی حکومت
۱۳- چنگیز خان کی فتح یابیاں
۱۴- تیمور کی کامرانیاں
۱۵- تیموری حملوں کے بعد
۱۶- جزائر کے جھرمٹ میں اسلامی مراکز

اہم واقعات

اعتراف

میرے عزیز دوست محمد عبدالمنیم کی جانب سے ہونے والی حوصلہ افزائی اس کتاب کے لکھے جانے کا باعث بنی، یہ نیویارک سے شائع ہونے والے رسالے ''مینار'' کے مدیر ہیں۔ یہی وہ شخصیت ہے جو بار بار مجھ سے اصرار کرتی رہی کہ میں عالمی نقطۂ نظر سے اسلامی تاریخ لکھوں۔

اس قسم کی کتاب کے لئے ان بزرگانِ دین اور اعلیٰ دماغوں سے ہی جوش وجذبہ حاصل ہوتا ہے۔ عالی حوصلگی ملتی ہے۔ جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ میں نے وہ جذبہ اکتساب حاصل کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ، سر سید احمد خان، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شیخ سید احمد سرہندیؒ جیسے اعلیٰ دماغوں اور بزرگانِ دین سے۔ بچپن ہی سے مجھے دہلی کی رضیہ سلطانہ، مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر، میسور کے ٹیپو سلطان شہیدؒ سے گہری انسیت رہی ہے۔ ان کے کارنامے ابتدائی زندگی سے میرے تخیلات کا ایک حصہ رہے ہیں۔ زندگی کے ابتدائی برسوں میں عبدالقیوم صاحب جیسے استاد کے تعلیم دینے کا وہ مشفقانہ انداز جس کا مجھ پر گہرا اثر رہا۔ استاد قیوم صاحب دوسری جنگ کے دوران اتحادیوں کی فوجوں میں شامل تھے۔ انہوں نے چین، برما، ہند، محاذ پر جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ان کے تجربات میرے دل میں اترتے گئے۔ یہ تجربات، یہ واقعات، مشرق بعید میں دلچسپی پیدا کرتے، میرے والد عبدالعظیم صاحب نے مجھ میں اسلام کے روحانی پہلو کی شمع جلائی، میری روح کی گہرائی میں شمع سلگتی رہی، سلگتی رہی۔

ابن خلدون اور ابن کثیرؒ کی ضخیم کتابیں مجھے دستیاب تھیں۔ ان کے گہرے مطالعہ سے ضروری معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر سید حسین نصر، ہوارڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سلیمان نیانگ اور کیلفورنیا یونیورسٹی برکلے کے پروفیسر حامد الغاز کی قیمتی نصیحتیں میری مددگار رہیں کیلفورنیا میری ٹائم اکیڈمی، ویالیجو کیلیفورنیا میں امریکی نیوی میں کام کرنے والے لفٹیننٹ مائیکل کم،

سان فرانسسکو کے گنا سسن رسالہ کے سابق اسوسی ایٹ پبلشر راشد پاچ، ان دونوں احباب نے اس مسودہ کو پڑھا اور قیمتی تاریخی بصیرت نگاہی سے مجھے نوازا۔

میں ممنون ہوں اپنی بیوی میمونہ کا جو اس مسودہ کو شروع سے لے کر آخر تک کئی مرتبہ پڑھتی رہیں اور اس کتاب کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اپنے قیمتی مشورہ سے نوازتی رہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان کی مدد کے بغیر شاید یہ کام مکمل نہ ہو پاتا۔

نذیر احمد
پی. ایچ. ڈی

دیباچہ

اسلامی تاریخ اس کے اپنے ہی اندرونی عمل ردعمل کا ایک عکس ہے۔ مسلم قوم کی جدوجہد، کامیابیاں اور المیے سب کچھ مسلمانوں کی اپنی انتخاب کردہ راہیں ہیں۔ وہ راستے جن کا چناؤ گذشتہ چودہ سوسالوں سے مسلمان خود کرتے چلے آرہے ہیں۔ جب بھی وہ اسلام کے اعلیٰ ترین اصولوں پر چلے، تو وہ دوسری تہذیبوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ بنے رہے۔ لیکن جب انہوں نے اصولوں سے سمجھوتہ کرلیا اپنی روحانیت سے جدا ہوگئے۔ اپنے اعلیٰ ترین اقدار سے دور ہوگئے تو انتشار کی گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ زندگی کے ہر ہر پہلو میں پہل کرنے کے اپنے حق کو دوسری تہذیبوں کی گود میں سونپ دیا۔

اسلام کا بنیادی پہلو اور اسکا بنیادی حق یہی ہے کہ ایک ایسے سماج کی تخلیق کرے جہاں حلال اور حرام کی تمیز ہو۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لے آئے۔ ایک مسلمان کی زندگی عبارت ہے اس سے کہ وہ مسلسل جدوجہد کرے، زمین پر ایک ایسی تہذیب کی تعمیر کرے جو رنگ، نسل اور وطنیت کے تنگ دائرہ سے بالکل الگ ہو۔ اس طرح اسلام ایک ایسا مسلسل عمل بن جاتا ہے جہاں آفاقی نظریات کے ذریعہ نسل و وطنیت کے نظریات کو برابر چیلنج کیا جاتا ہے۔ اس جہدِ مسلسل کا اعلیٰ ترین نمونہ خود رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ان چیلنجوں کا سامنا مکمل کامیابی کے ساتھ کیا اس کامیاب جدوجہد کے ذریعہ مسلمانوں کو وہ طریقہ کار بتلایا، ان رہنما اصول وضوابط کا مکمل اور صاف نقشہ بھی دکھلا دیا جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے اور کامیابی وکامرانی کی منزل کو پانا ہے۔

632ء میں ہادیٔ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مبارکہ کے بعد سے مسلمان ان رہنما اصولوں کے مطابق زندگی گذارنے کے لئے جدوجہد کرتے چلے آرہے ہیں۔ تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ برتر واعلیٰ

اصولوں کوانسانی پیمانے کے ذریعہ روبہ عمل لانے کے دوران کبھی کبھی ان اعلیٰ وارفع اقدار سے سمجھوتہ بھی کیا گیا۔ ان سے منہ بھی موڑا گیا-لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی جدوجہد نے ایسے آفاقی مرداورعورتوں کے کردار کی تعمیر کی جوانسانی تہذیب کے لئے روشنی ورہنمائی کا مینار بن گئے-انہی کے ساتھ ایسے بھی افراد پیدا ہوئے جوان اعلیٰ اقدار پر کھرے نہیں اترتے-

جدید دنیا کی تعمیر میں اسلام کا بہت بڑا تعمیری حصہ رہا ہے-اس وقت اس کی حالت ایک قوی پہلوان کی سی ہے جو ایک طویل نیند کے بعد بیدار ہوتا ہے اور سنبھلنے سے پہلے نیم خوابیدہ آنکھوں سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے-آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک سوتیس کروڑ سے زیادہ ہے یعنی دنیا کا ہر پانچواں فرد مسلمان ہے-اور اسلام کرۂ ارض پر انتہائی تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔

ایک انتہائی اہم بات امریکہ میں اسلام کا پھیلنا ہے-اعداد وشمار میں فرق ہوسکتا ہے لیکن مساجد میں جمع ہونے والی تعداد کے ذریعہ یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت امریکہ وکینڈا میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ لاکھ ہے-حالانکہ ان میں اکثریت تارکانِ وطن کی ہے۔لیکن امریکی باشندوں کے اسلام قبول کرنے کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔مسلمانوں کی اس بڑی تعداد اور دوسرے مذاہب کے علاوہ دنیا کی دوسری سیکولر تہذیبوں کے لوگوں کے درمیان جو باہمی عمل ردعمل ہورہا ہے وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں ہونے والے عمل ردعمل اور کرۂ ارض کی وہ تہذیبیں جو کھلا ہوا ذہن رکھتی ہیں ان کے ساتھ باہمی مناظروں کی یہ برقی رو ہم عصر دنیا کا اہم عنصر ہے۔روایتی طور پر امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے نظریات کی بنیاد کی ابتداء یہودی،عیسائی افکار سے ہوتی ہے۔ابھی اس دورحاضر ہی میں ان امریکوں نے یہ جانا ہے، یہ سمجھا ہے کہ دنیا میں ایک ایسا مذہب بھی ہے جو توحید پرست ہے، ایک خدا کا پرستار ہے اور وہ اسلام ہے، اس مذہب نے انسانی تہذیب کو بہت کچھ دیا ہے اب یہ امریکی اسے سمجھ پارہے ہیں-

ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت سے اسلام اکثر لوگوں کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ وہ ان قوی تاریخی عوامل کے بارے میں سمجھنا چاہتے ہیں جنہوں نے اس متحرک اور اثر آفریں عقیدے کو ایک روپ بخشا ہے۔وہ یہ بھی سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ عقیدہ جدید دور میں اپنے آپ کو کس طرح پیش کرتا ہے-مغربی دنیا

میں کلیساء اور حکومت کو بالکل ہی ایک دوسرے سے جدا مانا جاتا ہے-لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے-نظریات کے یہی اختلافات آج مغربی دنیا اور اسلام کے درمیان ہونے والے باہمی عمل ردعمل کو، باہمی مناظر کو دلچسپ اور جاندار بنا دیتے ہیں۔

جب اسلام اس دنیا میں آیا تو اس وقت سے پہلے ہی دنیا میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے والے ماورائی عقائد موجود تھے- یہ نظریات ان تمام ممالک میں بڑی شدت سے جاری وساری تھے۔ جہاں یہ نیا مذہب یعنی اسلام اشاعت پذیر ہوا- اس لئے اسلام سے پہلے کے ماورائی نظریات اور اسلام کی توحید پرستی کے درمیان ٹکراؤ ہونا لازمی تھا۔ جغرافیائی حالات نے اس لڑائی کا اولین منظرنامہ لکھ دیا تھا۔ اس مقابلہ کو سب سے پہلے مشرق وسطیٰ اور بحیرۂ روم میں ہونا تھا۔ اس علاقہ پر فارس اور بازنطینی شہنشاہوں کا اثر ورسوخ تھا-قوت ارادی کے پہلے امتحان میں مسلمان فتح یاب ہوئے اور اس ظفریابی کا سبب اس پختہ عقیدہ سے پیدا ہونے والا اتحاد تھا۔

جب اسلام اور پڑوسی تہذیبوں کے درمیان حالات کچھ پرسکون ہوئے۔ ان تہذیبی سرحدوں کے درمیان خطِّ فاصل کھینچ گئی تو اب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس پرکشش اور اثر آفریں توحید پرست عقیدہ کے ظاہری وباطنی صورتوں کی اصلیت کو معین کیا جائے-انہیں اجاگر کیا جائے ان کو واضح شکل میں پیش کیا جائے-مسلمان قاضیوں، منصفوں اور علم الکلام کے ماہرین نے اپنی تمام تر دماغی قوتوں کو اس چیلنج کی جانب مرکوز کردیا۔ ایک مکمل قانونی دستور مرتب کیا۔ ایک ایسا قانون جو اپنے اندرونی معاملات کے ساتھ نپٹ سکے۔ علاوہ اس کے تہذیبی تصادم اور تہذیبی مکالمے کی کشمکش آرائی سے بھی کامیابی کے ساتھ سامنا کرسکے-سب سے پہلے یونانی عقلیت پرست افکار کا تجربہ کیا گیا پھر اسے ترک کردیا۔ ہندوستانی ریاضی یعنی حساب اور چینی ٹکنالوجی کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ پھر مسلمان ایک قدم اور آگے بڑھے۔ سائنس کے نئے نئے شعبہ ایجاد کئے۔ نئی اختراعات اور ایجادات کرنے میں اولیت حاصل کی۔ سیاسی دنیا کو ٹھیک ٹھیک خانوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک دارالاسلام یعنی اسلام کا گہوارہ تھا تو دوسرا دارالحرب یعنی رسہ کشی اور کشمکش کا گہوارہ۔ یہ تقسیم پانچ سو سالوں تک مسلمانوں کے لئے بہتر ثابت ہوئی-اس لئے

کہ اس دورِ وسط میں براعظموں کے درمیان کشمکش آرائی کم ہی تھی۔ باہمی عمل ردعمل کچھ زیادہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ اگر تصادم ہوتے بھی تھے تو یہ رک رک کر کافی عرصہ کے درمیان ہوتے تھے۔ اسلامی تہذیب ترقی کی جانب بڑھتی رہی، اس زمانے میں فلسفہ، فنون لطیفہ، تاریخ اور تمدن ارتقاء پذیر رہے۔ اس ترقی یافتہ تہذیبی سرمایہ کو انہوں نے دنیا کے بقیہ حصہ کی جانب برآمد کیا۔

اپنے آپ میں خود کفیل یہ دنیا بارہویں صدی عیسوی میں پہلے صلیبیوں کے حملوں سے لرز اٹھی۔ پھر تیرہویں صدی عیسوی میں منگولوں کے حملوں کی وجہ سے لٹ گئی۔ اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ تباہ ہو گیا لیکن جب امتحان کی گھڑی آئی تو آزمائش کے لمحات میں اسلام نے اپنی قوت مدافعت، سخت جانی اور پھر سے ابھر آنے کا بھرپور ثبوت دیا۔ اسلام کی وہ روحانیت جسکا اظہار تصوف کی عظیم شخصیات نے کیا، وہی روحانیت فتح یاب ہوئی۔ منگولوں نے اسلام قبول کرلیا اور خود وہی اسلام کے پاسدار و محافظ بن گئے۔ اسلام کی روشنی کو پھیلانے والے ہو گئے۔ منگولوں، تاتاریوں اور ترکوں کا جو عنصر اسلام میں داخل ہوا تو اسلامی دنیا میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ ایک نئی قوت اس میں بھر گئی۔ ان کی محافظت میں ایران کی روحانی پاکی صفائی اور عرب کی دانشواری دونوں نے بھرپور جلا پائی۔ دونوں کی نشو و نما ہوئی۔ پرانی روایات نئے افکار میں پگھل کر آپس میں گھل مل گئے۔ اس کے نتیجہ میں جمال و جلال کا مظہر ایک ایسا عوامی اسلام ابھرا جو برصغیر ہندو پاک، انڈونیشیاء، افریقہ اور یوروپ کے علاقوں میں پھیل گیا۔ اس کے نتیجے میں دولت منداور طاقت ور شاہی سلسلے ابھر آئے، ہندوستان میں مغلیہ سلطنت، ایران میں صفوی، مغرب میں مالی اور سانگھے اور مشرقی بحیرۂ روم میں عثمانیہ ترکوں نے عظیم الشان حکومتیں قائم کیں۔ اپنے پیچھے ادب، فنون لطیفہ اور فن تعمیر کی اعلیٰ ترین میراث چھوڑی۔

وہ بندھن جو عام طور سے فرد کو تہذیبوں سے باندھتے ہیں وہی بندھن عقیدہ، رشتہ داری اور دوستی کو مضبوط کرنے کے علاوہ تہذیب کو بھی ارتقاء پذیر کرتے ہیں اور یہی عناصر عام اشخاص کو آپس میں جد و جہد کرنے اور ایسی منزل کو پانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں جو عام طور سے ان کی رسائی سے پرے ہوتی ہے۔ اسلامی تہذیب کو مسلسل قوت نمو بخشنے والی طاقت وہ آفاقی عقیدہ ہے جس کا واحد مقصد ہے اللہ تعالیٰ

کی ذات کو ماورائے ادراک سمجھنا اور اللہ کے احکامات کو کرۂ ارض پر نافذ کرنا۔

پندرہویں صدی عیسوی کے دوران سمندروں کے اس پار سے ایک نئے چیلنج نے سر ابھارا۔ وہ خطرہ تھا پرتگالیوں کا۔ انہوں نے توپ بردار جہازوں کے ذریعہ بحر ہند کے ساحلوں کو تباہ و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ وہ امن و امان جس نے نے ایک بڑے علاقے کو تجارت کی آزادانہ گذرگاہ بنا رکھا تھا اب یوروپی توپوں کی گھن گرج میں کھو گیا۔ اسی زمانہ میں امریکہ بھی دریافت ہوا۔ کرۂ ارض کے پورے گھیرے میں جہاز رانی ہونے لگی۔ دنیا بدل گئی- انہی حالات کے پس منظر میں شمالی یوروپ کی نئی طاقتوں نے سر اٹھایا اور کچھ عرصہ کے دوران ایشیاء اور افریقہ کے بڑے علاقہ مفتوح ہو گئے- انگلینڈ، فرانس اور روس نے اپنی طاقت کا دائرہ بڑھایا۔ جبکہ اسلامی دنیا نے نقطۂ نظر کا مرکز کھو دیا اور اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ کاہلی کی وجہ سے ایک عجیب قسم کی تنگ نظری، انتہاء درجہ کی مذہبی عصبیت اور سمندری ٹکنالوجی سے غفلت ان تمام عناصر نے اپنا اپنا رول ادا کیا- پرانے مسلم ادارے یوروپی جائنٹ کمپنیوں کا مقابلہ نہ کر سکے- اثر آفرینی، کارگذاری اور تاثیر میں مسلم ادارے یوروپی کمپنیوں سے مات کھا گئے۔ دنیا کے معاملات میں مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی- یہاں دوسرے تہذیبوں نے ان کو مات دے دی-

مسلم علاقے جب یوروپ کے زیرنگیں آ گئے یہ ان کی نوآبادیاں بن گئے تو مسلمانوں کا تاریخی اور تہذیبی ارتقاء کا سفر رک گیا- جب بیسویں صدی عیسوی میں نوآبادیاتی نظام ٹوٹنے لگا اور سیاسی اقتدار کی جگہ اقتصادی قوت نے لے لی تو مسلمان قوم اس کے لئے تیار نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھتی، بکھرے ہوئے اجزاء کو سمیٹتی اور اپنے ہم عصر یوروپی ممالک کے ساتھ ساتھ اپنا تاریخی سفر ایک بار پھر شروع کرتی- ایسے زمانے میں جبکہ ٹکنالوجی نے دنیا کو ایک دیہات کی طرح سکیڑ دیا ہے، مسلمان گہری نیند سے یوں بیدار ہو رہے ہیں کہ ابھی جماہیاں لے رہے ہیں- گرد و پیش کی خبر نہیں، یہ اپنے ہی ایک ایسے الگ دور میں پھنسے ہوئے ہیں جو کہ ٹوٹا سا بکھرا بکھرا سا ہے- موجودہ زمانے کے مسلمانوں پر ایک تہذیبی جمود طاری ہے۔ یہ کئی مختلف زمانوں میں جی رہے ہیں، کچھ بیسوی صدی میں تو کچھ اسلام کے عظیم الشان ''کلاسیکل'' دور میں اور کچھ اس سے پہلے کے زمانے میں۔ آج اسلامی دنیا میں جو شورش برپا ہے وہ اسی انتشار کا نتیجہ ہے-

نوآبادیاتی دور کی وجہ سے اسلامی تہذیب وتمدن کے ارتقاء کی کڑی جو ٹوٹ گئی تو اب جدید سکولر دنیا اور اسلامی تہذیب کے درمیان ہونے والی کشمکش اور عمل ردعمل کے درمیان حدود معین کرنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔صرف اسلام ہی اس کشمکش سے دوچار نہیں ہے۔دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کو بھی اسی قسم کی صورتِ حال کا سامنا ہے-یہ انتہائی ضروری ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح،اسلام کے تاریخی ارتقاء کے عمل کی جو کڑی ٹوٹ گئی ہے وہ پھر سے جڑ جائے یہ عمل پھر سے جاری وساری ہو جائے-

یہ کتاب اس سنگ میل کی نشاندہی کرتی ہے جو کہ اس عظیم اسلامی قوم کی جدوجہد سے عبارت ہیں. جن کے ذریعہ اسے ایک بار پھر انسانی تاریخ میں اپنے اصلی مقام کو پانا ہے۔ ان مسائل کے عالمی اور آفاقی حل نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول اقبالؔ

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

اسلام ایک عالمی جدوجہد ہے۔اس کے ماننے والے دنیا کے ہر ایک کونے میں موجود ہیں۔یہ ہرگز ہرگز صرف مشرق وسطیٰ کا ہی مذہب نہیں ہے-یہ ایک آفاقی مذہب ہے۔آفاقی تصورحیات ہے،ایک علاقہ تک یہ محدود نہیں ہے۔مسلمانوں کی دنیا تو اس وقت انڈونیشیاء کے جزائر سے لے کر مغربی افریقہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ایک زرین صافہ کی طرح جس پر قسم قسم کے خوبصورت مقامی بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ ایک عالمی رسائی کے بغیر،عالمی قربت کے بغیر عالم اسلام سے منسلک سوالات کے جوابات صحیح طریقہ سے نہیں دیئے جاسکتے۔ عالم اسلام کے مسائل کو سمجھنے کے لئے عالمی طرزفکر لازمی ہے-

وہ طوفان جو فیصلہ کن ہوتے ہیں۔زمانہ کی نازک گھڑی ہوتے ہیں وہ سارے فیصلہ کن طوفان مردوخواتین کے ذہنوں میں پلتے ہیں۔وہ انسانی دماغ،دل اور روح ہی تو ہیں جہاں انسانی حرص وہوس، محبت،نفرت،دنیا کی تمنا،دولت کی آروز،فیض رسانی جیسے جذبات ابھرتے ہیں پھر ایک دوسرے سے جُدا جُدا الگ الگ ہوتے ہیں-ممیّز ہوتے ہیں-انسان کے باطن سے ابھرنے والی کشمکش جب تاریخ کے صفحات پر بکھرتی ہے تو انسانی جدوجہد کو نئی سمتیں عطا کرتی ہیں۔ یہ کتاب انہیں طوفانی لیکن فیصلہ کن لمحات کو قلمبند

کرنے کی ایک کوشش ہے۔طوفان کے بعد انسانی تاریخ پر ہونے والے اثرات کو دکھلانے کی سعی ہے۔
ان کوششوں میں تاریخ کی گہرائیوں سے سمجھوتہ کرنے کا خطرہ رہتا ہے۔اس خطرہ کو کم کرنے کے لئے ان حالات کا گہرا جائزہ لیا گیا ہے۔ان شخصیات پر باریک بینی سے نظر ڈالی گئی ہے اور ان تحریکات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے جنہوں نے آنحضورﷺ کے وصالِ مبارک سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک اسلامی تاریخ کے بہاؤ پر فیصلہ کن اثرات چھوڑے ہیں۔

تاریخ ایک آفاقی مدرسہ ہے جو ماضی کے واقعات پڑھاتا ہے تاکہ ان کی روشنی میں ہم اپنے حال کو پہچان سکیں اور مستقبل کو سنوار سکیں۔چودھویں صدی عیسوی کے تاریخ دان ابن خلدون کے مطابق ''تاریخ ایک شاندار اور عالی ظرف اور عالیشان سائنس ہے۔کارآمد اور قابل تعظیم شعبہ ہے اس لئے کہ یہ ہمارے اسلاف کے کردار اور انکے حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔یہ ان راہوں پر روشنی ڈالتا ہے جن پر تمام پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام چلے۔حکمرانوں کے سیاسی اور حکومتی پس منظر کو دکھلاتا ہے۔تاکہ اگر کوئی ان پر چلنا چاہے تو وہ تاریخ سے ان کے واقعات وحالات کو لے سکتا ہے اور انہیں اپنا رہنما بنا سکتا ہے۔

یہ ان کاوشوں کا ایک تسلسل ہے جو کہ اسلامی تاریخ کے انسائیکلو پیڈیا بنانے کے لئے ہو رہی ہیں۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہوتا جا رہا ہے۔ہندوستان اور پاکستان کے لئے ایک الگ الگ ایڈیشن چھاپے جائیں گے۔امید ہے کہ اس کتاب سے جس میں رسول اکرمﷺ کے انتقال پر ملال سے لے کر دوسری جنگ تک کے حالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ان حالات کے اس عمل کو سمجھنے میں مدد ملی گی جنہوں نے اسلامی تاریخ کو ایک اعلیٰ وارفع شکل عطا کی ہے اور آگے آنے والے ادوار میں بھی عطا کرتے رہیں گے۔

نذیر احمد

پیالیس ورڈیز ایسٹیٹ، سی. اے

4جولائی 2000

''اپنی بات''

ڈاکٹر نذیر احمد نے جہاں سائنس وتکنالوجی کی دنیا میں اپنی ایجادات سے شہرت پائی، علم کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، علم وفضل اور دانشوری سے یہاں کی پوری ایک نسل کو متاثر کیا۔ وہیں اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ بھی جاری رکھا، قرآن، اسلامیات، تاریخِ اسلام پر غور وفکر کرتے رہے سائنسدان ہونے کے ناطے جدید دنیا کے علمی وتہذیبی تقاضوں میں انہیں عالم اسلام کے بارے میں ایک نقطۂ نظر عطاء کیا جو قدیم وجدید کا سنگم ہے۔ بقولہ اقبالؔ

آئین نو یہ چلنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

آپ نے عالم اسلام اور دنیا کا وسیع سفر کیا ہے۔ اندلس، مراقش، مصر، سعودی عرب، ترکی، قبرص، بخارا، سمرقند، ملیشاء، انڈونیشیہ، ہندوستان، جنوبی افریقہ وغیرہ کا سفر آپ اس لئے کرتے رہے کہ اسلامی تہذیب وتمدن، اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے عروج وزوال کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ جہاں آپ نے آقائے نامدار سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے حضور سلام ودرود کا تحفہ بادیدۂ نم پیش کیا ہے وہیں اس روشنی کو مستعار لے کر چمکنے والے ستارے مولانا جلال الدین رومیؒ، امام بخاریؒ خواجہ معین الدین چشتیؒ ،حضرت نظام الدین اولیاءؒ، جیسے بے شمار باکمال شخصیتوں کے در اقدس پر سلام کا تحفہ بھی پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے لہجہ میں توحید، جدیدیت، آفاقیت اور روحانیت کا ایک خوبصورت سنگم نظر آتا ہے۔ کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے کئی بار میری آنکھیں اشک بار ہوگئیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ ناچیز کو اس کتاب کا ترجمہ کرنے کا موقعہ عطا فرمایا۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے انگریزی زبان میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ امریکہ اور یوروپ کے مشہور اخباروں میں ان پر سیر حاصل اور جامع تبصرے شائع ہوئے۔ اسلام کے متعلق مغربی دنیا کو سمجھانے کے لئے اسلام کی اصلی روح کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کے لئے انہوں نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں انکو سراہا گیا۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی کتاب "اسلام اور ورحانیت" پڑھ کر کئی غیر مسلمین نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان کی تحریروں کو اس سے بڑھ کر اور کیا خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔

"اسلام تاریخ عالم میں" ایک ایسی کتاب ہے جو کہ مقامی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ عالمی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ ابن خلدون اور یوروپ کے دوسرے مشہور مورخین کے بعد پہلی بار اس میں انسانی تہذیب کے عروج وزوال کے اصولوں پر بہترین انداز سے بحث کی گئی ہے۔ ابنِ خلدوں یا دوسرے مورخین نے تاریخ میں اقوام کے بعد ان کی تہذیب وتمدن کے عروج وزوال پر جو نظریات پیش کئے ہیں وہیں ڈاکٹر نذیر احمد نے ان تمام پر ایک بالکل الگ نظریہ پیش کیا ہے۔ آپ نے قوموں کے عروج وزوال کے لئے اخلاقیات کو میعار بنایا ہے اور مسلمانوں کے عروج وزوال کا واحد سبب توحید سے قریب اور توحید سے دوری کو بتلایا ہے۔ مسلم قوم جس قدر توحید پرست رہی، احسان اور روحانیت سے قریب رہی اسی قدر وہ عروج کے منازل طے کرتی رہی۔ جیسے جیسے وہ اس منزل سے دور ہوتی گئی ویسے ویسے وہ زوال وانحطاط پذیر ہوتی گئی۔

"اسلام تاریخ عالم میں" لکھنے کا مقصد صرف واقعات نگاری قصہ نگاری، افسانہ طرازی سلاطین و شہنشاہوں اور فاتحین کے کارناموں کا ذکر کرنا نہیں ہے۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کے وصال مبارک سے لے کر آج تک، اسلام کو، اسلامی تہذیب کو، اسلامی افکار کو دنیا کے مختلف خطوں کی جن جن تہذیبوں کا سامنا کرنا پڑا ان کے ساتھ جو تہذیبی مکالمے ہوئے، جو تہذیبی تصادم، کشمکش آرائی اور گفت وشنید رہی اس کا تفصیلی جائزہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تہذیبی مکالمے عیسائی یوروپ واسلامی افریقہ کے درمیان الگ رہے تو عیسائی یوروپ و اسلامی ایشیاء کے درمیان جدا رہے۔ چین و ہندوستان کی تہذیبوں اور اسلامی تہذیب کے درمیان الگ مکالمہ رہا۔ افریقہ کے اندروں میں کچھ اور کشمکش آرائی رہی تو ملیشیاء وانڈونیشیا

میں اسکا رنگ ڈھنگ الگ رہا۔ان تہذیبی عمل ردعمل پر بصیرت افراز د روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب کا ایک اوراہم ترین جزیہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کے عروج کی شان کو پیش کیا گیا ہے۔ وہیں ان کے زوال کی دردناک داستان لکھی گئی ہے۔اس تنزلی کے اسباب کی نشاندھی بار بار کی گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمان علم وہنر،صنعت،حرفت،تجارت،سیاست ملک گیری میں دنیا کے قائد تھے۔تمام اقوام کے سردار تھے۔دنیاان کی ترقی پر حیرت زدہ تھی اورانہیں دیکھ کر جینے کے آداب سیکھتی تھی۔

آج مسلمان کی جو حالات ہے اس زوال کے کئی اسباب ہیں ان کی نشاندھی کرتے ہوئے ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ مسلمانِ اسلام کے سرچشمے سے دور ہو گئے۔اسلام کی روحانیت سے کنارہ کش ہو گئے اسی کے ساتھ انکا اتحاد بھی ٹوٹ کر بکھر گیا۔ جہاں وہ توحید سے دور ہوئے وہیں اسلام کی روح "احسان" سے جدا ہو گئے۔اس احسان کو بھول گئے جو کہ اسلامی تہذیب کا اہم پہلو ہے جو کہ سنت الرسول ﷺ ہے۔حدیث قدسی ہے 'احسان اسلام کی روح کو تازہ کرتا ہے' اسلام ایک عظیم الشان نہر ہے تو اس سے سیراب ہونے والا 'احسان' ہے۔جس سے دنیا سرسبز وشاداب ہوئی ہے،انسانی ارواح شرابور ہوتی رہی ہیں،توحید، روحانیت اوراحسان کی اساس پر دنیا کے وسیع علاقوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی جب تک مسلمان احسان نواز رہے تاریخ انکے قدم چومتی رہی۔افریقہ کے اندرونی ممالک، ہندوستان، ملیشیاء، انڈونیشیا، یوروپ اوروسط ایشیاء کے لاکھوں عوام نے اسلام قبول کیا۔احسان کا سبق بھولے اوراصولوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے تو تاریخ نے بھی ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔روح ختم ہو گئی خالی خولی بے حال جسم رہ گیا۔صرف خاک رہ گئی اس خاک میں وہ حرارت نہ رہی۔اسلام کوانہوں نے اصولوں اورفتاویٰ میں بند کردیا۔اسی کے ساتھ دنیا کو عالم گیری کا درس دینے والی اسلامی تہذیب زوال آشنا ہو گئی۔

اس کتاب کا ایک خصوصی پہلو یہ ہے کہ جہاں خلفاء، امراء، بادشاہوں،شہنشاؤں اورانکی حکومتوں کا ذکر ہے وہیں علمائے دین،صوفیائے عظام کے زرین کارناموں پر زیادہ تفصیل سے توجہ دی گئی ہے۔اس بات کے ثبوت وشواہد جمع کئے گئے ہیں کہ اسلام نے جسموں کو فتح نہیں کیا۔ بلکہ اسلام نے توحید پرست

روحانیت اور احسان کے عملی مظاہرہ کے ذریعہ عوام اور بادشاہوں کے دلوں کو فتح کیا۔

اس کتاب کا پیغام یہی ہے کہ آج ایک بار پھر اسلام کو اسی "احسان" کا بھولا ہوا سبق یاد کرنا ضروری ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن کا مغز احسان ہے۔ یہی احسان وہ سمینٹ ہے جو انسانیت کو آپس میں جوڑتا ہے۔ اسی کے ذریعہ مسلمان ایک بار پھر اقوام عالم سے اپنا رشتہ استوار کر سکتے ہیں۔

منیر احمد

مترجم

”پہلا باب“

ایمان کا دور

ایمان کا دور

خلاصہ:

اسلام ساتویں صدی میں دنیا کے پردہ میں باران رحمت بن کر نازل ہوا۔ایک خانہ بدوش قوم کو ایک ایسی انقلاب آفریں تبدیلی سے آشنا کیا جس کی وجہ سے وہ عظیم ترین عالمی تہذیب کی معمار بن گئی۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمایا تو مسلم قوم کے سامنے سب سے اولین اور بڑا چیلینج پیش آیا۔ مسلم قوم نے اس چیلنج کا سامنا کامیابی کے ساتھ کیا۔انہوں نے خلافت کے ادارہ کی بنیاد رکھی اور تاریخ کے دھارے میں اسلام کی کامیاب روانی کو مضبوطی کے ساتھ جاری وساری رکھا اسلامی ریاست نوزائیدہ تھی اس کا صدر مقام مدینہ تھا۔اس نئی حکومت کی قسمت میں بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کے خلاف محاذ آرائی کرنا لکھا تھا۔اس اسلامی حکومت نے کامیابی کے ساتھ ان کے حملوں کے خلاف اپنا دفاع کیا۔لیکن اسی کامیابی نے ہی قوم میں بے اطمینانی کے بیج بو دیئے۔فارس سے حاصل ہونے والی دولت اپنے ساتھ حرص اور اقرباء پروری بھی لے آئی۔جس کی وجہ سے حضرت عثمان بن عفانؓ کی شہادت ہوئی۔چوتھے خلیفہ حضرت علی ابن ابوطالبؓ نے کرپشن پر روک لگانے کی کوشش کیں اور قوم کو ایمان کے اصل سرچشمے کی جانب لے جانے کی بھرپور کوشش کیں لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پیدا ہونے والا سیلاب انہیں بھی بہا لے گیا حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ ہی ایمان کے دور پر پردہ گر گیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت

تہذیبوں کی آزمائش تاریخ کے نازک اور فیصلہ کن لمحات میں ہوتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ افراد کی آزمائش مصیبت کی گھڑیوں میں ہوتی ہے ۔ یہی وہ نازک فیصلہ کن لمحات ہیں جو کہ تہذیبوں کے اصل کردار کو ابھارتے ہیں اسی طرح جیسے کہ افراد کا کردار بھی ایسے ہی لمحات میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ عظیم تہذیبیں چیلنجوں کا سامنا انتہائی کامیابی سے کرتی ہیں ہر ایک بحران سے اور زیادہ مدافعت کی قوت اپنے آپ میں پیدا کرتی ہیں ہر مصیبت کی گھڑی کو کامیابی حاصل کرنے کے بہترین موقع میں تبدیلی کر لیتی ہیں افراد کے کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ عظیم مرد اور خواتین تاریخ کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیتے ہیں جبکہ کمزور لوگوں کو وقت کا بھنور نگل جاتا ہے۔

اس کتاب کا بنیادی مفروضہ یہی ہے کہ اسلامی دنیا کی اولین گفت وشنید باطنی رہی ہے ۔اس کی کامیابیاں اور ناکامیاں اس بات سے وابستہ رہی ہیں کہ قوم کس قدر مضبوطی کے ساتھ ان الہامی احکامات سے بندھی رہی جن کا درس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔اس عالمی قوم کا آپسی اتفاق یا نفاق ہی تھا جو کہ اس کی قسمت کو بنانے میں اپنا رول ادا کرتا رہا جب بھی اسلام کے ماننے والے قرآن کے الہامی احکامات اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی سے تھامے رہے فتح مندی ان کے قدم چومتی رہی جب بھی اس میراث سے ان کی نظریں ہٹیں وہ بکھر گئے اور تاریخ نے انہیں ایک کونے میں رکھ دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت وہ اولین لمحہ تھا جب کہ مسلمان قوم کو اولین چیلنج کا سامنا ہوا۔ قوم نے اس اولین چیلنج کا سامنا جس طریقہ سے کیا وہی طریقہ کار آنے والی صدیوں میں ان کی طاقت اور

کمزوری کی بنیاد بنا اسلامی تاریخ کا پر شکوہ شان و شوکت والی عمارت کا نقشہ اسی لمحہ تیار ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ بن الخطاب حضرت عثمانؓ ابن عفان اور حضرت علیؓ ابن ابو طالبؓ جیسی عظیم شخصیات تاریخ کے دھارے میں ابھر آئیں۔ ان شخصیتوں نے جو کیا اور جو کچھ وہ نہ کر سکے وہی حالات اسلامی تاریخ کے رخ کو چودہ سو سالوں سے متاثر کرتے چلے آ رہے ہیں۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی زندگی کا سر چشمہ تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امت مسلمہ نے جس گہری عقیدت و محبت کا ناطہ جوڑا انسانی تاریخ میں اور کسی بھی شخصیت کے ساتھ لوگوں نے ایسی عقیدت نہیں دکھلائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی سماجی، عمرانی، روحانی، سیاسی، اقتصادی، فوجی اور عدل و انصاف وغیرہ ان ساری باتوں کے منبع و مرجع تھے وہ خدا کے پیغمبرؐ تھے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جب وہ دنیا سے پردہ فرما گئے تو ایک ایسا خلاء چھوڑ گئے جس کو پر کرنا ناممکن تھا ان کے انتقال پر ملال کے فوری بعد ان کی چھوڑی ہوئی وراثت کو حالات کی کسوٹی پر کسنے کا موقع آ گیا۔

ملت کا تاریخی عمل و تسلسل داؤ پر لگاؤ ہوا تھا۔ ایک ایسی قوم جو نسل، رنگ، قبیلہ اور وطن کے خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس قوم کو انہوں نے اتحاد کی ایک مضبوط لڑی میں پرو دیا تھا۔ انہیں آپس میں متحد رکھنے والا سریس یا سمنٹ تھا قرآن اور سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اب جب کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے پردہ فرما گئے تو ایسا لگتا تھا وہ طاقتیں جنہوں نے اس قوم کو اسلام سے پہلے بکھیر رکھا تھا وہی طاقتیں ایک بار پھر سر اٹھائیں گی اور نو زائیدہ ملت کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کر دیں گی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارکہ پر پہلا ردعمل تھا بے یقینی کا ایک زبردست شاک کا ایک ایسا جھٹکا جس کے باعث لوگ کہہ رہے تھے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اجمعین کی زندگیوں میں یوں رچ بس گئے تھے کہ وہ اس محبت کے مرکز سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب حضرت عمر بن الخطابؓ نے یہ سنا کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں تو وہ اس قدر بدحواس ہوئے کہ نیام سے تلوار کھینچ لی اور اعلان کیا کچھ منافق یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب انتقال فرما چکے ہیں میں قسم کھاتا ہوں کہ انہوں نے انتقال نہیں فرمایا بلکہ اپنے خالق اعلیٰ سے ملنے

گئے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے دوسرے پیغمبر علیہ السلام گئے تھے۔حضرت موسیٰ اپنی قوم سے چالیس دنوں تک دور رہے وہ اس وقت واپس ہوئے جب لوگوں نے ان کے انتقال کی خبر پھیلا دی تھی۔ خدا کی قسم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح واپس ہونگے جیسا کہ حضرت موسیٰ واپس ہوئے تھے جو کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی جھوٹی افواہ پھیلائے گا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دونگا''

وہ اسلام کی اعلیٰ قوت تھی جو حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسی شخصیت کو سامنے لے آئی انہوں نے پہلے اس بات کی تصدیق کر لی کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم واقعی دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں پھر وہ مسجد نبوی آئے جہاں حضرت عمر بن الخطابؓ لوگوں سے بات کر رہے تھے۔انہوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی۔(حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہیں۔ان سے پہلے بہت سے رسولؑ ہو چکے ہیں کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز اللہ تعالیٰ کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گذاروں کو نیک بدلہ دے گا (۳۔۱۴۴)

لوگوں کو ایسا لگا جیسے وہ اس آیت کو پہلی بار سن رہے ہوں ان پر جیسے بجلی گر پڑی۔حضرت عمرؓ نے آگے چل کر اپنے اس وقت کے احساسات کو یوں بیان کیا خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے انتقال کا یقین ہوتے ہی میرے پیر کانپنے لگے۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی بات سامنے آ چکی لیکن اللہ تعالیٰ کے ازلی وابدی ہونے کی بات ایک بار پھر روشن ہوگئی اسلامی تہذیب کو اللہ تعالیٰ کی ذات کو مرکز بنانا تھا ۔انسان کی ذات کو نہیں۔اسلام کو لنگر انداز ہونا تھا اللہ تعالیٰ کی ذات میں اس کے الہامی کلام میں-اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بشر کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے اور اپنا تاریخی مشن پورا کیا اور دنیا سے پردہ فرما گئے۔لیکن وہ نور جوان کی ذات بابرکت کے ذریعہ چمکا وہی نور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا آرہا ہے اسلام نے اپنا ماورائے ادرک اعلیٰ ارفع کردار کو باقی رکھا اسلام کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی موجودگی کے بغیر زندہ و پائندہ رہتا تھا اور تاریخ کے صفحات پر اپنی روشن ترین اصولوں کا سکہ جمانا تھا۔

حالات بہت نازک تھے سیال تھے اور خطرات سے بھرے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیاوی جسم چھوٹے سے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔وہ شخصیت جنھوں نے تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا اب دنیا

سے پردہ فرما چکی تھی۔ یہی وہ شخصیت تھی جنہوں نے خانہ بدوش جاہل اور بکھری ہوئی قوم کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ انہیں خود اپنی قسمتوں کا مالک بنایا عوام کا ہجوم لہر در آتا رہا روتے ہوئے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلاتے ہوئے اپنے مستقبل کو غیر یقینی تصور کرتے ہوئے وہ اب اس لنگر کے بغیر تھے جو انہیں سہارا دیتا رہا وہ اپنے اس قائد سے محروم تھے جو انہیں قوت نمو بخشتے رہے اس استاد کے بغیر تھے جو انہیں تعلیم وتربیت دیتے رہے اور اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر تھے جن پر وحی اترتی تھی۔

اب سوال جانشینی کا تھا آنے والی نسلوں کے لئے وراثت کے نقش قدم چھوڑنے کا یہ سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا ۔اسلام کی منزل تھی ایک ایسی عالمی امت کی تشکیل جو کہ صراط مستقیم پر چلے جو اللہ تعالی کی وحدانیت پر ایمان رکھے اور دنیا کو حرام سے روکے اور حلال کی تمیز سکھائے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی موجودگی کے بغیر تاریخ عالم کے پیمانے میں اس مشن کو کس طرح کامیابی کی منزل تک پہنچانا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا علم سر بلند کرنے والی قوم کا شاندار محل تاریخ کی منزلوں میں ، کیسے تعمیر ہوگا کیا ان بزرگ ترین اعلیٰ ترین شخصیت کی موجودگی کے بغیر جنہوں نے تاریخ کے جھروکوں میں اس شاندار محل کی تعمیر کا نقشہ کھینچا تھا اس محل کی تعمیر ہوگی؟ آیا جانشینی کے مسئلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خصوصی احکامات دیئے تھے اگر ایسا نہیں تھا تو پھر اس کے پیچھے کیا راز چھپا ہوا تھا۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے فوری بعد جانشینی کے سوال پر کئی موقف ابھر کر سامنے آئے ۔ پہلا موقف تھا انصار کا جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور مدد کی جب وہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دل و جان سے مہمان نوازی کی اور آزمائش کی ہر گھڑی میں ان کا ساتھ دیا اسی لئے انہوں نے محسوس کیا کہ قوم کی قیادت انہیں ملنی چاہیئے ۔کم از کم انہوں نے یہ دلیل دی کہ قیادت تقسیم کی جائے ۔ انہوں نے صلاح دی کہ دو افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے ایک مہاجر ہو دوسرا انصار ہو اور یہ دونوں مل کر قوم کی قیادت کریں ۔ دوسرا موقف حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھیوں کا تھا انہوں نے اپنے موقف کے لئے دلیل پیش کی کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر کمزور ہو گئے کہ نماز کی امامت نہیں کر سکتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نماز با جماعت کی امامت

کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام قبول کرنے والے اولین فرد تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رفیق تھے۔ صحیح احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بہت زیادہ انسیت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے قریب بھی تھے تیسرا موقف حضرت علی ابن ابوطالبؓ کے ساتھیوں کا تھا۔ حضرت علیؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی تھے۔ انہوں نے آپ کی سب سے چہتی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرہؓ سے نکاح کیا تھا۔ نوجوانوں میں سب سے پہلے انہوں نے ہی اسلام قبول کیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا وارث قرار دیا تھا اور اپنا بھائی کہا تھا۔ امت مسلمہ نے پہلے دونوں موقف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چند گھنٹوں کے اندر ہی مفاہمت کرلی۔ لیکن تیسرے موقف پر رائے مسلسل بٹی رہی ان اختلافات نے آگے چل کر شیعہ سنی تفرقہ کو جنم دیا اور یہ الگ الگ موقف اسلامی تاریخ میں بڑے زلزلوں کے لئے زرخیز زمین ثابت ہوئے۔ یہ زلزلہ بار بار آتا رہا تباہیاں و بربادیاں ساتھ لیتے ہوئے ۶۸۰ء میں کربلا میں اہل بیت پر مظالم کی انتہا اور ان کا شہید کیا جانا ۱۵۱۷ میں چالڈران کی جنگ اور ۱۹۷۹ تا ۱۹۸۷ء تک عراق ایران کی جنگ اس کی مثالیں ہیں۔

جانشینی کے مسئلہ کو امت کے اجتماعی فیصلہ پر چھوڑ دیا جانا حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ ترین فہم وفراست کا ایک بہترین مظہر ہے۔ ایک آفاقی قوم کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام زمانوں کے لئے اور آنے والی تمام نسلوں کے لئے مسلسل رہنمائی ہوتی رہے۔ آج سے چودہ سو سالوں پہلے کے لوگوں کے لئے جو رہنمائی تھی وہی سچائی آج اکیسویں صدی کی امت کے لئے بھی موجود ہے۔ اس میں جہاں دانشوروں کے لئے غور وفکر کے لئے دعوت ہے وہیں جنگلوں کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے یکساں طور پر قابل قبول رہنمائی ہے۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی اعلیٰ ترین دانشوری اس سچائی میں موجود ہے کہ جہاں اسلام کے رہنما اصولوں کا ماخذ قرآن ہے وہیں ان اصولوں کو سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عملی نمونہ میں ڈھالا گیا۔ وہیں ان رہنما اصولوں کا اطلاق تاریخ کے مختلف ادواروں، زمانوں کے حالات کے مطابق لاگو کرنے کی ذمہ داری تاریخ کے تسلسل پر چھوڑ دیا۔ دوسرے الفاظ میں اسلام زندہ رہنے کا فن جاننے والا مذہب ہے۔ زمانے کی ذمہ داریوں کو سمجھنا ان سے عہدہ برآمد ہونا قرآن اور سنت کے مطابق

عمل کرنا ایک ایسا تسلسل ہے جو کہ ابدی طور پر جاری ہے اور یہ ذمہ داری امت کی تمام آنے والے ہر ایک نسل پر یکساں طور پر لاگو ہوتی ہے۔ یہ موقف کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی جانشینی کے سلسلے میں ہدایتیں دے رکھی تھیں ۔اسلام کے نمو حاصل کرنے والے عمل سے میل نہیں کھاتا لیکن تمام مسلمان اس نقطہ نظر کو نہیں مانتے ان کے اپنے موقف کو ثابت کرنے والی احادیث مبارکہ کی بنیاد پر جانشینی کے مسئلہ پر انتہائی کٹر موقف اختیار کئے گئے لیکن وقت بذات خود ایک بے رحم منصف ہے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ کٹر موقف اور زیادہ انتہا پرستی اختیار کر گئے آگے چل کر یہ موقف کٹر مباحثوں ، بغاوت ،ظلم اور خانہ جنگی صورت میں ابھر آئے۔

قوم میں ابھر آنے والی کھلی دراڑ کو روکنے کے لئے مختلف سرداروں کی درخواست پر حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر بن الخطابؓ کے ساتھ بنوساعدہ کے مقام پر تشریف لے گئے جہاں انصار اپنا قائد منتخب کرنے کے لئے جمع تھے۔ایک انصاری نے اپنے موقف کی وضاحت یوں کی ہم انصار ہیں اللہ تعالیٰ اور اسلامی فوج کے مددگار ہیں۔آپ مجاہدین ہیں اور فوج کا صرف ایک حصہ ہیں۔آپ میں کچھ لوگ اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں قیادت کے فطری حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔'' حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انصار سے کہا'' اے لوگو ہم مہاجرین نے سب سے اسلام قبول کیا ہم اعلیٰ حسب نسب سے ہیں۔عرب میں ہماری بڑی عزت وجاہ ہے ہماری تعداد بھی سب سے زیادہ ہے۔سب سے زیادہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے قریبی خونی رشتہ دار ہیں۔خود قرآن نے ہمیں اہمیت دی ہے۔اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سب سے اول مہاجر ہیں پھر انصار اور اس کے بعد وہ جنہوں نے ان کے بتلائے ہوئے صراط مستقیم پر چلے۔ پھر انہوں نے ان کی دونوں جانب بیٹھے ہوئے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کے ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھایا اور کہا'' امت مسلمہ کے قائد کی حیثیت سے ان میں سے کوئی بھی ایک قابل قبول ہے۔آپ جنہیں چاہے چن لیں اسی وقت حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکر صدیق کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا'' اے ابو بکرؓ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مسلمانوں کی امامت کرنے کا حکم دیا تھا اس لئے آپ ہی ان کے جانشین ہیں۔آپؓ کا انتخاب کرتے ہوئے ہمیں مکمل یقین ہے آپ ہی رسول خدا صلی

اللہ علیہ وسلم کے محبوب رفیق تھے۔آپؓ پر ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ اعتبار تھا اس کے بعد انصار اور مجاہدین دونوں آگے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بیعت کرنے لگے۔

اسی طرح مسلمانوں نے جانشین کا مسئلہ طے کرلیا اور اپنی تاریخ کی عالیشان اور پرشکوہ عمارت کی تعمیر میں جٹ گئے۔لیکن اس عمل سے حضرت علی ابن ابو طالبؓ، طلحہ ابن عبید اللہؓ اور زبیر ابن العوانؓ کچھ زیادہ مطمئین نہ تھے۔حضرت علیؓ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے فرد کی حیثیت سے تجہیز و تکفین کے سلسلے میں لگے ہوئے تھے۔طلحہؓ اور زبیرؓ مشاورت کے اولین مرحلہ میں شامل نہیں تھے۔ابتداء میں حضرت علیؓ نے بیعت نہیں کی۔لیکن جب حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ سے یہ کہا کہ آپ اپنی خلافت کا اعلان کردیں تو حضرت علیؓ نے ملت میں پھوٹ کے خطرات بھرے آثار امڈ آتے دیکھے تو فوراً آگے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ بیعت کرلی۔مشہور مورخ ابن خلدون کے مطابق حضرت علیؓ نے آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے چالیس دن بعد بیعت کی ابن کثیرؒ کے مطابق یہ بیعت حضرت فاطمہؓ کی وفات یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال فرمانے کے چھ ماہ بعد ہوئی اس کے فوری بعد حضرت طلحہ ابن عبید اللہؓ اور حضرت زبیر بن العوانؓ نے بھی بیعت کرلی۔

شیعہ وقائع نگار اکثریت کے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کرتے۔ان کا موقف ہے کہ خلافت پر بجا طور پر صرف اور صرف حضرت علیؓ کا حق ہے اس لئے کہ انہیں حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم نے نامزد کیا تھا۔لیکن تمام مورخین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ جانشینی کا سوال حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بالکل ہی دبا دبا رہا اور حضرت عثمان بن عفانؓ کی شہادت کے بعد ہی ابھر کر سامنے آیا جب دونوں کے موقف میں سختی آتی گئی تو آگے چل کر امیہ دور ۶۶۵ تا ۷۵۰ اور ۷۵۰ تا ۱۲۵۸ء عباسیہ دور میں دونوں فریقوں نے اپنے اپنے کٹر موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے خلافت، ولایت اور امامت کے بارے میں دستاویزی ثبوت پیش کرنا شروع کیا۔اس طرح یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ شیعہ سنی تقسیم کا تعلق مذہبی عقائد سے نہیں ہے بلکہ سیاسی جانشینی اور تاریخ سے ہے۔

کچھ صوفیائے کرام جانشینی کے اس مسئلہ کو ایک دوسرا رخ دیتے ہیں۔صوفیائے کرام اسلام کے

روحانی اور باطنی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کے زبردست اثرات نے اسلامی تاریخ کے بہاؤ کو گہرائی سے متاثر کیا ہے۔ان کے تصور کے مطابق ساری انسانیت کی روحانیت ہرایک زمانے کے ''قطب'' میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔قطب کا مطلب ہے مرکز اپنی طرف کھینچنے والا سردار یا قاید جب دھرتی پر پیغمبر ہوتے ہیں تو وہی پیغمبر سارے زمانے کے قطب ہوتے ہیں وہ انسان کے شعور کو دنیاوی آلائشوں سے دھوکر پاک وصاف کرتے ہیں تا کہ وہ پاک روح بن کر آسمانی انوار کو حاصل کر سکے- جب حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ تھے تو وہی اس زمانے کے قطب تھے اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام،حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اپنے زمانے کے قطب تھے۔جب تک آقائے نامدار تاجدار مدینہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے وہی زمانے کے قطب تھے۔ان کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد روحانیت کی وراثت حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے سپرد ہوئی اور حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد ولایت حضرت علی ابن ابوطالبؓ کو ملی۔صوفیائے کرام کی اکثریت اپنی روحانیت کا تسلسل حضرت علیؓ سے ملاتے ہیں۔ان کے ذریعہ حضرت فاطمہؓ سے اور حضرت فاطمہؓ کے ذریعہ روحانیت کے تمام زمانوں ومکانوں کے سرتاج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتے ہیں اور یہی روحانیت کی آخری ازلی وابدی منزل ہے۔صوفیائے کرام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں حضرت علیؓ،حضرت ابوبکرؓ سے بیعت نہیں کر سکتے تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے چھ ماہ بعد جب حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کا انتقال ہوا تو اس کے بعد ہی حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی- اس نظریہ کے مطابق روحانیت کی وراثت کا خزانہ حضرت علیؓ ابن ابوطالب میں سما گیا- تمام خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ،حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اور صحابہ کرام اجمعین اہم ترین مسائل کے فیصلوں کے لئے حضرت علی ابن ابوطالبؓ سے رجوع ہوا کرتے تھے- یہاں تک کہ وہ گروہ جس کے سربراہ حضرت امیر معاویہؓ تھے وہ بھی اہم شرعی فیصلوں کے لئے حضرت علیؓ سے ہی رجوع ہوتے تھے-

حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کر کے صحابہ کرام اجمعین نے کئی اولین اصول اور نظریات قائم کئے سب سے پہلے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ مسلمان ایک زندہ و پائندہ قوم ہے اور وہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی

جسمانی موجودگی کے بغیر بھی انہی کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے اجماع کے ذریعہ اپنی قسمت کا اپنے مستقبل کا فیصلہ کرسکتی ہے۔انہوں نے یہ بھی نظریہ قائم کیا کہ امت مسلمہ کے قائد یا خلیفہ کو خدا ترس ایماندار علوم کا مخزن، طاقت ور، انصاف پسند، اتحاد کا علمبردار نیک سیرت اور اعلیٰ کردار کا مالک ہونا چاہیئے اس وقت مسلم قوم کی حالت نوتولد شدہ بچے کی سی تھی جسے ابھی ابھی روحانی آقا کے وجود سے جدا کر کے دنیا میں لایا گیا ہو۔اور امت مسلمہ ان حالات میں سرخرو ہو کر ابھری۔

خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا پہلا مسئلہ تھا شمال کی جانب بڑھنے والی بازنطینی افواج ان کو روکنے کے لئے فوج کی روانگی۔تبوک کی جنگ میں مسلمانوں کو بازنطینی افواج کے مقابلے میں فیصلہ کن کامیابی نہیں ملی تھی۔جنگ کا فیصلہ برابر رہا تھا۔اس جنگ میں ان کے سپہ سالار زید بن حارثؓ شہید ہوئے تھے۔اس کے بعد مدینہ منورہ کے راستوں کی حفاظت کے لئے ایک دفاعی فوج آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق حضرت عثمان بن زیدؓ کی سرکردگی میں روانہ کی یہ مہم کامیاب رہی اور مسلمانوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا مرحلہ کامیابی وکامرانی سے پار کیا اور ثابت کیا کہ اس قوم میں مکمل اتحاد اتفاق اور ایمان کی روح پورے جوش سے جاری وساری ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کو جو دوسرا چیلنج درپیش ہوا وہ کچھ عرب قبائل کی جانب سے تھا انہوں نے زکوۃ دینے سے انکار کردیا تھا۔اسلام سے پہلے ملک عرب قبائل میں بٹا ہوا تھا۔ان میں سے کئی قبائل نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں مجبوراً اسلام قبول کیا تھا۔جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا تو ان قبائل کو ایک بہترین موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے زکوٰۃ جو کہ فرض ہے اسے ادا کرنے سے انکار کردیا یہ قبائل ابھی زکوٰۃ کا مطلب ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ پائے تھے وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کا ٹیکس ہے جو کہ ہم سے وصول کیا جارہا ہے۔

زکوٰۃ اسلام کا نہ صرف اخلاقی فرض ہے بلکہ قانونی طور پر بھی یہ لازمی اور فرض ہے۔یہ نہ صرف اپنے مال کو بلکہ اپنے آپ کو بھی پاک کرتا ہے۔مال کی زکوٰۃ پاکی کا ایک طریقہ ہے۔یہ اسلام کا پانچواں بنیادی

رکن ہے۔اسلام جہاں فرد کی اقتصادی ترقی چاہتا ہے وہیں قوم کی ترقی بھی انتہائی اہم ہے۔کسی بھی شخص کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی اسی چیز کی تمنا کرے جسے وہ خود اپنے لئے چاہتا ہے-اسلام ذخیرہ اندوزی کی مخالفت کرتا ہے وہ دولت کی تقسیم وشراکت اور (Investment) کاروبار میں رقم لگانے پر زور دیتا ہے۔زکوٰۃ سے دولت گردش میں رہتی ہے اور ذخیرہ اندوز ہونہیں پاتی۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی نماز پر زور دیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ پر یکساں زور دیا گیا ہے۔زکوٰۃ کو چھوڑ دینے سے سلطنت اسلامیہ کی اخلاقی بنیاد ہی برباد ہو جاتی اور اسلام ذاتی عقائد ومشاہدات کی بے جان ونامراد دعاؤں کا ایک مجموعہ بن کے رہ جاتا-

حضرت ابوبکرؓ نے فوری طور پر ان زکوٰۃ کے انکار کرنے والوں کے خلاف فوجی کارروائی کی انہوں نے بغاوت کرنے والوں کے خلاف کئی مہم جوئیاں کیں اور ان قبائل کو حکومت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے تیسرا مسئلہ تھا جھوٹے مدعیان نبوت کا-مسلمانوں کی کامیابی وخوشحالی کو دیکھ کر عرب میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کئی مرد اور خواتین نے سر اٹھایا- مذہب پہلے بھی ایک اچھا بیوپار تھا اور آج بھی ہے۔نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں نے اسلام کی کامیابی کو دیکھ خود اپنی جانب سے ایجاد کردہ مذہب کا اعلان کیا تاکہ وہ بھی خوشحال بن جائیں-حضرت ابوبکرؓ نے ان جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔انہوں نے ایسے گیارہ جھوٹے نبیوں کے خلاف مہم جوگیاں کیں ان میں سب سے مشہور جنگ مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں ہوئی جس کا نتیجہ جنگ یمامہ کی شکل میں سامنے آیا۔ایسی ہی فوجی کارروائیاں ان جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف یمن ،عمان اور حذیفہ میں بھی ہوئیں ان تمام جنگوں میں مسلمان کامیاب وکامران رہے-

مسلیمہ کذاب کے خلاف جنگ میں بے شمار صحابہ کرام اجمعین نے جام شہادت نوش کیا۔ان میں کئی حفاظ کرام بھی تھے۔قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانی نازل ہوا تھا اور سینکڑوں صحابہ کرام اجمعین نے اسے زبانی یاد کرلیا تھا۔یمامہ کی جنگ میں اس قدر حفاظ کی شہادت صحابہ کرام اجمعین کے لئے بڑے ہی تشویش کی بات تھی۔حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کو لکھنے کا حکم دیا، بالکل اسی انداز میں جیسے کہ حضور پرنور صلی

اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا تھا۔اللہ تعالیٰ کا یہ کلام آنے والی تمام نسلوں کے لئے تھا۔قرآن کریم کی لکھی گئی اس اولین جلد کو ''مصحف صدیقی'' کہا جاتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے سیاسی تناظر میں بازنطینی اور ایرانی دونوں حکومتیں ایک آزاد، متحدہ اور مضبوط عرب کو پنپتے ہوئے گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔صدیوں سے دونوں حکومتوں کی حریص نگاہیں جزیرہ نما عرب پر جمی ہوئی تھیں۔روم والوں نے سیریا اور اردن پر قبضہ کیا ہوا تھا تو ایران نے عراق یمن اور حجاز پر یہاں کے سیاسی وجغرافیائی حالات میں اب مذہبی عنصر بھی شامل ہوگیا۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک ابدی وازلی پیغام لائے اس آفاقی پیغام کو پھیلانا ان کی ذمہ داری تھی۔اسی ناطے سے انہوں نے بازنطینی اور ایرانی دونوں سلطنتوں کے سربراہوں کے نام پیغام بھیجتے ہوئے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دی تھی۔بازنطینی شہنشاہ ہراکیولس نے اس پیغام کا جواب نرمی سے دیا لیکن اپنی افواج کو عرب کی شمالی سرحدوں کی جانب کوچ کرنے کا حکم بھی دے دیا۔فارس کے شہنشاہ خسرو نے اس مبارک خط کے پرزے پرزے کردئے اور یمن میں موجود اپنی افواج کو حکم دیا کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرلیں۔بازنطینیوں اور ایرانیوں کے ان حملوں کو روکنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال اور مشرق میں دفاعی اقدامات کئے تھے۔حضرت ابوبکرؓ کی مہم جوئی خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دفاعی اقدامات کو آگے بڑھانا تھا۔

مشرق وسطیٰ کے سیاسی حالات جلد ہی اس نوازائیدہ اسلامی ریاست کے لئے سازگار ہوگئے۔ فارس افراتفری کا شکار تھا۔شاہی دربار قتل اور شورشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔شہنشاہ کے بڑے بیٹے شہریار نے نہ صرف اپنے باپ کا قتل کیا بلکہ اپنے تمام بھائیوں کو قتل کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا آٹھ ماہ بعد پراسرار حالات میں شہریار مرگیا۔اس کے بعد نوزائیدہ بچے کو تخت کا وارث قرار دیا گیا۔نوزائیدہ بچے کو بھی آگے چل کر قتل کردیا گیا اور کئی درباری تخت پر دعویٰ جتانے لگے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یکے بعد دیگرے سب کا قتل ہونے لگا۔آخرکار شاہی خاندان کے زندہ بچنے والے واحد نوجوان یزدگر کو تخت پر بٹھایا گیا اور ایک عورت کو اس کا قائم مقام مقرر کیا گیا۔

ایران کی کمزوری نے پڑوسی ریاستوں کو اچھا موقعہ فراہم کیا۔ بازنطینی شہنشاہ ہراکلیس نے ۶۲۵ء سے لے کر ۶۳۵ء تک ایران پر کئی حملے کئے اور کئی ایسے علاقوں کو دوبارہ چھین لیا جنہیں اس کے آباد و اجداد کھو چکے تھے ۶۲۲ء کے بعد سے اسلامی سلطنت دھماکو خیز انداز سے پھیلتی رہی اور پھیلتے پھیلتے اس کی سرحدیں دریائے فرات تک پہنچ گئیں جہاں سے ایران کی جنوب مغربی سرحدیں شروع ہوتی تھیں-ایرانی سرحدوں سے لگے علاقہ میں آباد عرب قبائل بڑے ہی خودسر تھے انکا مرکز حیرہ تھا۔ ایرانی دربار کے زیر ماتحت یہ قبائل ایک طویل عرصہ سے خودمختارانہ مراعات کا مزہ چکھتے آرہے تھے۔لیکن خسرو نے ان کی اس آزادی کو اوران کو دیئے سارے مراعات کو ختم کر کے اس علاقہ کو اپنی نوآبادی قرار دے دیا ان پر کئی نئے ٹیکس لاگو کر دیئے زیادہ ٹیکس عائد کئے جانے پر ان میں ناراضگی پھیلی ہوئی تھی ۔ان میں کئی قبائل نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام قبول کرلیا تھا۔لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے-حضرت ابوبکرؓ ان سارے حالات سے بخوبی واقف تھے۔مشرقی عرب میں بسنے والے قبیلے بنوشائبان کے سرداد حضرت مثنیٰ ابن حارثہؓ نے جب حضرت ابوبکرؓ سے ان سارے عرب قبائل کو ایران کے خلاف متحد کرنے کی تجویز رکھی تو آپ نے اسے مان لیا۔ ان قبائل کی بدلتی وفاداریوں کے پس منظر میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت المثنیٰؓ کو خبردار کہا کہ صرف ان قبائلی کو متحد کیا جائے جو کہ مرتد نہیں ہوئے تھے۔

اسی دوران میں مشرقی عرب میں مرتد ہونے والے قبائل کے خلاف مہم جوئی میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے کامیابی حاصل کر لی۔حضرت ابوبکرؓ نے انہیں حکم دیا کہ وہ حضرت مثنیٰؓ سے جاملیں۔دونوں نے متحدہ طور پر جنوبی عراق پر حملہ کیا۔صوبے کے ایرانی گورنر ہورمز کو دعوت دی گئی کہ وہ اسلام قبول کر لے اور اسلام کے عالمی مشن میں شامل ہو جائے یا جنگ کے لئے تیار ہو جائے - گورنر ہورمز نے ساری تجاویز کو ٹھکرادیا -جنگ کا آغاز ہو گیا۔عرب افواج نے سب سے پہلے ۶۳۳ء میں خادمہ پر قبضہ کیا جو کہ جدید کویت کے قریب تھا- یہاں سے شمال کی طرف مسلم افواج نے شط العرب کے دہانے پر واقع اُباسہ بندرگاہ پر دھاوا بولا جو کہ آج جدید زمانے میں بصرہ کہلاتا ہے-دریائے فرات کے مغربی ساحلوں کے کنارے حضرت خالد بن ولیدؓ کی افواج

انتہائی تیز رفتاری سے حملے کرتے ہوئے آگے بڑھیں فارس کی افواج کو شکست دیتے ہوئے الحیرہ اورالانبار پر قبضہ کرلیا۔اس علاقہ کے عرب قبائل نے اپنے عرب بھائیوں کا استقبال کیا جنہوں نے ان کو ایرانی ظلم سے نجات دلائی۔حضرت خالد بن ولیدؓ کی تیز رفتار پیش قدمی کی وجہ سے اس علاقہ کے شمالی بازو کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس علاقہ کو عرب دومۃ الجندل پکارتے تھے یہ عراق شام کے سنگم پر واقع تھا- یہاں کی عیسائی آبادی کھلے عام بازنطینوں کا ساتھ دے رہی تھی-حضرت خالد بن ولیدؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور دومۃ الجندل پر قبضہ کرلیا۔ اس قبضہ کے بعد حضرت خالدؓ اوران کی افواج مکہ واپس ہوئیں اور حج ادا کیا۔حضرت خالد بن ولیدؓ جب جنگ کے میدان میں واپس پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ نے انہیں شام کے محاذ پر جانے کا حکم دیا جہاں بازنطینی شہنشاہی افواج کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کا خطرہ منڈلا رہا تھا-

عربوں کا متحدہ قوت بن کر ابھرنا ایرانیوں کی طرح بازیطینیوں کو بھی منظور نہ تھا بازنطینیوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی مسلم دفاعی لائنوں کی مضبوطی کا جائزہ لیا تھا۔تا کہ آگے چل کر ایک بڑا حملہ کیا سکے۔اسی خطرہ کو ٹالنے کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کی جانب مہم جوئی کی تھی۔بازنطینیوں کے مسلسل دباؤ کے پیش نظر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثؓ کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی تھی ۔اس سے پہلے بھی ہم بتا چکے ہیں کہ جنگ ہار جیت کے فیصلہ کے بغیر ختم ہوئی اس جنگ حضرت زید بن حارثؓ شہید ہوگئے ۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ایک اور فوج اس مہم کے لئے تیار کی تھی۔لیکن اس مہم سے پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمالیا-

حضرت ابوبکرؓ نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اس فوجی مہم کو پھر سے روانہ فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسلامی افواج کے سپہ سالار اعلیٰ حضرت اسامہ بن زیدؓ کو جو احکامات دیئے تھے وہ اخلاقی ضوابط ساری دنیا کے لئے ایک اعلیٰ رہنما اصول ہیں۔

(۱)عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا

(۲)اپاہجوں کو تکلیف نہ دینا اور مرنے والوں کا مثلہ نہ کرنا یعنی ناک پیر کاٹ کر ان کی بے حرمتی نہ کرنا۔

(۳) کھڑی فصلوں کو اجاڑنا نہیں اور نہ ہی پھلدار درختوں کو کاٹنا

(۴) جنگ سے حاصل شدہ مال غنیمت میں بے ایمانی نہ کرنا

(۵) جانوروں کو ہلاک نہ کرنا ہاں غذا کے لئے اگر ضروری ہو ایسا کر سکتے ہو۔گذشتہ ۱۴۰۰ سالوں سے یہ احکامات بادشاہوں کے لئے فاتحین کے لئے اور سپاہیوں تمام کے لئے ایک شرعی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں انہی قوانین پر مسلمان افواج عمل کرتی آئی ہیں۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کی زیر کمان یہ جنگ بھی فیصلہ کن ثابت نہ ہوسکی۔شمال کی جانب سے حملہ کا خطرہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔اس لئے کہ بازنطینی جنگ کی زبردست تیاریاں کر رہے تھے۔حضرت ابوبکرؓ نے دشمن کے اس حملہ کو ناکام بنانے کے لئے اپنی افواج کو شام پر حملہ کا حکم دے دیا۔حضرت ابوعبیداللہ بن الجراحؓ کے زیر کمان 27,000 فوجیوں پر مشتمل ایک فوج ترتیب دی گئی۔اس کے تین حصے کئے گئے لیکن تینوں حصوں کی کمان حضرت ابوعبیداللہ بن الجراحؓ کے ہاتھ رہی۔حضرت ابوعبیداللہؓ ذاتی طور پر مرکزی فوج کی کمان کرتے رہے۔ان کا ساتھ دینے کے لئے حضرت امر بن العاصؓ فوج کے ایک حصہ کے سپہ سالار کی حیثیت سے ساتھ تھے۔انہیں فلسطین پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔تیسرے حصہ کے سالار کی حیثیت سے حضرت شرحبیل ابن حسناتؓ کو اردن پر حملہ کرنے کے لئے کہا گیا۔وادی عرب اور غزہ میں ابتدائی جھڑپیں ہوئیں۔اس کے بعد تینوں افواج ایک ساتھ دمشق کی جانب بڑھیں۔بازطینی شہنشاہ ہراکلیس کے بھائی تھیوڈوروس نے کوہ ہرمن اور کوہ ہوران کے درمیان ایک تنگ درہ میں ان افواج کی پیش قدمی روک دی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنی زندگی کی بہترین جنگوں میں سے ایک میں تاریخی کامیابی حاصل کی۔وہ عراق سے برق رفتاری سے آگے بڑھے راستے میں چھوٹے چھوٹے حملوں میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے جنگ کے مقام پر وہ اس طرح پہنچے کہ انہوں نے میدان جنگ کا محاصرہ کرلیا۔انہوں نے مسلم افواج اور بازنطینی افواج دونوں سے بچتے ہوئے دشمنوں پر پیچھے سے حملہ کردیا۔ادھر حضرت ابوعبیداللہ بن الجراحؓ کی افواج نے سامنے سے حملہ کیا بازطینی افواج ان حملوں سے حیرت زدہ ہوکر تیزی سے تتر بتر ہوگئیں۔مسلم افواج نے بھاگتی ہوئی بازنطینی افواج کا دور تک پیچھا کیا اور اسے زبردست نقصان پہنچایا۔۶۳۵ء میں دمشق فتح ہوگیا چند مہینوں کے اندر بلبک اور حما جیسے شہروں پر بھی

مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔

ہراکلیس شام جیسے اہم صوبہ سے اتنی آسانی سے ہاتھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔وہ اس دور کے انتہائی تعظیم یافتہ جرنلوں میں سے ایک تھا۔اس نے ایرانیوں کو کئی جنگوں میں شکست دی تھی ۔اس نے ایک بڑی فوج تیار کی جس کی تعداد دو لاکھ تھی اور ساحل کے کنارے جنوب کی جانب پیش قدمی کی ۔اس کی کوشش یہ تھی کہ ''بیر شیبہ'' جلد از جلد پہنچ جائے اور وہاں سے اسلامی افواج کی سپلائی لائن کو کاٹ دے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ایک طویل چکر کاٹا اور حضرت امر بن العاصؓ کی افواج سے جا ملے ۔وہاں سے'' بیر شیبہ'' جا پہنچے وہاں کی فوجی چھاونی سے مزید افواج کی کمک حاصل کی اور شمال کی جانب پیش قدمی کرنے لگے تاکہ ہراکلیس سے مقابلہ کیا جاسکے۔اجنادین کے مقام پر دونوں فوجوں کے درمیان خونریز مقابلہ ہوا یہاں بازنطینی افواج کو ایک اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اب ہراکلیس ایک خطرناک فوجی صورت حال سے دوچار تھا۔شمال اور جنوب دونوں جانب سے اس کے فرار ہونے کی راہیں کاٹ کر رکھ دی گئیں تھی ۔اس نے اپنی افواج کو دیرہ شہر کے لئے قریب دریائے یرموک کے کنارے جمع ہونے کا حکم دیا۔حضرت خالد بن ولید دشمن کی افواج سے بچ کر آگے بڑھے اور شمالی جانب سے فوج پر حملہ کیا۔ادھر حضرت ابوعبیدہ کی افواج نے بازنطینیوں پر جنوب سے یورش کی ایسا لگتا تھا کہ قسمت بھی یہاں اپنا کھیل کھیل رہی تھی ۔ایک زبردست ریت کا طوفان اٹھا اور بازنطینی افواج کو اندھا کردیا جب کہ عرب ایسے طوفانوں کی عادی تھے وہ اس سے اپنا بچاؤ کر گئے بازنطینی افواج کا زور ٹوٹ گیا۔

636ء میں ہونے والی یرموک کی جنگ تاریخ کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ایک ہے ۔اس سے اسلامی افواج کے لئے مشرق کے دروازے کھل گئے ۔یرموک کی جنگ کے چند دنوں بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ وفات پاگئے ۔ان کی عمر ترسٹھ سال تھی ۔انہوں نے دوسال تین ماہ حکومت کی ۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ کے درمیان ایک پل کا کام کیا۔ان کے بغیر ایک ادارے کی حیثیت سے زکوٰۃ کا خاتمہ ہو چکا ہوتا اور مذہب کی فطرت ہی بدل گئی ہوتی ۔ریاست کے قیام کا بنیادی جواز بدل گیا ہوتا اور امت بکھر گئی ہوتی ۔حضرت ابوبکرؓ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کیا کسی بھی نئے طریقہ یا خیال سے پرہیز کیا جھوٹے مدعیان نبوت کو سختی سے کچلا اور نوزائیدہ اسلامی ریاست کا بازنطینی و ایرانی حملوں سے کامیاب دفاع کیا انہوں نے صاف طور سے بتلا دیا کہ امت مسلمہ ایک زندہ و پائندہ اور متحرک و اثر آفریں قوم ہے ان کی قیادت میں اسلام تاریخ کے دھارے میں تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگا ۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی وجود کے بغیر لیکن قرآن اور سنت کی روشنی میں اپنے قدموں کے نشان چھوڑنے لگا۔

دوسرا باب

حضرت عمر بن الخطابؓ

اور

اسلامی تہذیب کی بنیاد

انسانی کی خودی تاریخ کو اپنے سامنے جھکا دیتی ہے بشرطیکہ اس میں ایمان کی قوت، مضبوط قوتِ ارادی اور ثابت قدمی ہو۔حضرت عمرؓ ایسی ہی خصوصیات کے حامل انسان تھے۔آپؓ نے تاریخ کے رخ کو موڑ دیا، اپنے پیچھے ایک ایسی اعلیٰ مثال چھوڑی جو آنے والی نسلوں کیلئے اعلیٰ معیار بنی جس کی تقلید انسانیت کے لئے باعثِ فخر بنی۔

وہ عظیم ترین فاتحین میں سے تھے، دانشور منتظم تھے۔ایک ایسے معمار جن کے کارنامے ہمیشہ کیلئے یادگار رہنے۔وہ بڑے ہی متقی تھے۔اور اللہ تعالیٰ سے ویسی ہی شدید محبت رکھتے تھے جیسی کہ اسی معیار کے دوسرے فاتحین سونے چاندی اور دولت کے انباروں سے محبت رکھتے تھے۔

رسول اکرم ﷺ نے توحید کے بیج بوئے۔توحید کا انتہائی سیدھا مطلب ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات واحد پر مکمل یقین رکھنا۔تاریخی نظریہ سے اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ توحید کا تصور ایسی تہذیبوں کو جنم دیتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا خوف غالب رہتا ہے جہاں انسان کا ایک ایک عمل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے تاریخ کے ایک نازک موڑ پر اپنی ایمانی فراست کے ذریعہ یہ احتیاط برتی کہ حضور اکرم ﷺ کے وصال مبارک کے بعد توحید کا وہ بیج تباہ وبرباد نہ ہونے پائے جس کی تخم ریزی نبی

کریم ﷺ نے کی تھی۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہ پودا تنا تناور درخت بنا کہ اس میں پھل پھول لگے۔ حضرت عمرؓ نے اسلام کی اس تاریخی عمارت کی تعمیر کی جس کی وجہ سے بنیادی طور پر اس کے وہی اصلی خدوخال برقرار رہے۔ آ گے آنے والی صدیوں میں اسلام ویسا ہی رہا جیسا کہ اسے رہنا چاہئے تھا اور وہ نہ ہوا جو دنیا کے سارے مذاہب کے ساتھ ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اسلامی تہذیب کے معمار تھے۔

حضرت عمرؓ کے کارنامے اس لئے بھی اور زیادہ قابلِ ستائش ہیں کہ وہ حسب نسب اور دولت کے اعتبار سے اپنے دوسرے ساتھیوں سے ممتاز نہ تھے۔ وہ بنی عدی کے قبیلے میں پیدا ہوئے جو اہل قریش کی نسبتاً ایک غریب شاخ ہے۔ بقول حضرت عمرؓ آپؓ ایک معمولی تاجر تھے، بکریاں چرانے والے تھے جو اکثر اوقات اپنی بکریوں کو کھو بیٹھتے۔ ایسی منکسرانہ ابتداء سے اتنی بلندیوں پر جا پہنچے کہ آپ ایک عالیشان سلطنت کے بنانے میں کامیاب وکامران رہے۔ ایک ایسی سلطنت جو روم وفارس کی سلطنتوں سے بھی زیادہ وسیع تھی۔ آپؓ نے حضرت سلیمانؑ کی سی فراست سے حکومت کی اور حضرت یوسفؑ کی طرز حکومت جیسی انتظامی قابلیت سے سلطنت میں صحیح نظم ونسق قائم کیا۔ اپنے خلیفہ منتخب کئے جانے کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ کو مشرق وسطیٰ کی ایک الگ ہی سیاسی وجغرافیائی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جزیرہ نمائے عرب ایک وسیع صحراء ہے۔ سوائے جنوب مغربی کونے کے جہاں نجران واقع ہے۔ نجران کے اس جنوبی کونے میں بحر ہند سے آنے والی ہواؤں سے موسمی برسات ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ زرخیز ہے۔ شمال میں اس کی حد دریائے اردن پر ختم ہوتی ہے جو اسے فلسطینی پہاڑیوں اور لبنان سے جدا کرتی ہے۔ مشرق میں یہ دریائے فرات تک وسیع ہے۔ دریائے فرات ودجلہ کا درمیانی علاقہ جزیرہ کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ قدیم زمانہ میں میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) کہلاتا تھا اور اسلام کی ابتداء سے ہی اسے عراقِ عرب کہا جاتا ہے۔ دونوں دریاؤں کے پانی سے یہاں آب رسانی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ علاقہ تہذیبوں کا گہوارہ بن گیا۔ دریائے دجلہ کے مشرق سے زمین دھیرے دھیرے بلند ہونا شروع ہوتی ہے اور فارس کے سطح مرتفع میں تبدیل ہو جاتی ہے جو قدیم فارس عظمیٰ کہلاتا ہے۔ عرب اس کو عراقِ عجم کہتے تھے۔ اس میں فارسی بولنے والا وہ سارا علاقہ آجاتا ہے جو کہ خوزستان، حمادان، فارس، پرس پولس

(Persepolis)، اصفہان، آذربائیجان، خراسان، مکران اور بلوچستان پر مشتمل ہے۔

اسلامی دور کی ابتداء میں فارس و بازنطینی حکومتیں اس علاقے میں طاقت کا توازن برقرار رکھے ہوئی تھیں۔ دریائے فرات ان دونوں حکومتوں کے زیر اثر علاقہ کو تقسیم کرنے والی تاریخی خط لائن تھی۔ فارس کا کنٹرول یمن پر بھی تھا وہ بحرِ احمر کے کنارے کنارے مکہ و مدینہ کے علاقوں پر بھی اثر انداز تھے۔ اسلام کے ابھرنے، عربوں کے متحد ہو جانے سے اس علاقہ میں طاقت کا وہ توازن تبدیل ہو گیا۔ یہ وہ صورتِ حال تھی جسے بازنطین یا فارس دونوں بھی چپ چاپ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ فارس کے شہنشاہ خسرو نے مدینہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی دوران یعنی 632 میں (Byzontine) بازنطینیوں نے شمالی سرحدوں پر ہلّہ بولا اور اسلامی فوجوں کے سردار زید بن حارثؓ کو شہید کر ڈالا۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں ہی اس زمانے کی دونوں عظیم ترین طاقتیں فارس و بازنطین اور اس نوزائیدہ اسلامی حکومت کے درمیان سرحدی جھڑپیں شروع ہو چکی تھیں۔ صرف دس سال کے قلیل سے عرصہ میں ان دونوں بڑی طاقتوں پر حضرت عمرؓ نے فتح حاصل کی اس طرح آپؓ نے فوجی تاریخ کا ایک انتہائی عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا۔

مسلمانوں کا اس طرح اچانک ابھرنا اس قوت متحرکہ کا نتیجہ تھا جو اسلام نے ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا کہ وہ ان کی زندگی کا واحد مقصد اور ایک ہی مشن بن گیا۔ یہ ایمان کا ہی جذبہ ہے۔ ایمان یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا اور وہ صرف اس ایک قادر مطلق ہستی کا زیر بار احسان ہے۔ اسلامی تہذیب اللہ تعالیٰ کو ہی مرکز بناتی ہے اور اس کا مقصد زمین پر احکامات الٰہیہ کو نافذ کرنا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہر اس سیاسی و سماجی نظام کو چیلنج کرنا ضروری ہے جو کسی جابر بادشاہ کی خوشامد پسندی کا نتیجہ ہوتا ہے یا کسی ظالم ڈکٹیٹر کے زیر سایہ آ جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو ملک شام میں فوجی کارروائیاں جاری تھیں۔ جنگ یرموک (636ء) نے بازنطینیوں کی دفاعی قوت توڑ دی تھی لیکن ابھی تک فلسطین پر قبضہ نہیں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاصؓ کو یرموک سے یروشلم کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ چونکہ یروشلم کے دفاع کرنے

والوں کی طاقت اب کمزور ہو چکی تھی اس لئے بیت المقدس کے اقسف اعظم نے شہر کی کنجیاں مسلمانوں کو دے دینے کی پیش کش کی بشرطیکہ حضرت عمرؓ خود انہیں لینے کیلئے وہاں آئیں۔ جب حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو انہوں نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو عارضی طور پر خلیفہ نامزد کیا اور مدینہ سے شمال کی جانب بڑھے اب حضرت عمر بن الخطابؓ پورے عرب اور آس پاس کے علاقوں کے خلیفہ تھے۔ وہ چاہتے تو ایک فاتح کی حیثیت سے ہر قسم کے عیش اور ظاہری سامان، آرائش و دولت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سفر کر سکتے تھے۔ لیکن دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرح انہیں بھی خود سید عالم ﷺ نے تربیت دی تھی۔ انہوں نے زمینی خزانوں کی کنجیاں سنبھالی تھیں ایک آسمانی امانت کی طرح اللہ کے ایک اطاعت گذار بندہ کی طرح، حضرت عمرؓ نے شمال کا سفر صرف ایک اونٹ پر کیا، ان کے ہم رکاب ایک نوکر بھی تھا دونوں باری باری اس اونٹ پر سوار ہوا کرتے۔ جب وہ یروشلم پہنچے تو حالت یہ تھی کہ نوکر اونٹ پر سوار تھا اور خود خلیفۃ المسلمین اونٹ کی نکیل تھامے چل رہے تھے۔ یروشلم کے امراء و روساء نے یہ سمجھا کہ اونٹ پر سوار شخص امیر المومنین ہے اور پیوند لگے کپڑے پہن کر چلنے کا والا شخص نوکر ہے۔ انہوں نے سردار کو جھک کر تعظیم دی۔ جب مسلمان جرنلوں نے اصل خلیفۃ المسلمین کو سلام کیا تو یروشلم کے ان فرمارواں رؤسا کو پتہ چلا کہ خلیفہ کون ہے، وہ دنگ رہ گئے اور مارے حیرت کے جھک جھک گئے۔

حضرت عمرؓ نے مفتوح لوگوں کے ساتھ ایسا روادارانہ سلوک کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی، یروشلم کی فتح کے بعد عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی جو دستاویز لکھی گئی وہ اس کی ایک مثال ہے اور ذیل میں پیش ہے۔

"الیاہ کے عوام کو مکمل حفاظت کی یقین دہانی اللہ کے ایک بندہ، مسلمانوں کے امیر عمر بن الخطابؓ کی جانب سے دی گئی ہے۔ یہ امان ان کے جان و مال کلیساء و صلیب، صحت مند و بیمار اور ان کے تمام ہم مذہب ساتھیوں کے لئے ہے۔ کلیساؤں کو رہائش کے مکانات کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا جائیگا۔ انہیں تباہ نہیں کیا جائیگا۔ کلیساؤں کو یا ان کی حصار بندی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا جائیگا۔ ان کی صلیبوں اور دولت کو بھی نقصان نہیں پہونچایا جائے گا۔ تبدیلی مذہب کے لئے کوئی جبر و اکراہ نہیں کیا جائیگا اور اس سلسلہ میں کوئی تکلیف نہیں دی جائیگی"

یہ دستاویز اپنی مثال آپ ہے۔اسلامی فوجیں عبادت کی آزادی کیلئے لڑ رہی تھیں، تبدیلیٔ مذہب کیلئے نہیں، انسانیت کو استحصال اور حق تلفی سے نجات دلانا ان کا مقصد حیات تھا، مفتوح لوگوں کو "ذمی" قرار دیا جاتا تھا۔ یہ لفظ ذمہ سے بنا ہے جس کا مطلب ہے امانت اور ذمہ داری۔ وہ ایک ایسی امانت تھی جس میں خیانت نہیں ہونی چاہئے تھی جیسا کہ تاریخ میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔حضرت عمرؓ نے یروشلم میں چند دن گذارے، شام میں فوجوں کے مورچوں کا معائنہ کیا، پھر مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

بازنطینیوں نے پھر سے مجتمع ہو کر صف آراء ہونے کی کوشش کی اور شام کو آزاد کرانے کیلئے اسے ایک اڈہ کے طور پر استعمال کرنا چاہا۔ 641ء میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی قیادت میں اسلامی افواج نے اسکندریہ پر حملہ کیا، وہاں کے قبطی باشندے بازنطینی اور مسلمانوں کے درمیان اس جنگ میں غیر جانبدار رہے۔اسکندریہ فتح ہوا مسلمان فوجیں فتح کے جھنڈے گاڑتی ہوئی لیبیا کے ترپوتی شہر تک جا پہونچیں۔

اس دوران فارس سے لگی مشرقی سرحدیں متحرک ہو اٹھیں، ایرانیوں نے دریائے فرات کے کنارے واقع اپنی سرحدوں پر شکست کو قبول کرنا گوارہ نہ کیا۔ وہ اپنی مغربی سرحدوں پر مشہور خراسانی جنرل رستم کی سپہ سالاری میں پھر سے صف آراء ہوئے۔مزید امداد کیلئے دو مشہور اور قابل افسران نرسی اور جبان کو بھیجا گیا۔عراق کے محاذ سے حضرت خالد بن ولیدؓ کو شامی محاذ بھیجا گیا جس کی وجہ سے وہاں کے اسلامی مورچے کمزور ہو چکے تھے۔اس لئے مثنیٰؓ مزید فوج طلب کرنے کیلئے مدینہ پہنچے۔امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے انہیں نئی فوج تیار کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ فوج پہلی بار ان عرب قبائل سے تیار ہوئی جو اس سے پہلے مرتد ہو گئے تھے۔ابو عبید الثقفیؓ کو اس نئی فوج کا سردار منتخب کیا گیا۔ایران اور اسلامی فوجوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ابو عبیدؓ نے جبان کی سرکردگی میں آنے والی ایرانی افواج کا مقابلہ کیا۔نمارق کی جنگ میں ابو عبیدؓ نے جبان کی ایرانی فوج کو شکست دی۔ پھر آگے بڑھ کر مقاطعہ کی جنگ میں نرسی کی سرکردگی میں مقابلہ کیلئے آنے والی افواج پر فتح پائی۔ان شکستوں کی پرواہ کئے بغیر ایران کے سپہ سالار اعلیٰ رستم نے مروان شاہ کی سرکردگی میں نئی فوج تیار کی اور ایک سو جنگی ہاتھیوں کے ذریعہ اسے اور مضبوط بنایا۔ عربوں کو جنگی ہاتھیوں سے سجی فوجوں کے ساتھ مقابلہ کا تجربہ نہ تھا۔جنگ کے دوران ابو عبیدؓ ہاتھی سے کچل

کر مارے گئے۔عرب افواج کو شکست ہوئی۔انہیں دریائے فرات کے پرے پیچھے دھکیل دیا گیا۔

اب یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ سرحدی جھڑپوں سے شروع ہونے والی یہ جنگ ایرانی سلطنت اور مسلمانوں کے درمیان طاقت آزمائی کا ایک امتحان بن گئی تھی۔حضرت عمرؓ نے عرب کے تمام امراء کو صلاح ومشورہ کے لئے جمع کیا۔آپ نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ بذاتِ خود اسلامی افواج کے سالار کی حیثیت سے ایرانی محاذ پر جائیں گے لیکن حضرت علیؓ بن ابی طالب کے مشورہ پر خلیفۃ المسلمینؓ نے حضرت سعد بن وقاصؓ کی سرکردگی میں بیس ہزار کی اسلامی فوج کو ایران کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا۔حضرت سعد ابن وقاصؓ بدری صحابیٔ رسول ﷺ تھے۔ان کے ساتھ ستر (۷۰) ایسے صحابہ رسول ﷺ بھی تھے جنہوں نے بدر کے میدان میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے تھے،اسلامی فوج میں بدری صحابہؓ کے شامل ہوجانے سے ایک دیوانہ وار جوش وجذبہ ابھر آیا،سرحد پر واقع کچھ عیسائی قبائل نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دینے کی پیش کش کی ان اسلامی افواج کے مقابلہ میں ایرانی سپہ سالار اعلیٰ رستم کے زیر قیادت پچاس ہزار تجربہ کار سپاہیوں کی فوج تھی۔

خلیفۃ المسلمینؓ کے حکم کے مطابق حضرت سعد بن وقاصؓ نے حضرت مثنیٰ بن حارثؓ کی قیادت میں ایک امن کا پیغام بھیجا رستم کو عربوں کے ایمانی جوش وجذبہ کا بخوبی احساس تھا،اس نے امن کی اس سفارت کو شہنشاہ یزدگرد کے دربار میں بھیجا،ایرانی شہنشاہ نے مسلمانوں کی سفارت کا انتہائی شاندار اور شاہانہ استقبال کیا اور انہیں یہ پیش کش کی کہ اگر وہ اپنے ملک کو واپس لوٹ جائیں تو اسکا انہیں معقول نذرانہ دیا جائیگا۔اسکے جواب میں مثنیٰ بن حارثؓ نے شہنشاہ کے سامنے تین شرطیں رکھیں (۱) پہلی شرط تھی کہ اللہ کی بندگی کو قبول کرلیں،اسلام لے آئیں اور مسلمانوں کے ایمانی بھائی بن جائیں (۲) دوسری شرط یہ تھی کہ اسلام نہ قبول کریں مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلیں اور جزیہ ادا کریں۔(۳) تیسری شرط یہ رکھی کہ اگر پہلی دو شرطیں نامنظور ہوں تو جنگ کیلئے تیار ہوجائیں۔شہنشاہ اس پیش کش پر تلملا اٹھا،اس نے کہا کہ اگر وہ امن کی سفارت پر نہ ہوتے تو انہیں قتل کروادیتا،اس نے مٹھی بھر خاک ان کے پہلو میں باندھی اور کہا کہ تمہیں اس خاک اور دھول کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔اور انہیں واپس بھیج دیا۔

اب جنگ ناگزیر ہو چکی تھی نقارۂ جنگ بجنے لگا اس موقع پر رستم نے ایک فاش غلطی کی، ایرانی افواج سپہ جنگی ذرہ پہنے ہوئی تھیں جو کہ صحرائی جنگوں کیلئے غیر موزوں ہے، جبکہ عربوں نے کوئی ذرہ نہیں پہنی تھی اور متحرک صحرائی جنگ کے طریقوں سے واقف تھے۔ رستم نے ایک اور غلط فیصلہ لیا، اس نے آنے والی جنگ کیلئے قادسیہ کے صحرائی میدان کا انتخاب کیا۔ یہ مقام دریائے فرات سے چالیس میل دوری پر واقع ہے۔ صحرائی دھوپ نے وزنی ذرہ پہنے ایرانی سپاہیوں کی طاقت توڑ دی، ابتدائی حملوں میں ایران کی طرف سے آنے والے جنگی ہاتھیوں کی وجہ سے مسلم سپاہیوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، دو دنوں تک گھمسان جنگ ہوتی رہی اور کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا تیسرے دن قسمت عربوں پر مسکرانے لگی۔ عرب سپاہی جنگی ہاتھیوں کو بیکار کرنے کے لئے تاک تاک کران کی آنکھوں پر تیراندازی کرنے لگے۔ زخمی ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے پلٹے اور خود اپنی فوجوں کو روندتے چلے گئے۔ رستم نے انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا، آخر کار میدان جنگ میں مارا گیا۔ جنگ قادسیہ (637ء) تاریخ کا ایک اہم ترین موڑ ہے۔ یہاں سے ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا اور اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ ایران اسلامی دنیا کا ایک حصہ بن گیا اور چودہ سو سالوں سے مسلمانوں کے معاملات میں بہت ہی اہم رول ادا کرتا آرہا ہے۔

حضرت سعد بن وقاصؓ قادسیہ سے اس پرانے شہر بابل کی طرف بڑھے جسکا تذکرہ بائیبل میں آتا ہے، یہاں انہیں معمولی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد کوسی اور بہرشیر شہروں پر بھی اسلامی افواج کا قبضہ ہو گیا۔ اب مدائن جو ایرانی شہنشاہیت کا پایہ تخت تھا فاتح افواج کی زد میں آچکا تھا ایرانی افواج کا بڑا حصہ قادسیہ کی جنگ میں کام آچکا تھا۔ یزدگرد نے دریائے دجلہ کے پل کو توڑ دیا اور اسلامی افواج کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش کی۔ یہ ساری جنگی تدابیر بیکار ثابت ہوئیں۔ عربوں نے اپنے گھوڑے ندی میں اتار دیئے اور آگے بڑھ کر دوسرے کنارے پر آ گئے۔ 637ء میں مدائن پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ایرانی صدر مقام کے سارے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے، سونے چاندی، ہیرے جواہرات، قالین اور موتیوں کے انباران کے ہاتھ لگے۔ اس ساری دولت کو مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔ اس مال غنیمت میں ایک جنگی ہاتھی بھی تھا جسے مدینہ کی خواتین نہایت حیرت سے دیکھا کرتی تھیں۔

یزدگرد نے مدائن سے راہ فرار اختیار کیا اور فارس کے شمالی مشرق کی جانب مرو میں جا پہونچا، اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے ساتھ یہ کوئی سرحدی جنگ نہیں ہے، اس نے تمام ایرانیوں کو اور اپنے حلیفوں کو ایک جگہ جمع ہو کر ایران کے دفاع کرنے کی آواز دی، ڈیڑھ لاکھ افراد کی عظیم فوج جمع ہوگئی، اس فوج کو مردان شاہ کی زیر کمان میں دیا گیا، جس نے اس سے پہلے فرات کی جنگ میں عربوں کو شکست دی تھی۔ ایرانیوں میں جنگی جوش پیدا کرنے کیلئے مردان شاہ کو ایران کے قومی نشان درفش سے سجایا گیا۔ کوفہ کے گورنر عمار بن یاسرؓ نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی اور مزید کمک کی درخواست کی، حضرت عمرؓ نے تیس ہزار (30,000) فوجیوں کی مزید کمک حضرت نعمان بن مخرانؓ کی قیادت میں روانہ کیا، ایرانیوں سے بات چیت ناکام ثابت ہوئی۔ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا نہاوند کی جنگ شروع ہوئی۔ ابتدائی جھڑپوں میں حضرت نعمان ابن مخرانؓ شدید طور پر زخمی ہوگئے، لیکن مسلمان فوجی جنرلوں نے اس خبر کو دوستوں اور دشمنوں دونوں سے پوشیدہ رکھا، پہلے دن کے اختتام پر ہی اسلامی افواج نے دشمنوں کی صفوں کو منتشر کر دیا، مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ حضرت نعمانؓ زخموں کی تاب نہ لا سکے، اسی شام ان کی شہادت ہوگئی۔

ایرانی مزاحمت مشرقی صوبوں کی جانب سے جاری رہی۔ یزدگرد نے مرو کو اپنا فوجی مستقر بنایا اور خود ذاتی طور پر اس نے فوجوں کی کمان سنبھال لی۔ خلیفہ حضرت عمرؓ نے یہ احساس کر لیا تھا کہ زخمی دشمن انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کسی بھی قیمت پر ایرانی مزاحمت کا خاتمہ کر دینا ضروری ہے۔ نہاوند میں موجود اسلامی افواج کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جہاں کہیں بھی ایرانی مزاحمت جاری تھی وہاں حملے کئے گئے، ان کے مضبوط قلعوں پر چڑھائی کی گئی۔ حضرت ابی العاصؓ نے (Persepolis) بابل پر فتح حاصل کی، عاصم ابن عمروؓ نے سیستان پر قبضہ کیا۔ حکم ابن عمیرؓ نے مکران اور بلوچستان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ عتبہ ابن فرخدؓ کے حملوں کے سامنے آذربائجان کی مزاحمت کا خاتمہ ہوگیا، بکیر ابن عبداللہؓ نے آرمینیا پر مکمل فتح حاصل کر لی، اسلامی فوجوں کے ایک دستہ نے احنف بن قیسؓ کی سرکردگی میں خراسان پر اسلامی جھنڈا لہرا دیا - 650ء تک ساری ایرانی شہنشاہیت عرب افواج کے زیر ماتحت آ گئی - یزدگرد فارس چھوڑ کر بھاگا اور ایران سے دور کسی اجنبی مقام پر اس کی موت ہوگئی -

حضرت عمر بن الخطابؓ کے خلیفہ منتخب ہونے کے دس سالوں کے اندر ہی۔ مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ کا نقشہ بدل گیا- مدینہ منورہ اب دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت بن گیا- اس کی سرحدیں آفریقہ میں تریپولی سے لے کر مرکز ایشیاء میں سمرقند تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سلطنت کسی شہنشاہ یا کسی فوجی جنرل کے زیر ماتحت نہیں تھی بلکہ یہ حکومت ایک انقلابی قوم کے ماتحت تھی اور اس کا نعرہ تھا ''لا إلٰه إلا الله محمدٌ رسول الله'' خلیفہ کی حیثیت اللہ کے بندہ سے زیادہ نہیں تھی، وہ آسمانی قوانین کی پاسداری کرنے والا تھا-

جب حضرت عمرؓ کو فارس پر مکمل فتح ہونے کی خوشخبری دی گئی تو وہ سیدھے مسجد نبوی پہنچے اور لوگوں سے یوں خطاب کیا۔ "اے ایمان والو! فارس والوں نے اپنی سلطنت گنوادی ہے۔ اب وہ آگے چل کر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اب تمہیں اس ملک کا وارث بنایا ہے، ان کی جائداد اور دولت کا مالک بنایا ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانا چاہتا ہے، اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ تم ہرگز ہرگز بدل نہ جانا۔ اگر تم بدل جاؤ گے تو اللہ کسی دوسرے ملک کو تم پر مسلط کردے گا۔ مجھے اپنی قوم کے لئے اپنے ہی لوگوں کی طرف سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔"

یہ الہامی الفاظ تھے جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں اور جس کا تذکرہ دوسرے باب میں کیا گیا ہے ۔ایران کی اس بے انتہاء دولت نے مدینہ منورہ کے کچھ لوگوں کے طور طریقے بدل دیئے جسکا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوا انجام کار مسلمان قوم بکھر گئی۔

حضرت عمرؓ نہایت اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے، انہوں نے مجلس شوریٰ قائم کی جہاں پر سلطنت کے کاروبار کے سلسلہ میں آپس میں مشورہ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے اس وسیع اسلامی سلطنت کو الگ الگ صوبوں میں بانٹ دیا۔ یہ صوبے تھے مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، دریائے دجلہ وفرات کے درمیانی حصے۔ بصرہ، خراسان، آذربائجان، فارس اور مصر، ہر صوبہ پر ایک گورنر نامزد کیا، یہ گورنر خلیفۃ المسلمین کو ہر معاملہ میں جواب دہ ہوتا، ہر گورنر کی ذمہ داری، اسکے حدود، اسکے اختیارات کا ایک بالکل واضح ضابطہ مرتب کیا گیا۔ ایسے گورنر جنہوں نے اپنے اختیارات کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا انہیں سخت سزائیں دی گئیں۔ عدالتوں اور حکومتوں کے فیصلۂ نظام کو الگ کیا، عدل وانصاف کے نظام کیلئے قاضیوں کو تعینات کیا۔

حضرت عمرؓ ایک کھلے ذہن کے مالک تھے۔ دوسری تہذیب وتمدنوں میں جو اچھی اور قابل قدر خصوصیات

ہوا کرتی تھیں، انہیں اپنانے کیلئے آگے بڑھتے ۔ جہاں کہیں بھی ضرورت پڑی تو آپ نے ٹکنالوجی، حکومت کے طریقہ، مفتوح اقوام سے سیکھنے میں گریز نہیں کیا۔ ان دنوں ایران میں ہوائی چکیوں کا استعمال عام تھا، حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اسی طرح کی ہوائی چکیاں عربستان میں اکثر جگہ لگوائی جائیں۔ حضرت ابوہریرہؓ مال غنیمت کی صورت میں بہت بڑی دولت بحرین سے حاصل کرکے مدینہ تشریف لائے، مدینہ والوں میں اس مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ ان اختلافات کو دیکھ کر حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت عمرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ ایک دستاویزی شہادت کا محکمہ قائم کیا جائے۔ اس قسم کا محکمہ انہوں نے فارس کی حکومت میں دیکھا تھا، حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق اور فارسی محکمہ جات کے متعلق چھان بین کرنے کے بعد مطمئن ہوکر اسی قسم کا ایک محکمہ اسلامی نظام کے مطابق مدینہ میں قائم کیا۔ چونکہ اکثر عرب غیر تعلیم یافتہ تھے اس لئے اس محکمہ کے نظام کو چلانے کیلئے فارس کے لوگوں کو مقرر کیا۔ اس محکمہ کے منشیون نے مال غنیمت کی تفصیل تیار کی اور ہر ایک مال غنیمت پر انفرادی افراد کے دعوی کو ضبط تحریر کیا۔ اس طرح سے خلیفۃ المسلمین کو جنگ سے حاصل شدہ مال واسباب کے تقسیم کرنے میں آسانی ہوگئی۔ آگے چل کر اس محکمہ کو اور وسیع کردیا گیا اور اسکے ذریعہ خزانے اور فوج کی بھی مکمل تفصیل اس نظام کے تحت ضبط تحریر آنے لگی۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب کے اس طرز عمل کی وجہ سے محکمہ جات کے دستاویزات کو ضبط تحریر میں لانا مسلمانوں کا ایک باوقار پیشہ بن گیا آگے چل کر آنے والے تمام خلفاء و بادشاہوں سے لیکر عثمانیہ سلاطین تک اور اس جدید دور میں بھی یہ روایت مسلمانوں میں زندہ و تابندہ ہے۔

خلیفۃ المسلمین کے دورِ خلافت میں ہی اسلامی اصول قوانین اور اس کے طور طریقوں کو قرآن وسنت، اجماع وقیاس کے مکمل نظام کو قانونی شکل دی گئی۔

فقۂ مالکی جو حضرت عمرؓ کے سو سال بعد معرض وجود میں آیا، اس کا سرچشمہ حضرت عمرؓ کے وہ فرمان تھے جن پر صحابہؓ کا اجماع تھا۔

فوج کی تنظیم پیشہ وارانہ انداز سے کی گئی، سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی، مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط (قاہرہ) دمشق، عدسیہ اور اردن میں فوجی چھاونیاں قائم کی گئیں۔ مالیہ اور اس کا حساب، محصول اور خزانہ، ان سارے محکمہ جات کی الگ الگ تشکیل کی گئی اور ان کے ذمہ داروں کو لازمی جوابدہ بنایا

گیا۔ پولیس، قید خانہ اور ڈاک کا نظام قائم کیا گیا اراضی کی پیمائش کروائی گئی۔ زراعت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ پرانی نہروں کی مرمت کی گئی، نئی نہریں کھدوائی گئیں۔ وسیع اراضی کو زراعت و کاشتکاری کے قابل بنایا گیا، راستوں کی تعمیر کی گئی، ان راستوں پر باقاعدہ چوکسی رکھی جاتی، ان تمام اصلاحات کی وجہ سے ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر ہوئی کہ مسافر مصر سے نکل کر مرکزی ایشیاء کے خراسان تک بغیر کسی خوف کے سفر کر سکتے تھے۔

مشرق وسطی اور شمالی افریقہ کے بڑے وسیع علاقہ کو آزادنہ تجارتی علاقہ بنادیا گیا، آزادانہ تجارت کی وجہ سے دولت میں بھی اضافہ ہوا، تعلیم کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اساتذہ کو باقاعدہ تنخواہیں دی جانے لگیں، قرآن، حدیث، لسانیات، ادب، فلسفہ، فنِ کتابت، کو سرکاری حوصلہ افزائی حاصل تھی، حضرت عمرؓ خود ایک اچھے شاعر تھے اور مشہور خطیب بھی، ان کے زمانہ میں چار ہزار سے زیادہ مساجد کی تعمیر ہوئی۔

ٹکنالوجی جیسے کہ ہوائی چکیاں وغیرہ کی تعمیرات کی حوصلہ افزائی کی گئی، پرانے پلوں اور راستوں کی ازسرنو تعمیر کی گئی، اسکے علاوہ نئے راستے اور پل بھی تعمیر کئے گئے، چین کے سانگ شاہی خاندان کی قائم کردہ مثال کو سامنے رکھ کر مردم شماری کو اپنایا گیا، اور وہ حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے ہجرتِ رسول اکرمؐ

کو بنیاد بنا کر اسلامی کیالنڈر کے نظام کو قائم کیا۔

روایات میں آتا ہے کہ جب قرآنِ شریف کی یہ آیت حضور پرنور ﷺ پر اتری تو حضرت عمرؓ بے اختیار رو پڑے۔

" ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا، لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے (مگر) انسان نے اسے اٹھا لیا، وہ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے (یہ اس لئے کہ) اللہ تعالیٰ منافق اور مشرک مردوں اور منافق و مشرک عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول فرمائے، اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا اور مہربان ہے (سورہ: 33 آیات 73-72)۔

حضرت عمرؓ نے اس آیت مبارکہ کا مطلب یوں لیا کہ انسان نے اپنی ہی مرضی سے اس امانت کو قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت سے شرابور بنی نوع انسان نے اس بارِ امانت کو اپنے سر لے لیا جب کہ دوسری تمام مخلوقات نے اس بار کو اٹھانے سے معذوری ظاہر کی۔

جب انسان کی مرضی کو انسانیت کے اعلیٰ ترین ظرف کے مطابق استعمال میں لایا جاتا ہے تو اس کا مقام فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ انسانیت کا ناطہ تقدیر کے ساتھ اس طرح جوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے کردار کے ذریعہ بہترین اور اعلی ترین صفات کا حامل ہوسکتا ہے۔ جب اس آزادانہ مرضی یا عمل کا غلط استعمال کیا جاتا ہے تو انسان بدترین کیڑوں سے بھی گر جاتا ہے آنحضور ﷺ کے وصال مبارک کے بعد اس بات کو حضرت عمرؓ اور چند ہی دوسرے لوگوں نے ٹھیک طریقہ سے سمجھا اور آپ نے اس بارِ امانت کو بہت ہی حکمت عجز وانکساری ثابت قدمی، اثر پذیری اور اولوالعزمی کے ساتھ برتا کسی بھی پیمانے سے ناپا جائے تو حضرت عمرؓ دنیا کہ عظیم ترین انسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

حضرت عمر بن الخطابؓ نے اسلامی تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی وہ ایک تاریخ ساز شخصیت تھے انہوں نے اسلام کا جو دستور اترا تھا اس کو منضبط کر کے ایک دستوری ادارہ کی شکل دی انہوں نے مسلمانوں کے اپنے آپسی تعلقات وروابط اور غیر مسلمین کے ساتھ برتاؤ کے طور طریقوں کو عملی روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے توحید کے فلسفۂ حیات کو اس زمین پر پھیلانے کیلئے مکمل سعی کی۔

آپ کے سامنے ایک دیوانی کی مقدمہ لایا گیا، انتہائی افسوس کی بات ہے کہ اسی مقدمہ کے سلسلہ

میں آپؓ کو شہید کیا گیا۔صحابی رسول ﷺ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے ایک ایرانی بڑھی ابولؤلؤ فیروز کو اپنا مکان کرایہ پر دیا تھا اس کا کرایہ دو درہم مقرر ہوا تھا، فیروز نے محسوس کیا کہ یہ کرایہ زیادہ ہے اس نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے سامنے مقدمہ پیش کیا۔حضرت عمرؓ نے تمام شہادتوں کو جمع کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ یہ کرایہ مناسب ہے بظاہر اس معمولی سے واقعہ کی وجہ سے اسلامی تاریخ کا بدترین سانحہ ہوا۔ابو لؤلؤ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ اس نے خلیفۃ المسلمین کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے وقت جب حضرت عمرؓ نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں داخل ہوئے تو اس وقت ابولؤلؤ اپنے لمبے چغہ کے اندر دودھاری تلوار کو چھپا کے ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا۔جب حضرت عمرؓ امامت کیلئے کھڑے ہوئے اور قرأت شروع کی تو ابولؤلؤ نے آپؓ پر چھلانگ لگائی اور اپنی دودھاری تلوار آپؓ کے پیٹ میں گھونپ دی۔آپکے اندرونی زخموں سے خون بہنا بند نہ ہوا۔ایمان پرست قوم کا قلعہ ڈھ گیا تھا۔دوسرے دن حضرت عمرؓ شہادت فرما گئے۔آپؓ کی شہادت 645ء میں ہوئی۔

تیسرا باب

خانہ جنگیاں

تہذیب وتمدن عقائداورعلم کی روشنی میں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس جہالت اور حرص وہوس انہیں تباہی وبربادی کرطرف لے جاتے ہیں۔ٹھیک اس وقت جب کہ اسلامی فوجیں ہندوستان چین اور بحرالکاہل کی سمت فاتحانہ انداز سے آگے بڑھ رہی تھیں تواس ملک میں جہاں اسلام کا جنم ہوا تھا حرص اوراقرباء پروری کے بیج بوئے جارہے تھے۔ فارس کی فتح سے آنے والا مالِ غنیمت بہت ہی زیادہ تھا سونا چاندی ہیرے جواہرات کی شکل میں بے انتہاء دولت مدینہ لائی گئی کہا جاتا ہے کہ اس دولت کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کافی مضطرب ہوئے انہوں نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی ملک کودولت سے نوازتا ہے تواسی کے ساتھ حسد جلن جیسی بیماریاں بھی لوگوں میں پیدا ہوتی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قوم میں دشمنی اور ناانصافی کی ابتداء ہوجاتی ہے۔صحابہ کرامؓ نے اپنی روحانی قوت کے ذریعہ آنے والے اس دورکواچھی طرح پہچان لیا تھا کہ اتنی بڑی دولت سے عوام کے کردار میں بھی کافی تبدیلیاں آئیں گی۔وہ دولت کے جمع کرنے کے خلاف تھے اس لئے کہ یہ دولت قوم کواسلام کے روحانی مرکز سے دور کردے گی۔مثلاً ایران سے آئے ہوئے مالِ غنیمت میں ایک ایسی انمول قالین بھی شامل تھی جسے فرشِ بہار بھی کہا جاتا تھا یہ انتہائی خوبصورت قالین ایران کے شہنشاہوں کے قبضہ میں تھی اس کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ اس پر بیک وقت ایک ہزار افراد بیٹھ کر شراب نوشی کرتے تھے۔مدینہ کے کچھ لوگ اس کومحفوظ رکھنا چاہتے تھے۔لیکن حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جانے کا مشورہ دیا۔حضرت علیؓ کی تجویز قبول کرلی گئی اوراس بیش بہا قالین کو

پھاڑ دیا گیا۔حضرت عمرؓ نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ بیت المال سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی کا ایک مقام نہ بن کررہ جائے آپؓ نے تمام ہیرے جواہرات فروخت کردیئےاوراس سے حاصل ہونے والی دولت کوسب میں تقسیم کردیا تاکہ سب اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔سرمایہ جب ہاتھ بدلنے لگا تو تجارت میں اضافہ ہونے لگااورتجارت کی ترقی سے دولت کی فراوانی ہونے لگی۔ واقعہ نگاروں نے اس بات کولکھاہے کہ جب حضرت عمر بن الخطابؓ کی شہادت ہوئی اس وقت ملک کے خزانوں میں صرف اتنا ہی مال بچا تھا کہ اس سے دس آدمیوں کو کھانا کھلایا جاسکتا تھا۔سیلاب کی طرح درآنے والی دولت کے صحیح استعمال کیلئے ثابت قدمی اور بصیرت کی ضرورت ہے وہ دانش مندی حضرت عمرؓ کے انتقال کے ساتھ ہی چلی گئی۔انکی وفات ہوئے ابھی دس سال ہی گذرے تھے کہ اس چھوٹے سے عرصہ کے اندرہی مسلمان قوم آپس میں ہی ایک دوسرے سے الجھ گئی۔اس کا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

عقیدہ کے بعد اہم ترین چیز ہے دولت.اس کے ذریعہ تہذیب وتمدن کی تعمیر ہوتی ہے۔اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد جمع ہونے والی دولت کا اگر صحیح استعمال کیا جائے ایجادات کے ساتھ اس کی سرمایہ کاری،اچھے منصوبوں میں کی جائے تو اس کا حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہے۔نت نئ ایجادات سامنے آتی ہیں۔تہذیب وتمدن کی آبیاری ہوتی ہے،معاشرہ ترقی کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہوجاتا ہے۔ جب یہی دولت خزانے کی شکل میں ذخیرہ اندوز ہوجاتی ہے تو سارا اقتصادی نظام ہی بگڑ جاتا ہے۔ایسی صورت حال میں حاسدانہ جذبات پروان چڑھتے ہیں۔اقرباء پروری پھیل جاتی ہے۔حرص وہوس کو راہ ملتی ہے نتیجتاً آپسی لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ان سب کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آخرکار تہذیب وتمدن ہی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام میں خانہ جنگیوں کی اصل وجہ ایران سے حاصل ہونے والا سونا تھا۔جب تک حضرت عمرؓ جیسی قدآور شخصیت بقید حیات رہی وہ زبردست دباؤ قابو میں رہا جس کی ابتداء دولت کے اچانک آجانے سے ہوتی ہے۔حضرت عمرؓ نے عدل وانصاف،ثابت قدمی کے ساتھ حکومت کے نظام کو چلایا جہاں کہیں بھی اقرباء پروری کی کوئی چھوٹی سی بات بھی سامنے آجاتی تو فوراً سزا

دیتے۔ جب کبھی یہ پتہ چلتا کہ دولت اور اقتدار کا استعمال اپنی ذاتیات کیلئے ہو رہا ہے تو برسرِ عام اس کی حوصلہ شکنی کرتے۔ اس کی ایک مثال پیش ہے کہ جب آپؓ کو پتہ چلا کہ خالد بن ولیدؓ جیسے مشہور اور کامیاب سپہ سالار نے ایک شاعر کو اس لئے انعام دیا کہ اس نے ان کی تعریف کی تھی تو آپؓ نے غصہ میں آ کر ان کی فہمائش کی حالانکہ جب حضرت عمرؓ کو پتہ چلا کہ یہ رقم حضرت خالد بن ولیدؓ نے شاعر کو اپنی ذاتی آمدنی سے دی تھی تو انہیں اس جرم سے بری کر دیا گیا۔

حضرت عمرؓ موت سے قریب ہو چلے تو آپؓ نے چھ افراد کی ایک مشاورتی مجلس نامزد کی انہیں یہ مشورہ دیا کہ ان کے جانشین کا انتخاب کیا جائے اور یہ حکم بھی دیا کہ کسی بھی صورت میں ان کے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا انتخاب نہ کیا جائے۔ انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ مجلس مشاورت اگر چاہے تو اس مجلس کے ہی کسی فرد کو چن سکتی ہے۔ اس مشاروتی مجلس کے افراد تھے (۱) حضرت علی بن ابی طالبؓ (۲) حضرت عثمان بن عفانؓ (۳) حضرت زبیر بن عوامؓ (۴) حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ (۵) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور (۶) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ جانشینی کے بارے میں عوام کی رائے اکٹھا کریں انہوں نے اس کام کو سرانجام دیا تو پتہ چلا کہ اکثریت کی رائے حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ دونوں کے درمیان برابر بٹی ہوئی ہے۔ نئے امیر المؤمنین کے انتخاب میں مسجد نبوی میں لوگوں کی بڑی تعداد جمع ہوئی۔ مجمع کے سامنے ان دونوں کے نام پیش ہوئے۔ ان سے سوالات پوچھے گئے جنکا جواب انہیں دینا تھا۔ پہلا موقع حضرت علیؓ کو دیا گیا، حضرت علی بن ابی طالبؓ سے یہ سوال ہوا کہ کیا آپ حکومت کی اس ذمہ داری کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات رسول اللہ ﷺ کی سنت اور دونوں خلفائے راشدین کے اپنائے ہوئے راستہ کے مطابق نبھائیں گے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں اس ذمہ داری کو اللہ تعالیٰ اور اسکے پیغمبر ﷺ کے احکامات کے مطابق نبھاؤں گا۔ اس جواب کا یہ مطلب نکالا گیا کہ حضرت علیؓ دونوں شیوخ یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے دورِ خلافت کی جو میراث چھوڑی ہے اس کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔ حضرت عثمان بن عفانؓ سے وہی سوال دہرایا گیا۔ انہوں نے

اثبات میں جواب دیا ہاں میں حکومت کی ذمہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے احکامات کے عین مطابق اور دونوں خلفائے راشدین نے جو عملی نمونہ چھوڑا اس کے مطابق نبھاؤں گا۔ اس طرح حضرت عثمان بن عفانؓ نے نامزدگی جیت لی انہیں خلیفہ منتخب کرلیا گیا۔

ظاہری طور پر یہ سوال بے ضرر سا لگتا ہے لیکن یہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے حق میں تھا۔ تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کی حد تک یہ مقدمہ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ پُر زور تاویل پیش کی جاتی ہے کہ خلافت کے انتخاب کے لئے اس مقام پر دونوں شیوخ یا خلفائے راشدین کی چھوڑی ہوئی روایات پر چلنے کی بات موزوں نہیں لگتی۔

جب حضرت عثمان بن عفانؓ کو خلیفہ نامزد کیا گیا اس وقت ان کی عمر ستر سال تھی۔ وہ متقی، خداترس، عالم، انتہاء درجہ کے ایمان دار اور منکسر المزاج تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بڑے دولت مند تھے۔ انہوں نے اپنی دولت انتہائی فراخ دلی کے ساتھ مسلمانوں کی بہبودی اور اسلام کی سربلندی کے لئے خرچ کی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹی حضرت رقیہؓ سے پہلے نکاح ہوا۔ حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹی ام کلثومؓ سے آپؓ نے شادی کی۔ حضرت عثمانؓ انتہائی شرمیلے اور فوری فیصلے لینے میں پس وپیش فرماتے تھے۔ یہ تمام خصوصیات فرد کو بے ضرر تو بناتی ہیں لیکن یہی خصوصیات ایک حاکم کی حیثیت سے حضرت عثمانؓ کے لئے مہلک ثابت ہوئیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ بنوامیہ سے تھے۔ اسلام کے آنے سے پہلے اقتدار کیلئے اکثر بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان رسہ کشی ہوا کرتی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کا تعلق بنو ہاشم سے تھا۔ یہ ساری حقیقتیں اس وقت انتہائی اہمیت اختیار کرگئیں۔ جب حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں وہ اتحاد کم ہونے لگا جو اسلام کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت بارہ سال کے عرصہ تک رہی ان کی خلافت کو دو واضح حصوں میں الگ الگ تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے پہلے چھ سالہ دور حکومت میں حضرت عمرؓ نے فتح ونصرت کا جو زور

قائم کیا تھا اسی سرعت و تیز رفتاری سے اسلامی فوجیں مغرب میں آذربائیجان، کرمان، افغانستان، خراسان اور قزاخستان کی جانب بڑھتی گئیں۔ ادھر مشرق میں ان فوجوں نے لیبیا تک فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اسی دوران کردستان اور فارس میں اٹھنے والی کئی بغاوتوں کو کچل دیا گیا۔

حضرت عثمانؓ نے دو ایسے اہم ترین کارنامے انجام دیئے جن کا اثر اسلامی تاریخ پر ہمیشہ رہا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے دور تک قرآن مجید سات الگ الگ لہجوں میں پڑھا جاتا تھا۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں قرآن شریف کی قرأت کا ایک ہی معیار قائم کیا۔ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور سینکڑوں حفاظ نے اس کو اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا۔ جنگ یمامہ میں جب کئی حفاظ کرامؓ نے شہادت فرمائی تو حضرت عمر بن الخطابؓ کے مشورہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن مجید کو بالکل اسی ترتیب سے لکھوایا جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دیا تھا۔ اس نسخہ کو مصحف صدیقی کہا جاتا ہے۔ زبان عربی اس زمانہ میں زیر وزبر اور حرکات کے بغیر لکھی جاتی تھی۔

اسی لئے مصحف صدیقی میں بھی اعراب نہیں ہیں۔ جب اسلامی حکومت کی سرحدیں عرب علاقوں سے نکل کر عجمی علاقوں تک پہونچ گئیں جہاں کی زبان عربی نہیں تھی، یہ خطرہ ہو چلا کہ کہیں قرآن شریف کے تلفظ کو غلط طریقہ سے نہ پڑھا جائے اور اسکے غلط مفہوم نہ اخذ کئے جائیں۔ اسی لئے حضرت عثمانؓ نے قرآن شریف کا ایک ایسا نسخہ تیار کرنے کا حکم دیا تھا جس کا لہجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجہ کے بالکل موافق ہو۔ اور جس میں اعراب و حرکات بالکل اسی انداز سے ہوں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا تھا- جہاں کہیں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت مختلف لہجہ اختیار کرتی تھی ان جگہوں پر اس لہجہ کے مطابق ضروری حواشی درج کئے گئے۔ اور آج تک تمام عالم اسلام اِسی لہجہ میں قرآن مجید پڑھ رہا ہے

حضرت عثمان بن عفانؓ کا دوسرا بڑا کارنامہ بحری بیڑہ کی تیاری تھا، اس تجویز کی مخالفت بھی ہوئی اس خیال سے کہ عرب کی فوجیں صحراؤں میں تیز رفتاری کے ساتھ حملہ کے عادی ہیں۔ اور یہ عرب افواج بحری بیڑے کے استعمال کے عادی نہیں ہیں۔ حضرت معاویہؓ کے مشورہ پر حضرت عثمانؓ نے ایک انتہائی طاقتور بحری بیڑے کی تیاری کا حکم دیا۔ تا کہ اس کے ذریعہ مشرق میں بحر روم کے ساحلوں پر بازنطینی افواج کے

حملوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکے، آپؓ کے حکم کے مطابق بحری بیڑہ تیار ہوگیا۔ جس کے ذریعہ یونان پر اسلامی افواج نے فتح حاصل کر لی۔ بحری بیڑہ کے مسلسل ترقی کی وجہ سے دس سال کے اندر اسلامی افواج میں ایسی زبردست طاقت پیدا ہوگئی کہ انہوں نے بازنطینی حکومت کے صدر مقام قسطنطنیہ (Constantinople) یعنی موجود استنبول پر بھی حملہ کے قابل ہوگئے۔

حضرت عثمانؓ کے دوسرے چھ سالہ دورِ خلافت میں مسلمانوں کے درمیان سنگین اختلافات ابھر آئے۔ حضرت عثمانؓ نرم مزاج خاموش طبیعت اور صلح پسند تھے، آپؓ فیصلہ کن قدم اٹھانے میں جھجھک محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اشرار کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ بنوامیہ قبیلہ کے چند افراد نے آپ کی اس جھجک کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور بڑی بڑی جائدادیں بنالیں۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ اہل کاروں کو نکال دیا۔ اور ان کی جگہ بنوامیہ کے افراد کا تقرر کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے اکثر افراد ان عہدوں کے اہل نہیں تھے۔ جب کبھی حضرت عثمانؓ کے سامنے ان کے نااہل افراد کے متعلق شکایت پیش کی گئی تو آپ فیصلہ لینے سے پیچھے ہٹتے رہے۔ چونکہ خود حضرت عثمانؓ کا تعلق بنوامیہؓ سے تھا۔ اسی لئے مخالفین کو ان پر اقرباء پروری کے الزامات عائد کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ بنو ہاشم اور بنوامیہ کے درمیان اسلام کے آنے سے پہلے آپسی چپقلش رہا کرتی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ کشمکش سرد پڑ گئی تھی۔ اب اس وقت اس باہمی رسہ کشی نے ایک بار پھر سر اٹھایا، سب سے اہم عنصر جو اس سیاسی غیر استحکام کے پیچھے کارفرما تھا وہ تھا ایران سے حاصل ہونے والا بے حساب خزانہ، ابن خلدون اپنی مشہور تصنیف ''مقدمہ'' کے صفحہ 478 میں مسعودی کے حوالہ سے لکھتا ہے۔

''جس دن حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہوئی اس وقت ان کے ذاتی خزانہ میں ایک لاکھ پچاس ہزار دینار اور ایک لاکھ درہم موجود تھے۔ علاوہ اس کے قراعہ اور حنین کی وادیوں میں ان کی کافی جائیداد تھیں جس میں بے شمار اونٹ اور گھوڑے بھی تھے ان جائیدادوں کی قیمت کا اندازہ دو لاکھ دینار بتایا جاتا ہے۔ حضرت زبیرؓ کی صرف ایک جائیداد کی قیمت پچاس ہزار دینار تھی جس میں ایک ہزار گھوڑے بھی تھے حضرت طلحہؓ کو عراق کی جائداد سے ایک ہزار دینار حاصل ہوتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے

اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے علاوہ اس کے دس ہزار بکریاں بھی تھیں۔ان کے انتقال کے بعد ان کی جائیداد کے ایک چوتھائی حصہ کی قیمت چوراسی ہزار دینار لگائی گئی۔حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس سونے اور چاندی کی اینٹیں تھیں جن کے کاٹنے کیلئے کلہاڑی کی ضرورت پڑتی تھی۔

حضرت زبیرؓ نے بصرہ، مصر، کوفہ اور اسکندریہ میں بے شمار مکانات حاصل کئے تھے۔اسی طرح حضرت طلحہؓ نے کوفہ میں بھی ایک مکان تعمیر کیا تھا یہ اس پرانے مکان کے علاوہ تھا جو مدینہ منورہ میں تھا اس مکان کی مرمت اینٹ گارے اور اوک کی لکڑی سے کی گئی تھی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک عالیشان مکان تعمیر کروایا تھا جس کی تعمیر میں لال پتھر استعمال کئے گئے حضرت مقدادؓ نے مدینہ میں ایک مکان بنوایا جس کے اندرونی اور باہری دیواروں پر روغن کیا گیا تھا۔

مسعودی لکھتا ہے کہ یہ ساری دولت بالکل ہی ایماندارانہ طریقہ سے حاصل کی گئی تھی۔یہ سب کچھ مختلف جنگوں سے حاصل شدہ مال غنیمت سے انہیں ملنے والا حصہ تھا۔

یہ دولت انہیں مختلف جنگوں سے حاصل شدہ مال غنیمت سے بھی ملی اور تجارت کے ذریعہ بھی۔یہ دولت جمع کی گئی تھی۔حلال طریقوں سے کمائی ہوئی اس دولت نے ان صحابہ کرامؓ پر کوئی اثر نہ چھوڑا۔لیکن قوم کے کچھ افراد اس دولت کے متعلق، اس کے استعمال کے بارے میں ہمیشہ سرگوشیاں کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی یہ دولت، یہ امارت اولین خلفائے راشدین کے اس سادگی بھرے دور کے بالکل برخلاف تھی، حضرت عمرؓ اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں پر بکرے کے چمڑے سے پیوند لگایا کرتے تھے۔لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔فارس کے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات نے کچھ عربوں کے کردار کو بدل دیا تھا۔دمشق جہاں پر اموی گورنر کی حکمرانی تھی وہی دمشق اب بڑے بڑے محلات اور عالیشان عمارتوں کا شہر بن گیا، عوام کی زندگی میں ایک بے رحم تنزلی کا دور شروع ہو گیا۔مردوں اور عورتوں میں قبائلی اور صحرائی زندگی سے پرے دولت و آسائش کا عمل شامل ہو گیا تھا۔روحانی قوت کی جگہ جسمانی لذت نے لے لی۔قوم میں بڑھتے ہوئے بگاڑ نے افواہ پھیلانے والوں، شرارت پسندوں اور فساد مچانے والوں کو ایک اچھا موقع فراہم کر دیا۔ اتھل پتھل کے اس دور میں دو اشخاص نے خصوصیت کے ساتھ انتہائی خباثت بھرا کردار نبھایا۔ایک تھا نو مسلم

عبداللہ بن سبا، اس نے حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کی، کوفہ اور مصر کے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف اکسایا، دوسرا شخص حکم بن مروان تھا، یہ اموی قبیلہ سے تھا اس کو حضرت عثمانؓ نے معتمد اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ حکم کے ذمہ سرکاری خط و کتابت کا اہم ترین عہدہ تھا۔ اس نے اس عہدہ کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور انتہائی فیصلہ کن لمحات میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے احکامات کی غلط ترجمانی کی۔ رفتہ رفتہ ایک غیر مطمئن اور بے وفائیوں سے بھری صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ آخر کار بغاوت کی شکل میں یہ لاوہ پھوٹ نکلا۔ کوفہ اور مصر سے باغیوں کے کئی دستے مدینہ منورہ میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے خلیفۃ المسلمین کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان سے استعفیٰ کی مانگ کرنے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے اُن کی اس مانگ کو پورا کرنے سے انکار کیا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو خلافتِ راشدہ کی بنیاد ہی ہل جاتی۔ باغیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور انتہائی بے رحمی سے انہیں شہید کر دیا ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾۔ آپ کی شہادت 655ء میں ہوئی اس کے فوری بعد خانہ جنگیوں کی ابتداء ہوئی۔

جذبات بھرے عمل ہمیشہ اسی قسم کے ہی جذبات کو جنم دیتے ہیں جس کے نتائج کی کوئی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کی شہادت سے مدینہ منورہ میں چاروں طرف افراتفری پھیل گئی۔ وہاں نہ کوئی امیر تھا نہ کسی کا حکم چلتا تھا۔ ہر طرف بدنظمی تھی۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کی میت چوبیس گھنٹوں تک یوں ہی پڑی رہی، انہیں سپرد خاک کرنے کیلئے کوئی آگے نہیں آ رہا تھا۔ آخر کار ایک جماعت ہمت کر کے آگے بڑھی۔ امیر المؤمنین کے جسم مبارک کو غسل دیا اور رات کے اندھیرے میں تجہیز و تکفین کی۔ اس وقت قبرستان میں صرف سترہ افراد کی جماعت تھی۔ اس بدامنی و بدنظمی کے دوران حضرت علیؓ سے بار بار یہ درخواست کی گئی کہ وہ خلافت راشدہ کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ اس بار خلافت کو سنبھالنے سے وہ جھجکتے رہے۔ آخر کار جب کئی مشہور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اصرار کیا تو آپؓ نے چوتھے خلیفہ کی حیثیت سے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔

حضرت علیؓ نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کی شہادت ایک گہری سازش کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایران سے حاصل شدہ دولت کی وجہ سے ایک ایسا زبردست طوفان پیدا ہوگیا تھا

جس کے درمیان اسلام کا سیاسی نظام الجھ گیا تھا۔اس میں سے کچھ دولت دوسرے مفتوح صوبوں کے صدر مقام تک بھی پہنچی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں بھی ایک طبقہ کو عیش پسندی کے لئے دولت ہاتھ آ گئی۔ جو لوگ اس قسم کی عیش پسندی کے عادی ہو گئے تھے انہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ زندگی کی طرف لوٹنا بہت گراں معلوم ہوتا تھا۔حضرت علیؓ کے سامنے اولین مرحلہ تھا بدامنی کا خاتمہ کرنا، وہ اس کا خاتمہ اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں در آئی ہوئی سماجی خرابیوں کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔اس کیلئے وہ کمر بستہ ہو گئے انہیں، اس کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ یہ صفائی اعلیٰ صفوں سے شروع ہونی چاہئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے تمام صوبائی گورنروں سے استعفیٰ مانگا۔کچھ گورنروں نے استعفیٰ نامہ بھیج دیا۔کچھ نے انکار کیا اور کھلی بغاوت پر اتر آئے۔انکار کرنے والی اہم ترین شخصیت حضرت معاویہؓ بن ابوسفیانؓ کی تھی جو شام کے اموی گورنر تھے۔

عقیدہ اور دولت تاریخ کے دو طاقتور ترین انجنوں میں سے ہیں۔حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد پہلی بار ہم ان دونوں آپسی مخالف قوتوں کو ایک دوسرے سے برسر پیکار دیکھتے ہیں۔ دولت تو ایک وحشی گھوڑے کی طرح ہے۔ جب اسے سدھایا جاتا ہے تو دلربائی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور سوار کو طاقت بخشتا ہے۔اگر سدھایا نہ جائے تو سوار کے ساتھ اپنے آپ کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے۔عقیدہ یا ایمان وہ طاقت ہے جو دولت کو لگام دیتا ہے۔عقیدہ کے ساتھ ذہنی و روحانی تربیت بھی آتی ہے۔اس تربیت کے بغیر دولت اس سارے اثاثہ کو تباہ و برباد کر دیتی ہے جس سے تہذیب و تمدن کی تعمیر ہوتی ہے۔ ایران پر فتح حاصل کرنے کے بعد جس چیز کی اشد ضرورت تھی وہ تھی حضرت عمرؓ کی سی سختی اور قوت فیصلہ۔تیسرے حضرت عثمانؓ کی صلح پسندی اور منکسر المزاجی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر تباہی مچانے والے عناصر نے چاروں طرف فساد مچا دیا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے دوسرے چھ سالہ دورِ خلافت میں یکایک آنے والی دولت سے بگاڑ اور اقرباء پروری اس حد تک جڑ پکڑ گئی کہ اس عقیدہ کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا جس کی وجہ سے فتح مندیوں نے مسلمانوں کے قدم چومے اور دولت کے ڈھیر انکے قدموں تلے آ گئے۔

حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت حاصل کی تھی۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

جس سادگی کے ساتھ اپنی زندگی گذاری تھی وہ مثال ان کے سامنے تھی۔ حضرت علیؓ بالکل ویسی ہی سادگی بھری زندگی مسلمانوں میں لانا چاہتے تھے، اب زمانہ بدل گیا تھا، ایران کی فتح نے کئی مشہور افراد کو دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ افراد اس حاصل شدہ دولت سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اسکو بچانے کیلئے لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے اسلام کو اب اِس دنیا کا مذہب بنالیا۔ آخرت کا خوف ان کے دل سے نکل گیا۔ اب لوگ ذاتی اقتدار، دولت اور دنیاوی زندگی کیلئے جینے لگے۔ اسی کو پانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ لوگوں کے دل اسلام کی ازلی اور ابدی سادگی سے بہت دور چلے گئے۔ جن لوگوں کی نظریں دنیاوی زندگی، دولت، سونا چاندی کے ڈھیر میں الجھ گئی تھیں، ان کے دل آنحضور ﷺ کے سادہ اور پر مشقت عملی نمونے سے دور ہو گئے تھے۔

عقیدہ یا ایمان اور حرص وہوس کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی اس پس منظر میں اگر غور سے دیکھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی غمگین اور اندوہناک شہادت اس معرکہ کی ابتداء تھی۔ اس شہادت نے اس معرکہ حق کو اور بھڑکایا۔ حضرت علیؓ کے سامنے اولین مرحلہ تھا، ملک میں پھیلی ہوئی بدنظمی پر قابو پانا، لیکن کئی ایک صحابۂ کرامؓ چاہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لیا جائے۔ شر پسندی اور بدامنی کو روکنے سے پہلے انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کی شہادت کی وجہ سے اسلامی دنیا پر ایک سکتہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ لوگوں میں اس قدر غصہ تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ جیسی جلیل القدر صحابیہ نے ہی قصاص کے اس مسئلہ کو سب سے پہلے اٹھایا۔ اس تحریک میں حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ اور زبیر بن العوامؓ جیسے مشہور صحابہ کرام بھی شامل ہوگئے۔ 656ء حضرت عائشہؓ نے تین ہزار کی فوج لے کر مکہ سے بصرہ کی طرف کوچ کیا، یہ واقعی بہت ہی سنگین مرحلہ تھا، یہاں خود ام المؤمنینؓ فوج کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں تا کہ حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لیا جائے۔ اس وجہ سے خلیفۃ المسلمین کے اختیارات کو بھی للکارا جارہا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر مکہ کے عوام بہت فکرمند اور افسردہ خاطر تھے۔ کچھ قصاص کے اس معرکہ میں شامل ہوئے، جیسے کہ صحابہ رسول طلحہؓ اور زبیر بن العوامؓ لیکن اکثریت نے وقت کی نزاکت اور سنگینی کا احساس کرلیا۔ انہوں نے

اس جنگ سے دور رہنا زیادہ پسند کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ خالص قصاص کے مسئلہ کو لیکر پیش قدمی کر رہی تھیں تاکہ عوام میں تبدیلی آئے اور قاتلوں کو سزا ملے، لیکن اس کا یہ اثر بھی ہوا کہ خلافت کے اقتدار پر ایک کاری ضرب بھی لگی۔ خلافت کے اندر ہی دوسری طاقتوں کو ابھرنے کا موقع فراہم ہوگیا۔ اس طرح خلافت کمزور ہونے لگی۔ ایک سیاسی نظام کے اندر دو آزاد فوجیں نہیں رہ سکتیں۔ جس انصاف کا تقاضہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کر رہی تھیں اس کا نتیجہ آخر کار خلافت کے اس نظام سے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس کی قیادت حضرت علیؓ فرما رہے تھے۔ ان دونوں نظریات کا ٹکراؤ، جنگ جمل کی شکل میں سامنے آیا۔

حضرت علیؓ ابتداء میں شام پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے تھے تاکہ حضرت معاویہؓ کو زیر قابو کیا جائے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کی رہنمائی میں مکی افواج کی پیش قدمی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسی لئے حضرت علیؓ سات سو سپاہیوں کے ساتھ عراق کی جانب بڑھے۔ یہ بھی تقدیر کا ہی ایک فیصلہ تھا کہ اس کے بعد حضرت علیؓ پھر مدینہ واپس نہ جا سکے۔ تقدیر و مکافات کا کھیل شروع ہوگیا۔ جب علیؓ کوفہ پہنچے تو یہاں عراق کے ہزاروں سپاہی انکے ساتھ شامل ہوگئے۔ ایک طرف مدینہ اور عراق کی متحدہ فوجیں حضرت علیؓ کی سرکردگی میں تھیں دوسری جانب حضرت عائشہ صدیقہؓ کے زیر کماں مکی فوجیں تھیں۔ ان دونوں میں ٹکراؤ کے لئے اب کچھ ہی لمحات رہ گئے تھے۔

دانشوروں نے فوجی ٹکراؤ سے بچنے کے لئے دونوں نظریات کے درمیان صلح کروانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ دونوں فریقوں کے درمیان ایک سمجھوتہ بھی ہوگیا، وہ سمجھوتہ یہ تھا کہ مسلح کارروائیوں سے بچنے کیلئے بات چیت کو اور آگے بڑھایا جائے۔ لیکن دونوں جانب ایسے افراد موجود تھے جو ہر قیمت پر فساد مچانا چاہتے تھے۔ وہ جماعت جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کیلئے ذمہ دار تھی وہ ہر قیمت پر اس سمجھوتے کو تخریب کاری کے ذریعہ ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ایک پرامن صلح ہوگئی تو وہ بے نقاب ہوجائیں گے پھر دونوں فریقین کی جانب سے انہیں سخت ترین سزا ملے گی۔

ان تخریب کاروں کی ایک جماعت کا سربراہ تھا عبداللہ بن صباح اس نے حال ہی میں اسلام قبول

کیا تھا۔عراق اور مصر میں اس کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔امن کے کسی بھی سمجھوتے کے امکان کو ختم کرنے کیلئے ان صبائیوں نے دونوں فریقین کی فوجوں پر رات کے اندھیرے میں حملہ کردیا۔اس حملہ کی وجہ سے ہرطرف انتشار پھیل گیا۔دونوں نے یہ سمجھا کہ دوسرے نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔حضرت عائشہؓ اونٹ پرسوار ہوئیں تاکہ اپنی فوج میں پھیلنے والے انتشار پر قابو پاسکیں۔ادھران کے ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ آپؓ خودفوج کی کمان سنبھالنا چاہتی ہیں۔اب ایک عام جنگ چھڑگئی۔چند گھنٹوں کے اندر ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔مشہورصحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ بھی اس جنگ میں شہید ہونے والوں میں سے تھے۔ایک اورمشہورصحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زبیر بن العوامؓ نے اس جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی۔لیکن واپسی کی راہ میں ہی انہیں شہید کردیا گیا۔حضرت علیؓ کو یہ احساس ہوگیا کہ جب تک حضرت عائشہؓ اونٹ پرسوار رہیں گی یہ خونیں جنگ یونہی جاری رہے گی۔آپؓ نے اس اونٹ کو نیچے گرانے کا حکم دیا۔جب اونٹ کو گرادیا گیا تو حضرت عائشہؓ کے تمام ساتھی تتر بتر ہوگئے۔حضرت علیؓ نے اس جنگ میں فیصلہ کن جیت حاصل کی۔حضرت علیؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ انتہائی عزت واحترام سے پیش آئے۔انہیں نہایت احترام کے ساتھ فوجی پہرہ میں مکہ واپس بھیج دیا۔

جنگ جمل مسلمانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی محنتوں کے ساتھ مسلم قوم کو جس اتحاد کی لڑی میں پرودیا تھا،محبت واتحاد کی وہ لڑی ٹوٹ گئی۔اپنی زندگی کے آخری ایام کے دوران خود حضرت عائشہ صدیقہؓ اس جنگ پر متاسف تھیں۔مسلمانوں میں خانہ جنگیوں کی یہ اولین کڑی تھی جس کی انتہاء کربلا کے واقعہ پر ہوئی۔حالانکہ حضرت علیؓ نے ایک فیصلہ کن جیت حاصل کی لیکن اب ان کی سیاسی حیثیت کمزور ہوگئی۔اس لئے ان کے مخالفین نڈر ہوکر حضرت عثمانؓ کا خون بہا طلب کرنے پر مصر رہے۔حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مخالفین کبھی اس فریق کے ساتھ ہوتے تو کبھی اس فریق کے ساتھ جس کی وجہ سے وہ سزا سے بچتے رہے۔یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ قصاص عثمانؓ کے لئے دار القضاء کی تشکیل ہی نہ کرسکے تاکہ قاتلوں کو سزادی جاسکے۔جنگ جمل نے حضرت معاویہؓ کو ایک اچھا موقع فراہم کردیا وہ حضرت علیؓ کے خلاف آگے چل آنے والی کشمکش کی مکمل تیاریوں میں جٹ گئے۔حضرت

عثمانؓ کی خون میں ڈوبی ہوئی قمیص دمشق کی جامع مسجد کے دروازے پر لٹکا دی گئی، دور دراز علاقوں سے لوگ جب مسجد کو آتے تو دروازے پر لٹکی اس خوں آشام قمیص کو دیکھتے، بے اختیار آنسو بہاتے، قسمیں کھاتے کہ ہم حضرت عثمانؓ کا قصاص لے کے رہیں گے۔فساد مچانے والے اس قدر نڈر ہو گئے کہ حضرت علیؓ کا نام حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سلسلہ میں لینے لگے۔ پہلے پہل انہوں نے دبے الفاظ میں یہ آواز اٹھائی پھر آہستہ آہستہ کھلے عام حضرت علیؓ پر الزام لگانے لگے۔حضرت معاویہؓ نے مشہور فصیح البیان مقرر شرحبیل بن سمرقندی کی خدمات حاصل کیں اور ان کو یہ کام سونپا کہ ملک شام کے کونے کونے میں تقاریر کے ذریعہ یہ بات دہراتے رہیں۔ اس طرح معاویہؓ شام کے لوگوں کو اپنے جھنڈے تلے متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے اور حضرت علیؓ کے خلاف لڑنے کیلئے ستر ہزار(70,000) نفری فوج تیار کر لی۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان رسہ کشی اصول اور سیاست کی محاذ آرائی و کشمکش کی ایک بہترین مثال ہے۔ کچھ مسلمانوں نے اس محاذ آرائی کو طریقت اور شریعت کی کشمکش قرار دیا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اس پر کچھ کہنے سے گریز کیا ہے۔انہوں نے اس خاموشی کو اس لئے صحیح قرار دیا ہے کہ تمام صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی ادب واحترام کے لائق ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا خلاف ادب ہے۔ہم نے یہاں اس کتاب میں اس موضع پر کسی بھی صحابی کے بے جا طرفداری نہیں کی ہم صرف تاریخ کے ان اوراق کو پلٹ رہے ہیں جن سے صحیح حقائق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

حضرت علیؓ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کا دروازہ قرار دیا تھا، آپ روحانیت کا سرچشمہ ہیں، ایک اصول پسند، انصاف پسند، عظیم عالم، باوقار اور بہادر سپاہی بھی، لیکن حضرت عثمانؓ کی خلافت اور ان کی شہادت سے جو فساد کا طوفان برپا ہوا اس کی زد میں وہ بھی آ گئے، معاویہؓ ایک اعلیٰ منتظم، بہترین سیاستدان اور اپنے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اٹل تھے۔ دونوں اپنے اپنے موقف پر اپنی زندگی کی آخری سانس تک اٹل رہے۔ حضرت علیؓ نے خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے ملک میں پھیلی بدامنی کو ختم کرنے کی جانب پہلا قدم اٹھایا اور حضرت عثمانؓ کے قصاص اور دوسرے ملکی معاملات پر بعد میں توجہ دینا مناسب سمجھا۔ لیکن حضرت علیؓ اس منزل کو پا نہ سکے اسی جدوجہد میں انہوں نے خلافت اور زندگی دونوں کی قربانی دے دی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے

سب سے پہلے قصاص کا مطالبہ کیا، پھر اس کے بعد حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت کو ترجیح دی۔

حضرت علیؓ نے 656ء میں اسلامی ریاست کا صدر مقام مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کر دیا اور یہاں انہوں نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی، انہوں نے شام کے خلاف محاذ آرائی کیلئے 80,000 کی فوج تشکیل دی۔ اس فوج میں زیادہ تعداد عراقیوں کی تھی، مدینہ والوں اور فارس کے باشندوں کی ٹکڑیاں بھی اس میں شامل تھیں، افق پر اٹھتے طوفان کو دیکھ کر کچھ مشہور صحابہؓ نے امن قائم کرنے کی کوشش کی۔ ابو مسلم خراسانیؒ نے حضرت امیر معاویہؓ کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ حضرت علیؓ کو خط لکھیں۔

حضرت امیر معاویہؓ نے خط لکھا کہ اگر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو ان کے حوالے کر دیں تو وہ حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کیلئے تیار ہیں۔ لیکن اب فریقین کے موقف میں بہت سختی آ گئی تھی، حضرت معاویہؓ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ حضرت علیؓ اس وقت سیاسی طور پر کمزور موقف میں ہیں اور قصاص کا معاملہ حل نہیں کر سکتے۔ کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت امیر معاویہؓ کے اس موقف کو دہرایا گیا تو مسجد میں موجود دس ہزار عراقیوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ اٹھائے کہ وہ سب حضرت عثمانؓ کے قاتل ہیں۔ شام سے آئے ہوئے سفیر کو خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔

حضرت معاویہؓ نے پہل کرتے ہوئے عراق پر حملہ کیا اور صفین کے میدانی علاقوں میں دریائے فرات کے پانی پر قبضہ کر لیا، جب حضرت علیؓ کی فوج یہاں پہنچی تو انہیں پانی لینے سے روک دیا گیا، حضرت علیؓ نے فوراً شامیوں پر حملہ کرنے اور پانی پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا۔

جنگِ صفین کی ابتداء ہو چکی تھی، یہ اس دور کی انتہائی خونی جنگوں میں سے ایک تھی، پورے تین ماہ تک عراقی اور شامی ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے، دونوں یہ سمجھتے رہے کہ ان کا موقف صحیح ہے، لیکن لیلۃ الحریر کی رات حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے ایسا شب خون مارا کہ شامی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کی شکست قریب ہے، یہاں حضرت امیر معاویہؓ نے ایک اور چال چلی، حضرت عمرو بن العاصؓ جنہیں مصر کے گورنر بنائے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا ان کے مشورہ پر شامیوں نے اپنے نیزوں پر قران شریف کو اٹھا لیا اور یہ اقرار کیا کہ وہ دونوں فریقین کے درمیان قرآن شریف کو حکم مانیں گے، حضرت علیؓ اس چال کو

اچھی طرح سمجھ گئے تھے لیکن جب دونوں افواج نے اس حکم کو ماننے پر اصرار کیا تو وہ مجبور ہو گئے۔

یہ فیصلہ تقدیر نے حضرت علیؓ کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ ثالثی کے لئے فریقین کا راضی ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ حضرت معاویہؓ بھی حضرت علیؓ کے ساتھ خلافت پر دعویٰ کا برابر حق رکھتے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جو ایک بزرگ اور خداترس صحابیٔ رسول تھے حضرت علیؓ کی طرف سے ثالث مقرر ہوئے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ جو کہ حضرت معاویہؓ کے کٹر حامیوں میں تھے ان کی طرف سے ثالث مقرر ہوئے۔

اس موقع پر حضرت علیؓ کی فوج سے کچھ لوگ الگ ہو گئے۔ یہ لوگ الخوارج کہلائے، خوارجی بہت ہی غصّہ میں تھے ان کا یہ کہنا تھا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت علی بن ابی طالبؓ نے حکم کے فیصلہ کو مان کر شرک (نعوذ باللہ) کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لئے کہ انسانوں کی یہ ثالثی قرآن کے حکم کے خلاف ہے۔ خوارج نے یہ عہد کیا کہ جب تک حضرت علیؓ اس ثالثی کے فیصلہ کو رد نہیں کریں گے وہ ان کی مخالفت ہی کرتے رہیں گے۔

کم فہم لوگ کس طرح آسمانی احکامات کو اپنی سمجھ کے مطابق اپنے سمجھوتوں میں استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک بہترین مثال الخوارج ہیں۔ خوارجیوں نے قرآنِ شریف کی دو آیات سے غلط مطالب اخذ کرتے ہوئے اپنی بے رحمانہ کارروائیوں کیلئے انہیں جواز بنالیا۔ ابتداء میں انہیں خوارجیوں نے انہی آیات کے مطلب کے تحت حضرت علیؓ کو ثالثی قبول کرنے پر مجبور کیا جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ کافر ہیں (آیت:5-44)۔

اس کے بعد جب کہ اس سے ایک عدالت کی تشکیل دے دی گئی تو یہی لوگ اس کا انکار کرتے ہوئے الگ ہوئے اور اس کے لئے انہوں نے قرآن شریف کی ایک اور آیت کو جواز بنایا پھر بھی کافر لوگ (غیر اللہ کو) اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں (آیت 6-1) انہیں لوگوں کا موقف تھا کہ حکم صرف قرآن کو بنایا جا سکتا ہے۔ انسانوں کی ثالثی ہمیں منظور نہیں۔

ثالثی کرنے والی عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں استعفیٰ دے دیں اور قوم کسی تیسرے شخص کا انتخاب کرے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ اس فیصلہ کا اعلان ہونے والا تھا ایک اور کھیل کھیلا گیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے درخواست کی گئی کہ وہ سب سے پہلے بات کریں انہوں نے

ایمانداری کے ساتھ اس فیصلہ کو عوام کے سامنے پیش کر دیا۔لیکن جب حضرت عمرو بن العاصؓ بولنے کیلئے اٹھے تو انہوں نے اس فیصلہ کو تبدیل کر دیا اور کہا کہ اے لوگو! آپ نے حضرت ابو موسیٰؓ کا فیصلہ کا سنا انہوں نے اپنے امیر کو عہدے سے اتار دیا ہے۔اب میں بھی انہیں اس عہدے سے برخاست کرتا ہوں لیکن میرے اپنے امیر معاویہؓ کو ان کے عہدے سے برخاست نہیں کرتا۔ یہ امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کے صحیح جانشین ہیں۔اسی لئے وہ ان کا قصاص لینا چاہتے ہیں اس لئے یہی خلافت کے صحیح وارث ہیں۔مجمع میں بھگدڑ مچ گئی، ایک دوسرے پر الزامات لگائے جانے لگے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی جب اس سارے واقعہ کی اطلاع حضرت علیؓ کو پہنچی تو بہت مغموم ہوئے۔حضرت عمرو بن العاصؓ وہاں سے سیدھے دمشق پہنچے اور 658ء میں معاویہؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا اس طرح 658ء تا 661ء خلافت کے دو مرکز بن گئے، ایک کوفہ تھا اور دوسرا دمشق۔ یہ صورتِ حال حضرت علیؓ کے ساتھیوں کو منظور نہیں تھی۔ایک بار پھر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔تین سالوں تک حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان مختلف صوبوں کیلئے جنگ ہوتی رہی۔ مدینہ منورہ، مکۂ مکرمہ، جزیرہ، عنبر، مدائن، بدیا، وقوسا، طلبیہ، قنقطانہ، دومۃ الجندل اور تدمور پر قبضہ کے لئے دونوں کے درمیان لڑائیاں جاری رہیں۔ایسا لگتا ہے کہ آخر کار دونوں ہی تھک گئے اور 660ء میں صلح کا اعلان ہو گیا۔اس کے مطابق مکہ، مدینہ، عراق اور ایران اور مشرقی صوبہ جات حضرت علیؓ کی خلافتِ راشدہ کے ماتحت رہے۔حضرت معاویہؓ کے زیرِ نگراں شام و مصر رہ گئے۔

حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان بٹوارے کی یہ صورتِ حال ایک بار پھر اس تاریخی جغرافیائی وسیاسی سرحدوں کے عین مطابق تھی جس کے تحت دریائے فرات کے اس پار فارس کی حکومت تھی تو اس پار بازنطینی عملداری، آگے چل کر جب تاریخ کے اوراق پلٹے جائیں گے تو یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اکثر خلفاء وسلاطین ان سرحدوں کو اور مضبوط کرتے رہے۔ یہ بٹوارہ اس قدر سنگین رہا کہ ایران، وسط ایشیاء، ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا تاریخی تجربہ مختلف رہا تو شام، اردن، لبنان، مصر اور شمالی افریقہ کے مسلمانوں کا تاریخی تجربہ اس سے بالکل الگ رہا۔مصریوں اور شامیوں نے 750ء میں عباسیوں کے بر سر اقتدار آنے تک حضرت علیؓ کو خلیفۃ المسلمین تسلیم نہیں کیا۔اس کے برخلاف ایرانیوں اور ان سے متاثر مشرقی مسلمانوں کے لئے حضرت

علیؓ شیر خدا، ہمیشہ کیلئے نہ صرف خلیفۃ المسلمین بلکہ مرشد اعلیٰ و معلم بھی بنے رہے۔

خوارجی حضرت علیؓ سے الگ ہو کر خاموش بیٹھ نہیں گئے۔ انہوں نے قتل و غارت گری اور فسادوں کی سازش کا ایک جال سا بچھا دیا۔ حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو خانہ جنگیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے ان تینوں کے قتل کا عہد کیا۔ جب یہ حملے ہوئے تو قسمت کا کھیل یوں رہا کہ حضرت علیؓ کو شہید کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ حضرت معاویہؓ ان کے حملے سے بچ نکلے ان کو معمولی سا زخم آیا۔ جس دن عمرو بن العاصؓ پر حملہ ہونا تھا اس دن وہ نماز کیلئے نہیں آسکے ان کی جگہ ان کے نائب قتل کر دیئے گئے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق حکومت کرنے والے اور اسی سنت کے مطابق مسلمانوں کے معاشرتی نظام کو ڈھالنے کی کوشش کرنے والے خلفائے راشدین کی آخری کڑی حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی شہادت 20 رمضان 661ء میں ہوئی۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کی شہادت سے جو طوفان اٹھ کھڑا ہوا اس نے امت مسلمہ کے اتحاد کو بکھیر دیا۔ حضرت علیؓ نے اس طوفان زدہ سمندر میں مملکت اسلامیہ کے جہاز کو پار لگانے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں اپنی زندگی بھی قربان کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں کوفہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ لیکن واقعات کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مزار مبارک کے بارے میں کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ اس خیال سے کہ کہیں خارجی ان کے جسد خاکی کو تباہ نہ کر دیں انہیں گمنام جگہ دفنایا گیا ہے۔ یہ مقام کوفہ بھی ہوسکتا ہے یا صحراء کا کوئی مقام یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مدینہ منورہ لا کر بھی انہیں سپرد خاک کیا گیا ہو اس عظیم شخصیت کو تاریخ کا اس سے بڑا اخراج کیا ہوسکتا ہے۔ انہیں سب خلفیۃ المسلمین تسلیم کرتے ہیں چاہے وہ شیعہ ہو یا سنی، چاہے وہ زید ہو یا فاطمی۔ وہ تمام صوفیائے کرام کے محور کے قطب ہیں۔ وہ ایک بے مثال خطیب، ثابت قدمی کے مینار، انتہائی جری و بہادر، روحانیت کا ابلتا چشمہ تھے۔ کلاسیکی عربی قواعد انہی کی ایجاد ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ''میرے بھائی'' کہا انہیں ''علم کا دروازہ'' سے تشبیہ دی۔ ان کے فصاحت و بلاغت بھرے ارشادات ''نہج البلاغۃ'' میں یکجا کئے گئے ہیں۔ ان میں ایک آفاقی جاذبیت ہے۔ دنیا بھر کے لوگ ان کے دیوانے ہیں، اسلام کی تاریخ میں کسی دوسری شخصیت کو یہ مقام حاصل نہ ہوا۔

فوجی امراء کا دور

خلاصہ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں جو اتحاد و اتفاق پیدا کیا تھا وہ اتحاد خانہ جنگیوں کی وجہ سے پارہ پارہ ہو گیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کی خلافت کو للکارا اور ان کے ساتھ جنگ کی۔ یہ جنگ ایک تعطل کا شکار ہو کر رہ گئی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے خلافت پر اپنا حق جتایا۔ وہ ایک تجربہ کار سپاہی تھے۔ انہوں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سلطنت کی سرحدوں اور فوجوں کی جانب خصوصی توجہ مبذول کی۔ حضرت معاویہؓ نے خلافت کی شبیہ بدل دی۔ اسے مشورہ اور انتخابی اصولوں سے نکال کر خاندانی وراثت میں تبدیل کر دیا۔ ان کے انتقال کے بعد انکا بیٹا یزید تخت نشین ہوا اور اس نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کے بیٹے حضرت امام حسینؓ سے بیعت طلب کی۔ جب اس کا جواب انکار کی صورت میں ملا تو حضرت امام حسینؓ کے ساتھ ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل کے کئی اور افراد کو بھی انتہائی بے دردی سے کربلا میں شہید کر دیا۔ کربلا کے سانحہ نے شیعہ سنی پھوٹ کو اور سخت کیا۔ اور اسلام کے سیاسی نظام میں شہادت کی نئی مثال قائم ہو گئی۔ اس اندرونی بھونچال سے بے نیاز اسلامی افواج کی کامیابی اور کامرانی کے قدم آگے بڑھتے ہی گئے۔ یہاں تک کے شمالی افریقہ، اسپین کو روندتے ہوئے اسلامی افواج فرانس کے قلب تک پہنچ گئیں۔ ادھر مشرق میں انہوں نے ملتان وسندھ کو فتح کر لیا اور چین کے تانگ شہنشاہی افواج کو ژلاس کے میدانِ جنگ میں شکست فاش دے دی۔ جیسے جیسے سلطنت کی سرحدیں وسیع ہوئی گئیں ویسے ویسے سرکار کے ایوانوں میں بگاڑ آتا گیا۔ حکومت کرنے والے عوام سے دور ہو گئے۔ ایران اور مصر کے نو مسلموں پر جو نئے محصول عائد کئے گئے وہ انصاف سے دور اور ظالمانہ تھے۔ سیاست میں پھیلے اس فساد کو دور کرنے اور اسے اسلام کی روح سے قریب کرنے کی وہ کوششیں جو خلیفہ حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے کیں وہ دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ اس سنگدلانہ گراوٹ نے سیاسی ہلچل کو جنم دیا۔ یہ سیاسی اتھل پتھل 750ء میں ایک انقلاب کا باعث بنی۔ جب عباسیوں نے بنی امیہ کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا تو اس کے بعد خلافت دمشق سے بغداد منتقل ہو گئی۔

چوتھا باب

حضرت معاویہؓ پہلے فوجی امیر

''میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں، ان کی اقتداء کرو، ہدایت پر ہوگے''۔ حدیث نبوی ﷺ۔
اس حدیث کے مطابق صحابہ کرامؓ کی اقتداء پر ہمارا ایمان ہے، ہم نے یہاں صرف ان واقعات پر تاریخی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے جو کہ اسلامی تاریخ کا ایک حصہ ہیں اور ہم تاریخ کے اس حصہ میں صحابہؓ کرام کے درمیان ''حکم'' نہیں ہیں۔

خانہ جنگیوں نے اسلامی تاریخ میں ایک خطِ فاضل قائم کر دیا۔ خلفائے راشدینؓ کا دور ختم ہو گیا۔ شیعہ سنی تفرقہ نے سر اٹھایا۔ یہ وہ زبردست حدِ فاضل ہے جو اسلامی تاریخ کے دھارے کو ابتداء سے لے کر اب تک تقسیم کرتی آ رہی ہے۔ ایران اور شام کے درمیان کی سرحدیں دریائے فرات سے مضبوط ہو گئیں۔ دریائے فرات سے لگی سرحدیں اور گہری ہو گئیں۔ یہاں ہونے والی شورشوں نے خارجی فرقہ اور اس سے وابستہ انتہا پسندی کو جنم دیا۔ انہی وجوہات کی بناء پر مسلم مؤرخوں نے خانہ جنگیوں کو فتنہ الکبیر قرار دیا۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ کی شہادت کے ساتھ ہی اسلامی تاریخ میں عقیدے کے باب پر پردہ پڑ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جس میں صرف اور صرف توحید کو ہی بالا دستی حاصل تھی۔ اسی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرنے کی سعی وجد و جہد کی۔ ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چالیس سال تک کا جو زرین زمانہ تھا۔ ایسا سنہرا زمانہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی اور کہیں نہیں گذرا تھا۔ اس مختصر عہد میں اللہ تعالیٰ کے مطلق العنان اور اعلیٰ و ارفع ترین فرمان کے مطابق اور اسی کی روشنی میں عقیدہ سپاہی کی تلوار کی دھار پر اور

بیوپاری کی دولت پر فرمان روا رہا۔ مدینہ منورہ تاریخ کی عظیم ترین سلطنت کا پایہ تخت تھا۔لیکن اس سلطنت کے حاکم درویشوں کی طرح ،فقیروں کی طرح زمین پر چلتے بستے اور زندگی گذارتے تھے،ان کے دل میں خوفِ خدا موجزن تھا اور وہ ہر لمحہ آخرت کے خوف سے لرزتے رہتے تھے۔

جیسے جیسے اسلام کی روشنی ایشیاء اور افریقہ کے وسیع وعریض علاقوں میں پھیلتی گئی ویسے ہی اسی شدت کے ساتھ اسکا مقابلہ دولت کی حرص اور اس سے ابھرتے ہوئے اندھیروں کے ساتھ پیش آتا گیا۔صدیوں پر محیط ایرانی شہنشاہیت نے اپنے خزانوں کو مال و دولت ،سونا چاندی ہیرے جواہرات سے لبریز کردیا تھا، اس دولت کی ترغیب وتحریص سے مسلمان بھی اپنا دامن بچا نہ سکے۔عقیدے کی سچائی اور دولت کی تحریص کے درمیان یہ کشمکش حضرت عثمانؓ کے دور میں شروع ہوئی جس نے ان کی خلافت کا خاتمہ کردیا۔حضرت علیؓ حرص واقتدار پرستی کے خلاف انتہائی بہادری سے لڑتے رہے۔دنیا پرستی کے ان شعلوں کو بجھانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس آگ کے شعلوں نے انہیں زیادہ دیر جینے نہیں دیا۔اسی راکھ سے بنوامیہ کی خاندانی حکومت نے جنم لیا۔

حضرت امیر معاویہؓ اسلامی تاریخ کے پہلے فوجی بادشاہ ہیں۔انہی کے زیرنگیں اسلامی سیاسی نظام میں خاندانی بادشاہیت نے جنم لیا۔ان کی قائم کردہ شہنشاہیت کا یہ طریقۂ کار مسلمانوں میں اٹھاویں صدی تک جاری رہا۔آخرکار یوروپ کے بیوپاری قوموں کے ہاتھوں سپاہیانہ بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔

حضرت امیر معاویہؓ اعلیٰ درجہ کے سپاہی، زیرک سیاستدان اور اچھے منتظم تھے۔انہوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ اس طریقہ سے جنگ کی کہ آخرکار وہ جنگ تعطل کا شکار ہوگئی۔پھر انہوں نے 658ء میں اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کردیا۔جب 661ء میں حضرت علیؓ کی شہادت ہوگئی تو امیر معاویہؓ نے مکہ، مدینہ اور عراق پر حملہ کی تیاریاں کیں۔اس دوران حضرت حسن بن علیؓ کو کوفہ میں خلیفۃ المسلمین چن لیا گیا۔وہ بارہ ہزار عراقی افواج کے ساتھ حضرت امیر معاویہؓ کا مقابلہ کرنے کیلئے آگے بڑھے۔لیکن عراقی بے وفا نکلے، جنگ سے پہلے ہی انہوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔مدائن کے مقام پر دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔اس کے تحت حضرت حسنؓ، حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوگئے۔انہیں سالانہ دولاکھ دینار وظیفہ دینا طے

پایا۔حضرت حسنؓ مدینہ آ کر گوشہ نشیں ہو گئے۔ایک عظیم استاذ اور امام کی حیثیت سے زندگی شروع کر دی۔اس کنارہ کشی سے خانہ جنگیوں کے اس پہلے باب کا خاتمہ ہوا جس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ہوئی تھی۔ حضرت معاویہؓ کو اسکا یہ فائدہ حاصل ہوا کہ عالم اسلام پر ان کی حکومت مضبوط ہو گئی۔

مدائن کے اس معاہدہ کی وجہ سے اقتدار کی منتقلی بنو ہاشم سے بنو امیہ کو ہو گئی جو کہ قریش کی ایک ذیلی شاخ ہے۔اسلام کے آنے سے پہلے بنو ہاشم کعبہ کے متولی ہوا کرتے تھے تو بنو امیہ دولت مند تاجر ہوا کرتے تھے مکہ کے دفاع کی ذمہ داری انہی کی ہوا کرتی تھی۔جدید زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے بنو ہاشم امام، عالم اور متولیان تھے تو بنو ہاشم تاجر اور سپاہی۔

ابتداء میں بنو امیہ کے سرکردہ لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے کٹر مخالفین میں سے تھے۔ اس کی ایک مثال کے طور پر ابو سفیان کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ اول تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمن تھے لیکن انہوں نے 638ء میں فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا۔یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قبائل کو اسلام کی روشنی سے منور کر کے انہیں شیر و شکر کر دیا، انہیں یکجا و متحد کر دیا، یہ نیا اتحاد حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت تک قائم رہا۔لیکن حضرت عثمانؓ جن کا تعلق بنو امیہ سے تھا، ان کی خلافت کے دوران یہ پرانی کشمکش پھر سے جاگ اٹھی۔جیسا کہ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں۔بنو امیہ کے کچھ افراد نے حضرت عثمانؓ کی خدا ترسی اور خاموش طبیعت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور انتہائی دولت مند بن گئے۔حالات کی اس کروٹ سے مخالفین کو حضرت عثمانؓ پر اقرباء نوازی کا بہتان لگانے کا موقع فراہم کر دیا۔آخر کار یہ آپؓ کی شہادت کا سبب بن گیا۔جب حضرت علیؓ خلیفہ چنے گئے تو حضرت معاویہؓ نے جو کہ اموی تھے۔خلافت کی بیعت سے پہلے حضرت عثمانؓ کا قصاص طلب کیا۔حضرت علیؓ سیاسی حالات کی بناء پر اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ فوری طور پر قصاص لے سکتے۔حضرت معاویہؓ نے ان حالات کا فوری فائدہ اٹھایا۔شامیوں کے جذبات کو بھڑکایا اور حضرت علیؓ کے خلاف جنگ کیلئے ابھار دیا جس کا انجام جنگ صفین کی شکل میں ظاہر ہوا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔انسانوں کے اندر ودیعت کردہ قبیلہ پرستی، قوم پروری اور نسلی تفاخر کے جذبات وقت کے ساتھ ساتھ بار بار سر اٹھاتے ہی رہتے ہیں۔بنو امیہ اسلام سے پہلے سپاہی اور

سوداگر تھے۔ انھوں نے ایران سے حاصل کردہ دولت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کے برعکس بنو ہاشم مسلمانوں کواسلام کی اس منزل کی طرف لے جانے میں لگے رہے جس کا راستہ آرام پرستی سے دور ہے بالکل سیدھا سادھا اور درویشانہ ہے۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ جنکا تعلق اموی قبیلہ سے تھا۔ عبادت گذار، زاہد، شرمیلے اور خاموش طبع انسان تھے۔ ان کی اس خداترسی کا لوگوں نے غلط فائدہ اٹھایا دولت کی طاقت نے اپنا اثر دکھایا۔ وہ لوگ جو اپنے اقتدار کے ذریعہ اس دولت سے فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔ یعنی تاجر وسپاہی پیشہ امویوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ جب کہ بنو ہاشم کے فرد حضرت علیؓ نے تاریخ کے دھارے کو ایک بار پھر اسلام کے اسی سچے عبادت گذار توحید پرست منزل کی طرف موڑنا چاہا، عقیدت اور حرص وہوس کے درمیان ٹکر ہوئی، خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں۔ ان جنگوں میں ایک طرف بنو ہاشم تھے تو دوسری جانب بنوامیہ، خانہ جنگی کے پہلے دور میں تاجر سپاہیوں کی جیت ہوئی۔ حاکم اعلیٰ کے برتر ترین اصولوں سے مزین عقیدہ سے لوگ بھٹک گئے۔ ایک دور کا خاتمہ ہوا۔ ایک اور نئے دور کی ابتداء ہوئی۔

خانہ جنگیوں نے خارجیوں کو جنم دیا۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدظنی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت علیؓ کا ساتھ اسوقت چھوڑ دیا۔ جب کہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ ثالثی کے لئے منظوری دے دی۔ ان خارجیوں نے بظاہر جمہوری اظہار رائے کا نظریہ اپنایا لیکن بہ باطن یہ انتہاء پسند تھے، انہوں نے اپنے اس باطل نظریہ کو صحیح قرار دینے کی کوشش کہ کہ حضرت علیؓ نے اپنے ایمان کا سودا کیا تھا۔ (نعوذ باللہ) خارجیوں نے اس نقطہ نظر کو بھی اپنایا کہ خلافت پر صرف اہل قریش کا ہی حق نہیں بلکہ ہر وہ مسلمان اس پر اپنا دعویٰ پیش کرسکتا ہے جو اسکا اہل ہو۔ اپنے اس نظریہ کو عوام پر لادنے کے لئے انہوں نے دہشت گردی کا راستہ اپنایا۔ قتل وغارت گری کا ایک طوفان مچادیا، بے رحمانہ طریقہ سے لوٹ مار کی، کوئی فرق کئے بغیر ان گنت معصوم مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے ہی ان کے خلاف جنگ کی۔ ہر بار یہ خارجی شکست کھاتے رہے۔ لیکن پھر ابھرتے رہے، اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ یہ منحرف اور ضدی گروپ پانچ سو سال تک بار بار سر اٹھاتا رہا۔ آخر کار چودھویں صدی عیسوی میں انہوں نے دہشت پسندی کو چھوڑ دیا اور شمالی افریقہ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ مشہور مؤرخ

ابن بطوطہ نے 1330ء سے 1334ء تک اس علاقہ کا سفر کیا تھا۔ اس نے اور دوسرے مشہور مؤرخوں نے انہیں (Ibadis) ''عبادی'' کا نام دیا۔ یہ لوگ نعت گو کی حیثیت سے بہت ہی معروف ومقبول تھے۔

خانہ جنگیوں کی وجہ سے اسلامی افواج کی کامرانیوں کی دھما کہ خیز رفتار رک سی گئی۔ جب یہ خانہ جنگیاں تھم گئیں تو یہ رفتار ایک بار پھر تیز ہوگئی۔ مہلب بن ابی صفرہؓ نے برصغیر کے مغربی علاقوں یعنی جدید پاکستان کے سرحدی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ سعید بن عثمانؓ نے وسط ایشیاء میں بخارا وسمرقند پر نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ عقبہ بن نفیؓ کی سرکردگی میں اسلامی افواج شمالی افریقہ کو روندتی ہوئی براعظم کے دوسرے کنارے سے ٹکرانے والے بحر اقیانوس تک پہنچ گئیں۔ یہی وہ مشہور فاتح جنرل ہیں جنہوں نے فتح کے قدم رک جانے سے جھنجلا کر سمندر میں اپنے گھوڑوں کو ڈال دیا۔ پھر راہ نہ پا کر واپس ہوئے اور کہا، ''یا اللہ اگر یہ سمندر راہ میں حائل نہ ہوتا تو میں زمین کی آخری حد تک فتح کے جھنڈے گاڑ دیتا۔ صرف اور صرف اسے لئے کہ ہر طرف تیرا ہی نام سر بلند ہو۔ یہ الفاظ اس دور کے مسلمانوں کے جوش ایمانی کا ایک مکمل اظہار خیال ہے۔ جس سے سرشار ہوکر انہوں نے کامرانی ونصرت کے علم سر بلند کر دیئے۔ وہ عقیدہ جس سے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مقصود تھی۔ وہی جذبہ، وہی ایمانی قوت، اسلامی افواج کو سبک رفتاری عطا کرتی رہی۔ فتح مندیاں بخشتی رہی۔ اسلام یہ درس دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ لیکن اسے صرف اسی خالق کے آگے سجدہ ریز ہونا ہے کسی اور کے سامنے نہیں، قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے جو جدوجہد کی تھی اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ دنیا میں ایک صالح نظام قائم کرنا جہاں لوگ صرف خدائے بزرگ وبرتر کے حمد گائیں۔ غیر اللہ، جھوٹے خداؤں، خدا ہونے کا دعویٰ کرنے والے ظالموں کی غلامی سے انسانیت کو آزاد کرانا، انکا عین مقصد حیات تھا۔

حضرت امیر معاویہؓ کا یادگار کارنامہ ہے۔ طاقتور بحری بیڑہ کا قیام تاکہ مشرقی بحیرۂ روم پر بازنطینی افواج کے شکنجہ کو ختم کیا جا سکے۔ یہ بحری بیڑہ جب تیار ہوگیا تو حضرت جندب بن ابی امیہؓ کو امیر البحر مقرر کیا گیا۔ اڈمیرل کا انگریزی لفظ اسی امیر البحر سے ماخوذ ہے۔ 671ء میں روڈ ہس اور دوسرے جزائر پر اسلامی بحری افواج نے قبضہ کرلیا۔ بازنطینی شہنشاہیت کے صدر مقام قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ بازنطینی دفاع کافی مضبوط تھا۔ یونانی کیمیائی ہتھیار ''نافتھا'' (یونانی آگ) میں

ماہر تھے۔ یہ ''نافتھا'' موجودہ دور کا ''ناپام بم'' بنا۔محاصرہ طول پکڑتا گیا۔اسلامی بحری بیڑہ میں قئے دست کی وباء پھیل گئی۔مسلمانوں کو یہ محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہونا پڑا۔اسی محاصرہ کے دوران صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاریؓ کی شہادت ہوئی۔قسطنطنیہ کے قلعہ سے قریبی پل کے پاس انہیں دفنایا گیا۔ترکی کے جدید استنبول شہر کے اندر واقع حضرت ابوایوب انصاریؓ کا عظیم الشان مقبرہ اس خوبصورت شہر کی اہم ترین یادگاروں میں سے ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ بنیادی طور پر ایک سپاہی تھے۔انہوں نے افواج کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی۔انہوں نے فوجی ٹکنالوجی کے بارے میں تحقیقات اور ایجادات کی حوصلہ افزائی کی۔حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں ہی مسلمانوں نے منجنیق ایجاد کی جس کے ذریعہ دشمن کے قلعوں پر بھاری پتھروں کی برسات کی جاتی تھی۔انہوں نے افواج کی جدید کاری کی۔خصوصی صحرائی دستے قائم کیئے۔ برفانی راستوں پر حملے کرنے کے لئے خصوصی فوج ترتیب دی۔نئے قلعے تعمیر کروائے۔حضرت معاویہؓ اولین مسلمان امیر ہیں جنہوں نے عربی نقش کے ساتھ سب سے پہلے سکہ ڈھالا اور اسے رائج کیا۔ بازنطینی اور فارسی سکہ کے چلن کا خاتمہ کیا۔اس طرح اسلامی حکومت کی بالادستی کا جھنڈا بلند کیا۔مغرب میں قیروان شہر کی بنیاد رکھی۔نظام حکومت کی دستاویزی قلمبندی کی اس ریکارڈ کے باقاعدہ اصول مرتب کیئے۔ پرانی نہروں کی پھر سے کھدوائی کی گئی۔نئی نہریں تعمیر کی گئیں۔شُرطہ یعنی پولیس فورس کو مضبوط کیا گیا۔ ڈاک کا نظام جسے حضرت عمرؓ نے فوج کیلئے رائج کیا تھا۔اسے پہلی بار عوام کے لئے رائج کیا گیا۔

حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ آپؓ سے کاتب قرآن کی خدمات لی تھی۔اس حیثیت سے تمام مسلمان ان کی بے انتہاء عزت کرتے ہیں۔تاریخ میں ان کے رول کے متعلق اختلافات تو نظر آتے ہیں۔لیکن ان کے کارنامے یقیناً قابل لحاظ ہیں۔یہ ایک ایسے امیر کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں جن کے دور میں حضرت علیؓ پر برسر عام دشنام طرازی ہوتی رہی اور یہ اسے نظر انداز کرتے رہے۔اس روایت کو پچاس سال بعد 719ء میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں ختم کیا گیا۔سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے ظالم بیٹے یزید کو اسلامی تاریخ پر زبردستی نافذ کیا۔

پانچواں باب

کربلا، عقیدے کے دور کی آخری سانس

مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، زبان، شاعری پر جس قدر اثر کربلا کے سانحہ نے ڈالا ہے شاید ہی تاریخ کے کسی اور واقعہ نے اتنا اثر چھوڑا ہو۔ اردو اور سواحلی زبانیں جو اس المناک سانحہ کے ایک ہزار سال بعد پیدا ہوئیں ان زبانوں میں بھی اس کا تذکرہ یوں ہوتا ہے کہ جیسے موجودہ عوام نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہو۔ کربلا سے بہت دوری پر واقع کوالالمپور کی سڑکوں پر کام کرنے والا مزدور بھی بلاواسطہ طور پر ہی ان واقعات کے بارے میں اسی شدت غم کا اظہار کرتا ہے جتنا کہ لاہور کا ایک قوال یا شکاگو کا کوئی پروفیسر۔ کربلا کیا ہے بیک وقت وہی فعل ہے، وہی فاعل ہے اور وہی مفعول، اصل بات تو یہ ہے کہ کربلا اسلامی تاریخ میں قربانی وشہادت کا ایک اعلیٰ ترین پیمانہ ہے، ایک مرکزی محور ہے جس کے چاروں طرف مسلمانوں کے اپنے داخلی بحث مباحثے ومناظرے گھومتے ہیں۔

تاریخی حیثیت سے کربلا کا سانحہ دورِ عقیدت کی آخری ہچکی ہے۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ کی شہادت تک آنحضورﷺ کی خلافت کا مسئلہ آپسی مشورہ سے ہی طے ہوتا تھا۔ خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنی آخری وصیت کے ذریعہ چھ جید صحابۂ کرام کی مجلس مشاورت نامزد کی تھی تاکہ ان کے جانشیں کا انتخاب کیا جا سکے۔ ان صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خاندانی بادشاہت کے خطرات کا اچھی طرح احساس تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے۔ رائے اور مشورہ سے طے پانے والی خلافت ہی بہترین حکومت دے سکتی ہے۔ ان کا وہ زمانہ عقیدہ کا زمانہ تھا۔ چاروں خلفائے راشدین نے ایک صالح سماج کے لئے جدوجہد کی جس

میں حلال کی بالاتری اور حرام سے اجتناب ہو، اللہ کی ذات پر ایمان ہو۔ اس جدوجہد کے دوران انہوں نے اس بات کا انتہائی خیال رکھا کہ انکے اعلیٰ منصب سے اپنے خاندان کا کوئی فرد ناجائز فائدہ اٹھا نہ سکے۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نے اس طرز عمل کو بدل ڈالا، مغیرہ بن شعبہؓ کے مشورہ پر انہوں نے اپنے بڑے بیٹے یزید کو جانشین مقرر کر دیا۔ یہ فیصلہ بھی تاریخ کے اقدار کو ناپنے کا ایک پیمانہ ہے۔ صلاح ومشورہ سے جو حکومت قائم ہوتی ہے وہ عوام کو جوابدہ ہوتی ہے۔ بزورِ طاقت جو بادشاہ بن جاتے ہیں وہ کسی کو جوابدہ نہیں ہوتے۔ یزید کی جانشینی نے اسلام کے اس بنیادی جوابدہی یا جمہوریت کے تصور کو برباد کر دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسے دور کا آغاز ہو گیا جس کے تحت آگے چل کر یا تو شہنشاہ پیدا ہوئے یا سلاطین جن میں کچھ اچھے تھے بقیہ جابر اور مطلق العنان بادشاہ تھے، کچھ بادشاہوں نے اپنے آپ کو خود خلیفہ ہونے کا اعلان کیا اور چند ایک نے خلافت کے تصور کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ اپنی بیٹیوں کی شادیاں انتہائی شان وشوکت کے ساتھ کرتے رہے۔ انہیں تحائف کے طور پر خزانے بخشتے رہے۔ ان تمام کی حکومت سپاہیانہ طرز کی تھی وہ حکومت جو توحید کے اعلیٰ ترین تصور کے ساتھ قائم تھی اس کے ساتھ عوامی جوابدہی کا جو سلسلہ جاری تھا وہ سلسلہ تو حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ ختم ہو گیا۔

حضرت علیؓ اور حضرت حسن بن علیؓ کے زیر خلافت جو علاقے تھے اُن پر اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو قائم کرنے میں حضرت امیر معاویہؓ نے دیر نہیں کی۔ یزید نے اپنی پولیس فورس کا شکنجہ عراقیوں پر انتہائی بے دردی سے کس دیا، جسکی وجہ سے عراقیوں کے سامنے یزید کے آگے سر جھکانے کے سوا اور کوئی راستہ نہ رہ گیا۔ صوبۂ حجاز جو کہ جدید سعودی عرب میں شامل ہے اور جس کے تحت مکہ اور مدینہ آتے ہیں اس کی حالت بالکل الگ تھی۔ حضرت حسین بن علیؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ جیسی جید اور مانی ہوئی معزز شخصیات نے خاندانی حکومت کی مخالفت کی، اس لئے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف تھی اور خلفائے راشدین نے جو مثال چھوڑی تھی اس کے بالکل برعکس تھی ان ذی حیثیت شخصیتوں کو مطمئن کرنے کیلئے خود حضرت امیر معاویہؓ نے مدینہ منورہ کا سفر کیا ان کے درمیان خیالات کا تبادلۂ بھی ہوا لیکن ان کے ذہنوں اور خیالات کے درمیان دوری باقی رہی۔ اس اجلاس میں ہونے والی گفتگو کے برخلاف باہر آ کر حضرت امیر معاویہؓ نے یہ اعلان کر دیا کہ

پانچوں شخصیتیں یزید کے ہاتھ بیعت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ترابی اور ابن اسیر کے مطابق حضرت امیر معاویہؓ کے امراء نے دھمکی بھی دی کہ بیعت کروانے کیلئے طاقت کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔اس دھمکی سے خوف کھا کر عوام نے ان کی بات مان لی، اس کے بعد آگے چل کر پتہ چلا کہ ان پانچوں معزز شخصیات نے بیعت کیلئے ہاں نہیں کی تھی ان کے بارے میں صرف افواہ اڑائی گئی تھی۔

اس کے فوراً بعد 692ء میں حضرت امیر معاویہؓ کا انتقال ہوگیا اس وقت ان کی عمر 78 سال تھی۔ یزید بنوامیہ کے تخت پر بیٹھ گیا۔یزید نے جو اولین احکامات جاری کئے اس کے تحت مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ کو یہ حکم دیا کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کی بیعت حاصل کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جائے۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو یہ احساس ہوگیا کہ ان کی جان کو خطرہ ہے تو انہوں نے رات کے اندھیرے میں مدینہ کو خیرآباد کہا وہ سیدھے مکہّ پہنچے اور کعبۃ اللہ میں پناہ گزین ہوگئے۔ان کا خیال تھا کہ یہاں وہ یزید کی فوجوں سے محفوظ ہیں-حضرت حسین بن علیؓ اپنے سوتیلے بھائی حضرت محمد بن حنفیہؒ سے مشورہ کیا اور وہ بھی مکہّ کی جانب چل پڑے-

وہ صحابۂ رسولؐ اور مسلمان جو یہ سمجھتے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ان کی جانشینی کا حق صرف حضرت علیؓ کو ہے وہ شیعانِ علیؓ کہلائے یعنی حضرت علیؓ کے چاہنے والے یہی شیعہ لفظ کا ماخذ ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ سنّی کا استعمال بعد میں شروع ہوا۔ابن کثیرؒ اور ابن خلدون کے مطابق یہ صحابۂ کرامؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ نامزد کئے جانے پر مطمئن نہیں تھے لیکن امت کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا اور ان کے ماتحت کام بھی کیا۔جب حضرت حسنؓ حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے تو شیعانِ علیؓ کہلانے والے اکثر افراد سیاست سے کنارہ کش ہوگئے۔انہوں نے ایک ایسے سیاسی نظام سے خاموش سمجھوتہ کرلیا جو ہمیشہ ان کے لئے مخالفانہ اور معاندانہ رہا۔انہوں نے حضرت علیؓ اور ان کے آل کی روحانی خلافت کو تسلیم کرلیا۔

حضرت علیؓ کا دارالخلافہ کوفہ تھا وہاں شیعانِ علیؓ کی کافی تعداد تھی حضرت حسین بن علیؓ کو کوفہ کی سرکردہ ہستیوں کی جانب سے بے شمار خطوط آنے لگے۔انہیں بااصرار عراق آنے کی دعوت دی گئی اور اہلِ کوفہ کی

طرف سے ان کی خلافت کے لئے بیعت قبول کرنے پر بار بار اصرار کیا گیا۔ابتدائی قدم کے طور پر حضرت حسینؓ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا تا کہ حقیقت کا پتہ لگ سکے۔مسلم بن عقیلؓ کوفہ پہنچے اور اپنے چاہنے والے حضرت ہانیؒ کے گھر قیام کیا۔ یہاں حضرت حسینؓ کے چاہنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت مسلمؓ نے حضرت حسینؓ کو کوفہ چلے آنے کا پیغام بھیجا۔

ادھر یزید نے عبیداللہ بن زیاد کو جسے عموماً ابن زیاد اور کربلا کے قصائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کوفہ روانہ کیا اسے یہ ہدایت دی گئی کہ مسلم بن عقیلؓ کو گرفتار کرے اور وہاں ابھرنے والی بغاوت کچل کر رکھ دے۔ابن زیاد نے کوفہ پہنچتے ہی یہ اعلان کر دیا جو یزید کا ساتھ دے گا اسے انعامات سے نوازا جائے گا اور جو اس کا ساتھ نہیں دے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔حرص اور جان کے خوف سے اس کی چال میں آئے کوفہ والوں نے حضرت مسلمؓ سے منہ موڑ لیا۔ابن زیاد کی فوج نے اُن پر حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ حضرت مسلمؓ نے شہادت پانے سے پہلے حضرت حسینؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ کوفہ میں حالات بدل چکے ہیں اور انہیں اس طرف ہجرت نہیں کرنی چاہئے۔اس وقت تک ابن زیاد کی افواج نے حضرت حسینؓ اور ان کے طرفداروں کے درمیان خط و کتابت کو ختم کر دیا۔اس طرح دوسرا خط حضرت حسینؓ تک نہیں پہنچ پایا۔

کوفہ کے اصلی حالات سے بے خبر 680ء میں حضرت حسینؓ اپنے طرفداروں اور چاہنے والوں کے ساتھ مکہ سے کوفہ کی جانب چل دیئے۔راستے میں انہیں حضرت مسلمؓ کی شہادت کی خبر ملی۔ابن کثیرؒ کے مطابق حضرت حسینؓ یہاں سے واپس جانا چاہتے تھے لیکن حضرت مسلمؓ کے بھائیوں نے قصاص لینے کا مطالبہ کیا اور یوں کوفہ کی جانب چل پڑے انہوں نے اپنے رفقاء کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ جو واپس جانا چاہتے ہیں وہ چلے جائیں۔اب ان کے ساتھ چند جان نثار اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے افراد ہی رہ گئے۔بقیہ ان کے ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے۔

حالات سے بے نیاز حضرت حسین بن علیؓ کا یہ قافلہ آگے بڑھتا گیا آخرکار دریائے فرات کے کنارے کربلا کے مقام پر عمرو بن سعد کے افواج نے ان کا راستہ روک دیا۔آپؓ نے پڑاؤ ڈال دیا، دونوں کے درمیان بات چیت ہوئی۔عمرو بن سعد نے کوفہ میں ابن زیاد کو تمام حالات سے واقف کروایا۔ لیکن ابن زیاد حضرت حسینؓ کی جانب سے یزید کی مکمل فرماں برداری اور بیعت سے کم کسی بھی بات پر

راضی نہ ہوا۔عمرو بن سعد کو حضرت حسینؓ پر حملہ کرنے سے ہچکچاتے ہوئے دیکھ کر ابن زیاد نے اسے واپس بلالیا اس کی جگہ شمّر ذی الجوشن کا تقرر کیا۔شمر ایک بد اخلاق اور ظالم شخص تھا اُس نے حسینی خیموں کا محاصرہ کرلیا اور پانی کی فراہمی بند کردی آخری معرکہ (10) دس محرم کو پیش آیا۔

محرم اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے یہاں محرم اور دسویں تاریخ کا خصوصیت کے ساتھ اس لئے تذکرہ کیا گیا ہے کہ آگے چل کر اسلامی تاریخ میں اس مہینہ اور دن نے انتہائی اہمیت حاصل کرلی۔حضرت حسینؓ اللہ کے سپاہی تھے انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہونٹوں سے جام نوش فرمایا تھا، وہ یزید کے ظلم اور بربریت کی طاقت کے سامنے کیسے جھکتے۔انہوں نے اپنے بہتر (۷۲) ساتھیوں کی صف بندی کی اور باطل کی طاقتوں پر ٹوٹ پڑے، ایک ایک ساتھی دیوانہ وار فدا ہوتا گیا اور ان کے مبارک جسموں کو بداندیش ٹکڑے ٹکڑے کرتے گئے، آخر کار نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کا سر قلم کر کے کوفہ بھیجا گیا جہاں ابن زیاد نے آپ کے سر مبارک کی انتہائی ظالمانہ اور بدبختانہ بے حرمتی کی اور کوفہ کی گلیوں میں نمائش کی، اس جنگ سے بچنے والے حضرت حسینؓ کے قافلہ کے عورتوں اور بچوں کو ان کے چاہنے والوں نے بحفاظت مدینہ واپس بھیج دیا۔یہ المناک واقعہ 680ء میں پیش آیا۔

حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کو یاد کر کے ان کے مبارک جسم سے بہنے والے ایک ایک قطرۂ خون کو یاد کر کے مسلمانوں نے جتنے آنسو بہائے ہیں اتنے آنسو اسلامی تاریخ میں کسی اور شہید کیلئے نہیں بہائے گئے۔حضرت حسینؓ کی شہادت بے لوث جدوجہد اور اعلیٰ ترین قربانی کی سب سے بہترین مثال ہے۔ صدیوں سے حضرت حسین بن علیؓ کا نام لے کر نسل در نسل لوگ اٹھتے رہے۔انصاف کا جھنڈا بلند کرتے رہے، ظلم کے خلاف لڑتے رہے کچھ مسلمانوں کے لئے یہ شہادت اسلام کا تاریخ ساز لمحہ ہے۔ ایک طرف حضرت حسینؓ تھے، انصاف اور عقیدے کے علمبردار دوسری طرف ظلم اور سیاسی دباؤ تھا، آپ بربریت کی تیز تلوار کے سامنے ایمان کا اٹل پہاڑ بن کر کھڑے رہے۔

قرآن کا درس ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔لیکن اسے صرف اور صرف اس ذاتِ واحد کے سامنے سر جھکانا ہے جو تنہا اور یکتا ہے۔حضرت حسینؓ اس کی زندہ اور تابندہ مثال ہیں۔اللہ تعالیٰ نے تمام عورتوں اور مردوں کو ایک امانت کے طور پر آزادی عطا کی ہے۔اس آزادی کو کسی فنا ہونے والے ظالم

کے سامنے قربان نہیں کرنا ہے۔

کربلا نے جدوجہد کو نئے معنی دیئے، انتہائی نامساعد حالات میں بھی انسان کو چاہئے کہ وہ صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرے۔ اس باقی رہنے والی ہمیشہ کی زندگی کو حاصل کرنے کیلئے اس اعلیٰ ترین جدوجہد کی راہ میں، دنیاوی عیش وآرام اور تحفظ کو تج دینا ضروری ہوتا ہے۔

حسینؓ نے اس جدوجہد کی راہ سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی منہ نہیں موڑا۔ حالانکہ ان کے وہی ساتھی جنہوں نے ان کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا وہ سب ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑتے گئے، لیکن انتہائی سنگین اور خطرناک حالات میں بھی انہوںؓ نے باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

تاریخ انتہائی حاسد اور ظالم ہوتی ہے، ہمیشہ سے وہ قربانی مانگتی رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً یہ تاریخ ایمان کے متوالوں سے اعلیٰ ترین قربانیاں حاصل کرتی رہی ہے۔ تاکہ ایمان کی حرارت بار بار تازہ ہوتی رہے۔ حسین بن علیؓ کی شہادت سے اسلام کو قربانی کی اس راہ میں ابدیت حاصل ہوگئی۔ حالانکہ ظاہری طور پر تلوار کی جیت ہوئی۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ باطنی طور پر ایمان کو ابدی فتح حاصل ہوئی۔

کربلا سے پہلے شیعانِ علیؓ ایک مذہبی تحریک تھی۔ کربلا کے بعد یہ تحریک مذہب کے ساتھ ساتھ سیاسی رنگ میں بھی ڈوب گئی جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں کربلا کی یہ گونج بار بار سنائی دیتی ہے اور ایک فعّال تحریک کی شکل میں نہ صرف تاریخ کے صفحات پر بکھری ہوتی ہے بلکہ آج اس دور میں بھی ایک مخصوص رخ کی طرف اس کا بہاؤ جاری ہے۔

حضرت حسینؓ کی شہادت وہ عظیم سانحہ تھا اور اس کے اثرات اس قدر زیادہ تھے کہ خود یزید نے بھی آگے چل کر اس المناک واقعہ سے اپنے آپ کو دور کرنے کی بھی کوششیں کی۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ جب یزید کو کربلا کے غمگین واقعات کا علم ہوا تو وہ بے اختیار رو پڑا اور ابن زیاد کی زیادتیوں پر لعنت بھیجنے لگا۔ لیکن جب ہم یزید کے کل حالات اور اس کے کرتوتوں پر غور کرتے ہیں تو یہ صاف احساس ہو جاتا ہے کہ یہ آنسو صرف اور صرف مگرمچھ کے آنسو تھے۔

چھٹا باب

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ احیائے اسلام کے پہلے امیر

اسلام، اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل طور سے اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ یہ ایک ازلی وابدی فلسفۂ حیات ہے۔ مسلمان اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اسلام ہی وہ اولین مذہب ہے جو بنی نوع انسان کے لئے نازل ہوا۔ یہی وہ مذہب ہے جو سب سے پہلے تخلیق کئے جانے والے انسانوں یعنی آدمؑ اور حواؑ پر نازل ہوا۔ اس کی توثیق تمام پیغمبروں نے بشمول حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔

اسلام اپنے ماننے والوں کے سامنے ایک چیلنج پیش کرتا ہے کہ وہ ایسے سماج اور معاشرہ کی تشکیل دیں جس میں معروف احکام آگے بڑھیں اور منکر احکام ختم ہو جائیں۔ انسان کے آپسی روابط و معاملات کو اسی معیار سے جانچا جائے، اسی اعلیٰ وارفع معیار سے اسلامی تاریخ عبارت ہے۔ اسی بلندی کو حاصل کرنے کیلئے اور اس راہ میں آنے والی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے جو جد و جہد ہوتی رہی جو کوششیں جاری و ساری رہیں یہی اسلامی تاریخ کا اصل حصہ ہے۔ یہ جد و جہد جاری تھی، جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔ یہ کوششیں، یہ جدوجہد ازلی اور ابدی ہے۔ صدیوں سے مسلمان اسی سرچشمۂ حیات کو پانے کیلئے سرگرداں رہے۔ جہد مسلسل کرتے رہے۔ یہ وہ سرچشمہ ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے نکلا تھا۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مسلمانوں کو بھی سیراب ہونے کی دعوت دی، جو کچھ بھی بگاڑ یا کرپشن اور فساد وقت کے ساتھ ابھرتا رہا ہے اس کو مسلمانوں نے بار بار للکارا، اس کا مقابلہ کیا اور ہمیشہ سے ایمان اور صحیح عقیدہ کی تجدید کیلئے کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اس طرح احیائے اسلام کی یہی تحریکیں وہ معیار ہیں جس

کے ذریعہ تاریخ کے آنے والے واقعات کو ناپا جاسکتا ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جو اسلامی تاریخ کا واحد اہم ترین معیار ہے جس کے ذریعہ ہم ان واقعات کو سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جنہیں تاریخ میں عمر ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ ایک ایسے اولین امیر ہیں جنھوں نے ٹھیک ٹھیک خلفائے راشدین کی طرح احیائے اسلام کی کوششیں کی، حضرت امیر معاویہؓ کے بعد خلافت کا کردار بدل دیا گیا، خاندانی حکومت نافذ کردی گئی۔ بنوامیہ کا بگاڑ کربلا میں اپنے انتہاء کو پہنچ گیا۔

بنوامیہ نے عالیشان محل تعمیر کئے۔ اپنے اطراف واکناف نوکروں اور کنیزوں کی فوج رکھ لی بڑی بڑی جائیدادیں بنائیں۔ بیت المال کو اپنا ذاتی خزانہ سمجھ لیا۔ بادشاہوں، شہزادوں کی طرح شاہانہ زندگی گذارنے لگے۔ ان کی دولت اور ان کے کردار کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ عوام الناس کو ریاست کے معاملہ میں حصہ لینے اور کچھ کہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ خلیفہ کا نہ تو انتخاب ہوتا تھا اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا کوئی سوال کیا جاسکتا تھا۔ عوام کا بس یہی کام تھا کہ وہ اس طاقتور شخص کے سامنے سر اطاعت خم کرتے رہیں، ٹیکس ادا کرتے رہیں اور فوج میں کام کرتے رہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک تاریخی اتفاق سے امیر بنے، اموی امیر سلیمان (714ء تا 717ء) جب قریب المرگ ہوا تو کچھ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے فرزندوں میں سے کسی کو بھی خلیفہ نامزد نہ کرے بلکہ باہر کے فرد کو جانشین کی حیثیت سے نامزد کرے۔ اس طرح وہ خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اللہ کی خوشنودی حاصل کرسکے گا۔ اسی وجہ سے اس نے ایک وصیت لکھوائی جس کے تحت اپنے ایک دور کے چچازاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کو جانشین مقرر کیا۔ ان کے بعد یزید بن عبدالملک کو تخت کا وارث قرار دیا۔

عمر بن عبدالعزیز ایک تجربہ کار اور با اخلاق شخص تھے انہیں مصر اور مدینہ کے گورنر کی حیثیت سے حکومت کا ۲۲ سالہ تجربہ حاصل تھا۔ ان کی تعلیم وتربیت اس دور کے مشہور عالم صالح بن قیسان نے کی تھی۔ خلیفہ بننے سے پہلے عمر بن عبدالعزیزؒ ایک نمود ونمائش پسند، فیشن زدہ اور عطر کے دلدادہ نوجوان تھے۔ لیکن جب انہوں نے خلافت کی ذمہ داری قبول کرلی تو جتنے بھی اموی امیر ہوئے ان سب سے زیادہ خداترس لائق، دوراندیش اور ذمہ دار امیر ثابت ہوئے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ نے قوم کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی عمارت کی مکمل اصلاح کا بیڑہ اٹھایا، اسلام کے ابتدائی دنوں کے وہ انقلابی نظریات جنہوں نے قوم کی ہیئت ہی بدل دی اسی پر ایک بار پھر قوم کو چلانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے آپ سے اس کی ابتداء کی۔ خود کو ایک اچھی مثال میں ڈھالنے پر توجہ مبذول کی ،خلیفہ نامزد کئے جانے کی خبر جب ان تک پہنچی تو انہوں نے عوام سے خطاب کرتے کہا" لوگو ! یہ ذمہ داری مجھ پر میری اپنی مرضی کے خلاف اور آپ سے مشورہ کے بغیر لادی گئی ہے اگر آپ کسی اور کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں تو میں فوراً اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہوں اور آپ کے اس فیصلہ کا ساتھ دیتا ہوں۔" ایسی باتیں عوام کے لئے ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوئیں۔ متفقہ طور پر عوام نے انہیں منتخب کرلیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عیش و آرام کی زندگی تج دی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح انتہائی درویشانہ زندگی کو اپنالیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ تاریخ میں اسلام کے اولین درویشوں اور صوفیوں میں سے ایک کی حیثیت سے مشہور ہیں جو حضرت عثمانؓ کے دور میں مدینہ کی عوامی زندگی کو چھوڑ کر صدر مقام سے کچھ دور پر ایک تنہائی کے مقام میں ایک چھوٹی سی کٹیا بنا کر رہنے لگے تھے، اسی مثال کو اپناتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی شاہانہ زندگی و شہزادگی کی تمام عیش و آرام کی چیزوں پر لات ماردی۔ نوکر غلام کنیزیں، گھوڑے، محل، سونے کے لباس، بڑی بڑی جائدادیں سب کچھ بیت المال میں داخل کردیا۔ اپنے خاندان کے تمام افراد کو جس میں ان کی اپنی بیوی بھی شامل ہے۔ یہ حکم دیا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔ فدک کا باغ اس کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ کھجوروں کا یہ باغ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت تھی۔ حضرت فاطمہؓ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وراثت میں اس باغ کو مانگا تھا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے کہ پیغمبر کی وراثت تمام قوم کی امانت ہوتی ہے۔ بی بی فاطمہؓ کو دینے سے انکار کردیا۔ حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے دور میں اس باغ پر اپنا حق جتایا لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے اس باغ کو دینے سے انکار کردیا اور کہا جو کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ کام میں کیسے کرسکتا ہوں۔ یہ باغ حضرت علیؓ کے دور تک بیت المال کا ہی حصّہ بنا رہا آپؓ کے انتقال کے بعد بنوامیہ نے اس اراضی کو اپنی ذاتی جائداد میں تبدیل کرلیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس باغ کو پھر بیت المال میں داخل کیا اور کہا کہ

یہ تمام قوم کی امانت ہے۔

بنو امیہ نے بیت المال کو اپنی ذاتی املاک بنالیا تھا اور اس کے خرچ کے لئے کسی کو بھی جوابدہ نہیں تھے، اپنی شاہانہ زندگیوں کے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے مصر اور ایران کے عوام سے حد سے زیادہ ٹیکس وصول کیا۔ انہوں نے تاجروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی چیزیں رعایتی قیمتوں پر فروخت کریں۔ امیر کے اہلکار کسی بھی جائز و ناجائز اعانت کے بدلے میں عوام سے سونے اور چاندی کے شکل میں تحائف وصول کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس عمل پر روک لگادی۔ حضرت عمر ثانیؒ نے نہ صرف بدعنوان طریقۂ کار پر روک لگائی بلکہ ان سرکاری بدعنوان کارندوں کو سزا بھی دی اور بالکل صحیح جوابدہی کا نظام قائم کیا۔

بنو امیہ کے کچھ اعلیٰ اہلکار طاقت کے نشہ میں چور ہوکر مفتوح رعایا سے بُرا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ بغیر کسی جواز کے، بنا کسی قانونی کارروائی کے، ان کی جائیدادیں ضبط کرلیا کرتے۔ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مفتوح عوام سے ان کے اسلام قبول کرنے کے باوجود زبردستی جزیہ وصول کرتے، جو ٹیکس دینے سے انکار کرتے انہیں انتہائی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؒ نے ان تمام غلط طریقوں کو بیک قلم ختم کردیا اور ٹیکس کی وصولی میں انصاف کا بول بالا کردیا۔ اب عراق میں حجاج بن یوسف اور مصر میں قرہ بن شریک کے مظالم کے وہ دن ختم ہوگئے۔ عوام نے دل کھول کر نئے خلیفہ کی انصاف پسندی کا خیر مقدم کیا، صنعت وحرفت ترقی کرنے لگی، زیادہ سے زیادہ مال تیار ہونے لگا۔ ابن کثیر لکھتا ہے کہ حضرت عمرؒ کے رفاہِ عامہ کی ان کارروائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف فارس سے جہاں سالانہ پہلے دو کروڑ اسی لاکھ درہم محصول وصول ہوتا تھا اب دس کروڑ چوبیس لاکھ درہم تک وصول ہونے لگا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے چین اور تبت کے درباروں میں اپنی سفارت بھیجی اور انہیں اسلام قبول کرلینے کی دعوت دی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ حکومت میں اسلام کی جڑیں اور مضبوط ہوئیں، ایران اور مصر کی بڑی آبادیاں دارالاسلام میں داخل ہوگئیں جب سرکاری افسران نے یہ شکایت کی کہ بڑی بڑی آبادیوں کے اسلام قبول کرلینے سے جزیہ وصولی میں

بھاری کمی ہوگئی ہے تو حضرت عمرؒ نے لکھا کہ انہوں نے خلافت اس لئے سنبھالی ہے کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، اس لئے نہیں کہ ایک ٹیکس وصول کرنے والے امیر بنیں۔ بے شمار غیر عرب عوام کے اسلام قبول کرنے سے سلطنت کے طاقت کا توازن ایران اور مصر کی طرف منتقل ہونے لگا۔ یہ تبدیلیاں، عباسی انقلاب (750ھ) اور فقہ کے مختلف مسلکوں (760ء تا 860ء) کے دور میں انتہائی دوررس نتائج کی حامل رہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خود اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔ محمد بن کعبؒ اور میمون بن مہرانؒ جیسے عظیم علماء ان کی رفاقت میں رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اساتذہ کو خصوصی وظائف دیئے اور تعلیم کی ہمت افزائی کی۔ خود اپنی مثال کے ذریعہ انہوں نے عوام میں خدا ترسی، راست بازی، ایماندارنہ تجارت اور اعلیٰ اخلاق کو رواج دیا، انہوں نے شراب بندی کو سختی سے لاگو کیا۔ زکوٰۃ کی انصاف پسند طریقہ سے تقسیم کاری جیسے رفاہِ عامہ کے کام کئے۔ ایران، خراسان اور شمالی افریقہ میں عوام الناس کی بہبودی کیلئے بہت کچھ کیا۔ نہریں کھدوائیں، راستے بنائے، شفاخانے اور مسافروں کیلئے سرائے تعمیر کئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پہلے امیر ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے مسلکی اور سیاسی اختلافات کو دور کرنے اور آپس میں مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ سے خطبات میں خطیب کی طرف سے حضرت علی بن ابی طالبؓ پر دشنام طرازی ایک روایت بن گئی تھی۔ حضرت عمرؒ نے اس بیہودہ اور نامعقول روایت پر پابندی لگادی اور حکم جاری کیا کہ اس کے بجائے یہ آیت تلاوت کی جائے '' اللہ عدل کا، بھلائی کا، احسان کا اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم وزیادتی سے روکتا ہے۔ وہ خود تمہیں نصیحتیں کررہا ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو' (النحل: ۹۰) یہ آیت آج بھی دنیا بھر کی تمام مساجد میں خطبۂ جمعہ کے دوران دہرائی جاتی ہے۔ انہوں نے بنو ہاشم اور شیعہ کے ساتھ پُر وقار اور منصفانہ برتاؤ کیا یہاں تک کہ انہوں نے خارجیوں کے جانب بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ابن کثیرؒ کے مطابق انہوں نے خارجیوں کے سردار بوستم کو لکھا کہ وہ آئے تا کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت کے بارے میں کھلا مذاکرہ کیا جائے۔ انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر لکھا کہ اگر بوستم انہیں قائل کردے تو وہ توبہ کرکے خود اس کے گروہ میں شامل ہوجائیں

گے۔ بوستم نے اپنے دوسفیروں کوخلیفہ کے دربار میں روانہ کیا۔مباحثہ کے بعدایک سفیر نے برسر عام تسلیم کرلیا کہ حضرت عمر ثانیؒ حق پر ہیں۔وہ خارجیت کی انتہائی پسندی سے تائب ہوکرعمر ثانیؒ کے ساتھ ہوگیا۔ دوسرا سفیر مکمل طور سے مطمئن نہ ہوا اور وہ واپس اپنے سردار کے پاس چلا گیا۔اس کے باوجود حضرت عمر ثانیؒ نے اس سے کسی قسم کی باز پرسی نہیں کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وہ پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے ظاہری فتوحات کی بجائے باطنی فتوحات کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔انہوں نے اپنی افواج کوفرانس وہندوستان کی سرحدوں سے اور قسطنطنیہ کے مقامات سے واپس بلالیا۔ان کی خلافت کے دوران کچھ اندرونی خلفشار بھی مچا، بغاوتیں بھی ہوئیں۔اسلام نے فی الحال اپنی ساری نظروں کا محور خود اپنی روح کو بنالیا تھا، اپنی ہی تاریخ کا محاسبہ کرنے خود اپنے اخلاقی خزانے کو پرکرنے کیلئے، لبریز کرنے کے لئے اپنی ساری طاقتیں مرکوز کردیں۔ایمان اور عقیدہ مائل بہ عروج ہونے لگا۔سرسبزو شاداب ہونے لگا۔حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور کی طرح پرزور قوت حاصل کرنے لگا۔ انہی وجوہات کی بناپر تاریخ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو حضرت عمر ثانیؒ کے لقب سے نوازا، انہیں خلفائے راشدین کے سلسلہ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے بعد پانچویں خلیفہ کا اعزاز دیا گیا۔

حرص شیطانیت کا ایک پہلو ہے۔وہ انسانیت کو اپنا شکار بنانے کی مسلسل کوشش کرتی ہے۔حضرت عمر ثانیؒ کے رفاہِ عامہ کے یہ کام برہم بنوامیہ اور امیر بیوپاریوں کو راس نہ آئیں۔حضرت عمر ثانیؒ کو زہر دے دیا گیا۔اسی زہر سے 719ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ان کا دورِ حکومت صرف ڈھائی سال رہا۔انتقال کے وقت ان کی عمر انچالیس (39) سال تھی۔ان کے ساتھ بنوامیہ حکومت کی آخری کڑی کی بھی موت ہوگئی۔

ساتواں باب

اسپین کی فتح

دنیا کی تاریخ میں اسپین کی فتح ایک نئے باب کی ابتداء ہے،مغرب کے لاطینی تمدن کے ساتھ اسلامی تہذیب کی یہ پہلی مسابقت تھی۔ براعظم یوروپ جو غفلت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اس کے لئے مسلم اسپین صدیوں تک علم کا ایک روشن مینار بنا رہا۔

جنوبی اٹلی کے ساتھ ساتھ وہ اسپین ہی تھا جس کی قسمت میں علم کا ایک ایسا دریا بننا لکھا تھا جس سے مغرب سیراب ہوتا رہا۔ اس نے یوروپ کی از سرنو بیداری میں مرکزی رول ادا کیا۔اندلس کا نام ذہن میں آتے ہی گذرے ہوئے اس سنہرے دور کی عظیم تہذیب کی پرچھائیاں ابھر آتی ہیں۔اندلس جسے آج اسپین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔بحیرۂ روم کے شمال مغربی کنارے پر واقع ہے یہ ایک جزیرہ نما ہے جسکے مغرب میں بحرِ اوقیانوس ہے۔مشرق میں بحیرۂ روم ہے۔شمال میں کوہِ پیرینیس اسکو فرانس اور بقیہ یوروپ سے الگ کرتا ہے،جنوب میں تنگ آبنائے جبرالٹر (جبل الطارق) بحراوقیانوس کے پانیوں کو بحیرۂ روم سے ملاتا ہے۔جغرافیائی حیثیت سے یہ بحیرۂ روم کا ہی حصہ ہے۔لیکن جغرافیائی نقشہ کے لحاظ سے اور اس جزیرہ نما کے ناہموار سلسلے کی وجہ سے یہ جنوبی یوروپ کی بہ نسبت افریقہ کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔

بحراوقیانوس نے مغرب کی جانب مسلم افواج کی پیش قدمی روک دی تھی،لیکن مراقش اور اسپین کو جدا

کرنے والا وہ آبنائے اتنا چوڑا نہ تھا کہ شمال میں یوروپ کی جانب ان کی بے کراں پیش قدمی کو روک دیتا۔ وہ ایک ایسے دنیاوی نظام کے زیر اثر آگے بڑھ رہے تھے جس کے تحت ظلم کا خاتمہ اور مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت ملے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان توحید یعنی صرف اللہ تعالیٰ کو مرکز جاننے والی تہذیب کو آسمانی امانت سمجھتے تھے۔ اور انہی آسمانی احکامات کو زمین پر نافذ کرنا، اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتے تھے۔ کرۂ ارض پر نظامِ الٰہیہ کو پھیلانے کا جو مقصد لے کر وہ اٹھے تھے اس کی راہ میں کوئی سمندر، کوئی صحرا ان کے لئے ناقابل تسخیر نہ تھا۔ اسلامی حکومت کے اولین صدیوں میں عقیدہ یا ایمان طاقت کا مرکزی سرچشمہ ہوا کرتا تھا جبکہ دنیا میں آج طاقت کا اصلی محور اقتصادیات ہے۔

ایمان تہذیب وتمدن کو مضبوطی فراہم کرتا ہے، علم کو پھیلاتا ہے اور خوشحالی لاتا ہے، بدعقیدگی تہذیبوں کو تباہ وبرباد کرتی ہے۔ جہالت کو ابھارتی ہے اور غربت کو دعوت دیتی ہے، قوم کی روح جب ایمان کی روشنی سے معمور ہوجاتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی لالچ، کوئی جذبہ اور ناموری یا تعریف وستائش اس کو ایک اعلیٰ ترین منزل کو پانے سے روک نہیں سکتی۔ جن لوگوں کے دلوں میں ایمان راسخ ہوتا ہے وہ لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں اور تہذیبوں کی تخلیق کرتے ہیں جب ایمان کمزور ہوجاتا ہے تو لالچ اور دنیاوی جذبات انسان پر قابو حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح باہمی جدوجہد ختم ہوجاتی ہے اور تہذیب وتمدن کے قصر زمین بوس ہوجاتے ہیں۔

پانچویں صدی عیسوی میں وِسی گوتھیوں نے اسپین کو فتح کیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی جس کا صدر مقام طولیدو تھا۔ وِسی گوتھ کے بادشاہ سرکار کو چلانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اس لئے انہوں نے 565ء میں لاطینی چرچ کو دعوت دی کہ وہ سرکاری نظام چلائیں، لاطینی چرچ نے اس کے بدلہ میں اپنے عقیدہ کے پرچار کے لئے اجازت حاصل کر لی۔ لیکن اس نئے نظام سے اسپین کے کسان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ انہیں اب دوہرا ٹیکس دینا پڑا، ایک بادشاہ کو تو دوسرا مقامی خانقاہ کو۔ مالدار شان وشوکت اور عیش وآرام کی زندگی گذار رہے تھے تو کسان غربت کی انتہاء پر تھے، یہودیوں کی حالت اور خراب تھی انہیں جائیداد بنانے سے محروم رکھا گیا تھا اور ان کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی بھی نہیں تھی۔ جب انہوں

نے احتجاج کیا تو چرچ کا ظلم اور بڑھ گیا۔ 707ء میں وِسی گوتھ بادشاہ وئیزا نے یہودیوں پر ظلم کرنے میں نرمی برتی تو پادریوں نے فوراً اس کو معزول کردیا اس کی جگہ ایک عیش پرست فوجی افسر راڈرکس کو بادشاہ مقرر کردیا۔ یہودیوں کو غلام بنایا گیا اور عورتوں کو کنیزیں بننے پر مجبور کیا گیا۔ آٹھویں صدی کی ابتداء میں شمالی افریقہ اور اسپین کے درمیان تہذیبی تضاد اتنا تھا جتنا کہ دو پڑوسی ممالک میں ہوسکتا ہے۔ مسلمان ایک نیا مذہب اور ایک مشن لے کر تاریخی پردہ پر نمودار ہوئے تھے، انسان کی آزادی اور قانون کے مطابق انصاف کی تبلیغ کررہے تھے، اسلام کی روشنی اسپین کے لئے نئی روشنی تھی۔ یہاں سے کئی مصیبت زدہ لوگ اور یہودی فرار ہوکر مغرب الاقصیٰ یعنی مراقش میں پناہ لے چکے تھے۔ اسپین کے ظالمانہ نظام کو ختم کرنے کے لئے بس ایک بہانہ کی ضرورت تھی۔

شمالی افریقہ ایک انگڑائی لیتی ہوئی توانائی سے ابل رہا تھا۔ بربروں کی بغاوت فرو ہوگئی تھی۔ بربر نئے جوش ایمانی کے ساتھ اسلامی فوجوں میں شامل ہورہے تھے۔ دمشق میں ولید اول بنوامیہ کے تخت پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ماہر منتظم اور ہوشیار سیاست داں تھا، اس نے دور خراسان کی بغاوت کو کچل دیا تھا۔ چین کے بادشاہ کو سنکیانگ کی سرحد سے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ ولید تاریخ میں اس لئے مشہور ہے کہ اس نے بنوامیہ کے دوسرے حکمرانوں کی بہ نسبت باصلاحیت سپہ سالاروں کو اپنے اطراف جمع کیا تھا۔ محمد بن قاسم (پاکستان کا فاتح)، قطیبہ بن مسلم (سنکیانگ کا فاتح)، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد (اسپین کے فاتح) ان مشہور جرنیلوں میں سے تھے، مغرب کا اموی گورنر موسیٰ بن نصیر، مغرب الاقصیٰ پر کنٹرول حاصل کرنے کیلئے وسی گوتھیوں کے ساتھ مسلسل جنگ کرتا رہا۔ بحیرۂ روم کے ساحل یعنی مراکش کے شمالی حصے میں واقع وسی گوتھیوں کے مضبوط گڈھ یکے بعد دیگرے سپر ڈالتے گئے۔ اب صرف سیوٹا ہی وسی گوتھیوں کے قبضہ میں رہ گیا تھا۔ وسی گوتھ کا نائب کاؤنٹ جولین اس پر حکومت کررہا تھا۔

وسی گوتھ شرفاء کے یہاں ایک رسم تھی۔ وہ اپنی بیٹوں کو شاہی آداب سیکھنے کے لئے شاہی محل بھیجا کرتے تھے۔ اسی رواج کے تحت کاؤنٹ جولین نے اپنی بیٹی فلورنڈا کو طولیدو کے دربار میں بھیجا۔ وہاں عیاش راڈرکس نے اس کی عصمت لوٹ لی۔ جولین غصہ سے کھول اٹھا اور راڈرکس سے اس اہانت کا بدلہ

لینے کی ٹھان لی۔ علاوہ اس کے جولین کی بیوی ویٹزا کی بہن تھی جس کا تخت غاصب راڈرکس نے چھین لیا تھا۔ اس وقت سیوٹا کے اطراف کے علاقہ پر موسیٰ بن نصیر کے نائب طارق بن زیاد کی حکومت تھی جولین نے خیروان کا سفر کیا اور موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اسپین پر حملہ کرے اور راڈرکس کو شکست دے۔ آزمائش کا وقت آچکا تھا، موسیٰ نے طارق بن زیاد کو حکم دیا کہ وہ مسلم فوج کے ساتھ آبنائے کو پار کرے۔

ابن خلدون کے مطابق طارق بن زیاد کی فوج میں تین سو عرب اور دس ہزار بربر سپاہی تھے۔ وہ سربہ فلک چٹان جس کے کنارے طارق بن زیاد نے لنگر ڈالے تھے جبل الطارق یعنی طارق کے پہاڑ کے نام سے پکارا جاتا ہے، انگریزی میں اسے جبرالٹر کہتے ہیں اور وہ آبنائے جو شمالی افریقہ اور اسپین کو جدا کرتا ہے آبنائے جبرالٹر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ طارق ایک بہترین سپاہی، قابل سپہ سالار، ایمان کا پکا، مضبوط ارادہ کا مالک تھا، اس نے وہ کشتیاں جلادیں جس کے ذریعہ اس کی فوج آئی تھی۔ اس میں جوش بھر دیا کہ توحید کی سربلندی کے لئے آگے بڑھیں یا اسی راہ میں فنا ہو جائیں، مقامی وسی گوتھ افسر تھیوڈرے میر کے ساتھ جھڑپ شروع ہوئی۔ جس میں آخرالذکر کو مکمل شکست ہوئی۔ یہ 711ء کا سال تھا۔

راڈرکس کو جب اس حملہ کی اطلاع ملی تو اس نے اسی ہزار فوج جمع کی اور مسلم افواج سے مقابلہ کیلئے آگے بڑھا۔ طارق نے شمالی افریقہ سے مزید فوج کی درخواست کی، مزید سات ہزار فوج کا ایک دستہ تعریف بن مالک کی کمان میں آ گیا (اسی کے نام سے اسپین کا شہر تعریفہ موسوم ہے) گوڈالوپ کے مقام پر دونوں افواج کا آمنا سامنا ہوا۔ مسلمان منصفانہ سیاسی نظام کے قیام کے لئے لڑ رہے تھے جبکہ وسی گوتھ ایک جابرانہ نظام کی بقا کو بچانے کیلئے جنگ کر رہے تھے۔ عرب حرکت پذیر گشتی جنگ کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ بہترین شہسوار تھے۔ یہ عرب، عربستان اور ایشیاء کے صحراؤں میں مسلسل حملے کرتے کرتے برق رفتاری کے ساتھ لپٹ لینے والے حملے کرنے میں طاق ہو گئے تھے۔ وسی گوتھ ساکن اور مقامی طور پر جنگ کے عادی تھے، دونوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس کے باوجود کہ مسلم افواج تعداد میں بہت کم تھیں انہوں نے وسگوتھیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔ راڈرکس میدانِ جنگ میں قتل ہو گیا۔

شکست کھا کر بھاگنے والے وسگوتھی طولیدو پہنچنے لگے جو اسپین کا پرانا صدر مقام تھا۔ طارق نے اپنی

فوج کو چار دستوں میں بانٹ دیا۔ایک دستہ قرطبہ کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ کرلیا۔دوسرے دستہ نے مورسیا پر دھاوا بولا اور اسے مطیع کرلیا۔فوج کا تیسرا حصّہ شمال کی جانب سرگوسہ کی جانب بڑھا،خود طارق نے سرعت کے ساتھ طولیدو کی طرف پیش قدمی کی،شہر والوں نے بغیر کسی جنگ کے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح اسپین سے وسی گوتھ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

موسیٰ بن نصیر تازہ دم فوج کے ساتھ اسپین کی سرزمین پر اُترا۔سب سے پہلے وہ سویلے کی جانب بڑھا،شہر کا دفاع کرنے والوں نے قلعہ کا دروازے بند کرلیا اور ایک طویل محاصرہ کی ابتدا ہوئی،عربوں کی حملہ کرنے کی قوت ان کی فوجی انجینئر نگ اور ٹکنالوجی وسی گوتھوں کے دفاعی طریقوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔موسیٰ اپنے ساتھ منجنیق لایا تھا جن کے ذریعہ قلعہ کی دیواروں پر بڑے بڑے پتھر پھنکے جانے لگے جس کی وجہ سے قلعہ توٹ پھوٹ گیا تو اس کے بعد شہر والوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔اب بنوامیہ کی فوجیں جزیرہ نما اسپین میں چاروں طرف پھیل گئیں یکے بعد دیگرے تیزی کے ساتھ شہر در شہر فتح ہونے لگے۔ میاڈریڈ،سرگوسہ، بارسلونہ اور پرتگال ایک ایک کرکے فتح ہوگئے۔پائیرینیس کے بلند پہاڑی سلسلوں کو بھی یہ پار گئے اور فرانس کے جنوبی حصہ لائینس پر قبضہ کرلیا۔یہ فتح 712ء میں ہوئی۔

موسیٰ بن نصیر فرانس اور اٹلی کی جانب اور آگے پیش قدمی کرنے کیلئے تیار تھا۔لیکن اسی دوران دمشق میں ولید دوم بیمار ہو گیا۔اقتدار کیلئے رسہ کشی شروع ہوگئی۔نئے خلیفہ سلیمان کے ہاتھ وفاداری کا عہد لینے کے لئے موسیٰ کو بلایا گیا۔موسیٰ نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اسپین کا امیر مقرر کیا۔دوسرے بیٹے عبداللہ کو شمالی افریقہ کی کمان میں دیا، تیزی کے ساتھ بنوامیہ خلیفہ کے دربار میں جا پہنچا۔اسپین کی فتح کے دوران مسلمانوں کو بہت زیادہ مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔موسیٰ اس مال غنیمت کو جلد از جلد خلیفہ کے دربار پہنچانا چاہتا تھا تاکہ ولید دوم مرنے سے پہلے اس بے انتہا خزانے کو دیکھ کر موسیٰ کی خدمات کا اعتراف کرے۔ ادھر سلیمان نے موسیٰ تک پیغام بھیجا کہ وہ آنے میں جلدی نہ کرے۔سلیمان کا مقصد یہ تھا کہ خزانہ اس وقت آئے جب ولید دوم کا انتقال ہو چکا ہو اور خود اس کا مالک بن جائے۔موسیٰ ملک دوم کا احسان مند تھا۔ از راہِ خوشی وانکساری اس نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔وہ ولید کے انتقال سے پہلے آ پہنچا۔سلیمان اس پر

بہت تلملایا کہ مالِ غنیمت پرحق جتانے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ جیسے ہی سلیمان تخت پر بیٹھا اس نے بدلہ لینے کی خاطر موسیٰ سے تمام اختیارات و اعزازات چھین لیئے۔ جنگ کے لئے دیئے جانے والے مالیہ کے غلط استعمال کا الزام لگایا۔ اس کی ساری جائیداد ضبط کرلی۔ اسے انتہائی غربت تک پہنچادیا۔ موسیٰ اب نیم اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی بقیہ زندگی عوامی چندہ پر ایک بھکاری کی طرح گذاری۔

اسپین کے یہودیوں اور دیہاتیوں نے مسلمانوں کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ بندھوا مزدوری کا خاتمہ کیا گیا۔ منصفانہ مزدوری کا دیا جانا لازمی کردیا گیا۔ ٹیکس کو کم کرکے اُسے پیدوار کا صرف پانچواں حصہ قرار دیا گیا۔ اسلام قبول کرلینے والے کو غلامی سے نجات دلائی جاتی۔ اپنے پرانے آقاؤں کے ظلم وستم سے نجات حاصل کرنے کیلیئے غلامی کا جوا اتار پھینکنے کیلیئے بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ مذہبی اقلیتوں کو، یہودیوں اور عیسائیوں سب کو سرکاری تحفظ حاصل تھا۔ سرکار کے اعلیٰ ترین عہدوں تک انکو رسائی دی گئی تھی۔

اسلامی حکومت کے تحت، اسپین یوروپ کے لئے، سائنس، فنون لطیفہ اور تہذیب وتمدن کا ایک روشن مینار بن گیا۔ مساجد، محلات، باغات، ہسپتال اور لائبریریوں کی تعمیر کی گئی۔ پرانی نہروں کی مرمت کی گئی۔ نئی نہریں کھودی گئیں۔ اندلس مغرب کا زرخیز گودام بن گیا، صنعت وحرفت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ جزیرہ نمائے اسپین کا سلک، کمخواب اور کشیدہ کاری دنیا بھر کے تجارتی مراکز کے منظور نظر بن گئے۔ اندلس کو چار صوبوں میں بانٹا گیا اور نظم ونظام کو بہتر بنایا گیا۔ شہروں کی آبادیاں بھی بڑھیں، اور دولت مندی بھی آئی، اندلس کا صدر مقام قرطبہ یوروپ کا سب سے بہترین شہر بن گیا، دسویں صدی عیسوی میں اس کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی۔

آٹھواں باب

سندھ کی فتح

سندھ جو آج کل پاکستان کا ایک صوبہ ہے اس کی فتح مرحلہ وار ہوئی حضرت عمر بن الخطابؓ، خلیفہ دوم کے زمانے میں اسلامی فوجیں مکران کی سرحدوں تک پہنچ گئیں ۔لیکن حضرت عمرؓ نے وہاں کے مخدوش اور سخت جغرافیائی حالات کی وجہ سے اپنی فوجوں کو واپس بلالیا۔ امیر معاویہؓ نے افغانستان اور شمالی مشرقی سرحدی علاقہ پر قبضہ جمالیا۔لیکن ولید اول (705ء تا 713ء) کے زمانے تک یہ اسلامی حکومتوں کی پہنچ سے دور ہی رہا لیکن ولید نے ہی آج جو موجودہ پاکستان ہے اس کے اکثر حصہ کو فتح کیا۔

اسلام کے پردۂ ظہور پر آنے سے پہلے ہی جزیرہ نمائے عرب اور ہندوستان کے مغربی ساحل اور سری لنکا کے درمیان تجارت کافی زوروں پر تھی۔ اکثر جہاز مشرقی مانسون کے ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے، مالابار اور سری لنکا کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوتے، مسالہ جات خریدتے اور مغربی مانسون کی ہواؤں کے ساتھ واپسی کے سفر پر روانہ ہوتے۔ مغربی ایشیاء، شمالی افریقہ اور جنوبی یوروپی ممالک میں گرم مسالوں کی بہت مانگ تھی اور یہ تجارت کافی منافع بخش تھی۔ یہ تجارت مسلمانوں کے مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ کو فتح کرنے تک زور وشور سے چلتی رہی، انہیں بیوپاریوں کے ذریعہ اسلام پہلی مرتبہ کیرلا، جنوب مغربی

ہندوستان اور ہندوستان سے قریب واقع سری لنکا کے علاقوں میں اسلام پہنچا۔

اس دور میں سندھ ڈاکوؤں اور بحری قذاقوں کی وجہ سے بہت ہی بدنام تھا یہ بحری قذاق سندھ کے ساحل پر انتظار میں رہتے جب کبھی کوئی تجارتی جہاز ادھر گذرتا تو اس پر شب خون مارتے اور اس کو لوٹ لیتے۔ تاریخ بدلنے والا ایسا ہی ایک واقعہ ہوا 707ء میں ان بحری قذاقوں نے سری لنکا سے بحیرہ فارس کی جانب جانے والے سمندری تجارتی جہازوں پر حملہ کیا۔ جہازوں کے تمام مسافروں جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، گرفتار کرلیا اور سندھ کے اندر پہنچایا گیا جہاں کے راجہ نے انہیں قید کرلیا۔

حجاج بن یوسف ثقفی اس وقت عراق کا اموی گورنر تھا، اس واقعہ کی خبر جب اسے پہنچی تو اس نے راجہ داہر کو خط لکھ کر مانگ کی کہ قیدیوں کو فوراً چھوڑ دیا اور قذاقوں کو مناسب سزادی جائے، راجہ داہر نے انکار کردیا، اس انکار کی وجہ سے معرکہ آرائی کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ خلیفۂ وقت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی رعایا کی حفاظت کرے، ناانصافی کے خلاف جنگ کرے۔ چاہے یہ ناانصافی کسی سے بھی سرزد ہوئی ہو خلیفہ کی جانب سے گورنر نامزد ہونے کی وجہ سے حجاج بن یوسف پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ اس نے عبید اللہ بن بنہان کے زیر کمان ان قیدیوں کو چھڑوانے کے لئے فوج روانہ کی۔ جنگ میں راجہ کی فوج نے اسے شکست دی، عبداللہ بن بنہان مارا گیا۔

سندھ کی صورتِ حال سے حجاج بن یوسف غضب ناک ہوا تھا۔ اس کا مناسب جواب دینا ضروری تھا۔ حجاج نے سات ہزار آزمودہ کار فوج کے ساتھ محمد بن قاسم ثقفی کو اس مہم پر روانہ کیا۔ محمد بن قاسم صرف سترہ سالہ نوجوان تھا۔ لیکن یہ اس دور کے بہترین جنرلوں میں سے تھا، اس نے جنگ کی پلاننگ پر توجہ مبذول کی۔ اُدھر بھاری آلات جنگ اور ضروری رسد بذریعہ سمندر روانہ کیا اور ادھر گھوڑ سوار فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔

حملہ کرنے والی فوج کی کامیابی کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس کے جنگی ہتھیار دفاع کرنے والوں کے ہتھیاروں سے برتر ہو، مسلمان بازنطین، ایران اور وسط ایشیاء میں جنگوں کا سامنا کرتے رہے اور ان علاقوں میں جس قسم کے جنگی ہتھیاروں کا سامنا ان کو کرنا پڑا ان ہتھیاروں کو اور زیادہ ترقی یافتہ بناتے رہے۔ 700 تک سامانِ جنگ اور آلات حرب تیار کرنے میں مسلمان کافی آگے نکل چکے تھے، آلات

حرب کی ایک ترقی یافتہ مثال منجنیق ہے جو بڑے بڑے پتھر دشمنوں پر کافی دور تک پھینک سکتی تھی اس قسم کا ہتھیار چوتھی صدی عیسوی سے ہی چین میں استعمال ہوتا تھا، مسلمان انجینئروں نے اس چینی جنگی انجن میں دو خصوصی تبدیلیاں کیں پہلا تو یہ کہ غلیل کی طرح استعمال میں آنے والے اس انجن کے مرکزی محور کے دوسرے کنارے پر توازن کے لئے وزن کا اضافہ کیا جس کی وجہ سے اس ہتھیار کو اور زیادہ دوری تک مار کرنے میں آسانی ہوگئی۔ دوسرے انہوں نے اس کے پورے انجن میں پہیے لگا دیئے جس کے ذریعہ اسے اور قریب لے جا کر دشمن پر کارگر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ منجنیق دو سو پونڈ کے وزنی گول پتھر تین سو گز سے زیادہ دوری تک مار کرتی تھیں اس زمانے کے مضبوط ترین قلعوں پر جب ان انجنوں سے پتھروں کی برسات ہوتی تو مضبوط سے مضبوط دیواریں زمین بوس ہو جاتیں۔

محمد بن قاسم پنجگور اور ارمابیل پر قبضہ کرنے کے بعد دیبل بندرگاہ کی طرف بڑھا۔ یہ آج کے جدید کراچی شہر کے قریب واقع تھی۔ دیبل کے راجہ نے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ایک طویل محاصرہ شروع ہو گیا۔ ایک بار پھر حملہ میں کام آنے والے ہتھیار دفاعی ہتھیاروں سے برتر ثابت ہوئے۔ انہیں اعلیٰ و برتر ہتھیاروں کی استعمال وجہ سے مسلم افواج دنیا بھر میں فتح کے جھنڈے گاڑتی رہیں اور دنیا میں فوجی و سیاسی حیثیتوں سے مرکزیت حاصل کرتی رہیں جیسا کہ مسلمان فاتح اپنے حملہ کرنے کے بہتر طریقوں کی وجہ سے میدان جنگ میں برتر رہے تھے، اسی انداز کو اپناتے ہوئے منجنیقوں کے ذریعہ قلعہ کی بلند اور مضبوط دیواروں پر پتھروں کی برسات کرتے رہے، آخرکار دیواریں تباہ ہو گئیں، ایک ہفتہ کے بعد دیبل اسلامی فوج کے زیرنگیں آ گیا وہاں کا مقامی گورنر بھاگ نکلا اور وہ مسلمان قیدی جو یہاں جیل خانوں میں بند تھے انہیں آزاد کروالیا گیا۔

محمد بن قاسم دیبل سے اور آگے شمال و مشرق کی طرف آگے بڑھا بلوچستان اور سندھ پر اس کا مکمل قبضہ ہو گیا، فتح ہونے والے ان علاقوں میں سیستان، بحراج، کچھ، ارور، کیرتج اور جیور کے صوبہ جات بھی شامل تھے۔ جیور کی جنگ میں راجہ داہر مارا گیا، اس کا ایک بیٹا جے سنگھ برہان آباد کی جنگ میں محمد بن قاسم کا مقابلہ کرتا رہا، لیکن اسے بھی شکست ہوئی اور وہ بھاگ نکلا، محمد بن قاسم نے موجودہ دور کے کراچی شہر

کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا وہاں ایک مسجد تعمیر کی اور شمال کی جانب مغربی پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ اس کا نشانہ ملتان تھا اس وقت ملتان کا راجہ گورسنگھ تھا۔ اس کی اپنی ایک بڑی فوج تھی۔ اس کے علاوہ اطراف واکناف کے راجاؤں نے بھی اپنی افواج سے اسکو تقویت بخشی۔ ہندوستانی ساکن جنگ میں طاق تھے، اس کیلئے وہ زرہ بردار ہاتھیوں کا استعمال بھی کرتے تھے۔ لیکن برق رفتار، تیز اور زبردست وار کرنے والے گھوڑسوار دستوں کا اور ان کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ راجہ کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ سیماب وش سریع الحرکت جنگ میں محمد بن قاسم کی افواج کا سامنا کرنا ممکن نہیں۔ وہ ملتان کے قلعہ میں بند ہوگیا۔ محاصرہ شروع ہوا، ایک بار پھر منجنیق کی تکنالوجی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ان بھاری مشینوں نے قلعہ کو تباہ کردیا۔ راجہ نے ہتھیار ڈال دیئے 713ء میں ملتان، اسلامی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔

سندھ کی فتح کے ساتھ ہی اسلامی تہذیب اور سندھ و گنگا کے میدانی علاقوں کی آغوش میں پلنے والی قدیم ویدک تہذیب ایک دوسرے کے مد مقابل ہوئے۔ آگے آنے والی صدیوں میں مسلمانوں نے ہندوستان سے بہت کچھ سیکھا۔ ریاضی، فلکیات، لوہے اور دوسری دھاتوں کو پگھلا کر صاف کرنے کا ہنر وغیرہ ایسے علوم ہیں جنہیں مسلمانوں نے ہندوستانیوں سے حاصل کیا۔ مسلم علماء نے اسلام اور مغرب کے درمیان باہمی اثر اندازی پر زیادہ زور دیا ہے جبکہ اسلامی تہذیب اور مشرق کے درمیان جو تہذیبی تصادم وگفت وشنید رہی جو ایک آپسی کشمکش رہی، اس پر بہت ہی کم توجہ مبذول کی ہے۔ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے اس لئے کہ اٹھارویں صدی عیسوی تک زیادہ تمدن یافتہ اسلامی تہذیب کو دینے کے لئے مغرب کے پاس ایسا کچھ سرمایہ نہ تھا۔ زیادہ تر علم کا بہاؤ اسلام کی طرف سے مغرب کی جانب رہا۔ اس کی بہ نسبت مسلمانوں نے ہندوستان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

بنوامیہ کی سلطنت بہت جلد چین کے سرحدوں تک پھیل گئی، مسلمانوں نے چین سے کافی ترقی یافتہ تکنالوجی حاصل کی۔ خام سلک کو سلک میں تبدیل کرنے کا عمل، چینی مٹی سے لطیف اشیاء بنانے کی ترکیب، کاغذ سازی، بارود سازی وغیرہ علوم مسلمانوں نے چین سے حاصل کئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، علم حاصل کرو چاہے تمہیں اسکے لئے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ آج کے پاکستان پر

قبضہ کے بعد مسلم سلطنت کے حدود یوروپ کے پائرانیز سے لے کر سندھ تک اور ادھر صحرائے گوبی تک پھیل گئیں۔ یہ عظیم سلطنت اب چین اور ہندوستان کی پرانی تہذیبوں سے ٹکر لے رہی تھی۔ برتری کی اس منزل پر کھڑے مسلمان اب ایک ایسے مقام پر تھے جہاں سے وہ چین، ایران، یونان اور ہندوستان سے علوم حاصل کر کے انہیں اور ترقی یافتہ شکل دے سکتے تھے۔

محمد بن قاسم شمالی اور مشرقی پنجاب میں اور آگے پیش قدمی کرنے کیلئے بے چین تھا۔ لیکن دور دمشق میں ہونے والے تبدیلیوں کا اثر پاکستان کے واقعات پر بھی پڑا۔ 713ء میں ولید اول کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد پیش آنے والی سیاسی رسہ کشی کی وجہ سے محمد بن قاسم کو عراق واپس بلا لیا گیا، بالکل اسی طرح جیسے کہ موسیٰ بن نصیر کو اسپین بلایا گیا تھا۔

خلیفہ ولید اول کے مرنے کے بعد محمد بن قاسم کا خاتمہ، موسیٰ بن نصیر سے بھی زیادہ المناک حالات میں ہوا۔ محمد بن قاسم عراق کے گورنر حجاج بن یوسف جسے ظالم حجاج کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، کا بھتیجہ تھا۔ نئے خلیفہ سلیمان کو حجاج سے ذاتی دشمنی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ سلیمان اس سے بدلہ لیتا حجاج کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح سلیمان نے حجاج کے رشتہ داروں سے انتقام لینا شروع کیا۔ محمد بن قاسم کو اس کے عہدہ سے معزول کر کے عراق بھیجا گیا، عراق کا نیا گورنر صالح بن عبدالرحمٰن حجاج سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حجاج نے صالح کے بھائی کو مروا دیا تھا۔ چونکہ حجاج مر چکا تھا اس لئے صالح نے بھی حجاج کے رشتہ داروں کے خلاف انتقام کا آغاز کر دیا۔ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے قید میں ڈالوا دیا۔ اس کی کوئی غلطی نہ تھی اگر جرم تھا بھی تو یہی کہ حجاج کا رشتہ دار تھا۔ محمد بن قاسم کی آنکھیں نکلوا دیں اور اذیتیں دے کر خلیفہ نے مروا دیا۔ اس طرح آٹھویں صدی کے دو قابل ترین فوجی سپہ سالاروں کا خاتمہ المناک حالات میں ہوا۔

موسیٰ بن نصیر اور محمد بن قاسم کی اموات تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ حضرت معاویہؓ اتفاق رائے سے نہیں بلکہ بزور طاقت امیر بنے تھے۔ اس طرح عوامی رائے کو پس پشت ڈال دیا گیا جس کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے سلطان آتے رہے جو یا تو بزور طاقت سلطان بنے یا صرف وارث کی حیثیت سے۔ یہی وہ وراثت تھی جو جانشینوں کو سپاہی فاتحین کی طرف سے ملی۔ جب کوئی عادل، منصف اور قابل شخص سلطان ہوا تو عوام نے آزادی کے مزے لوٹے، جیسا کہ عمر بن عبدالعزیز کے دور سے ثابت ہے۔ جب کوئی سلیمان

بن عبدالملک جیسا ظالم تخت نشین ہوا تو عوام مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ مسلمانوں نے کسی ایسے سیاسی نظام کے قانونی ادارہ سازی کی تعمیر کر کے اسے پروان نہیں چڑھایا جس کے ذریعہ سیاسی لیڈرشپ عوام سے اٹھ سکے۔ جب کبھی کوئی فوجی لیڈرشپ ابھرتی تو عام رجحان یہ رہا ہے کہ اس کی لیڈرشپ تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی وہ لیڈر اپنی ہوشیاری سے یا طاقت کے بے رحم استعمال سے بچ رہے۔ عوامی سطح سے سیاسی لیڈرشپ کو پروان چڑہانے کے اس فقدان نے مسلمانوں کی طاقت کی حد مقرر کرنے کے ساتھ اسلامی تہذیب کی تکمیل کی سرحدیں بھی مقرر کیں، ابھرنے کی قابلیت رکھنے والے لیڈروں کی قسمت ہمیشہ مطلق العنان بادشاہ کے اشارے پر یا اس کے لنگوٹی یاروں کی مرضی پر منحصر رہی۔

عالم اسلام کے ان دو مایۂ ناز سپہ سالاروں کی المناک موت سے دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ اسلامی دنیا کے اندرونی مناظر و مناظرے اور اندرونی منطقی دلائل نے اس کی فتح یابی کی حد فاصل طے کر دی ہے۔ اسپین پر مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد، موسیٰ بن نصیر فرانس پر حملے کیلئے پر تول رہا تھا، اس اہم مرحلے پر اسے واپس بلا لیا گیا۔ شاید وہ فرانس اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ گول کے اس علاقہ میں اس وقت اس سے مقابلہ کی سکت رکھنے والا کوئی مضبوط لیڈر نہ تھا۔ اس کے بعد جب مسلمان ایک بار پھر فرانس پر حملے کے لئے تیار ہوئے تو اس وقت وہاں چارلس مارٹل کی شکل میں ایک جرأت مند لیڈر موجود تھا۔ 737ء میں اس نے مسلم افواج کو جنگِ طورس میں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح محمد بن قاسم نے بھی دریائے سندھ کے میدانی علاقوں میں ہندوستان کی دفاعی لائن کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر اس کو بغداد اور کوفہ سے ہری جھنڈی دکھائی جاتی تو شاید خلافت کی سرحدیں گنگا کے میدانی علاقوں تک وسیع ہو جاتیں۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ محمد بن قاسم کو ملتان سے عین ایسے موقع پر بلایا گیا جب کہ وہ دریائے سندھ کے ساحلوں کے اس پار پیش قدمی کرنے جا رہا تھا۔ شمالی ہندوستان فی الحال راجپوت راجاؤں کے زیر حکومت ہی رہا اس کے کافی آگے بعد محمد غوری نے پانی پت کی جنگ میں فتح حاصل کی تو پھر دہلی پر مسلمان قبضہ جما سکے۔ یہ واقعہ ۱۱۹۱ء میں پیش آیا۔ دونوں ہی صورتوں میں مسلمانوں کی اپنی اندرونی سیاسی رسہ کشی کی وجہ سے ہی مسلم افواج کی فاتحانہ پیش قدمی رک گئی۔

نواں باب

جنگ طورس (Tours)

جنگ طورس ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔اس سے ایک تہذیب کے آخری حدود بنے اور دوسری تہذیب کی ابتداء ہوئی۔732ء میں مسلم افواج شمالی یوروپ میں اپنی آخری حدود تک پہنچ گئیں۔جنگ طورس کے بعدان کوجنوب کی طرف لوٹنا پڑا۔لاطینی مغرب نے نہ صرف مسلم افواج کی پیش قدمی روک دی بلکہ جوابی حملے شروع کردیئے۔

جنگ طورس کوتاریخی پس منظر میں سمجھنا چاہئے۔پانچویں صدی عیسوی میں گوتھک قبائل نے یوروپ کے اکثر علاقوں کے ساتھ فرانس کوبھی روند ڈالا انہیں ''جرمن قبائل'' بھی کہا جاتا ہے۔غیر مہذب ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنے قبیلے اور نسل سے بے انتہا اُنسیت ومحبت رکھتے تھے۔ابن خلدون نے اسکے لئے ''عصبیہ''لفظ استعمال کیا ہے۔یہی یکجہتی اور ملاپ انہیں ایک کامیاب پلیٹ فارم پر لے آیا۔اسی اتحاد کی وجہ سے وہ رومن شہنشاہیت کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کامیاب ہوگئے۔نسل پرستی،قبیلہ پرستی وطن پرستی یوروپ کی سیاسی تحریکوں کے اہم عنصر رہے ہیں۔اس کی مثال بیسویں صدی میں جرمنی کی نازی ازم سے ملتی ہے۔ مغربی جرمنی کے ''وزی گوتھیوں'' نے فرانس اور اسپین کو فتح کیا۔مشرقی جرمنی کے ''آسٹرا گوتھیوں'' نے اٹلی اور اڈریاٹک سمندر کے ساحلی ممالک پر قبضہ جمایا۔جنہیں آج کروشیا وسلوونیا کہا جاتا ہے۔''فرانکس'' نامی ایک اور جرمن قبیلے نے ''گال''یعنی فرانس کے وسطی وشمالی علاقوں میں اپنی پوزیشن مستحکم کرلی۔وحشی بادشاہوں کے اس ملے جلے دور میں چرچ آف روم نے اپنے آپ کو ایک

مہذب طاقت کے روپ میں پیش کیا۔ چھٹی صدی عیسوی تک گوتھ قبیلے کے لوگ مفتوح علاقوں میں زمینداروں کی حیثیت سے رہائش پزیر ہوگئے۔ وہ عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ لادتے اور ان کا استحصال کیا کرتے تھے، چرچ نے مغربی یوروپ میں خانقاہوں کا جال بچھا دیا۔اس نے زمینداروں اور طاقتور لوگوں کے ساتھ مل کر ایک طرح کا کام چلاؤ رشتہ استوار کرلیا۔

565ء میں لاطینی چرچ اور اسپین کے وسی گوتھ بادشاہوں کے درمیان ایک معاہدہ عمل میں آیا،اس کے تحت چرچ نے حکومت کو اپنا نظام چلانے میں مدد دینے کا وعدہ کیا جواب میں حکومت نے چرچ کو نئے مذہب کی تبلیغ کے لئے آزادی دے دی۔ اس وقت چرچ ایک ہی سیاسی نظام سے واقف تھا وہ تھا جاگیرداریت، یہ نظام سارے اسپین میں مکمل طور سے نافذ ہوگیا۔ چرچ کا مقامی نظام کلیسا اور خانقاہوں پر منحصر تھا، مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بدلے میں انہوں نے خود اپنے ٹیکس سسٹم کو عوام پر لاگو کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ کلیسا اور خانقاہ دولت مند ہوتے گئے جیسے جیسے ان کی دولت میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے ان کی سیاسی طاقت بھی بڑھنے لگی۔ کئی مقامات میں چرچوں اور خانقاہوں کے اطراف ہی سب سے مضبوط قلعہ تعمیر کئے گئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس تعمیر پر جوزبردست اخراجات ہوتے تھے ان اخراجات کا بار صرف وہی برداشت کرسکتے تھے، سیاسی اور فوجی طاقت کلیسا، جاگیرداروں اور فوج کے مردآہن کے درمیان منقسم ہوگئی تھی۔ کسانوں اور عوام پر کلیسا، جاگیردار اور فوجی امراء، اپنے اپنے الگ الگ ٹیکس نافذ کرتے اس طرح ہر طریقہ سے عوام کا استحصال کیا جاتا تھا۔

شمالی یوروپ کی تاریخ جس طرح جرمن قبائل پر محیط ہے اسی طرح مغربی یوروپ کی تاریخ بربر قبائلیوں سے عبارت ہے۔ بربر قوم بڑی جفاکش، مضبوط اور وجیہ الشکل تھی۔ یہ اٹلاس کے پہاڑوں میں زندگی گذارتی تھی۔ عقبہ بن نفیؓ نے انہیں شکست دے کر بحراوقیانوس کی طرف پیش قدمی کی تھی لیکن یہاں بار بار بغاوتیں ہوتی رہیں۔ تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یہاں اٹھنے والی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے بارہا فوجوں کو معرکہ آرائی کے لئے بھیجنا پڑتا تھا۔ آخر کار آٹھویں صدی کے شروع میں بربر قوم نے اسلام قبول کرلیا اور اسلام کے جھنڈے کو سربلند رکھنے والے بن گئے۔

مسلمان افواج کا یوروپ میں آگے بڑھنا اور بربر قبائل کا بار بار شورش برپا کرنا ان دونوں کے درمیان ایک باہمی ربط ہے جب بھی بربر لوگ امن وامان سے رہتے تو اسلامی فوجیں پیش قدمی کرنے لگتیں۔ جب بھی بربروں کی بغاوت ہوتی یا تو اسلامی افواج کی کامیابی رک جاتی یا انہیں پیچھے ہٹ جانے پر مجبور ہونا پڑتا۔ یہ صورت حال ہمارے اس نظریہ کو تقویت بخشتی ہے کہ تاریخ اسلام کو بنیادی طور پر چلانے والا عنصر اسلام کے اپنے اندرونی مناظرے رہے ہیں۔

فرانس پر حملے کو اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے، جنوبی فرانس وسی گوتھ حکومت کا ایک حصہ تھا، فرانس میں اس طرح اسلامی افواج کی پیش قدمی بذات خود وسی گوتھیوں کے خلاف تھی۔ اس علاقہ میں پہلا حملہ خلیفہ الولید کے دورِ حکومت میں ہوا۔ اس حملہ میں سورگون اور لائینس پر فتح حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ یہ حملہ 713ء میں ہوا تھا۔ 714ء میں دوسرا حملہ ہوا اور نارمنڈی پر قبضہ ہوگیا۔ ابتدائی حملوں سے جن علاقوں پر قبضہ ہوگیا تھا۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے وہاں اپنی پوزیشن مستحکم کی۔ اس کے بعد اسلامی افواج نے ''گال'' یعنی وسط فرانس پر حملہ کیا۔ 731ء میں عنباسہ بن صائم کی زیر قیادت ایک حملہ ہوا اور مسلمانوں نے کارکازون سے بھی آگے بڑھ کر اطراف کے علاقوں پر قبضہ کرلیا، لیکن عنباسہ ان حملوں کے دوران مارا گیا، عنباسہ کے بعد عبدالرحمٰن بن عبداللہ کو فرانس کا گورنر بنایا گیا۔ اس نے کافی تیاریوں کے بعد 732ء میں موسمِ بہار کے دوران ''پیرانیس'' کو عبور کیا۔ بورڈن بندرگاہ کے قریب فرانسیسیوں نے ڈیوک آف اچیٹین کی سرپرستی میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ ڈیوک کو شکست فاش ہوئی اور بورڈن پر قبضہ ہوگیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے جنوبی فرانس کا سارا جنوبی علاقہ فتح کرلیا۔ یہاں سے وہ شمال کی جانب بڑھا طورس کے میدانوں میں جس کے قریب آج کا جدید پیرس آباد ہے، وہاں فرانس کے بادشاہ چارلس مارٹیل سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔

مارٹیل جرمن بادشاہ پپین دوم کی ناجائز اولاد تھا، فرانس کے شمال مشرقی حصہ پر پپین کا کنٹرول تھا۔ مارٹیل نے پڑوسی فرانسیسی اور جرمن بادشاہوں کی افواج کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اب طورس کا وہ تاریخی اور فیصلہ کن معرکہ شروع ہوا، فرانس کی افواج جو ہتھوڑوں اور لمبے نیزوں سے لیس تھیں وہ اپنی جگہ پر مضبوطی

سے ڈٹے رہے اور مسلم گھوڑسوار برق رفتار دستوں کا مقابلہ کیا۔ امیر عبدالرحمٰن اپنی افواج کے ساتھ خود میدانِ جنگ میں کود پڑا، دوسرے دن ایک معرکہ میں وہ مارا گیا اپنے امیر کے مارے جانے کے بعد مسلم افواج رات کی تاریکی میں پیچھے ہٹ گئی، اس جنگ میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان مارے گئے۔

شمالی یوروپ پر یہ مسلمانوں کا آخری بڑا حملہ تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ طورس کی جنگ سے مسلمانوں

کی کمر ٹوٹ گئی۔ یوروپ پر اور دوسرے بڑے حملے نہ ہونے کی اصل وجہ شمالی افریقہ میں بربروں کی بغاوت اور دور وسط ایشیاء اور مشرق وسطی میں عباسیوں کا انقلاب ہے۔ ویسے مسلمانوں کی جنگی طاقت اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن رسد کی فراہمی پر بہت زیادہ بار پڑ رہا تھا، طویل محاذ آرائی کی وجہ سے فوجی بھی بے چین ہو رہے تھے۔ وہ جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ طویل عرصہ تک گھروں سے دوری لگا تار جنگیں، آرام کی کمی، یہی وہ وجوہات تھیں جن کے باعث مسلم افواج اپنی قوت سے جنگ نہیں لڑ سکیں۔

طورس کی شکست کے باوجود یوروپ کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی پیش قدمی جاری رہی۔ فرانس کے جنوبی حصوں پر مسلمان تقریباً ایک سو سال سے زیادہ عرصہ تک قابض رہے۔ 734ء میں مسلمانوں نے آرلس، سینٹ ریمی، اور اویگان پر فتح حاصل کی، لائنس اور برگنڈی پر پھر سے قابض ہو گئے۔ آٹھویں اور نویں صدی کے دوران فرانس کے مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحلوں پر اسلامی افواج کامیاب حملے کرتی رہیں۔ 889ء میں مسلمان مغربی سوئٹزرلینڈ پر قابض ہو گئے۔ تقریباً دو سو سال تک انکے قدم یہاں جمے رہے۔ اسپین پر عبدالرحمٰن سوم (939ء تا 942ء) کے دورِ حکومت میں مسلمان فراکسی نے ٹم Fraxinetum، ولائنس، جنیوا، تولان اور گریٹ سینٹ برنارڈ پر بھی قابض ہو گئے وہاں اپنی پوزیشن کو مستحکم بنایا۔ اس کے بعد فاتح افواج جنیوا کی جھیل کے اطراف پھیل گئیں۔ 956ء میں پہاڑوں کے ان دروں تک پہنچ گئیں۔ جو سوئٹزرلینڈ کو اٹلی سے ملاتی ہیں۔

مسلمانوں کی جنگی طاقت دسویں صدی کے بعد کم ہونے لگی۔ اس کی اہم وجہ اسپین میں مسلمانوں کی اپنی خانہ جنگیاں تھیں۔ جن کی وجہ سے آخر کار 1032ء میں اسپین سے بنوامیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور خلافت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی۔ اکثر یہ ایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں۔ لڑائیوں میں عیسائیوں سے مدد طلب کی جاتی تھی، مغرب میں بربر ہمیشہ شورش مچایا کرتے تھے۔ جب بنو اغلب ابھرنے لگے تو شمالی افریقہ پر عباسی خلافت کی گرفت کمزور ہو گئی۔ آخر کار یہاں قبائلیوں کی بغاوت کی وجہ سے اسپین کی خلافت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ آگے چل کر اغلبوں کے خاتمہ کے بعد فاطمیوں نے عروج حاصل کیا۔ انہوں نے شمالی افریقہ میں اپنے پیر جمائے۔ 969ء میں مصر پر فتح حاصل کرنے کے بعد ان کی حکومت اور

مضبوط ہوگئی۔ مصر کے فاطمی، بغداد کے بنوعباس، اور قرطبہ کے بنوامیہ آپس میں مسلکی اختلافات میں الجھے رہے۔ یہ اختلافات اس قدر بڑھے کہ تینوں باہمی جنگوں میں الجھ گئے۔ خانہ جنگیوں کے اس طوفان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1050ء میں صلیبی جنگوں کے ابتدائی دور میں ہی عیسائیوں نے جنوبی فرانس، اٹلی اور بحیرۂ روم کے جزائر مسلمانوں سے چھین لئے۔

جنگ طورس تاریخ عالم کا ایک اہم ترین موڑ ہے اس جنگ میں چارلس مارٹیل کو شکست دینے میں ناکامیاب ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوروپ عیسائی بنا رہا۔ باہمی جنگیں مسلمانوں کی طاقت کو گھن لگاتی رہیں۔ اس کے بعد مسلمان پھر کبھی یوروپ پر بھرپور حملہ کرنے کے قابل نہ ہوسکے۔

دسواں باب

بنوعباسیہ کا انقلاب

اسلامی تاریخ میں بنوعباسیہ کا انقلاب پہلا قومی سیاسی تغیر ہے جو کہ اہم ترین اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔اس انقلاب کے نتیجہ میں ایک خاندانی حکومت تباہ ہوگئی اوراس کی جگہ دوسرے خاندان نے لے لی۔ 750ء میں رونما ہونے والا یہ انقلاب آج بھی ہمارے لئے وہی درس دیتا ہے جواس دور کے لئے صحیح تھا۔

تہذیبیں باطنی طور پر تباہ ہوتی ہیں ۔ بیرونی عناصران تہذیبوں کوتغیر پذیر ہونے کے لئے صرف خارجی سامان فراہم کرتی ہے اسلامی تاریخ بھی اس سے کچھ الگ نہیں ہے۔تاریخ عالم میں مسلمانوں کونظر انداز کئے جانے کی اولین وجہ مسلمانوں کا اپنا اندرونی خلفشار ہے۔اگرکوئی 740 میں زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ اسلامی حکومت کی سرحدیں پیرس سے لے کرلاہورتک پھیلی ہوئی ہیں۔اس کے باوجود اسلامی حکومت کے اس عظیم الشان محل کے اندر ایسی تخریب کارقوتیں پنپ رہی تھیں جواس محل کی بنیاد کو پارہ پارہ کرسکتی تھیں۔ اسلامی تاریخ کے ایک طالبِ علم کے سامنے یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ کونسی اندرونی طاقتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو بکھیر دیا۔

تاریخی سچائی یہ ہے کہ عقائد انسان کے ہرایک عمل کا احاطہ کرتے ہیں۔ مذہبی عقائد، اقتصادیات، تمدنیات، سیاست، حکومت، نظم ونسق سائنس، فنونِ لطیفہ اورتہذیب ہرایک انہی عقائد کے خوشہ چین ہیں۔ اسلامی عقائد زندگی کے ان تمام امور کا احاطہ کرتے ہیں اوراس عقیدہ کا نام توحید ہے۔جس تہذیب کی بنیاداس پر رکھی جاتی ہے خالص توحید پرست تہذیب ہوتی ہے۔موجودہ دور کے اکثر مسلمانوں نے توحید کو صرف ایک ہی نظریہ میں بند کردیا وہ ہے اللہ پر یقین رکھنا اوراس عقیدہ سے وابستہ دوسرے تمام اہم ترین

پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

بنو امیہ اپنی شان و شوکت سے اس لئے ہاتھ دھو بیٹھے کیونکہ وہ اس توحید پرست تہذیب سے کنارہ کش ہو گئے تھے جس کی بنیاد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی اور جس پر چاروں خلفاء راشدین عمل کرتے رہے۔ بنو امیہ اعلیٰ درجے کے سپاہی تھے بہترین سیاست دان تھے جس کی بہترین مثال حضرت امیر معاویہؓ اور ولید اول ہیں۔ اسی بنو امیہ کے سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے نیک نفس اور خدا ترس امیر بھی ہوئے۔ ان تینوں کے علاوہ بقیہ تمام حکمران انتہائی ظالم، سرکش، جابر اور نیک نفسی سے دور تھے۔ بنو امیہ کے حکمرانوں کی سب سے نمایاں خامیاں یہ تھیں۔

(1) بنو امیہ اپنی حکومت کو قانونی طور جائز قرار دینے میں ناکام رہے۔ رسول اکرم ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے فوراً بعد جانشینی اور اس کے قانونی جواز ہونے کا مسئلہ درپیش آیا تھا۔

ہم نے پہلے باب میں یہ بتلا دیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کس طرح خلیفہ منتخب ہوئے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کن بلا خیز حالات میں حضرت علی بن ابی طالبؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ ان سوالات پر بحث ہوتے ہوتے سرکار دو عالمؐ کے جانشین کے سوال پر 740ء تک مختلف مکاتب فکر وجود میں آ گئے۔ ان میں سے کچھ اہم مکاتب فکر کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے اس کے ذریعہ ہمیں بنو عباس کے عروج کے صحیح تناظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جس نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے اور یہ تقسیم آج بھی جاری ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ اور متنازعہ فیہ مسائل ہیں۔ ہم صرف انکا اقتباس پیش کر رہے ہیں۔

(2) حضرت ابو بکر صدیقؓ کا خلیفہ چنے جانے کا عمل متفقہ نہیں تھا۔ ابن خلدون نے ابن عباسؓ اور حضرت ابو بکرؓ کا ایک مکالمہ قلمبند کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت علیؓ کو ہی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح جانشین سمجھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد یہ اختلافات کچھ اور ابھرے۔ جانشین کے انتخاب کے لئے انہی کے نامزد کردہ مجلس شوریٰ میں بھی یہی اختلافات ابھر آتے ہیں۔ اکثریت نے صرف قرآن اور سنت کو تسلیم کیا بلکہ صحابہؓ کے اجماع پر بھی سر تسلیم خم کیا۔ حضرت عثمانؓ کے حامیوں نے بھی اسی نظریہ کو ہی مانا۔ دوسری جانب حامیان حضرت علیؓ کا یہ نظریہ تھا کہ ولایت کا

علم قرآن اور سرکاردوعامؐ کی سنت سے ہوتے ہوئے آنحضورؐ کی جانب سے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو عطا ہوا، وہ لوگ جنہوں نے اس دوسرے نظریہ کا اتباع کیا وہ شیعتِ علی یا شیعانِ علی کہلائے۔

عرب کے اندرونی تناظر سے دیکھا جائے تو قوم کی سرداری کے لئے یہ کشمکش، یہ تفرقہ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی طرف سے برابر آ رہا ہے۔ حضرت علیؓ رحمتِ عالمؐ کے چچیرے بھائی اور ہاشمی تھے جبکہ حضرت معاویہؓ نسب کے اعتبار سے بنو امیہ سے تھے جنگ صفین اور کربلا کے المناک واقعات کی وجہ سے ان دونوں قبیلوں کے درمیان محبتوں کی نہیں بلکہ نفرتوں کی دیوار حائل ہوگئی۔ بنو امیہ نے بنو ہاشم کی لیڈر شپ پر ہمیشہ کڑی نظر رکھی اور اکثر اوقات ان کے ساتھ سخت اور ظالمانہ برتاؤ روا رکھا۔

اکثریت کی وہ جماعت جس نے قرآن سنتِ رسول اکرمؐ اور صحابہ کے اجماع پر لبیک کہا وہ آگے چل کر راسخ العقیدہ سنی کہلائے، سیاسی طور پر یہ مطلب نکلتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو خلافت کے صحیح اور جائز جانشین مانا، اسے صحابۂ کرام کی متفقہ رائے مانا، اس نظریہ کی ترکیوں، مغلوں، شمال اور مغرب کے شاہی خاندانوں کے سلسلہ، اسپین، ملیشیاء اور انڈونیشیا وغیرہ نے حمایت کی۔ آج دنیا کے نوے ٪۹۰ فیصد مسلمان اس مسلک کے حامی ہیں، حضرت علیؓ کی حامی جماعت اس بات کی قائل ہے کہ قرآن وسنتِ رسول اکرمؐ کے ذریعہ ہوتے ہوئے ہی حضور سرور عالمؐ کی وساطت سے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو ولایت حاصل ہوئی۔ اس جماعت کے افراد شیعہ کہلائے ان کا ایک یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ ولایت حضرت علیؓ کے ذریعہ انکے جانشین ائمہ کرام کو بہ طور امانت ملتی رہی ہے۔ ایران کے صفوی خاندان نے جس کا دورِ حکومت 1500ء سے 1720ء تک رہا اس مسلک کو اپنایا اس کے حامی بنے اور اسے تقویت دی اور پروان چڑھایا۔ عالم اسلام کے تقریباً دس فیصد ٪۱۰ فیصد مسلمان اسی نظریہ کو صحیح مانتے ہیں۔

750ء تک آتے آتے یہ شیعہ نظریہ مزید تقسیم کا شکار ہوا۔ کربلا میں حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد امامت کی ذمہ داری انکے بیٹے حضرت زین العابدین کے سر آئی جنہیں علی بن حسینؓ بھی کہا جاتا ہے۔ آلِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بنی امیہ کا دباؤ بہت جابرانہ اور بہت ہی ظالمانہ تھا۔ اسی لئے حضرت زین

العابدینؒ نے اپنی ساری طاقتیں، اپنا پورا پورا دھیان اپنی روحانی قوت کو قوم کی باطنی تعمیر کی جانب مرکوز کردیا، سیاست سے کنارہ کشی انکے کچھ حامیوں کو منظور نہ تھی۔ وہ تو سیاست میں کچھ زیادہ ہی اقتدار چاہتے تھے۔ انہوں نے اس میدان میں زیادہ فعال لیڈر کی تلاش شروع کردی۔ حضرت زین العابدینؒ کے فرزند حضرت زیدؒ نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ کوفہ کے کچھ لوگوں نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سے حوصلہ پا کر بنوامیہ کے خلاف انہوں نے جنگ کا اعلان کردیا۔ کوفی تو تاریخی طور پر بے وفائی کے لئے مشہور ہیں۔ ان بے وفا کوفیوں نے ان کا عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیا۔ حضرت زیدؒ میدانِ جنگ میں شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت کی وجہ سے شیعہ فرقہ میں زیدی شاخ کی ابتدا ہوئی۔ زیدی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ کو خلیفہ مانتے ہیں علاوہ اس کے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدینؒ اور حضرت زید کو امام عالی مقام مانتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی خلافت کو نہیں مانتے۔ تاریخ کے لئے زیدیوں کی دین یہ ہے کہ انہوں نے اومان اور مشرقی افریقہ میں اسلام کی اشاعت کی اور سولہویں صدی عیسوی کے دوران پرتگیزی حملہ آوروں کا انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا۔

پانچویں امام، حضرت جعفر الصادقؒ کے بعد شیعان علیؓ میں دوسری مرتبہ پھوٹ پڑ گئی۔ ان کی اپنی زندگی میں ہی انکے پہلے فرزند اسمعیلؒ انتقال فرما گئے جس کی وجہ سے امام جعفرؒ اپنے دوسرے بیٹے حضرت موسیٰ کاظمؒ کو امام مانتے رہے یہی جماعت اسمٰعیلیہ فرقہ کے نام سے موسوم ہے۔ انہیں فاطمی بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی بی بی فاطمۃ الزہراءؓ کے عقیدت مند ہیں۔ بنو فاطمہ نے نویں اور دسویں صدی عیسوی کے دوران مصر، شمالی افریقہ، حجاز اور فلسطین کو فتح کرنے کے بعد اسلامی تاریخ میں مرکزی کردار ادا کیا، دسویں صدی عیسوی میں بنو فاطمہ نے ہی اٹلی کو فتح کرنے کے لئے زبردست جدوجہد کی۔

جب گیارہویں صدی میں صلیبیوں نے یروشلم پر حملہ کیا تو یہی فاطمی تھے جنہوں نے پہلے ان صلیبیوں کے حملوں کو برداشت کیا۔ دسویں صدی عیسوی میں انہی کی فوجی طاقت کی وجہ سے ہی اسپین کی اموی حکومت کو تقویت ملتی رہی۔ دسویں گیارہویں بارہویں صدی عیسوی کے دوران بنی فاطمہ کے اثرات حد

سے زیادہ بڑھنے لگے تو بغداد کی راسخ العقیدہ سنی خلافت کو فاطمیوں سے بچانے کے لئے ان کے حملوں سے بغداد کا دفاع کرنے کے لئے سلجوقی ترکوں کو آگے بڑھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ آخر کار بارہویں صدی میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے فاطمیوں کا خاتمہ کیا۔

بات کو واضح کرنے کے لئے مسلمانوں میں رائج مختلف مسالک کا ایک خاکہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ ''سنی'' قرآن، سنتِ رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے اجماع پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ چاروں خلفاء یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو خلفاء راشدین مانتے ہیں۔ اثنا عشری قرآن، سنتِ نبوی مکرمؐ اور بارہ ائمہ کرامؒ کی امامت کو مانتے ہیں یعنی حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زید العابدینؒ، حضرت محمد باقرؒ، حضرت جعفر صادقؒ، حضرت موسیٰ کاظمؒ، حضرت علی رضاؒ، حضرت جواد راضیؒ، حضرت علی نقی معاویؒ، حضرت حسن عسکریؒ اور محمد مہدیؒ۔ سباعی صرف اولین سات اماموں کو، فاطمی پہلے چھ ائمہ کرام کے علاوہ حضرت اسماعیل کی امامت کو بھی مانتے ہیں۔ اثنا عشری فاطمی اور سباعی ان سبھوں کو شیعہ کی حیثیت سے ہی جانا جاتا ہے۔ کچھ تاریخ داں انہیں علوی بھی لکھتے ہیں۔ زیدیوں نے شیعہ اور سنی عقائد کی درمیانی راہ کو اپنایا۔ زیدی پہلے چھ ائمہ کرامؒ اور زید بن علیؒ کی امامت کو مانتے ہیں۔ علاوہ اس کے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کو بھی مانتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمان کی خلافت کو نہیں مانتے۔ ہمیں یہاں اس بات پر زور دینا چاہئے کہ تمام مسلمان قرآن اور سنتِ رسول کو مانتے ہیں اگر نہیں مانتے تو انسان کے معاملات کے اس معیار کو جس کے مطابق اسلامی تاریخ میں انسانی اقدار کو آپسی معاملات کی کسوٹی پر ناپا جاتا رہا ہے۔ اس کی مثال ایک بڑے درخت کی طرح ہے جس کے الگ الگ ڈالیاں ہوتی ہیں لیکن چھاؤں گھنی ہوتی ہے اسی طرح اسلامی فقہ کی ان الگ الگ ٹہنیوں کی ٹھنڈی چھاؤں تمام امت مسلمہ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے بغیر بھی اسلامی تاریخ ویسی نہ رہے گی جیسی کہ اب ہے۔

حضرت امام جعفرؒ کے زمانے میں ایک اور مسلک نے جنم لیا جس نے اسلامی تاریخ پر زبردست اور انمنٹ نقش چھوڑے۔ امام جعفرؒ کی سیاسی خاموشی کی وجہ سے ان کے کچھ پیروکار ناراض ہو گئے۔ انہوں

نے قیادت کے لئے کسی اور کی تلاشی شروع کر دی۔انہوں نے محمد بن حنفیہؒ کی شخصیت میں اس قائد کو پالیا۔ یہ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے بیٹے تھے۔حضرت بی بی فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے جو دوسری شادی کی تھی ان کے بطن سے یہ پیدا ہوئے تھے۔علویوں کی غیر فاطمی شاخ کی ابتداء یہیں سے ہوئی۔محمد بن حنفیہؒ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ابو سلیمان عبداللہؒ امام ہوئے لیکن بنو امیہ کے خلیفہ سلیمان نے انہیں زہر دے دیا۔ جب وہ بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے تو انہوں نے امامت کا منصب عطا کرنے کے لئے اپنے اطراف نظر ڈالی لیکن اپنے اہل وعیال میں سے کسی کو بھی اس منصب کا اہل نہ پایا۔قریبی شہر میں بسنے والے محمد بن علی عباسؒ پر ان کی نظر انتخاب پڑی جو کہ ہاشمی تھے۔محمد بن علی عباسؒ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے پوتے تھے۔اس طرح تاریخی حالات کے ایک موڑ کی وجہ سے امامت کی ایک شاخ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے اہل وعیال سے حضرت عباسؓ کے اہل وعیال کی طرف منتقل ہوگئی۔ یہ شاخ بنوعباس کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بنوعباس ہی تھے جنہوں نے 750ء میں بغداد میں اپنی خلافت قائم کی جو کہ پورے پانچ سو سال تک قائم رہی۔ یہ خلافت بڑی شان وشوکت وآن بان کی تھی۔ بنو عباس بغداد سے ایک انتہائی وسیع علاقہ پر اس وقت تک حکومت کرتے رہے جب تک 1258ء میں منگولوں نے بغداد کو تباہ وبرباد نہیں کر دیا۔

محمد بن علی عباسؒ ان تھک کام کرنے والے انسان تھے انہوں نے اپنی محنت سے بنوعباس کے مقصد کی تکمیل کے لئے سارے عراق ، ایران، خراسان اور موجودہ دور کے ان وسطِ ایشیائی جمہوری مما لک ترکمان، کرخیزیا، تاجک، ازبک کے عوام میں اپنے حامیوں کا ایک جال بچھا دیا۔محمد بن علی عباسؒ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ابراہیمؒ امام بنے۔ جیسے جیسے بنوعباس کی یہ تحریک زور پکڑنے لگی کہ خلافت پر بنو ہاشم کا ہی اصل حق بنتا ہے۔اس کی ایک شاخ ہونے کی وجہ بنوعباس خلافت کے حقدار ہیں۔ ویسے ویسے بنوامیہ کی جانب سے بنو ہاشم پر ظالمانہ دباؤ بڑھتا گیا۔ بنوامیہ کے خلیفہ مروان نے ابراہیمؒ کو گرفتار کرلیا اور قید خانے میں ڈال دیا۔ آخر کار کھولتے ہوئے چونے میں ان کا سر ڈبو کر انہیں شہید کر دیا۔ مرنے سے پہلے ابراہیم اپنے بھائی ابوالعباس عبداللہؒ سے ربط قائم کرلیا اور انہیں امام مقرر کر دیا۔ ابوالعباس عبداللہؒ

نے قسم کھائی کہ وہ اپنے بھائی کی اس ظالمانہ موت کا بدلہ لیں گے۔آ گے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے انتہائی بے دردی سے یہ بدلہ لیا۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے پوری ایک نسل بعد ہی بنو عباس کی حکومت کو نظریاتی جواز مل سکا۔ 770ء میں خلیفہ منصور نے ایک خارجی کے سوال پر یہ جواز فراہم کیا تھا۔ان کا نقطۂ نظر تھا، سرکار دو عالمؐ کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی تھی۔ وراثت باپ سے بیٹوں کو ملتی ہے۔اس لئے حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی اولاد کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت پر کوئی حق نہیں ہے۔اس لئے وراثت خود بخود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی نرینہ اولاد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

عباسیہ انقلاب کے دوران خلافت کے بارے میں ایک اور نظریہ ابھر آیا جو انتہائی دوررس سیاسی نتائج کا حامل رہا۔لیکن یہ نظریہ آنے والی صدیوں میں اپنی تاثیر کھو بیٹھا۔اس نظریہ کو خارجیوں نے پیش کیا تھا انہوں نے یوں دلائل پیش کئے کہ خلافت پر صرف بنو ہاشم یا بنو امیہ کی ہی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ اس پر تمام مسلمانوں کا برابر حق ہونا چاہئے۔ چاہے وہ عربی ہوں کہ عجمی بہ ظاہر یہ جمہوری نظریہ اسلام کے سیاسی ڈھانچے کے کنارے سے ہمیشہ چھلکتا رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ خارجیوں نے اپنے انتہاء پسند مطالبہ کے لئے انتہائی قاہرانہ اور جابرانہ راہ اپنائی۔

740ء میں اسلام کے سیاسی افق پر طوفان کے آثار دکھائی دے رہے تھے طوفان کے یہ بادل ایک نئے انقلاب کی طرف اشارہ کر رہے تھے اسلام کا سیاسی نظام خلافت اور امامت کے باہم متصادم ہونے والے دعویداروں سے گھرا ہوا تھا۔ بنو امیہ برسر اقتدار تھے، لیکن اس اقتدار کو دھیرے دھیرے بنو ہاشم، بنو عباس کے ذریعہ چیلنج کر رہے تھے۔ بنو عباس نے علویوں سے یہ میراث ایک تاریخی حادثہ کے ذریعہ پائی تھی لیکن خود علوی زیدیوں فاطمیوں، سباعیوں اور اثناعشریوں میں بٹے ہوئے تھے۔

بنو امیہ، سیاست کے ایوان میں حضرت علی بن ابی طالبؓ کی شہادت کے بعد زبردستی گھس آئے تھے اور اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تھی حالانکہ بنو امیہ نے خلافت کو انتخابی اجماع سے نکال کر شخصی بادشاہت میں تبدیل کر لیا تھا لیکن سیاسی ضرورت کے تحت انہوں نے راسخ العقیدہ سنی مسلک کو بڑھاوا دیا لیکن وہ بنو ہاشم

یا شیعانِ علی کے مطالبہ کو بزور طاقت دبا نہیں پائے سوائے عمر بن عبد العزیز کے کسی اور اموی امیر نے مسلمانوں میں جاری وساری اختلافات کو دور کرنے کی سنجیدگی کے ساتھ کوششیں نہیں کی۔ رسہ کشی جاری رہی جسکی وجہ سے خارجیون کے خلاف مسلسل جنگیں ہوتی رہیں کبھی کبھی شیعانِ علی کے ساتھ بھی خونین جھڑپیں ہوتی رہیں جیسا کہ کربلا کے واقعہ سے ظاہر ہے۔

بنوامیہ ہمیشہ سے ان اعتراضات کی زد میں رہے کہ انہوں نے اقتدار کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے غصب کرلیا ہے۔ یہ ان کا کمزور سیاسی بازو تھا اور یہی وہ نظریاتی نقطۂ نظر تھا جہاں سے عباسی تحریک نے ان پر حملہ کیا۔

(3) بنوامیہ کے بیانوے سالہ دورِ حکومت میں توحید کی جگہ دینار نے لے لی۔ حکّام یہ بھول گئے کہ اسلامی حکومت آسمانی امانت ہے اور اس کا اولین عمل توحید پرستی کو پھیلانا ہے۔ یہی وہ اعلیٰ و برتر فلسفیانہ تبدیلی تھی جس نے مجاہدوں کو حجاز کے ریگستان سے اٹھا کر پیرس کے کنارے اور دریائے سندھ کے ساحل تک پہنچا دیا۔ یہ اعلیٰ فلسفہ بنوامیہ کے دور میں کہیں کھو گیا۔ بنوامیہ بھی ایشیاء یا یوروپ کے سلاطین کی طرح بادشاہت کا ایک سلسلہ بن کر رہ گئے جن کا مطمحِ نظر دولت اور اقتدار تھا بادشاہ ٹیکس یا لگان جمع کرنے میں جٹ گئے تاکہ دمشق میں واقع ان کے عالیشان محلوں کی شان وشوکت کو برقرار رکھا جا سکے۔ وہ روحانی لیڈر شپ کا حق کھو بیٹھے۔ جہاں عقیدہ کمزور ہوجاتا ہے وہاں تہذیب زوال پذیر ہوجاتی ہے۔ جب روحانیت کھو جاتی ہے تو سیاسی اقتدار تلوار کے زور سے ہی قائم رکھا جاتا ہے۔ بنوامیہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ان کی حکومت حد سے زیادہ جبری ہوتی گئی جسے قائم رکھنے کے لئے ظلم کا سہارا لینا پڑا۔ اس جبر و تشدد کے لئے صرف بنوامیہ کو ہی دوش دینا غلط ہوگا - اسلامی سیاست کا نظام پہلے چار خلفائے راشدین کے بعد خدا ترسی سے دور ہوگیا۔ اس کے بعد صرف ایک ہی مرتبہ حکومت کو آسمانی امانت سمجھا گیا اس کی مثال یوں دے سکتے ہیں۔ برصغیر ہند میں تیرہ سے سترھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے حکومت کی۔ لیکن ان مسلمان بادشاہوں نے تبدیلیٔ مذہب کو روکنے کی کوششیں کی، صرف اس وجہ سے کہ اس سے ان کے لگان اور آمدنی میں کمی ہوجاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ سو سال حکومت کرنے کے باوجود ہندوستان میں

صرف ایک چوتھائی لوگ ہی اسلام قبول کر پائے۔

(4) بنوامیہ نے اسلام کے بنیادی پیغام کو بھلا دیا وہ نومسلموں کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کرتے۔ اکثر نومسلموں کو مذہبِ اسلام قبول کرنے کے باوجود جزیہ دینے پر مجبور کیا جاتا۔ امام ابوحنیفہؒ نے - جو عباسی انقلاب کے دوران زندہ تھے- اس ناانصافی کے خلاف جہاد کیا انہوں نے اپنے فتوے میں کہا اسلام قبول کرنے والے نومسلم ترک کا عقیدہ بھی عربوں اور حجازیوں کے عقیدے کے برابر ہے، لیکن بنوامیہ نے ایسی اصلاحات کا برا مانا اور امام ابوحنیفہ کو ان کی تحریک کی وجہ سے قید کر دیا گیا۔ خراسان اور ایران میں عرب فوج اور نظامِ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے اس کا نتیجہ نسل پر مبنی تقسیم اور علحدگی پسندی کی صورت میں نکلا۔

اسلام میں بے شمار لوگوں کے داخل ہونے کے ساتھ ہی طاقت کا مرکز نومسلم ایرانیوں اور ترکیوں کی طرف منتقل ہو گیا جنہیں ایوانِ اقتدار کے فائدہ بخش عہدوں سے دور رکھا گیا تھا۔ اس دور میں سماجی ڈھانچہ یوں دکھائی دینے لگا تھا جیسے کوئی اہرام الٹ دیا گیا اور ہر چیز اس وقت الٹی نظر آ رہی تھی۔ اپنے کو برتر سمجھنے والے عرب اقلیت اس کے اقتدار سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اب سماجی انقلاب کے لئے راہ بالکل ہموار تھی اور سماجی، اقتصادی وسیاسی ناانصافی کے اس اہرام کے گرنے میں صرف کچھ لمحات ہی باقی رہ گئے تھے۔

(5) کرپشن جو سیاست کے اعلیٰ ایوانوں سے شروع ہوا تھا، ہوتے ہوتے گورنروں اور چھوٹے چھوٹے عہدہ دار تک اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ حجاج بن یوسف کی سفاکی اور بربریت تو ایک زبان زد خاص وعام کہاوت بن گئی، عہدہ داروں کو ایمانداری واہلیت کی وجہ سے ترقی دینے کے بجائے جیسا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد میں ہوا کرتا تھا یا جیسا کہ اسی دور کے چینی شہنشاہیت تانگ میں قابلیت اور امتحان کی بنیاد پر ہوتا تھا، بنوامیہ کے گورنروں اور عہدہ داروں کا انتخاب شاہی خاندان کے افراد سے ان کو وفاداری کی بنیاد پر ہونے لگا۔ گورنروں کے ظلم وستم کو ایک سرمایہ، ایک قابلیت کے طور پر شمار کیا جاتا۔ اس اقرباء پروری، عوام کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کو مفتوح علاقوں کو قابو میں رکھنے کا ایک طریقہ خیال کیا جاتا۔ دراصل دمشق کے حکمران دور دراز صوبوں کو اپنے قابو میں رکھ نہیں سکے۔ اس دور کا مواصلاتی نظام بھی ایسا نہ تھا کہ رابطہ برابر قائم رہتا۔ اس سے جب کافی فاصلہ پر واقع صوبۂ خراسان سے بنوامیہ کے خلاف مضبوط

چیلنج نے سر اٹھایا تو دمشق کا ردعمل کافی آہستہ کمزور اور غیر مربوط رہا۔

(6) بنوامیہ سماج میں اتحاد قائم رکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے۔ رعایا میں اتحاد کو فوقیت دینے کے برخلاف وہ عرب قبائل کے آپسی چھوٹے موٹے جھگڑوں میں جانبدارانہ رویہ اپنانے لگے، اسلام کے آنے سے پہلے عربستان کے عرب قبائلی عصبیت میں گرفتار تھے، معمولی سی باتوں پر نسل در نسل لڑائیوں میں جنگوں میں الجھ جاتے۔ یہ قبائل دو بڑے دھڑوں میں منقسم تھے ایک تھا مزروعی، شمالی عرب کے قبائل، دوسرا حصہ تھا یمنی جو جنوبی عرب کے قبائل پر مشتمل تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل کے زخموں پر مرہم لگایا، ان میں اتحاد واخوت پیدا کیا، انہیں باہم شیر وشکر کر دیا۔ آپسی بھائی چارہ کی ڈور سے مضبوط باندھ دیا۔

بنوامیہ کے دور میں یہ قبائلی تقسیم ایک بار پھر ابھر کر آئی۔ مزروعی قبائل بنوامیہ کا ساتھ نباہ رہے تھے۔ انہی کی پالیسیوں کی وجہ سے جنوب کے عربی قبائل یعنی یمنی بنوامیہ کے دشمن بن گئے۔ نو زائیدہ عباسی انقلاب کے معماروں نے اس تقسیم کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

(7) ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بنوامیہ دھیرے دھیرے شہری تمدن کے عادی ہو گئے اور وہ عربوں کی اس بنیادی صحرائی عادات وخصلتوں کو چھوڑ بیٹھے۔ شہری زندگی کا بگاڑ ''عصبیہ'' کو تباہ کر دیتا ہے۔ ابن خلدون کے مطابق ''عصبیہ'' یعنی یہی قبائلی اتحاد تہذیبوں کا جنم داتا ہوتا ہے۔ آگے چل کر آنے والے اموی خلفاء دمشق کی عیش وعشرت بھری رنگینیوں میں یوں گم ہو گئے کہ وہ اپنے آباء واجداد کی اعلیٰ قابلیتوں سے دور ہو گئے۔ ان کے اس مردانہ وار آگے بڑھنے کے حوصلہ، طاقت، ولولہ اور اصلی جوش کو یہ بمشکل سمجھ سکتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں اب وہ وقت آ گیا تھا کہ بنوامیہ تاریخ کے اسٹیج سے ہٹ جائیں۔

بنوعباس ہر اس میدان میں کامیاب رہے جہاں بنوامیہ ناکام رہے تھے۔ ان کی قیادت انتہائی قابل رہبر کے ہاتھ تھی جس کے پاس ایک اعلیٰ مقصد حاصل کرنے کا جذبہ تھا جس نے بہترین سپہ سالار میدان جنگ میں اتارے، شاطرانہ چالوں سے حریف کی کمزوریوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

اس انقلاب کی مرکزی شخصیت تھی ابومسلم خراسانی، یہ ایرانی نژاد تھا۔ پیدائش اصفہان میں ہوئی، اس طرح مظلوم ایرانی اکثریت کے لئے پیدائشی طور پر معصومیت کی سند لئے ہوئے تھا۔ ابتدائی پرورش کوفہ

میں ہوئی جہاں کے عوام نے عربوں کے بزعم خود اعلیٰ نسبی ہونے کے غرور وغصہ کا ذائقہ بھی اچھی طرح چکھا تھا۔عباسیوں کا پروپگینڈہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ذریعہ عراق میں ہورہا تھا۔ابومسلم کو پروپگینڈہ کا پہلا ہتھیار ایک عباسی داعی عیسٰی بن موسیٰ سراج کے ذریعہ ملا۔اس کی عقلمندی اور قابلیت نے جلد ہی ابومسلم کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔اوراس نے امام محمد بن علیؓ سے اس کا تعارف کروایا۔امامؒ نے اس نوجوان میں اندرونی طور پر چھپی ہوئی ان قابلیتوں کو پہچان لیا، کچھ وقت بعد اسکوخراسان میں مقرر کردیا۔ یہ واقعہ 744ء میں ہوا۔

خراسان میں عدم اطمینان کا لاوہ پک رہا تھا۔بنوامیہ کے ظلم وستم کی اس وراثت نے مقامی عوام میں انتہائی تلخی گھول رکھی تھی ۔غیر منصفانہ محصول اور لگان کی وجہ سے ایرانیوں کے دلوں میں عربوں کے لئے نفرت پنپ رہی تھی۔عرب بذات خود کئی قبائل میں بٹے ہوئے تھے، بنوامیہ نے لائق انسانوں اور علماء کا منہ یاتو بند کردیا تھا یا علماء مجبوراً آپ خود عوامی زندگی سے ہٹ کر گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ایسے ماحول میں بنو ہاشم اوراہل بیت کے حقوق کے لئے عباسیوں کا پروپگنڈہ عوام میں بہت جلد مقبول ہوگیا۔علویوں نے بھی عباسیوں کا ساتھ دیا ان کے لئے نفرت انگیز بنوامیہ کو ہٹانے اور شاید حضرت علیؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے گھرانے کی حکومت ایک بار پھرلانے کا یہ بہترین موقع تھا۔عام آدمی بھی بنوامیہ کے عہدہ داروں کے ظالم اورغیر انسانیت بھرے سلوک سے تنگ آچکے تھے اوران سے نجات کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

خراسان کا گورنر اس وقت نصر بن سیار تھا، وہ ایک لائق، بنوامیہ کا وفادار مزروعی عرب تھا،اس کی عمر اسی برس سے تجاوز کرچکی تھی۔ دمشق میں اسکے مالک جس نظام سے حکومت چلارہے تھے وہ بھی اپنے مالکوں کی طرح اسی محدود جابرانہ سیاسی نظام کا سخت پیروکار تھا۔اس نے مقامی یمنی اور مزروعی قبائل کے جھگڑوں میں جابرانہ رویہ اپنایا اورایک قبیلے کے سردار علی کرمانی کا قتل کروادیا۔اس کی وجہ سے کرمانی کے قبیلے والے اس سے دور ہوگئے اور بنوامیہ کے پکے دشمن ہوگئے ۔عربوں کے ان داخلی جھگڑوں کو سلجھانے کی کوششیں بھی ہوئیں ۔لیکن ابومسلم نے اپنی سیاسی بازیگری سے ان دونوں قبائل کو آپس میں ملنے نہیں دیا اورانہیں ایک دوسرے سے دور رکھنے میں کامیاب رہا۔

عربوں میں ادھر جب آپسی دشمنی بڑھنے لگی تو ادھر ابومسلم نے اپنا پانسہ پھینکا۔ اپنے انتہائی کارآمد خفیہ زمین دوز نظام کے ذریعہ سب طرف یہ خبر پھیلا دی گئی کہ پچیس رمضان کو یوم ماتم منایا جائے ان تمام ائمہ کرام کی یاد میں جنہیں بنوامیہ نے شہید کیا ہے۔ مقررہ دن خراسان کے عوام نے کالے جھنڈے لہرائے اور بغاوت کی ابتداء ہوگئی۔ یہی کالا رنگ آگے چل کر بنوعباس کے نشان کا حصہ بن گیا۔ مروشہر جلد ہی روند ڈالا گیا۔ نصر نے مروان سے مدد کے لئے اپیل کی لیکن جیسا کہ تاریخ کے فیصلہ کن لمحات کے دوران ہوتا آیا ہے حالات نے ایسے کروٹ لی کہ بنوامیہ بے بس ہوکر رہ گئے۔ مکہ اور مدینہ میں خارجیوں نے زبردست بغاوت کردی۔ مروان اس بغاوت کو فرو کرنے میں لگ گیا، اور عراق کے گورنر نصر کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ عراقیوں کے خراسان کی سرحدوں پر پہنچنے تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ ابوموسیٰ نے پورے خراسان پر مکمل قبضہ جمالیا اور اب اس کے مالی و انسانی وسائل میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ عراقیوں کے لئے کوئی موقع نہ تھا وہ بری طرح شکست کھا گئے۔

تقریباً یہی وہ وقت تھا جب مروان نے امام ابراہیمؒ کو چمڑے کے تھیلے میں بھرے کھولتے ہوئے چونے میں ان کا سر ڈبو کر انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس قتل نے اور جس سفاکی سے یہ قتل کیا گیا اس عمل نے جلتی آگ پر پٹرول چھڑکنے کا کام کیا۔

ابوالعباس عبداللہؒ نئے امام بنے اور انہوں نے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ حالات تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ابومسلم نے اپنی خدمت میں اس دور کے بہترین فوجی جرنلوں کو رکھا۔ ایک قہتبہ بن شباب تھا اور یہ عربی النسل تھا اس کا تعلق مدینہ سے تھا۔ دوسرا خالد بن برمک تھا یہ ایرانی النسل تھا۔ قہتبہ نے جنوب میں اصفہان کی جانب سے نصر پر حملہ کیا، نصر بھاگا اور راستہ ہی میں مر گیا۔ قہتبہ کے بیٹے حسن نے نہاوند کا محاصرہ کرلیا۔

ادھر مروان کا بیٹا عبداللہ ایک امدادی فوج لے کر آگے بڑھا۔ 749ء میں خود قہتبہ نے کربلا کے میدانوں میں اس فوج کو شکست دے دی۔ عراق کے صدر مقام کوفہ پر مزید کسی خون خرابے کے قبضہ ہوگیا۔ عوام کو کوفہ کی جامع مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ ابومسلم نے بڑی مہارت سے غیر مطمئن ایرانی

یمنی عرب، بنوعباس اور علویوں کے درمیان ایک مضبوط اتحاد قائم کر دیا اس نے یہ بھی عقلمندی برتی کہ خلافت یا امامت کا دعویٰ نہیں کیا۔ جامع مسجد میں اس نے انتہائی جذباتی تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ عوام کی طاقت نے ہی غاصب بنوامیہ کا تختہ پلٹا ہے۔ بنوامیہ اپنے غلط کار اور جابرانہ نظام حکومت کے ذریعہ قیادت کے منصب پر اپنی فوقیت جتانے کے حق کو کھو چکے تھے۔ اب ایک نئے امام اور نئے خلیفہ کے انتخاب کئے جانے کا وقت آ چکا تھا۔ ابوالعباس عبداللہ سے بہتر اور کوئی شخصیت نہ تھی جو امامت اور خلافت دونوں کے لئے موزوں ہوتی۔ اس طرح ابومسلم نے ۱۳/رجب المرجب 132ھ یعنی نومبر 25، 749ء میں ابوالعباس کو کوفہ میں بنوعباس کا پہلا خلیفہ نامزد کر دیا۔

مروان آخر کار خواب غفلت سے جاگ اٹھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ عراق پر حملہ آور ہوا۔ مروان ایک بہادر سپاہی تھا۔ لیکن اس کے علاوہ وہ ایک خودسر اور ضدی مزاج شخص تھا۔ اس کے مقابلے میں عبداللہ بن علی کی ایک لاکھ کی فوج تھی جس کی کمان ایک قابل سپہ سالار ابوعیون کر رہا تھا۔ جنوری 25، 750ء کو عراق میں دریائے ذاب کے کنارے کشاف کے مقام پر دونوں فوجیں آپس میں ٹکرائیں، خودسر مروان نے دریا پر ایک پل تعمیر کیا اور دشمن سے مقابلے کے لئے آگے بڑھ آیا۔ اس طرح اس نے خود ہی فرار ہونے کے راستے مسدود کر دیئے۔ ظلم وستم میں پسنے والے بنوعباس نے بدلہ لینے کے جذبات سے بھرپور ہو کر زبردست حملہ کیا۔ قسمت نے اپنا کھیل کھیلا۔ مروان جب گھوڑے سے اتر رہا تھا تو اسکا گھوڑا بدکا اور اسکے بغیر ہی بھاگ نکلا۔ جب فوج نے دیکھا کہ گھوڑا مروان کے بغیر ہی بھاگا جا رہا ہے تو انہوں نے تصور کیا کہ مروان کا قتل ہو گیا۔ وہ ایک مکمل شکست تھی، بہت بڑی ہار تھی۔ مروان موصل کی جانب بھاگا لیکن وہاں قلعہ کا دروازہ اس کے لئے کھولا نہیں گیا وہاں سے وہ مغرب میں دمشق کی جانب فرار ہوا، راستے میں اس نے ایک فوج تیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بنوعباس سرگرمی کے ساتھ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ عبد اللہ بن علی نے شہر در شہر اس کا پیچھا کیا اس نے دمشق پر حملہ کیا اور اپریل 750ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے فرار ہو کر مروان مصر میں داخل ہوا اور فسطاط (جدید قاہرہ) پہنچا۔ عبداللہ بن علی نے اپنے بھائی صالح اور جنرل ابوعیون کو اس کے پیچھے روانہ کیا۔ مروان نے یہ سوچا کہ عیسائی بازنطیوں کی مدد حاصل کی

جائے ،مگراس کے ساتھیوں نے اس آپسی خانہ جنگی میں غیر کی مداخلت کورد کر دیا آخر کار دریائے نیل کے کنارے واقع ایک خانقاہ میں محصور ہو گیا ان حالات کے باوجود اس نے خود سپر دگی سے انکار کیا۔ ہاتھ میں تلوار سنبھالی اور جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔لیکن بنوعباس کی فوج کی جانب سے پھینکے گئے ایک نیزے نے اس کا کام تمام کر دیا اس طرح بنوامیہ کی عظیم سلطنت کے تاجدار کا خاتمہ ہو گیا۔

مروان ایک قابل سپاہی تھا اگر قسمت اس کا ساتھ دیتی تو وہ ایک بہترین حکمران ثابت ہوتا لیکن وہ تاریخ کے اسٹیج پر اس وقت نمودار ہوا جبکہ اسے اپنی قابلیتوں کو ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔عباسیوں نے بنوامیہ کے خلاف بدلہ لینے کی جو قسم کھائی تھی وہ اس قسم پر کھرے اترے۔بنوامیہ کے خاندان والوں کے ایک ایک فرد کا خرگوشوں کی طرح شکار کیا اور قتل کیا صرف بوڑھے مرد، عورتیں اور بچوں کو بخشا گیا۔سوائے عمر بن عبدالعزیز کے بنوامیہ کے تمام بادشاہوں کی قبروں کو کھودا گیا اوران کی ہڈیاں نکال کر جلادی گئیں۔دمشق میں عبدالعزیز بن علی نے اسّی 80 بنوامیہ کے شہزادوں کو کھانے کی دعوت پر بلایا گیا اور انہیں معافی کی آس دلائی گئی جیسے ہی شہزادے کھانے کے لئے بیٹھے تو ان کو رسّیوں سے باندھ کر قالینوں میں لپیٹ دیا گیا پھر لاٹھیوں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔جس طرح زمانہ کی رفتار کے ساتھ پرانے درخت فنا ہو جاتے ہیں اور ان فنا ہونے والے درختوں کے بیجوں سے ہی نئے پودے اُگ آتے ہیں اسی طرح پرانے شاہی خاندان بھی فنا کی گہرائیوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور بادشاہیت کا نیا سلسلہ ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ جب اموی شہزادوں کو شکار کی طرح ہنکایا جا رہا تھا تو اسی وقت ان کے تین شہزادے دریائے فرات کے کنارے پہنچے، جب انہیں عام معافی کا پتہ چلا تو دو شہزادے واپس آ گئے اور وہ گرفتار ہو گئے اور مارے گئے لیکن ایک بہادر شہزادہ عبدالرحمٰن اول دریاء میں کود پڑا، دریا میں جاری زبردست سیلاب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ تیر کر دریاء کے دوسرے کنارے پہنچا، برسوں ادھر ادھر چھپتے چھپاتے اسپین پہنچ گیا وہاں بنوامیہ کے اہلکاروں نے اس کا استقبال کیا اس طرح اس نے اندلس میں بنوامیہ کے شاہی سلسلہ کی بنیاد رکھ دی یہ وہ خاندان تھا جو آنے والے صدیوں میں یوروپ کے لئے تہذیب وتمدن اور علم وہنر کا ایک عظیم گہوارہ بن گیا۔عبدالرحمٰن کی نسل سے ہی اندلس اسلامی تہذیب وتمدن کے تاج کا ایک درخشاں ہیرا بن گیا۔

''عقل ودانائی کا سرسبز وشاداب چمن زار''

خلاصہ:

اسلام دنیا میں آسمانی احکامات کا اعلیٰ ترین نظام قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مسلمانوں نے یہ ذمہ داری، نہایت جوش اور جانفشانی سے سرانجام دی۔ جیسے جیسے ایران، ہندوستان، وسط ایشیاء، مصر، افریقہ اور اسپین کے لوگ جوق در جوق اس آفاقی مذہب کے دامن آغوش میں داخل ہوتے گئے، ویسے ہی مسلمانوں کے سامنے نئے نئے مسائل ابھر کر آنے لگے۔ ان علاقوں کی قدیم تہذیبوں سے ہونے والے تصادم سے اسلام کا دفاع کرنا بھی ضروری تھا۔ مسلمانوں نے اپنی تمام تر توانائیوں کو اس مقصد کے حصول کی جانب لگا دیا۔ اسی کے نتیجہ میں اصول فقہ اور علم حدیث کی تدوین ہوئی۔ یونانی فلسفہ اور بدھ دھرم کی روحانیت کا تجزیہ بھی کیا گیا۔ نظریات کی اس بھٹی میں تپ کر معتزلہ اُبھرے اور انہوں نے عقائد اور منطق کی عقلیت پسندانہ تطبیق کرنا چاہی۔ لیکن اس دھن میں معتزلہ ناکامیاب رہے۔ انہوں نے جب ٹھوکر کھائی تو ان کی جگہ اشاعرہ نے لی۔ اس کے دوسو سال بعد اس مہم کو صوفیائے کرام نے سنبھالا۔ عقل ودانائی کی اس پیہم کشمکش سے سائنس اور تہذیب کی نشو ونما ہوئی جس نے کلاسیکی اسلامی تہذیب کو جنم دیا۔ اس تہذیب نے علم کی شمع اس وقت روشن کی جس وقت یوروپ دور وسط کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ قرطبہ، قاہرہ، بغداد، سمرقند، نیشاپور، ہرات اور بخارا وغیرہ علم وفن کے عظیم مراکز بن کر ابھرے۔ یہاں سے سائنسدان، فلسفی، فقیہ،

ریاضی دان، فن تعمیر کے ماہرین، فنون لطیفہ، تہذیب وتمدن کے ماہرین پیدا ہوئے۔ ان فنون کو پروان چڑھایا۔ علوم وفنون کے ان ذہین وفہیم دانشوروں نے دنیا کی تہذیب وتمدن کے لئے ایک ایسی اعلیٰ ترین میراث چھوڑی جس کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔ اس فہرست میں الجبرا (Algebra)، علم کیمیاء (Chemistry)، فلکیات (Astronomy)، جغرافیہ، عمرانیات (Sociology)، نباتیات (Botony)، تاریخ اور تصوف کے علاوہ لامحدود یا لامتناہی (infinity) کا تصور بھی شامل ہے۔

گیارہواں باب

فقہ کی نشوونما

ایشیاء، یوروپ، افریقہ کے براعظموں میں اسلامی افواج کی فاتحانہ پیش قدمی کی وجہ سے بے شمار لوگ اسلامی حکومت کی سرپرستی میں آئے۔ سب سے پہلے آنے والوں میں عیسائی، یہودی، بودھ یا ہندو تھے، ابتداء میں اس نوزائیدہ مذہب یعنی اسلام کے قبول کرنے کی رفتار دھیمی تھی۔

فاتحینِ اسلام مفتوح اقوام کو اپنے اپنے مذاہب پر چلنے کی آزادی عطا کرتے جس کے لئے انہیں صرف حفاظتی ٹیکس یعنی جزیہ ادا کرنا پڑتا۔ جب عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آیا تو غیر مسلمین نے گروہ در گروہ، جوق در جوق اسلام قبول کیا- عمر بن عبدالعزیز کا دورِ حکومت 717ء تا 719ء تھا انہوں نے غیر مسلمین پر عائد کردہ تمام غیر منصفانہ ٹیکس ختم کر دیئے۔ انہیں اظہارِ خیال کی آزادی دی، ایک ساتھی انسان کی حیثیت سے انہیں تمام جائز حقوق عطا کئے اور اس کے لئے مسلم غیر مسلم کا امتیاز ختم کر دیا۔ ان اصلاحات سے متاثر ہو کر دور دراز کے علاقوں میں بے شمار لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ خصوصیت کے ساتھ ساسانی اور بازنطینی بڑی تعداد میں آغوشِ اسلام میں پناہ لینے لگے۔

یہ نومسلمین اپنے ساتھ اپنا پرانا تہذیبی سرمایہ تو لئے ہی آئے۔ علاوہ اس کے زندگی کے اہم سوالات پر نظر ڈالنے کا ان کا اپنا ہی ایک انداز تھا جو کہ بنیادی طور پر عربوں کے نقطۂ نظر سے کافی الگ تھا۔

تاریخی اسلام کو یونان کی عقلیت پسندی، یہودیوں کے داؤ پیچ، ہندوؤں کی تپسیا، بودھ دھرم کے فلسفۂ ابطال یا نفی، تاؤسٹ کے سیکولر لیکن اعلیٰ شائستہ اخلاقی ضابطہ اور چینی کنفیوشین جیسے نظریات کا سامنا تھا۔

علاوہ اس کے اندرونی طور سے بنو ہاشم واہل بیت کے آپس میں متصادم ہونے والے مطالبات، قانونی مسائل پر مختلف گروہوں کے غیر منصفانہ اور لنگڑے لولے دلائل سے اسے نپٹنا تھا۔ ایک زبردست ہلچل عالمِ اسلام کے اندرون میں مچی ہوئی تھی اس سارے تناظر اور پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی بھی یہ اندازہ اچھی طرح لگا سکتا ہے کہ ابتدائے اسلام کے دوران کسی بھی ایک منصف کو کس قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس طرح اسلامی تہذیب کو بھی کن کن قسم کے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسلام کے اس ابتدائی دور میں جس قسم کے مسائل یا چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے ٹھیک اور صحیح ردِّ عمل و جواب کے لئے علم فقہ وجود میں آیا۔ فقہ کے دستور العمل سے اسلامی تہذیب کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں۔ آنے والی صدیوں میں اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے میں اسلامی تہذیب کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی جب تک فقہ کا یہ عمل فعّال رہا۔ متحرک رہا جدّت پسند رہا تو افکار کا سیلاب اسلامی تہذیب سے دوسری تہذیب وتمدنوں کی طرف بہتا رہا جب یہ عمل غیر متحرک ہوگیا اور اس کا بہاؤ رک گیا تو اسلامی تاریخ نے صرف اپنے اندرون یا باطن کی طرف جھانکنا شروع کیا اس طرح کرۂ ارض میں جاری نوع انسان کی جدوجہد کی دوڑ میں یہ پیچھے ہوگیا۔

شریعت، فقہ اور سیکولر قانون کی جو اصطلاحات بنیں ان کی تشریح وتعریف یوں ہے۔ شریعت اسلام کا وہ بنیادی ستون ہے جو غیر متزلزل اور مستحکم ہے۔ جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں اس کی بنیاد قرآن ہے اور آسمانی احکامات ہی سے یہ منور ہے۔ شریعت صرف انسان سے انسان کے رشتوں کی حد بندی نہیں کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ سے انسان کی بندگی کی تشریح بھی کرتی ہے۔ یہ کائنات سے انسان کے رشتوں کے حدود بھی معین کرتی ہے اس طرح اگر اس کا مکمل محاسبہ کیا جائے تو اس کے حدود لامحدود بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف سیکولر قانون صرف انسان سے انسان کے رشتوں کی بات کرتا ہے اور اسے آسمانی احکامات کے ساتھ انسانی رشتہ کی کوئی فکر نہیں ہوتی وہ محدود ہے وہ تبدیل ہوتا رہتا ہے، وقت، تاریخ، جغرافیائی حقائق کے ساتھ ساتھ وہ جواز حاصل کرتا ہے شہنشاہوں، مطلق العنان فرمارواؤں اور وطن پرستی سے، اس طرح شریعت آفاقی ہے لامحدود ہے، غیر متزلزل ہے تو سیکولر قانون محدود ہے متزلزل ہے، دنیاوی ہے۔

فقہ، شریعت کے تاریخی ارتقاء کا تدریجی حجم ہے۔ یہ مسلمانوں کی مسلسل اور لامتناہی جدوجہد سے عبارت ہے، یہ جدوجہدان آسمانی احکامات کے تحت زمان ومکان وکائنات میں زندگی گذارنا ہے۔

تاریخ جیسے جیسے اپنے ادوار میں بدلتی جاتی ہے، جیسے جیسے اسکے ابواب تبدیل ہوتے جاتے ہیں، بنی نوع انسان کی اس بدلتی تاریخ میں شریعت کا نفاذ بھی ان ادوار کے ساتھ ہی سفر طے کرتا رہتا ہے۔

اس طرح ہر لحہ تغیر پذیر دنیا میں شریعت کا برمحل نفاذ ایک انتہائی سخت اور مشقت بھرا عمل ہے۔اس طرح تاریخ کا یہ عمل شریعت کے معرضِ عمل، طریقۂ استدلال اوراس کے علاوہ اس کے استعمال کے ذرائع کوبھی اپنے جلو میں ساتھ ساتھ لئے چلتا ہے۔ یہ نہ صرف فرد کے خوداپنے قلبی رجحان کے حدودکوواضح کرتا ہے بلکہ خاندان سماج اورقوم کے ساتھ اس کے روابط کے خطوط کوبھی صاف طور پر پیش کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ہی اسلام اوردوسری تہذیبوں دوسرے عقائداورتصورات کے درمیان باہمی عمل وردّعمل تہذیبی مکالمے کے حدودکوبھی بالکل واضح اورروشن کردیتا ہے۔

اس باب میں ہم فقہ کے ان پانچ بڑے مسالک جن پر مسلمانوں کی اکثریت چلتی ہے ان کے تاریخی مخرج کے بارے میں اختصار کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں۔ یہ مسالک ہیں: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اورجعفریہ، علاوہ اس کے فقہ کے دوسرے مسالک بھی ہیں جیسے زیدی اوراسماعیلی وغیرہ جس پر مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعتیں چلتی ہیں۔ ان مسالک کو جہاں کہیں ضرورت ہوتاریخی پس منظر کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کیجائیگی۔ علاوہ اس کے معتزلہ اوراشاعرہ مسالک کا بھی اختصار کے ساتھ تذکرہ کریں گے جن پراب تقریباً کوئی نہیں چلتا لیکن ان مسالک نے اسلامی طرزفکراورتہذیب وتمدن پر بہت ہی گہرا اورشاید فیصلہ کن نقش چھوڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ وبرتر احکامات قرآن شریف کی سورتوں میں نازل ہوئے ہیں تاکہ انسان حقیقت کو پہچانے۔کئی صحابہ کرامؓ نے قرآن شریف کامکمل حفظ کرلیا تھاوہ حفاظ جوقرآن پڑھتے تھے سمجھتے تھے انہوں نے نہ صرف اسے پڑھااورسمجھا بلکہ دوسروں کوبھی اس کی تعلیم دی۔قرآن کوصحیح طرز سے پڑھنے والے ''قرّاء'' کہلائے۔ جب اکثرصحابۂ کرامؓ وقت گذرنے کے ساتھ حجاز سے عراق، ایران اورمصرہجرت کرگئےتو وہاں کی

مقامی قیادت کی ذمہ داری ان ہی قراء پر آئی، اسلام سے پہلے اکثر عرب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور جو کوئی پڑھا لکھا ہوتا تو اسے بڑی قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ تہذیب پر تو زبان ہی کی حکمرانی ہوتی ہے اور ’’قراء‘‘ کو جن کی اکثریت صحابہ کرامؓ سے تھی دور دراز علاقوں میں انتہائی قدرو منزلت ملی۔ یہی وہ صحابۂ کرامؓ تھے جن سے اکثر قانونی معاملات میں صلاح لی جاتی۔

جنگ یمامہ میں بے شمار قراء اور حفاظ کام آ گئے جس کی وجہ سے قرآن کو لکھے جانے کی ضرورت پیش آئی اس بات کی بڑی فکر ہونے لگی کہ جلد یا بدیر تمام حفاظ کرام جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھا ہے انتقال فرما جائیں گے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے مشورے پر خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کو لکھوایا اس نسخہ کو مصحفِ صدیقی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں لکھی جانے والی عربی زبان پر اعراب نہیں ہوا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ کے دور میں اسلام دور دراز علاقوں میں پھیلنے لگا، سب سے پہلے تو جزیرہ نمائے عرب میں مکمل طور سے پھیل گیا یہاں سے یہ اس کی سرحدوں سے اور آگے بڑھا تو ان علاقوں کا مقامی لہجوں کا اثر، قرأت پر پڑنے لگا۔ عربی انتہائی طاقتور متحرک اور لطیف زبان ہے، ایک لفظ کا غلط تلفظ اس کے معنی ومطالب کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ نے قرآنِ شریف کا معیاری نسخہ تیار کرنے کا حکم دیا اس سے مقصود اس قرات کی حفاظت تھی جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرمایا کرتے تھے اس قرآنِ شریف کی سات جلدیں تیار کی گئیں اور عظیم الشان سلطنتِ اسلامیہ کے مختلف حصّوں کو بھیجی گئیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ایک سو سال کے اندر صحابۂ کرامؓ کی وہ جماعت جنہیں خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور وہ تابعین جنہوں نے ان صحابہ کرامؓ سے قرآن سیکھا تھا سب کے سب انتقال فرما گئے۔ صحابۂ کرامؓ قرآن کو اس کے صحیح پس منظر میں جانتے تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف اوقات میں نزول ہوتا رہا، صحابہ کرامؓ اس وحی الٰہی کے سرچشمہ کے انتہائی قریب تھے۔ ان آسمانی احکامات کی ضوفشانی سے وہ پورے کے پورے شرابور تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تاریخ پر اس کا زبردست اثر پڑنے والا ہے اس لئے انہوں نے ان احکامات پر انتہائی پرجوش انداز میں لبیک کہا۔ صحابۂ کرامؓ کی دنیا عمل کی دنیا تھی باتوں کی نہیں۔ وہ کردار کے غازی تھے گفتار کے نہیں۔ انہوں نے

اپنے کارناموں سے ایک نئی تاریخ مرتب کی۔ دوسروں کی رہنمائی کے لئے درخشاں قابل مثال نقوش چھوڑے۔انہوں نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں سوچنے، سمجھنے اور انہیں دلائل فراہم کرنے کا کام آنے والی نسلوں پر چھوڑا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال ہوئے زیادہ عرصہ گذرنے لگا تو اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا جائے ان کے مستند ہونے کے بارے میں مکمل تحقیق کر کے محفوظ کیا جائے، آنے والے دور کے لئے آنے والی نسلوں کے لئے یہ ''علوم حدیث'' کی ابتداء تھی۔ حالانکہ بخاری، صحیح مسلم وغیرہ احادیث کی مشہورترین کتابوں کی تدوین کئی صدیوں بعد ہوئی لیکن احادیث کو محفوظ کرنے کی روایت اس درمیانی دور میں باقاعدہ سرگرمِ عمل رہی۔ علوم القرآن کے بعد علوم فقہ کی ترویج وترقی میں علوم سنّت کا سب سے بڑا حصہ ہے۔علوم سنّت وہ علم ہے جس کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات وواقعات اور سیرت بالکل صحیح انداز مین جمع کیئے گئے۔

علوم فقہ کی ترقی ایک تاریخی عمل ہے۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باحیات رہے قوم کی رہنمائی کے لئے صرف انہی کی مثال کافی تھی وضروری بھی تھی۔

فقہ کے دستوری نظام اور ظاہری وباطنی اخلاقی ضابطۂ حیات کا واحد مآخذ قرآن ہے۔سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قرآن شریف کے اصولوں کی تشریح کی،ضروری حوالہ جات دیئے اور اپنی سیرت سے اس کی وضاحت کی،اس کے نافذ کرنے کے طریقہ سے بھی صحابۂ کرامؓ کو واقف کروایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک سے صحابۂ کرامؓ کے سامنے تاریخی چیلنج درپیش ہوا۔ وہ تھا اللہ تعالٰی کی مرضی کو ہی انسان کے معاملات کا معیار بنانا۔اولین مسلمان اس معیار پر کامیاب وکھرے اترے۔ جہاں وحی کے احکامات موجود تھے اور جس کی مکمل وضاحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔اسی نہج کا اتباع وہ کرتے رہے۔ایسے مسائل جن کے متعلق قرآن وسنت نے صرف عمومی اصول پیش کئے لیکن ان کے نفاذ کے بارے میں مکمل وضاحت نہیں کی۔ ان مسائل کے سلسلے میں انہوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں عام رائے اور استدلال سے کام لیا۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ اس طریقۂ کار نے ایک وسیع روایت کی شکل اختیار کرلی۔ چاروں خلفائے راشدین نے اس پر عمل کیا۔اس طریقۂ کار کو صحابۂ کرامؓ کی سنت یا صحابۂ کرام کا اجماع کہا جاتا ہے۔ یہ اجماع بسا اوقات آفاقیت اختیار کر گیا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ رائے میں اختلافات آ جاتے تھے، ایسے اختلافات صحابہؓ کرام نہ صرف برداشت کر لیتے بلکہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ عربی زبان کا لطیف نازک فرق رکھنے والا وہ لہجہ اور قرآن کی وہ اعلیٰ ترین زبان، وہ آفاقی قوت، ان سب کی وجہ سے معاملات کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں کہیں کہیں اختلاف الرائے ہونا ناگزیر تھا۔ فقہ کے یہی اختلافات مختلف مسالک کے ارتقاء کا باعث بنے۔

حالانکہ اسلامی علم فقہ کو اگلی صدی تک دستاویزی شکل نہیں دی جا سکی اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دور خلافت میں مختلف النوع معاشرہ پر شریعت کا مکمل نفاذ ہوا۔ یہ حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے قانون کے تحت انصاف کے نفاذ کو اسلامی فرض منصبی قرار دیا۔ انہوں نے ایک جامع محکمۂ انصاف قائم کیا۔ منصفوں کو تعینات کیا اور انہیں مخصوص ہدایتیں بھی دی ان میں سے کچھ یوں ہیں۔

قانون کے سامنے سب انسان برابر ہیں۔

انصاف ایک اسلامی فرض منصبی ہے جس کی بنیاد قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر ہے۔

تمام بالغ مسلمان قانون کی نگاہ میں یکساں ہوں گے، قانون کی جانکاری رکھنے والے مانے جائیں گے اور شریعت کے مطابق جوابدہ ہوں گے۔

ثبوت بہم پہنچانا مدعی کی ذمہ داری ہے۔ تمام فریقین کو ثبوت فراہم کرنے کے لئے پورا موقع دیا جانا چاہئے۔ اگر فیصلہ پیش کئے جانے والے ثبوت کے برخلاف ہو تو اس فیصلہ کو بدلا جا سکتا ہے۔

اگر کسی معاملہ میں قرآن اور سنت خاموش ہو تو ایسے ہی دوسرے معاملات کے مطابق قیاس سے کام لینا چاہئے۔

تمام امت مسلمہ کا اجماع قانون کے بنانے کے لئے قانونی جواز فراہم کرتا ہے۔ آگے آنے والی صدیوں میں مختلف مسلمان شہنشاہوں نے انہی اصولوں کو علم قانون کی کتابوں میں درج کروایا۔ خلیفہ بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا تھا۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن الخطابؓ کی زندگی سے ایسے کئی واقعات مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں کہ کس طرح سلطنت کے سربراہ سے بھی ویسا ہی سلوک روا رکھا گیا جیسا کہ ایک عام شہری کے ساتھ ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ایسے ہی فیصلے کی وجہ سے جو ایک غیر مسلم مجوسی ایرانی آپ کے پاس لے آیا تھا۔ آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

وقت کے ساتھ اور بھی نئے چیلنج ابھر آئے۔صحابۂ کرامؓ کے انتقال کے بعد تابعین کی نئی دانشورانہ قیادت نے ان کی جگہ لے لی۔ یہ مسلمانوں کی دوسری نسل تھی۔ وقت کے ساتھ یہ نسل بھی چل بسی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام میں غیر عربوں کے شامل ہونے کی وجہ سے اسلامی قانون کو درپیش چیلنج اور بھی گہرے ہوگئے۔ان حالات میں مجتہدین اور فقہاء ابھرے انہوں نے ان چیلنجوں کا کامیابی کے ساتھ سامنا کیا۔اس دورعمل میں فیصلہ کن اقدامات کئے گئے۔انہی اقدامات نے اسلامی تاریخ کا نقشہ بدل دیا۔

اگر کوئی 740ء میں زندہ ہوتا تو اسلامی سلطنت کی وسعت اور عظمت سے حیران وششدر رہ جاتا۔ مسلم افواج فرانس میں داخل ہوچکی تھیں اور سوئٹزرلینڈ کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ بازنطینی شہنشاہیت کے صدر مقام پر کئی حملے ہوچکے تھے۔مسلمان تاجر قدیم ریشم شاہراہ سے ہوتے ہوئے سنکیانگ میں چینیوں سے آنکھ ملا رہے تھے، اُدھر انڈونیشائی جزائر اور مشرقی چین میں سرعت کے ساتھ تجارت میں لگے ہوئے تھے۔اِدھر سندھ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔

امت اسلامیہ میں عرب، ایرانی، مصری، افریقی، اسپینی، ترکی اور ہندوستانی شامل ہوچکے تھے۔ نئے لوگوں کا ایک سیلاب سا اسلام میں داخل ہوا۔اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ نئے لوگ اپنے ساتھ نئے افکار بھی لے آئے۔ مسلم معاشرہ ایک غیر معین صورت حال سے دوچار تھا۔ جومختلف عوام اسلام کے دامن میں نئے داخل ہوئے ان کے اپنے افکارنو نکاسی کی راہ ڈھونڈ رہے تھے، جو کہ فی الحال مسدود تھی۔ یہ وہ حالات تھے جو بنوعباس کے دور میں ایک آتش فشاں کی طرح پھوٹنے کے لئے تیار تھے۔ عالم اسلام کا ایک وسیع اور مختلف النوع طول وعرض تھا اس میں افکارنو کی ایک بھٹی تھی جو پک رہی تھی۔عصر جدید کے وہ تقاضے اپنے سوالات کے جوابات طلب کررہے تھے۔

یہ سچ ہے کہ عظیم مرد اور عظیم عورتیں تاریخ کی تعمیر کرتی ہیں۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کے نازک لمحات عظیم مرد اور عورتوں کو جنم دیتے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں حالات کے لہروں نے ایسے علماء وفضلاء کو جنم دیا جنہوں نے علم فقہ اور اس کے اصولوں کو مرتب کیا۔اسلام کے ابتدائی دور میں مدینہ اور کوفہ علم کے مراکز تھے۔ مدینہ تو آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر تھا۔ وہاں کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بے انتہاء قربت رکھتے تھے۔ مدینہ جو کہ اسلامی حکومت کا

قلب تھا، اسکو بیرونی تہذیب وتمدنوں کے چیلنجوں سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ جب کہ کوفہ عرب وایران کی سرحدوں پرواقع تھا۔ یہ نہ صرف بیرونی افکار کی آماجگاہ تھا بلکہ اورزیادہ حساس تھا۔ اسی کوفہ سے بنوامیہ نے عراقِ عرب، عراقِ عجم، فارس، خراسان اور موجودہ پاکستان پر حکومت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں، ان کے احکامات اور روایتوں تک کوفیوں کی رسائی کچھ حد تک دھیمی رہی - اس کے برعکس یہ اسلامی حکومت کی سرحدوں کے اس آخری سرے پر واقع تھے جہاں انہیں پڑوسی یونانی، ایرانی، ہندوستانی اور چینی نظریات کے چیلنج کا پہلے پہل سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس طرح یہ فطری عمل تھا کہ مدینہ اور کوفہ دونوں مختلف مسالک کے اصول قانون کے اولین مراکز بنے۔ اسی باعث فقہ کا ابتدائی ارتقاء کچھ حد تک الگ الگ جغرافیائی اور تاریخی پس منظر میں ہوا۔ یہ دونوں مسالک مدنی مسلک اور کوفی مسلک کی حیثیت سے پکارے جاتے ہیں۔ کوفی مسلک کے اولین اور سب سے نمایاں اسکالر یا عالم امام ابوحنیفہؒ تھے۔ مدنی مسلک کے اولین عالم ہیں - امام مالکؒ ان کے ساتھ ساتھ امام شافعیؒ کا نام آتا ہے۔ بالکل اسی وقت ایک اور متوازی جعفریہ مسلک کا بھی ارتقاء ہورہا تھا۔ یہ حضرت امام جعفرؒ کے نام سے موسوم ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نام سے موسوم فقہ کچھ حد تک بعد آنے والے دور کا ہے یہ مسلک نویں صدی عیسوی میں ہونے والے سیاسی اور عقلی ہلچل کا نتیجہ تھا۔

امام ابوحنیفہؒ جنکا انتقال 768ء میں ہوا۔ ایک اعلیٰ ترین درجہ کے عالم اور عملی انسان تھے۔ اس متبحر علامہ نے اسلامی تاریخ پر جو صاف صاف دکھلائی دینے والے نقش چھوڑے ہیں۔ ایسا کام بہت کم دانشور کر پائے۔ ان کے والدین افغانی تھے۔ عراق کی مشرقی سرحدوں سے باہر نئے فتح شدہ علاقوں میں علم فقہ کو درپیش چیلنجوں کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ہم عصر یونانی، ایرانی، ہندوستانی اور چینی تہذیب وتمدن کے عقلی چیلنج سے بھی مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ بچپن میں ہی وہ کوفہ آ گئے اور اس دور کے مشہور علماء کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ نوجوانی میں ہی انہوں نے بنوامیہ کے مظالم اور عرب امراء کی تندمزاجی کے خلاف آواز بلند کی۔ سرکار کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کردیا اسی وجہ سے انہیں بنوامیہ اور بنوعباس دونوں حکومتوں کے دوران قیدخانے کی مصیبت جھیلنی پڑی۔ آپ کا یہ قول کہ ایک نومسلم ترک کا ایمان ایک

حجازی مسلمان کے ایمان کے بالکل برابر ہے۔ان کی جدت طرازی اوراعلیٰ دماغی کا بہترین مظہر ہے۔ ایک اسکالر کی حیثیت سے وہ علم کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔اکثر امام جعفر الصادقؒ کے حلقۂ علم میں بھی شامل ہوتے اور فیض یاب ہوتے۔

امام ابوحنیفہؒ کی اعلیٰ ذہانت کی مثال فقہ کا وہ تصور ہے کہ فقہ ہر دور کے مسلمانوں کے لئے ایک بہتا ہوا چشمہ ہے۔انہوں نے اسلام کو ایک آفاقی نظریہ حیات سے دیکھا جو کہ کائنات اور بدلتے ہوئے تمام زمانوں کے لوگوں کے لئے قابل حصول اور قابل قبول ہے۔فقہ ایک ساکن اصول قانون نہیں کہ صرف ایک صورت حال اور ایک مقام کے لئے ہی لاگو ہو۔ بلکہ یہ اسلامی تہذیب کے طریقۂ کار کی مضبوط بنیاد ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ دوسری تہذیبوں سے مباحث کے لئے دلائل کی ایک تلوار ہے۔انہوں نے دیکھا کہ مدنی مسلک انتہائی سخت گیر طریقۂ کار ہوسکتا ہے۔ان کی دوراندیش نگاہوں نے وقت کے ساتھ اسلامی تہذیب کو پیش آنے والے انجانے چیلنجوں کو دیکھا۔انہوں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ ماہرین قانون اس بنیادی سختی کی وجہ سے ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے سے پیچھے رہ جائیں۔اسی لئے انہوں نے اس کی بنیادوں کو وسیع کیا جس پر مصمّم علمِ فقہ کی تعمیر ہوسکے۔امام ابوحنیفہؒ کے مطابق علم فقہ کے بنیادی سرچشمے یہ ہیں۔

(۱) قرآن

(۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

(۳) اجماع یعنی اکثریتی اجماع،ضروری نہیں کہ تمام صحابہ کا اجماع ہو۔

(۴) قیاس: پہلے تین اصولوں کے تحت کئے جانے والے فیصلوں کو بنیاد بنا کر قیاس کرنا۔

(۵) استحسان: تخلیقی قانونی مشورہ - استحسان کو قانونی مان لینے کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کو ایک مسلسل انقلاب آمیز عمل کی صورت دے دی۔آنے والی انجانی غیرانجانی تہذیبوں کے مقابلے کے لئے علمائے دین کی جدوجہد کے لئے آپؒ نے یہ اوزار فراہم کئے۔

یہاں ایک اور لفظ کی تشریح ضروری ہے۔وہ ہے اجتہاد، یہ لفظ ج - ھ - د سے بنا ہے جس کا مطلب ہے مسلسل جدوجہد، اجتہاد، دانشورانہ عمل کا مرکزی کردار ہے۔جس کا آخری نتیجہ ہے اجماع یا قیاس یا

استحسان۔ اجتہاد ایک مسلسل عمل ہے۔ حنفی اور جعفریہ مسالک اجتہاد کے لئے کھلی آزادی اور تاویل پسندی عطا کرتے ہیں۔ لیکن مختلف مسائل کو اہمیت دیئے جانے کے معاملہ میں اختلاف رائے ہے۔ جعفریہ مسلک میں ائمہ کرام کے اجتہاد پر زور دیا جاتا ہے تو حنفی مسلک میں صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد پر علماء، فضلاء اور قاضیوں کا اجتہاد بھی قابل قبول ہوتا ہے۔ اجتہاد کے لئے کس قدر آزادی دی جانی چاہیئے اس کے بارے میں بھی کوفی مسلک یعنی امام ابوحنیفہؒ کے مسلک اور مدنی مسلک یعنی امام مالکؒ کے مسلک دونوں میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مدنی مسلک بنیادی طور پر قرآن شریف کی گواہی یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلمسے مناسبت رکھنے والی روایات سے اکتساب حاصل کرتا ہے جبکہ کوفی مسلک زیادہ روشن خیالی کا اظہار کرتے ہوئے نہ صرف قرآن، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہوتا ہے بلکہ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجماع اور علماء وفضلاء وقاضیوں سے بھی شہادت حاصل کرتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے بذات خود اپنے نام سے موسوم مسلکِ فقہ کو قائم نہیں کیا اور نہ ہی اپنے طریقۂ کار کو ضبطِ تحریر کیا۔ اس دور میں تحریر عام نہیں تھی۔ زبانی الفاظ ہی کا دور دورہ تھا۔ زبانی درس ہی اس زمانے کا طریقۂ درس وتدریس تھا عربی زبان، صرف ونحو اور قواعد زبانی ہی سیکھے جاتے تھے۔ اولین دور کے قراء کی طرح عظیم علماء وفضلاء، مدارس میں زبانی پڑھایا کرتے، ضبط تحریر کا کام تو آنے والی نسلوں کے طلباء وشاگردوں پر چھوڑ دیا گیا۔ خصوصیت کے ساتھ گیارہویں صدی کے دوران سینہ بہ سینہ چلے آنے والے حنفی مسلک کے اس علم کو قلمبند کیا گیا۔ اس طرح یہ ایک دستاویزی شکل میں سامنے آیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر دبوسیؒ 1038ء میں جن کا انتقال ہوا۔ حضرت احمد حسین البیہقیؒ (انتقال 1065ء)، حضرت علی محمد البز دویؒ (انتقال 1089ء) اور حضرت ابوبکر السرخسیؒ (انتقال 1096) حنفی مسلک کے عظیم ترین علماء ہوئے ہیں۔

دسویں صدی عیسوی کے بعد حنفی مسلک کو بغداد میں بنوعباسیہ حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ امام ابوحنیفہ کے اجتہاد پسند طریقۂ کار اور حنفی فقہ کے تخلیقی پہلو سے ترک باشندے محبت رکھتے تھے۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو حنفی فقہ اختیار کیا۔ اور اس کے سب سے بڑے حلیف بن گئے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی ترکی شہنشاہیت اور آگے چل کر عثمانیہ ترکوں نے بھی حنفی فقہ کو اپنایا۔ تیموری ترکمان

اور ہندوستان کے عظیم مغل بھی اسی مکتبۂ فکر کے علمبردار تھے۔ ہندوستان پاکستان، افغانستان، وسط ایشیاء کی جمہوری ریاستیں (سولہویں صدی عیسوی تک) ترکی، شمالی عراق، بوسنیا، البانیہ، اسکوپ جے، روس، چیچنیا کے اکثر مسلمان حنفی فقہ پر ہی عمل کرتے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی تک ایران بھی اسی مسلک کا پاسدار تھا علاوہ اس کے مصری، سوڈانی، اریتریائی اور شامیوں کی اکثریت اسی مکتبۂ فکر کی خوشہ چین ہے۔ جغرافیائی اسباب کی بناء پر ان علاقوں میں شافعی اور مالکی مسالک کی بنیادیں بھی کافی مضبوط ہیں۔

مدنی مسلک اپنے طریقۂ کار کے لحاظ سے بنیاد پرست ہے۔ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں زندگی بسر کرتے ہوئے وہیں اسلام کے گہوارہ میں پرورش پاتے ہوئے۔ مدنیوں کے لئے اہم ترین اہمیت سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ مدنی مسلک کے پہلے عالم تھے امام مالک بن انسؒ (انتقال 795ء) انہوں نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ مدینہ منورہ میں گذارا اور ان کے آباء نے امام ابوحنیفہؒ کی طرح قانونی معاملات میں عباسی حکومت سے ٹکر لی۔ اس پاداش میں انہیں بر سرِ عام کوڑے مارے گئے، قید کیا گیا۔ امام مالکؒ کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ کہیں امام ابوحنیفہؒ کا ''استحسان'' غیر پسندیدہ نئے افکار کے سیلاب کے لئے دروازہ نہ کھول دے۔ اس لئے انہوں نے اجماع کے اصول کو اور سخت بنا دیا۔ انہوں نے قرآن کی بنیاد کو قبول کرتے ہوئے اس نظریہ کو آگے بڑھایا کہ کسی بھی مسئلہ پر تمام اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اجماع ہونا ضروری ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثریت کے اجماع کو بھی قابل قبول تسلیم کرتے تھے۔

مالکی مسلک حج کے ذریعہ مصر، لیبیا، الجیریا اور مراکو میں پھیل گیا۔ شمالی افریقہ کے مسلمان حج کے لئے مکہ اور مدینہ کا سفر کرتے دوران قیام مدینہ والوں سے فقہ سیکھتے۔ ان کے پاس کوفہ یا عراق کے سفر کا کوئی ضروری جواز نہیں تھا اس لئے حنفی مسلک سے ان کا سامنا کبھی کبھار ہی ہو پاتا۔ ابن خلدون کے مطابق شمالی افریقہ کے خانہ بدوش بربروں اور عرب کے بدوؤں کے درمیان تمدنی یکسانیت تھی اسی لئے لیبیا اور مغرب میں مالکی مسلک کو قبولیت حاصل ہوئی۔ شمالی افریقہ سے یہ اسپین پہنچا۔ بنوامیہ کے دورِ حکومت میں اسپین کا صدر مقام قرطبہ تھا اس دربار کا واحد سرکاری مسلک مالکی تھا۔ جیسے جیسے تجارتی راستوں کے ذریعہ اسلام صحراء

کے جنوبی علاقوں کی طرف پھلتا گیا ویسے ہی موریطانیہ، چاڈ، نائجیریا اور دوسرے مغربی افریقائی ممالک میں مالکی مسلک کی اشاعت بڑھتی گئی۔ آج افریقی مسلمانوں کی اکثریت مالکی مسلک کی پابند ہے۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں مصر میں بنو فاطمہ کی حکومت تھی جو کہ شیعہ تھی اس کے باوجود شمال کے بربروں اور عرب کے بدوؤں کے درمیان تعلقات برقرار رہے۔ جب 1170ء میں سلطان صلاح الدین نے بنو فاطمہ کو شکست دی اور مصر پر قبضہ کیا تو مالکی مسلک کا شمالی افریقہ میں پھر سے بول بالا ہو گیا۔

امام محمد ابن ادریس الشافعیؒ وہ پہلے عالم ہیں جنہوں نے اپنے جریدہ ''رسالہ'' کے ذریعہ فقہ کی بنیاد کو باضابطہ دستاویزی شکل دی اور اس کے طریقۂ کار کا تنقیدی جائزہ لیا۔ امام شافعیؒ پیدائشی طور پر شامی تھے۔ انہوں نے کوفہ اور مدینہ کا سفر کیا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے شاگردوں سے علم حاصل کیا۔ انہیں حنفی اور مالکی مسالک کے چند اصولوں سے اختلاف تھا اس لئے اپنی ہی الگ آزادانہ روش اختیار کی۔ امام شافعیؒ کے مطابق فقہ کے سر چشمہ یہ ہیں۔

(۱) قرآن:

(۲) سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں انہوں نے مالکی مسلک کے اصولوں کی سختی کو کم کیا انہوں نے صلاح دی کہ اگر ایک بھی صحیح اور قابل قبول روایت ملے تو وہ سنت کے علم اور قانون کا ایک جائز سرچشمہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تمام صحابہ اجمعین کا اجماع ہونا ضروری نہیں۔

(۳) قیاس:

یہ صرف اس وقت جائز ہے جب کہ پہلے ہی کوئی مقدمہ سختی کے ساتھ قرآن اور سنت کی بنیاد پر فیصل ہو چکا ہو۔ امام شافعی استحسان کو فقہ کا جائز سرچشمہ نہیں مانتے۔

اس طرح امام شافعی کا طرز فکر امام مالکی کے طرز فکر سے کچھ کم ہی سخت ہے لیکن امام حنفی کی طرح

رواداریا ہمہ گیر نہیں۔ شافعی مسلک کی اشاعت مصر، سوڈان، اریٹریا، مشرقی افریقہ، ملایا، اور انڈونیشیائی جزائر میں ہوئی۔ حنفی مسلک کی طرح شافعی مسلک نے بھی کئی ذہین وممتاز علماء واسکالروں کو جنم دیا۔ انہیں جید علماء میں سے ایک ہیں ابوحمید الغزالی جنکا انتقال 1111ء میں ہوا۔ جنہوں نے نہ صرف فقہ کے ارتقاء پر اپنا اثر چھوڑا بلکہ اپنے انتہائی فطین وذہین طرز استدلال سے اسلامی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

یہاں یہ ضروری ہے کہ معتزلہ مسلک کے طرز فکر اور اس کے ہم رنگ الاشعری مسلک کی جانب بھی خصوصی اشارہ کردیا جائے۔ جب مسلمانوں نے شام، مصر اور شمالی افریقہ فتح کیا تو وہ نہ صرف وہاں کے عوام بلکہ ان کے نظریات کے بھی امین بن گئے۔ اس علاقہ کا اکثر حصہ مشرقی رومیوں یا بازنطینی حکومت کے زیر حکومت تھا جہاں یونانی طرز فکر کا تسلط تھا۔ تاریخی طور پر ''یونانی طرز فکر'' کا مطلب ہے مشرقی بحیرۂ روم کے عوام کی اجتماعی دانائی اور کلاسیکی فکر۔ یہ علاقہ ایک وسیع جغرافیائی قوس ہے۔ یہ یونان کے ایتھنس سے شروع ہوکر اناطولیہ سے ہوتے ہوئے شام، مصر اور لیبیا تک جا پہنچتا ہے۔ یونانی تہذیب انسانی عظمت کے گیت گاتی ہے۔ یہ تہذیب انسان کے طرز استدلال کو تخلیق کا اعلیٰ ترین معیار گردانتی ہے۔ پلوٹو، ارسطو، طولمی، یوکلڈ اور آرکمڈیس یونانی، تہذیب کے درخشاں فلسفی ہیں جنکا نام زبان زد خاص وعام ہے۔ یونانی طرز فکر کا دیرپا اثر یہ رہا کہ اس نے عقلیت پسند عمل کو قطعیت دی اور انسانیت کے لئے ایک ایسی میراث چھوڑی جسکا اثر بہت دیرپا ہے۔

مسلمانوں نے سب سے پہلے اس میراث کو حاصل کیا۔ مسلمانوں کے ذریعہ ہی خصوصیت کے ساتھ اسپینی مسلمانوں کے ذریعہ یہ عقلیت پسند میراث لاطینی مغرب تک پہنچی۔ مغرب جو اندھیروں میں گم تھا صرف بارہویں صدی کے بعد ہی گہری نیند سے جاگا اور یونانی تہذیب کو اپنی ہی میراث کے طور پر اپنا لیا، جبکہ مسلمان تقریباً اسی وقت عقلیت پسند طرز فکر سے منہ موڑ کر مخفی علوم اور وجدان پرستی میں ڈوب گئے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے نہ صرف اس عقلی طرز فکر کو اپنایا بلکہ اپنی عقلیت پسندانہ اصطلاحوں کے ذریعہ اپنے عقائد کی تشریح کرنے کے لئے بھی آگے بڑھے۔ انسانی فطرت، تخلیق کا مقصد، تخلیق سے اسکا رشتہ، اسکے فرائض اور ذمہ داریاں، الہامیات جیسے سوالات کا عقلی تجزیہ کیا گیا۔ کوئی بھی مسلمان عالم اپنے

طرز استدلال کی بنیاد کے لئے صرف دانائی اور عقل کا ہی سہارا نہیں لیتا۔ صرف دانشوری پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ اس کے ہر ایک استدلال کے لئے ہر ایک نظریہ کے لئے قرآن کو بنیاد بنانا لازمی ہوجاتا ہے۔ عقلیت پسندوں نے بھی اپنی طرز فکر کو قرآنی آیات اور سنتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جواز کے طور پر پیش کیا ''بیشک آسمان اور زمین کا پیدا کردینا، رات دن کا بدلتے ہوئے آنا اور انسانوں کی کام کی چیزیں لیکر جو کشتی دریا میں بوجھ لادے چلتی ہے اور پانی جو اللہ نے آسمان سے اتارا کہ مردہ زمین کو زندگی عطا کرے اور پھلا دے اس میں ہر طرح کے جاندار اور ہواؤں کا الٹ پھیر اور زمین وآسمان کے درمیان بدلیاں جو حکم کے تابع ہیں ان سب میں نشانیاں ہیں عقل والوں کیلئے'' (سورۃ البقرۃ-164)۔

سچ تو یہ ہے کہ قرآن انسان کو فکر کی دعوت دیتا ہے کہ وہ تخلیق کے جاہ وجلال شانِ رفعت کو دیکھے اس کے معانی پر رموز واسرار پر غور کرے اور اس برتر واعلیٰ وماورائے ادراک ہستی کے بارے میں گہرائی سے سوچے اور سمجھے جو ان کی نشو ونما کرتی ہے۔ وہ فلسفیانہ سائنس، وہ علم جو اس غور وفکر کی کاوشوں سے وجود میں آیا، اسی کا نام علم الکلام ہے۔ بسا اوقات کلام کا ترجمہ تھیالوجی یعنی علم مذاہب کے طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ تھیالوجی یا علم مذاہب جس طرح عیسائیوں میں مقبول رہا۔ مسلمانوں میں کبھی قبولیت کا درجہ حاصل نہ کرسکا، اس لئے کہ مسلمان دنیا کے سامنے اللہ تعالیٰ کے ماورائے ادراک ہونے کے تصور کو قائم رکھنے میں کامیاب وکامران رہے۔ عیسائیوں نے یہ عقیدہ اپنایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو ایک عام شخص کی طرح پہچانا جاسکتا ہے، جانا جاسکتا ہے، اسی لئے اس تک رسائی انسانی ادراک کے ذریعہ ممکن ہے۔ یونانی فلسفہ کے پیہم چیلنج کے باوجود مسلمانوں نے اس عقیدے کا کامیابی کے ساتھ دفاع کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات صرف اس کے ناموں سے، اس کی صفات سے اور اس عظیم الشان کائنات کی تخلیق سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ وہ ذات صفات ماورائے ادراک ہستی اس کے اپنے ہی نور میں مستور ہے جو انسانی عقل وفہم سے بالاتر ہے۔

اسلامی عقائد کو عقل کی کسوٹی سے ثبوت فراہم کرنے والی اولین عالم شخصیت الجوہانیؒ کی ہے جن کا انتقال 699ء میں ہوا۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ عقلیت پسندانہ طریقۂ استدلال انسانی دلیل کو تخلیق کا محور بنادیتی ہے اور اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچاتی ہے جہاں سے دنیا کو پہچانا جاسکتا ہے۔ الجوہانیؒ نے نہ

صرف اس نظریہ کو اپنایا کہ انسان میں اتنی قابلیت ہے کہ وہ اپنے دلائل کے ذریعہ تخلیق کے عمل کو پہچان سکے بلکہ اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ آزادانہ فیصلے لے سکے۔علم کا صحیح ادراک اور اس کو سمجھنے کا نتیجہ عقیدہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے سچ تو یہ کہ انسان کا یہ اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ کائنات پر غوروفکر کرے اور اسے پہچاننے کے ناطے انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ نہ صرف دنیا کو سمجھے بلکہ اپنے عقلی نتائج کے مطابق اپنی آزادانہ روش سے کام کرے اس طرح الجوہانی کے نظریات کے مطابق انسان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دلائل سے کام لے۔اپنی عقل کا استعمال کرے اور دانائی کا مظاہرہ کرے۔

جنت اور جہنم دونوں انسانی اعمال کا ہی نتیجہ ہیں۔ یہ فلسفیانہ مسلک، قادریہ مسلک کہلایا۔قادر کا مطلب ہے طاقت اور آزادانہ روش یہاں یہ بات صاف کردینی ضروری ہے کہ قادریہ فلسفیانہ مسلک الگ ہے اور وہ قادریہ صوفیانہ سلسلہ بالکل جداگانہ ہے جس کی بنیاد بارہویں صدی میں بغداد کے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے رکھی تھی۔

قادریہ طرز استدلال کی انتہا یہ ہے کہ انسانی معاملات کے تناظر سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہٹا کر انسان کے اپنے اعمال کے مطابق جنت یا جہنم پانے کی پیشن گوئی کردی جاتی ہے۔مسلم مکتبۂ فکر کے لئے یہ بات قابل قبول نہیں تھی۔ بنیاد پرست حلقوں سے اس کے خلاف ردعمل ہونا لازمی تھا۔یہ ردعمل ''قضاء'' مسلک کی صورت میں ابھر آیا۔اس مسلک کی بنیاد ابن صفوانؒ جن کا انتقال 745ء میں ہوا نے ڈالی۔ابن صفوانؒ کا موقف یہ تھی کہ خدائے تعالیٰ قادر مطلق ہے، انسان دنیا میں جو کچھ کرتا ہے، بھلائی یا برائی سب کچھ اس کی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے۔ وہ جنت میں جائیگا یا جہنم میں اس کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔قادریہ مسلک کی طرح ''قضا'' مسلک بھی اپنے طرز فکر کیلئے قرآن شریف اور سنت رسول سے ہی جواز ڈھونڈ نکالتا ہے ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیجئے کہ اللہ جو چاہے وہی ہوکر رہتا ہے میں تو اپنے نفع نقصان کا مختار بھی نہیں۔اگر میں غیب جان لیا کرتا تو یوں ہوتا کہ سب نفع سمیٹ لیتا اور کوئی تکلیف مجھے پہنچ نہ پاتی میں تو ایمان والوں کو خبردار کرنے والا اور خوشی سنانے والا ہوں'' (قرآن 7-188)۔

اب نظریاتی مقابلے کے لئے میدان تیار تھا۔عیسائیت کے ابتدائی دور کی طرح اسلامی تہذیب نے

بھی ابھی ابھی یونانی عقلیت پسندی کے ساتھ زور آزمائی شروع کی تھی۔اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔جواب ابھی واضح نہیں تھا۔اس کے جوابات ان جان مستقبل کے اندھیرے میں گم تھے۔امام جعفرالصادق ؒ اور امام ابوحنیفہؒ دونوں قضاوقدر کے دلائل سے اچھی طرح واقف تھے۔لیکن انہوں نے ان اختلافات سے اپنے آپ کودور رکھا۔

واصل بن عطاءؒ نے جن کا انتقال 749ء میں ہوا قادریہ مسلک کی تدوین کی،اسے پروان چڑھایا، اس کی وضاحت کی اور ایک مدلّل فلسفہ کی شکل دی۔آگے چل کر یہی معتزلہ مسلک کہلایا۔یونانی طرزفکر نے اسلامی تہذیب کو جو چیلنج پیش کیا تھا ہم معتزلہ مسلک کواس یونانی طرزفکر کا پہلا جواب کہہ سکتے ہیں۔معتزلہ مسلک تقریباً دوسوسالوں تک ارتقاء پذیر رہااور اکثر اوقات اسلامی مسالک میں انتہائی بااثر اوراہم طرزفکر کا مسلک بنارہا۔اس کی اثر پذیری کو ہم امام ابوحنیفہؒ،امام جعفر صادق ؒ ، یا امام مالکؒ کے مسالک کے ساتھ مسابقت کر سکتے ہیں۔معتزلہ مسلک کوسب سے پہلے امام حنبلؒ جن کا انتقال 855ء میں ہوا نے چیلنج کیا پھر حسن العشاریؒ جن کا انتقال 935ء میں ہوا نے کیا۔آخرکار امام الغزالیؒ جنکا انتقال 1111ء میں ہوا نے اس مسلک کومکمل طور پر مات دے دی۔افکار کی اس جنگ نے اسلامی تاریخ پر اپنے ان مٹ نشان چھوڑے۔آج بھی یہ مسلم طرزفکر پر کافی اثر انداز ہے۔

معتزلہ مسلک کا تمام تر زورانسانی دلائل اورانسان سے انسان کے رشتہ اورانسان سے خدائے تعالیٰ کے رشتہ کوسمجھنے کی صلاحیت پر قائم ہے۔لازمی طور پرانہوں نے اپنے دلائل کوقرآن اورسنت سے ہی اخذ کیا ہے۔ معتزلہ مسلک کے اصول یہ ہیں (ا) توحید" کہہ دو کہ اللہ ایک ہے، واحد ہے، بےاحتیاج ہےاس کوکسی کی حاجت نہیں، نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہےاوراس کے برابر کوئی نہیں"۔قرآن (112-1 تا5)

(۲) انسان کی آزادانہ مرضی۔"اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لاتے تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں۔حتی کہ وہ مومن ہوجائیں"۔ (10-99 قرآن)

(۳) انسان کی ذمہ داری کا اصول اورانسان کے اعمال کے مطابق جزاءوسزاء" کسی آدمی کواس

کی طاقت سے زیادہ تکلیف دینا اللہ کا دستور نہیں''۔(قرآن 2-110)۔

(۴) سخت اخلاقی ضوابط کا وہ حکم کہ بری باتوں سے بچیں اور نیک کام کریں ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو''۔ (قرآن 3-110)۔

معتزلیوں نے انسان سے انسان کا رشتہ، انسان کا تخلیق کائنات سے تعلق اور پھر خود انسان کی خدا سے وابستگی جیسے مسائل پر ان اصولوں کو لاگو کیا۔ انسان کو تخلیق کا مرکز مانتے ہوئے انہوں نے یہ نظریہ آگے بڑھایا کہ انسان خود اپنی تقدیر کا معمار ہے۔ یہ بھی انسان کی ہی ذمہ داری ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے احکامات کے مطابق دنیا کی تعمیر کرے۔

خلیفہ مامون نے معتزلہ مسلک کو سلطنت کا سرکاری عقیدہ بنالیا۔ 847ء تا 861ء تک یعنی خلیفہ منصور سے لے کر خلیفہ المتوکل تک معتزلی سرکاری سرپرستی سے استفادہ کرتے رہے۔ یہی وہ دور ہے جب بغداد میں دارالحکمۃ قائم کیا گیا۔ جہاں یونانی فلسفہ ہندوستانی فلکیات اور چینی ٹکنالوجی کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ علم کی نشوونما ہونے لگی اور بغداد دنیا بھر کے دانش وروں کا مرکز بن گیا۔

معتزلیوں کے زوال کا سبب تھا۔ ان کا حد سے زیادہ جوش اس مسلک کے آخری حدود کو سمجھنے میں ان کی ناکامی، سرکار کی سرپرستی کی وجہ سے انہوں نے ان علماء کو سزا دی جو ان سے اختلاف رکھتے تھے، مخالفت کی آواز کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے مسلک کے حدود کو اس قدر زیادہ بڑھایا چڑھایا کہ ایسے طریقہ کار کو اللہ تعالیٰ اور قرآن کی صفات سے متصف کردیا۔ اسلام کی پوزیشن یہ ہے کہ اللہ واحد ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اس لئے معتزلیوں نے یہ دلیل پیش کی کہ قرآن اس ذات یکتا کا حصہ بھی اگر نہیں ہے تو اس سے الگ بھی نہیں ہوسکتا۔ خدائے تعالیٰ کی یکتائی یعنی خالص توحید کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے قرآن کو خلق کے مقام پر رکھ دیا۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تخلیق وقت کے ایک مقرر کردہ مرحلہ پر کی۔ مخلوق کے مسئلہ نے مسلمانوں کو نہ صرف بڑے گروہوں میں بانٹ دیا بلکہ آپسی خلفشار میں مبتلا کردیا۔ علاوہ اس کے ان کا ایک اور نظریہ بھی تھا کہ انسان کے اعمال کے ساتھ ہی جزاء وسزاء کا بہاؤ خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے دانشوروں نے ان خیالات پر

اعتراض کیا اور انہوں نے سوال پیش کیا کہ اگر انسان کو اچھے اعمال کی جزاء خود بخود مل جاتی ہے اور برے اعمال کی سزاء بھی خود بخود مل جاتی ہے تو خدائے تعالیٰ کے رحم وکرم کی ضرورت ہی کہاں رہ جاتی ہے؟ اس قسم کے فیصلہ کن نظریات نے مسلمانوں میں غیض وغضب کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ جس کی وجہ سے بغاوت کا بھڑک اٹھنا لازمی تھا۔

معتزلیوں کو ''اصولی'' علماء کی جانب سے چیلنج درپیش ہوا اس مزاحمت کے مشہور ترین عالم ہیں امام حنبلؒ جن کا انتقال 855ء میں ہوا وہ ایک جید عالم تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں جاری تمام فقہ کے مسالک کے اصولوں کی تعلیم حاصل کی۔ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور جعفریہ علاوہ اس کے انہوں نے علم کلام یعنی اس دور کے فلسفی مسلک کی بھی تعلیم حاصل کی۔ معتزلیوں کے نظریات سے عوام میں بہت زیادہ انتشار پھیل رہا تھا۔ استحکام وقت کی بڑی ضرورت تھی۔ ان نئے نظریات کا مقابلہ لازمی تھا۔ امام حنبلؒ نے یہ دلیل پیش کی کہ قرآن اور سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ان روایات کی پابندی انتہائی سختی کے ساتھ لازمی ہے جو باقاعدہ تصدیق شدہ ہیں۔

ہر وہ اصول چاہے وہ قانونی ہو یا فلسفیانہ اگر اس کی بنیاد قرآن اور سنت نہیں ہے تو وہ بدعت ہے۔ انہوں نے اجماع کے اصول سے بھی اختلاف کیا۔ اس کو اس وقت تک نہیں مانتے تھے جب تک کہ سنت سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔ انہوں نے فقہ میں قیاس اور استحسان کے طریقۂ کار کو بھی مکمل طور پر رد کر دیا۔ ان کا یہ طرز استدلال معتزلیوں کے لئے بڑا چیلنج تھا جن کی سرپرستی خلیفۂ وقت کی سرکار خود کر رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام حنبلؒ کی زندگی کا اکثر حصہ سزا بھگتنے اور جیل خانہ میں گذرا۔ ان کی ثابت قدمی اور مسلسل جدوجہد نے ان تمام افراد کی ہمتیں بڑھا دیں جو معتزلیوں کے خلاف تھے۔ بنیادی طور پر امام حنبلؒ کی کوششوں سے ہی 847ء میں خلیفہ المتوکل نے معتزلہ مسلک سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ جس طرح معتزلیوں نے اپنے عروج کے دور میں اپنے خلاف آواز اٹھانے والوں کو انتہائی سخت ایذائیں دی تھیں۔ انہیں جیلوں میں ڈالا تھا۔ اسی طرح جب اشاعریوں نے اقتدار کا دامن تھاما تو اپنے مخالفین کو ویسی ہی سزائیں دے کر انتقام لیا۔ اسلامی تاریخ میں مخالف افکار رکھنے والوں کا اکثر اوقات ایسا ہی انجام ہوتا رہا ہے۔

حنبلی مسلک عرب اور مغربی عراق میں اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسویں میں وہابی تحریک کے اٹھنے تک نشوونما پاتا رہا۔ اس وقت یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا۔ ترک تصوف کو علم سیکھنے کا ایک قانونی عمل سمجھتے تھے چونکہ وہ حنفی المسلک تھے اس لئے اپنے نظریات میں کافی آزاد خیال تھے۔ وہابیوں نے ترکوں کے مسلک کو اپنی مروجہ روایات کے خلاف سمجھا وہابی مسلک کے عربوں نے اٹھارویں صدی میں بغاوت کردی۔ جب 1917ء میں وہابیوں نے حجاز پر قبضہ کر لیا تو حنبلی مسلک کو عرب کا باقاعدہ سرکاری قانون قرار دیا گیا۔ یہی عرب آگے چل کر سعودی عرب بنا۔ آج کل سعودی عرب میں عملاً جو حنبلی فقہ سرکاری طور نافذ ہے اس کی اپنی الگ خصوصیت کی وجہ سے وہ مشہور ہے۔

یہ ہر اس عمل کو نفرت انگیز اور ناکارہ قرار دیتا ہے جو اس کی نظروں میں بدعت ہے۔ یہاں یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ بدعت کا مطلب ہے مذہب میں نئی چیزوں کی ایجاد۔ حنبلی مسلک کے مطابق ہر وہ عمل جو قرآن اور سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق نہ ہو اسے بدعت قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس نکتہ میں حنبلی مسلک دوسرے مسلک سے نہایت کٹھن ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی چاروں فقہ مالکی، شافعی اور حنبلی آپس میں ایک دوسرے کو تسلم کرتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات ان کی آپسی چپقلش نے تاریخ کے اہم واقعات کے نتائج پر دیرپا اثر چھوڑا ہے۔ ہم دیکھتے ہین کہ جب چنگیز خان عالم اسلام پر حملہ کے لئے پر تول رہا تھا تو خصوصیت کے ساتھ اس وقت حنفی، شافعی اور جعفریہ فقہ کے ماننے والے خراسان اور فارس میں آپس ہی میں دست بہ گریبان تھے۔ ایک دوسرے سے لڑائیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ وہ حالات تھے جنہوں نے چنگیز خان کو 1219ء میں خراسان کے بادشاہ کے خلاف جنگ کرنے کی راہ ہموار کی۔ اس صورت حال سے چنگیز خان کو زبردست فائدہ حاصل ہوا۔

شاید وہ طرز فکر جو اسلامی افکار پر بے انتہاء اثر انداز رہا وہ الاشعری ہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی یہ موقف اختیار کر سکتا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے بعد اسلامی تہذیب کو ترقی کی طرف لے جانے میں الاشعری مسلک نے فیصلہ کن رول ادا کیا ہے۔ صدیوں سے مسلمانوں کی اکثریت پانچوں فقہ یعنی حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور جعفریہ کے ساتھ ہی اشعری فلسفیانہ افکار کو بھی اپناتی آرہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے

کہ فقہ کے پانچوں مسالک پر کھلم کھلا بحث ہوتی رہی ہے۔لیکن ان کے درمیان باہمی تعاون بھی رہا اور آپسی کشمکش بھی رہی ہے۔جبکہ اشعری نظریات اسلامی تہذیب وتمدن میں اس طرح سرایت کر گئے جیسے کہ نخلستان میں پانی جذب ہوجاتا ہے۔اسلامی تہذیب کی اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں میں اشعری نظریات کا بہت بڑا اثر ونفوذ رہا ہے۔الغزالی جن انتقال 1111ء میں ہوا سے لے کر ہندو پاکستان کے علامہ اقبال جن کا انتقال 1938ء میں ہوا تک الاشعری نظریات ایک ابلتے چشمہ کی طرح اسلام کی زرخیز سرزمین کی آبیاری کرتے رہے۔مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد کے رخ کا تعین کرتے رہے،اسے نئ جہد نئ سمت عطا کرتے رہے۔

ابوالحسن الاشعریؒ جن کا انتقال 935ء میں ہوا انہی کے نام سے اشعری مسلک موسوم ہے، انہیں الاشعری مسلک کے ماننے والوں نے آخرکار معتزلیوں کو مات دی۔الاشعریؒ ابتداء میں معتزلہ مسلک سے ہی وابستہ تھے۔معتزلیوں نے دلیل کو وحی الٰہی پر فوقیت دے دی اور اس غلط نتیجہ پر پہنچے کہ قرآن کی تخلیق وقت کے ساتھ ہوئی۔ایسے خیالات مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھے۔الاشعریؒ نے ان دلائل کی نفی کی اور وحی کو حجّت کی دسترس سے پرے رکھا۔ حجت وقت کے حدود میں مقید ہے۔ یہاں اول اور آخر کے متعلق پہلے ہی ایک مفروضہ طے کرلینا ہوتا ہے۔ وحی اعلیٰ و برتر اور ماورائے ادراک ہے۔اس کی تشریح یہی ہے کہ کسی بھی طرح سے ہمارے کسی بھی فہم سے بعید ہے وہ اول وآخر کے مفروضات سے بھی دور بہت ہی دور ہے۔ وہ حجت یا دلیل نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے اترنے والی وحی ہے جو صحیح اور غلط کی تمیز بتاتی ہے،حرام اور حلال کو ممیّز کرتی ہے۔اللہ تعالیٰ کے صفات کی روشنی سے آگاہی بخشتی ہے، جنت ودوزخ کے قائم ہونے کا مکمل یقین ہمیں دلاتی ہے۔شعور وہ ہتھیار ہے جس کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو عطا کیا ہے تاکہ وہ تخلیق شدہ دنیا پر غور کرے اور مخلوق کے رشتوں کو تلاش کرے اور اس طرح اپنے عقیدہ کو مضبوط بنائے۔

الاشعریؒ کی دلیل کا مرکزی نکتہ اللہ تعالیٰ کے مظاہر میں سے ایک مظہر قدرت وقت کی تعریف ہے۔ الاشعریؒ کو یونانیوں کے اس نظریہ کا علم تھا کہ مادہ کو ذروں (Atoms) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے اس نظریہ کو اس بحث کا مفروضہ بنایا کہ وقت الگ الگ حصوں میں منقسم ہو کر آگے بڑھتا ہے، ہر ہر قدم پر، ہر

وقت، وقت کے ایک ایک لمحہ کے درمیان اللہ تعالیٰ کی رحمت مداخلت کرتی ہے اور واقعات کے نتائج کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس نظریاتی راہ کے کھل جانے سے اشعری اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کے تصور کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ جبکہ اس منزل پر معتزلی بری طرح ٹھوکر کھائے۔ اس کی بنیادی وجہ انکا اپنایا ہوا نظریہ تھا انہوں نے یہ نظریہ اپنایا تھا کہ وقت ایک مسلسل (continuous) خلق ہے۔ اس لئے ایک عمل خود بخود اپنے ردعمل کی جانب بڑھتا ہے۔ نیوٹن (Newton) کے جدید میکانیکی نظریہ کی طرح اگر یہ مان لیا جائے کہ کوئی بھی واقعہ اپنے ہی ردعمل کے طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے تو پھر یہاں اللہ تعالیٰ کے وجود کا جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ بلکہ یہ تو صرف ایک سیکولر خودکار میکانکی عمل بن کر رہ جاتا ہے۔ اسکے ایک ہزار سال بعد وجود میں آنے والی جدید دور کی مغربی تہذیب جو کہ اب عالمی تہذیب بن گئی ہے بالکل اسی نظریہ سے وابستہ ہے۔

الاشعریؒ کے علم وفہم کا خلاصہ یوں پیش ہے کہ ذرہِ یعنی ایٹم اور مادّی دنیا اس سیڑھی کا اولین پہلو ہیں، یہ طبعیاّتی، اور مادّی دنیا دلیل کی محتاج ہے۔ لیکن دلیل خود وحی کی محتاج ہے اور وحی دلیل کو منسوخ کرسکتی ہے۔

اس کے برخلاف معتزلہ کے ساتھ ہی ساتھ یونانیوں اور جدید مغربی دنیا نے یہ مفروضہ پیش کیا کہ اس عالم طبعی اور وحی دونوں کو دلائل کے ذریعہ سمجھا بوجھا جاسکتا ہے۔

اشعری فلسفہ کے دو اور اہم پہلوؤں کے متعلق وضاحت ضروری ہے۔ اشعری اس پر زور دیتے ہیں ''عالم کے سارے کاروبار کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے،، 100-10 قرآن)۔

انسان میں آزادانہ عمل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت بس ایک بندے یا غلام کی سی ہے جس نے عمل کی کوئی بھی صلاحیت صرف اللہ تعالیٰ سے انعام کے طور پر ہی حاصل کی ہے۔ یہ عقائد اصول کسب کہلائے- ان اصولوں کو آگے آنے والے کئی مسلمانوں نے غلط سمجھا اور انکا غلط مطلب اخذ کرکے اسے تقدیر کے مترادف سمجھ لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کچھ مسلمانوں نے تقدیر کو اسلام کا چھٹا ستون قرار دے دیا۔ ایک تاویل یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ اسی کی وجہ سے آگے چل کر اسلامی دنیا کو جمود نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دوسرے اشعری نے یہ نظریہ بھی اپنایا کہ کارخانۂ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل ہے۔کوئی بھی چیز اچانک وقوع پذیر نہیں ہوتی یہ کائنات علت ومعلول کا سلسلہ نہیں، جو نتائج اور اسباب ہم دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں وہ صرف ظاہری ہیں اور قدرت کے خلقی مظاہر کے وصف کا صرف عکس ہیں۔یہی نظریہ الغزالی کے مشہور رسالہ ''تحفظ الفلاسفہ'' کا مرکزی نقطۂ دلیل ہے یہ 1100ء کے آس پاس لکھا گیا جو اسلام میں فلسفہ کے لئے دعوت کا پیغام ثابت ہوا اور اسلامی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ابن رشد نے (انتقال 1198ء) جو شاید ارسطو کے بعد تاریخ عالم میں سب سے عظیم فلسفی مانے جاتے ہیں 1190ء میں اپنے مشہور رسالہ ''تحفظ التحفظ'' میں اس نظریہ کے خلاف دلیل پیش کی۔مسلمانوں نے الغزالی کو اپنایا اور مغرب نے ابن رشد کو اس طرح دونوں تہذیبیں دو مختلف سمتوں کی جانب چل نکلیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخ عالم کے کھلتے ہوئے صفحات پر اس کا زبردست اثر پڑا۔مغربی دنیا فلسفے کی طرف چلی اور مسلمان اشاعرہ نظریۂ کی طرف مڑے۔

اسلامی تاریخ اور ہم عصر مسلمانوں کو سمجھنے کیلئے یہ اشد ضروری ہے کہ ایک ہزار سال پہلے معتزلہ اور اشعری کے نظریات، انکا ارتقاء، ان کا عروج اور ان کا زوال ان تمام کے بارے میں جانکاری حاصل کی جائے۔

معتزلہ یونانیوں کے کاندھوں پر سوار تھے لیکن انہوں نے اس طریقۂ کار کو قرآن پر لاگو کرنے اور اپنے ساتھی مسلمانوں پر زبردستی تھوپنے کی کوشش کی۔اس غلطی کی وجہ سے ان کے نظریات کو مغربی لاطینی دین کہہ کر اسلام سے خارج کر دیا گیا۔اشعری معتزلہ کے کندھوں پر سوار تھے لیکن انہوں نے معتزلیوں کے طریقۂ کار کی نفی کی اور انہیں کافر قرار دیا۔آنے والی مسلمان نسلوں نے ان اشعری نظریات کو سمجھنے میں غلطی کی، ان کے تفکرات کو تقدیر سے الجھا دیا اور آرام کے ساتھ غفلت کی نیند سو گئے۔

جعفریہ مسلک کا ارتقاء آزادانہ طور پر ہوا اور یہ سنی مسلکِ فقہ کا متوازی ہے۔اس کے ساتھی مسالک کی طرح اس کی جڑیں بھی قرآن اور سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی پیوستہ ہیں۔حالانکہ اس نے اپنے سرچشمہ سے اکتساب حاصل کرنے کے لئے آزادانہ روش کا مظاہرہ کیا لیکن اکثر عملی معاملات میں سنّی مسلک اور جعفریہ مسلک کا موقف ایک ہے یا آپس میں ملتا جلتا ہے۔سچ تو یہ ہے، سنی فقہ اور جعفریہ فقہ

نے اکثر معاملات میں جو موقف اختیار کیا ہے ان کے درمیان میں اختلاف کم ہے، جبکہ خود سنی مسالک میں انہی معاملات پر آپسی اختلافات زیادہ ہیں۔

مسلمانوں کے ایک گروہ نے یہ منفی موقف رویہ اختیار کیا کہ فقہ کے صرف چار ہی مسالک ہیں یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی۔ تاریخی حقائق کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو جعفریہ فقہ بھی اسی قدر جائز ہے جس قدر کہ سنی فقہ اس لئے کہ اس کا ارتقاء آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے شروع ہوا اور اسے مسلمانوں کی ایک بڑی اقلیت مانتی ہے۔ اسی طرح زیدی مسلک کا فقہ بھی تاریخی طور پر جائز ہے لیکن ہم اس کا زیادہ تذکرہ اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی صرف ایک معمولی سی اقلیت ہی اس پر گامزن ہے۔

قرآن شریف آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خصوصی درجہ عنایت کرتا ہے۔ ''نبی کے گھرانے والو! اللہ نے ارادہ فرمالیا ہے کہ وہ تمہیں صاف رکھے گا اور بہترین پاکیزہ زندگی عنایت فرمائے گا'' (الفرقان 33:)۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کے افراد کو اہل بیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیت سے مراد حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے علاوہ حضرت عقیلؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت عباسؓ اور انکی آل اولاد ہیں۔ کچھ دوسری احادیث میں صرف حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ہی اہل بیت سے مراد لیا گیا ہے۔ حج سے واپس ہوتے ہوئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام ''عزیز قم'' پر ٹھہرے وہاں انہوں نے اعلان کیا ''اے لوگو میں اپنے پیچھے دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں اگر تم ان کو سنبھالو گے تو کبھی غلط روش اختیار نہ کرو گے وہ ہیں: ''کتاب'' جو ایک رسی کی طرح آسمان سے زمین تک دراز ہے اور ''میرے اہل وعیال''۔ علاوہ اس کے شیعہ و سنی احادیث دونوں حضرت علیؓ کے اس اعلیٰ مقام کی تصدیق کرتے ہیں جن میں انہیں علم کا دروازہ اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین قرار دیا گیا ہے۔ ''علیؓ میرے لئے اسی طرح ہیں جس طرح ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے لئے تھے، فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔'' حدیث

جعفریہ فقہ کا مرکزی اصول یا عقیدہ یہ ہے کہ فقہ کے سلسلۂ سند کا سرچشمہ قرآن سے بہتا ہوا سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم تک چلا پھر اہل بیت تک اور نتیجتاً آخر کار صرف اور صرف اہل بیعت کے ائمہ کرام

تک ہی پہنچتا ہے۔موزانہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سنی اس موقف کومنظور کرتے ہیں کہ اقتدار کے سلسلہ کا سر چشمہ قرآن سے شروع ہوکر سنت الرسولؐ تک بہتا ہے پھر یہاں سے اجماع صحابہؓ تک جا پہنچتا ہے۔ یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔''اے لوگو! میں تمہارے لئے اللہ کی کتاب اور میری سنت چھوڑ رہا ہوں اگر تم انکی اتباع کروگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے'' اور میری امت کبھی کسی گمراہی پر متحد نہیں ہوگی''۔ یہ دونوں موقف اس وقت پہلی بار بالکل واضح ہوگئے جب حضرت عمر بن الخطابؓ کی شہادت کے بعد نئے خلیفہ کے انتخاب کے لئے نامزدگی گئی، مجلس شوریٰ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ سے سوال کیا تھا کہ کیا آپ سلطنت کے امور قرآن اور سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دونوں شیوخ یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے چلائیں گے۔حضرت علیؓ نے جواب دیا تھا۔ ''میں قرآن اور سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق خلافت کی پاسبانی کروں گا''۔اور حضرت عثمانؓ نے جواب دیا تھا کہ واقعی میں قرآن ،سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دونوں شیوخ کی سنت کی پیروی کروں گا۔اوراسی وجہ سے انہیں خلیفہ نامزد کردیا گیا۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی اکثریت نے اس موقف کو قبول کرلیا تھا۔

خلافت کے بارے میں اختلاف رائے اور کئی تباہ کن خانہ جنگیوں کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت فرمانے کے ایک سو سال تک فقہ کا کوئی بھی الگ مسلک موجود نہیں تھا۔ جو بھی اختلاف الرائے تھا وہ سیاسی تھا۔فقہ یا شریعت کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جبکہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ سے کئی معاملات میں فتوی مانگا۔جبکہ دونوں انتہائی تلخ خانہ جنگی میں مشغول تھے۔اہل بیت نے خصوصیت کے ساتھ حضرت علیؓ اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کی روایت کردہ احادیث کو جمع کیا ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سنی گئی ہیں۔حضرت علیؓ کے مقولے جو کہ ''نہج البلاغۃ'' میں جمع کئے گئے ہیں۔اسلامی تعلیمات اور اصول اخلاقیات کا لاثانی سرمایہ اور مخزن ہے۔

فقہ کی واضح ومعین شکل، ایک شائستہ مہذب ذہنی وتعلیمی درس دینے والے شعبۂ علم کی حیثیت سے،

حضرت امام جعفر الصادق ؒ جن کا انتقال 765ء میں ہوا کے دور میں ارتقاء پذیر ہوا۔ حضرت جعفر الصادق ؒ ایک غیر معمولی طور پر ذہین عالم، استاذ اور رہنما امام تھے۔ انہوں نے ''حلقہ'' کی ابتداء کی جہاں اس دور کے عظیم علماء جمع ہوتے، صلاح ومشورہ کرتے اور یوں حلقہ میں علم سیکھتے۔ امام ابوحنیفہؒ ان کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے امام جعفرؒ کے گھر پر منعقد ہونے والے حلقہ میں حصہ لیا اور فیض حاصل کرتے رہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرح امام جعفر الصادق ؒ نے بھی اپنے نام سے موسوم ہونے والے فقہ کو آپ نے خود قلمبند نہیں کیا۔ وہ ایک استاذ تھے جو زبانی درس دیا کرتے تھے، فقہ کے اصولوں کو کھول کھول کر صاف صاف الفاظ میں بیان کرتے تھے، اسلام کے اولین دور میں جاری ''قراء'' طریقۂ کار یعنی ''زبانی درس'' کے ذریعہ دیئے جانے والے ان کے درس کے سلسلے کی فہرست کو ترتیب دینے اور انہیں دستاویزی شکل دینے کا کام ان کے شاگردوں پر چھوڑ دیا گیا۔ امامیہ مصنفین کے سلسلے کی سب سے اہم شخصیت محمد ابن الحسن القمیؒ کی ہے جن کا انتقال 903ء میں ہوا۔ انہوں نے ولایت اور امامت کے اصولوں کو تحریری طور پر منضبط کیا حالانکہ یہ اصول خلیفہ حضرت علیؓ کے دور میں ہی موجود تھے۔ ولایت ''ولی'' سے ماخوذ ہے جسکا مطلب ہے محافظ/استاذ، مصاحب اور یہ شیعہ اصولوں کا مرکزی نقطۂ نظر ہے، شیعہ نے یہ نقطۂ نظر اپنایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد مسلم قوم کی محافظت ایک ولی پر عائد ہوئی اور حضرت علیؓ اولین ولی ہیں۔ قوم کا ایک مالک یا استاذ ہونا ضروری ہے اور یہ مالک بغیر کسی تردد کے صرف اور صرف اہل بیت کا ایک فرد ہی ہوسکتا ہے۔ چونکہ خدائے تعالیٰ نے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پاکیزہ بنایا ہے اسی لئے ائمہ کرام بھی پاک ومعصوم ہیں، اسی لئے وہ قوم کی امامت کے لئے خصوصیت کے ساتھ واحد فرد کی حیثیت سے چنے گئے ہیں۔ جعفریہ مسلک کے ماننے والے بارہ ائمہ کرام کی امامت کو مانتے ہیں۔ امام علیؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ، امام علی زین العابدینؒ، امام محمد باقرؒ، امام جعفر الصادق ؒ، امام موسیٰ کاظمؒ، امام علی رضاؒ، امام جواد راضیؒ، امام ہادیؒ، امام حسن عسکریؒ اور امام محمد مہدیؒ۔ بارہ ائمہ کرام کو قبول کرنے کی وجہ سے جعفریہ مسلک کو اثناء عشری کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جو بارہ امام پر یقین رکھتے ہیں۔ جعفریہ مسلک کا ''عصمۃ'' پر بھی عقیدہ ہے یعنی امام وقت کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے، مذہبی غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچاتا ہے۔

پرسنل لاء کے معاملے میں جعفریہ فقہ اور حنفی فقہ کے درمیان کچھ مسائل کے بارے میں اختلافات ہیں لیکن قومی مسائل یا قوم کی بھلائی کا جہاں تک سوال ہے اس معاملہ میں جعفریہ فقہ بھی حنفی فقہ کی طرح انتہائی سخت ہے۔ ایسے مسائل جس کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملتی ایسے مسائل پر دونوں فقہ میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہے حنفی فقہ کی طرح جعفریہ میں بھی استحسان کی گنجائش موجود ہے۔

جس طرح حنبلی فقہ کا عروج اپنے دور کے سیاسی حالات کا مرہون منت رہا بالکل اسی طرح جعفریہ فقہ کا عروج بھی اور اس کی ترقی بھی شیعہ طبقہ کے عروج سے وابستہ رہی۔ کربلا کے سانحہ کے بعد جعفریہ تحریک ایک غیر سیاسی تحریک بن گئی اور بنوامیہ کے ساتھ راست ٹکراؤ سے گریز کیا۔ جب بنوعباس کا دور شروع ہوا تو ایسا لگا کہ جعفریہ تحریک کے لئے امید کی کرن روشن ہوئی ہو اس لئے کہ بنوعباس بنو ہاشم کے بھائی تھے۔ لیکن یہ ساری امیدیں آگے چل کر خاک میں مل گئیں۔ بنوعباس نے شروع شروع میں تو شیعہ تحریک سے اپنے مفاد کے لئے فائدہ اٹھایا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے بنوامیہ سے بھی زیادہ سختی اور بربریت کے ساتھ شیعہ تحریک کو کچلا۔ اہل بیت کو سیاسی حاکمیت کے حقوق دلوانے میں ہر طرف سے ناکام ہو کر شیعہ تحریک زیادہ تر تزکیہ نفس کی طرف راغب ہوگئی۔ صرف مصر میں بنوفاطمہ کا دور اس سے مستثنیٰ تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں بھڑک اٹھنے والے فلسفیانہ مباحث سے اور ان کے تنازعوں سے مفر ممکن نہ تھا۔ اپنے ہم عصر سنی، فقہ کی طرح فقہ جعفریہ بھی دو الگ الگ نظریات کے ساتھ ارتقاء پاتا رہا۔ ایک تھا عقلیت پسند دوسرا روایت پسند، عقلیت پسندانہ نظریات سے عقبری مسلک کا ارتقاء ہوا۔ اس مسلک نے معتبر ترین کتابوں کو ہی فقہ کی بنیاد بنانے پر زور دیا۔ اس کے مطابق معتبر کتابیں ہیں۔ قرآن، احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی احادیث۔ روایت پسند مسالک، ''اصولی مسلک'' سے مربوط ہو گئے اور احادیث و روایات کے مستند ہونے کے بارے میں ثبوت کے لئے طریقۂ کار اور اصول قائم کرنے پر زور دیا۔ جعفریہ فقہ کے ''اصولی مسلک'' کا طریقۂ کار امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعیؒ کے اصولی مسلک سے تقریباً ملتا جلتا ہے۔ اس مسئلہ پر جہاں قرآن اور سنت الرسولؐ سے صاف صاف اور واضح رہنمائی نہیں ملتی وہاں حنفی مسلک کی طرح جعفریہ مسلک نے بھی ''اجتہاد'' کو فقہ کے لئے قابل قبول طریقۂ کار کی حیثیت سے

قبول کیا ہے۔

اس طرح جعفریہ اور سنّی مسالک دو آپسی الگ الگ ندیوں کی طرح ہیں جو ایک ہی عظیم جھیل سے نکلتی ہیں اور اسلام کی سرزمین کے لالہ زاروں کو مختلف سمتوں سے سیراب کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان دونوں مسالک نے اپنے اپنے دلائل سے اکثر ایک ہی نتیجہ نکالا ہے اس لئے کہ دونوں کا ماخذ قرآن اور سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے حالانکہ ان کے درمیانی سرچشمے الگ ہو سکتے ہیں اور ان میں اختلافات کی گنجائش بھی ہے۔

فقہ نے ایک ایسے پل کی تعمیر کی ہے جس کے ذریعہ اسلامی تہذیب مستقبل کی جانب کامیابی کے ساتھ پیش رفت کرتی ہے۔ اُس دور میں دنیا میں جو مروجہ نظریات تھے مسلمانوں نے ان سارے افکار کا سامنا اعتماد، جوش اور ولولہ سے کیا اور یہی بات تاریخ کے ایک طالب علم کی توجہ فوری طور پر مبذول کر لیتی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی تک اسلامی تہذیب نے اس دور کی ہم عصر تہذیبوں کا موثر جواب دینے کے لئے اور اپنے جوابی اقدام کے لئے جن تصورات کی ضرورت تھی ان کو واضح اور معین شکل دے دی۔ یہ جوابی اقدام بنیادی طور پر یونان کے عقلیت پسند چیلنج سے اور مشرق کے روحانی چیلنج دونوں سے الگ تھا۔ کچھ تجربات کے بعد یونانی فکر کو دھتکار دیا گیا اور اسے بوریا بستر باندھ کر مغرب کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ ابن رشد کا ''تحفظ التحفظ،، جو کہ 1190ء کے آس پاس لکھا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک حسرت بھرا الوداعی سلام ہے۔ ایک مسلمان اسکالر کا جو اپنے آبائی اسلامی وطن کو چھوڑ کے لاطینی مغرب کی طرف ہجرت کر رہا ہے۔ دوسری جانب اسلام نے مشرقی افکار کا مقابلہ یوں کیا کہ اس کے کئی روحانی افکار کو باطنیت اور اسلامیت میں رنگ لیا گیا۔

بارہویں صدی کے بعد صوفی افکار نشو ونما پانے لگے اور منگولوں کی بربادیوں سے بھرپور یلغار کے بعد اس کی جڑیں اور مضبوط ہوئیں اور یہ اسلام کا بنیادی ذریعہ بن گیا۔ اب اسلامی عمارت کے معمار بوعلی سینا، یا القندی، یا البیرونی یا ابن رشد نہیں رہے۔ بہ استثنائے ابن خلدون جن کا انتقال 1407ء میں ہوا۔ بلکہ ان کی جگہ حافظؒ، رومیؒ یا شاہ ولی اللہؒ نے لے لی۔ یہ اب اس اسلامی قصر کے معمار بن گئے، تجرباتیت اور عقلیت ماضی کی یادگار بن گئے۔ اس طرح قرونِ وسطی کے بعد عالم اسلام میں اور مغرب

میں سائنس اور تہذیب کے نئے اور مختلف رشتے استوار ہوئے۔ مغرب نے بوعلی سینا یعنی اوسینا اور ابن رشد یعنی (Averoes) اور ان کے تجرباتی و عقلی ورثہ کو اپنا لیا اور جس سائنس کو آج ہم جانتے ہیں اس سائنس کو اپنی تہذیب وتمدن کا اٹوٹ حصہ بنالیا۔ مسلمان تیزی کے ساتھ عقلیت پسندانہ تجرباتیت سے دور ہوتے گئے اور مشاہدۂ نفس ومراقبہ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔

وہ مسلمان جو یہ اعلان کرتے ہیں کہ سائنس اور مذہب اسلام کے درمیان کوئی تصادم نہیں ہے۔ وہ ضرور اس پر غور وفکر کریں۔ سائنس کو اپنے ابتدائی نظام سے نکال کر آپ اسے زندگی کی بازی کے دوران یا آخر میں اسی میدان میں نہیں اتار سکتے۔ آپ کو نظامِ زندگی یا اس بازی کے ابتدائی نظام کو ہی بدلنا ہے، یعنی وہ بنیادی تصورات جس پر مسلم تہذیب نے نویں صدی عیسوی کے دوران معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان ہونے والے باہم مناظروں کے بعد سے ''کائناتی نگاہ بینی'' کے قصر کی تعمیر کی اس کو سامنے رکھ کر قابل فہم ومربوط فلسفۂ سائنس اور فلسفۂ تہذیب کو از سرنو منضبط کرنا ہے۔

وقت کے ساتھ اسلامی افکار پر جمود طاری ہوگیا۔ وہ افکار جو ایک زمانے میں مستقبل کی جانب جادہ پیمائی کرتے تھے اب ماضی کی طرف لے جانے لگے۔ مسالک کے فقہ بذات خود مذاہب بن گئے۔ ٹھوس اور منجمد ہو گئے۔ نسل پرستی، سرکاری سرپرستی، سیاسی بدعنوانیاں، قبیلہ پرستی، وطن پرستی، ان تمام نے حالات کو منجمد بنانے میں اپنا اپنا رول ادا کیا۔ وہ قراء جو اسلام کے اولین دور میں خانہ بدوشوں کی طرح بستی بستی گھوم کر اسلام کا درس دیا کرتے تھے اب ناپید ہو گئے ان کی جگہ پیشہ ور اساتذہ نے لے لی۔ حالات کو جوں کا توں برقرار رکھنا ہی ان کا کام تھا۔ نزاعی معاملات سے چھٹکارا پانے کے لئے لوگ تڑپنے لگے۔ وسیع تر پیمانے پر یہ اجماع ہوا کہ موجودہ نظامِ فقہ موجودہ دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسلام نے یونانی طرز فکر کی یلغار کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا اور مشرقی مذاہب کے روحانی چیلنج کو کامیابی کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسلامی تہذیب وتمدن اور ہم عصر مروجہ تہذیب وتمدن کے درمیان تہذیبی ٹکراؤ اور مناقشہ کی حدیں باقاعدہ کھنچی جا چکی تھیں۔ شاید اب مقدمہ کو آرام دینے کا وقت آ گیا تھا۔ اس لئے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا، لوگ تقلید کو اپنانے لگے وہ صرف سنی، شیعہ، حنفی، مالکی،

شافعی،جعفری،زیدی یا فاطمی بن کر رہ گئے۔

سیاسی تبدیلیاں،عقل وخرد پر بھی جمود طاری کر دیتی ہیں۔نویں صدی عیسوی میں بنو فاطمہ نے مصر کو فتح کیا اور سنّی اکثریتی عوام پر فاطمیہ فقہ کے ذریعہ حکومت کی۔ بنو فاطمیہ کے چیلنج کے جواب کی حیثیت سے ترک آگے آئے جو سنی فقہ کے علمبر دار تھے۔خلافت کا مرکزی کردار حاکمانہ اقتدار میں گم ہو گیا۔ان کی جگہ سلاطین اور امیروں کی آزادانہ ریاستوں نے لے لی۔

سولہویں صدی عیسوی کے دوران عظیم شاہی خاندان ابھرے وہ تھے عثمانیہ ترک، مغل اور صفویہ۔صفویہ نے جعفریہ فقہ کو اپنایا تو عثمانیہ ترکوں اور مغلوں نے حنفی فقہ کو۔آپس میں چند ایک افکار پر اختلافات تو ضرور ہوتے تھے لیکن سرحدوں اور علاقوں پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے آپسی جنگوں میں ہمیشہ ''مذہب'' کا سہارا لیا گیا۔صرف جغرافیائی حالات اور اس دور کی محدود ٹکنالوجی نے انہیں ایک دوسرے کو مکمل برباد کرنے سے باز رکھا۔جو کچھ بھی ہو ان کی اپنی متعصب ''مذہبی'' پالیسیوں نے سترھویں صدی تک اس بات کو یقینی بنا دیا کہ بنیادی طور پر ایران اثنا عشری اور پاکستان ہندوستان، وسط ایشیاء اور عثمانیہ ترک حنفی خطوط میں منقسم ہو کے رہ گئے۔ شیعہ اور سنی ''مذاہب'' کے درمیان مفاہمت کی آخری بڑی کوشش نادر شاہ نے کی۔ابتداء میں یہ بہت بڑا سخی تھا۔لیکن 1739ء میں قتل وغارت گری کے بعد جب دہلی سے بہت بڑی دولت لوٹ لے گیا تو بہت بڑا کنجوس بن گیا۔ایران واپس لوٹنے کے بعد اس نے شیعہ اور سنی علماء کو جمع کیا اور اس تاریخی تقسیم کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔لیکن شیعہ اور سنی دونوں نے اسکی مخالفت کی اور اسکے خلاف دشنام طرازی پر اتر آئے۔اس مخالفت نے اسے اور ظالم بنا دیا اور وہ ایک کنجوس کی موت مرا۔زندگی بھر شیعہ اور سنی دونوں کو حقارت سے دیکھتا رہا اور تاریخ خود اسے حقارت سے دیکھتی رہی۔

اجتہاد پر موت کا جمود طاری ہونے کے لئے اکثر تاتاریوں اور منگولوں کو مورد الزام قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن تاریخی طور پر یہ بات صحیح نہیں ہے۔سچ تو یہ ہے کہ گیارہویں، بارہویں اور تیرھویں صدی میں صلیبیوں کے حملے اور تیرھویں صدی میں منگولوں کی جانب سے ہونے والی تباہیوں اور بربادیوں اور بغداد میں خلافت کے خاتمہ سے بہت پہلے ہی جمود کا یہ عمل شروع ہو چکا تھا۔بیرونی اہم واقعات نے تو بس حالات کو برقرار رکھا۔

اورخارجی عناصر سے دور ہوکر اسلامی تہذیب زیادہ تر باطن کی جانب راغب ہوتی چلی گئی۔ اپنی باطنی روح کی طرف اس کے بعد صوفی اصحاب نے لیڈرشپ کوقراء اورفقہاء کے ہاتھوں سے نکال کرخودسنبھال لیا۔

اہم مسالک فقہ نے ابتدائی دور کے مسلمانوں کی اہم ضروریات کو پورا کرنے کی خدمت انجام دی، معاشرہ کومربوط کیا، بیرونی تہذیبوں کے نظریات سے انکے افکار سےقوم کو بچایااورتاریخ کے نازک لمحات میں اس کی حفاظت کی۔ اٹھارویں صدی میں اسلام کوفوجی حیثیت سے مشرق وسطیٰ اور بحیرۂ روم میں غلبہ حاصل تھا۔اس دور میں اسلامی تہذیب کا یونانی، چینی اور ہندی تہذیبوں کے ساتھ باہمی اثر اندازی کا عمل بھی جاری رہا۔لیکن اس دور کی ابتدائی ٹکنالوجی کی وجہ سے ہرایک تہذیب کافی حدتک اپنے ہی دائرہ اثر میں آزادتھی۔مسلمانوں کے سامنے سب سے پہلا چیلنج تھا خوداپنے داخلی رشتوں کو چھانٹ کرانہیں مستحکم بنانااس کے بعددوسری تہذیبوں کے افکار کے ساتھ اس کے روابط کی تشریح کرنا۔اس دور میں اس وقت کے حالات کے مطابق اسکاحل انہوں نے ڈھونڈ نکالا اسی دھن میں انہوں نے دنیاکو''دارالحرب''اور''دار الاسلام'' میں بانٹا۔دارالاسلام دنیا کا وہ حصہ تھا جہاں اسلامی شریعت کا نفاذ تھا۔''دارالحرب'' وہ دوسری دنیاتھی جہاں کفار یا اللہ تعالیٰ کی توحید کو نہ ماننے والے بستے تھےاس لئے دارالحرب پر حملے کرنااوراس پر قبضہ جمانا ایک مستحب کام سمجھا جاتا تھا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظریہ کی ازسرنوتعریف کی جائے۔آج مسلمانوں کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی غیرمسلم اکثریتی ممالک میں بستی ہے۔فقہ ایک منجمد ہتھیارنہیں ہے۔یہ شریعت کا تاریخی حجم ہےاس سکڑتی ہوئی دنیا میں جوٹکنالوجی کی وجہ سےایک دوسرے کے بہت ہی قریب آ گئی ہے۔جہاں انفارمیشن انقلاب نے ممالک کی قومی سرحدوں کوغیرمحفوظ کردیاہے۔تہذیبی عمل ردعمل تمدنی مکالمے وگفت وشنیدا لگ ہی طریقہ سے ظہور پذیر ہیں۔یہ عمل آٹھویں اورنویں صدی کے عمل سے بالکل ہی الگ ہے۔

آج اکیسویں صدی عیسوی میں اسلام کو یونان کی عقلیت پسندی کا سامنانہیں ہے، نہ ہی بودھوں کے مراقبہ (Abnegnation) سےاورنہ ویدوں کی اوتار پرستی سے بلکہ ایک ایسی مادہ پرست تہذیب جوکسی بھی کے مذہب کے خلاف ہے آج دنیا کی تہذیب ایک نئے اوتاروادکی پرستار ہے۔اس تہذیب کا

مرکزی نقطۂ نظر ہے اقتصادی مرکزیت، آج کی عالمی مادہ پرست تہذیب نے سائنس، ٹکنالوجی، فلسفہ، علم اخلاقیات اور سیاست کو اپنا اوتار بنالیا ہے اور بذات خود مذہب کی اصل روح کو سب سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔ آج کے سب سے اہم اور بڑے مسائل بنیادی طور پر اقتصادیات سے وابستہ ہیں، روحانیت سے نہیں۔ آج دنیا کے تمام مذاہب کے لوگ چاہے وہ مسلمان ہوں، عیسائی ہوں یا بودھ اور ہندو سب ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔ ایک دوسرے پر عمل ردعمل کے مسئلہ کی تشریح سے متصادم ہیں۔ علاوہ اس کے اس صورت حال سے بھی دوچار ہیں کہ اس مادہ پرست تہذیب سے کس طرح نپٹنا چاہئے۔ صاف ظاہر ہے کہ علماء کی جانب سے ایک مدلل ردعمل کو ابھی اور ظہور میں آنا باقی ہے۔

استفادہ:

(۱) صحیح مسلم حدیث 3920

(۲) صحیح ترمذی، روایت 874، راوی زید بن اکرمؓ، کنزالعمال سے لی گئی روایات

(۳) حجۃ الوداع: عرفات کی پہاڑی سے کی گئی تقریر، روایت ربیعہ بن امیہؓ جو اسے دہرایا کرتے تھے۔

بارھواں باب

استدلال (Reason) کا دور

خلیفہ ہارون وخلیفہ مامون

یہ تاریخ کا وہ لمحہ تھا جب کہ اسلامی تہذیب نے اپنے دروازے تمام علوم کے لئے کھول دیئے چاہے وہ مغرب کے ہوں یا مشرق کے پُر اعتماد مسلمانوں نے ان علوم کو لے کر ازسرِ نو اسلام کے نئے سانچے میں ڈھالا۔ اسی بھٹی سے تپ کر نکلے اسلامی فنون، فن تعمیر، فلکیات، کمیسٹری (الکیمیا) حساب، طبعیات (مڈیسن) موسیقی، فلسفہ، اور اخلاقیات، سچ تو یہ ہے کہ فقہ کا عمل اور معاشرہ کے مسائل پر انکا نفاذ اس دور کے تاریخی پس منظر کے تحت ہوا ہے۔

ہارون الرشید منصور کا بیٹا تھا اور بنوعباس کا چوتھا حکمران 786ء میں جبکہ ابھی وہ بائیس سال کا تھا اسی کم عمری مین تخت نشین ہوا۔ حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد ہی اسے اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے زیرِ حکومت افریقہ کی صوبائی بغاوتوں کو کچل دیا گیا۔ مصر میں قیس وقزاء کی قبائلی شورشوں کا خاتمہ کیا گیا اور علوی فرقہ کی بغاوتوں پر قابو پایا گیا۔ بازنطینیوں کو پیچھے ڈھکیل کر خراج دینے پر مجبور کیا گیا۔ تیئس 23 سال تک اس نے ایک وسیع سلطنت پر حکومت کی جس کی سرحدیں ایک قوس کی طرح چین وہندوستان سے لے کر بازنطینی روم وبحر اوقیانوس تک باہم جڑی ہوئی تھیں۔ یہاں خام مال اور مختلف نظریات آزادی کے ساتھ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچ سکتے تھے۔ ویسے ہارون کو عظیم الشان

سلطنت کے شہنشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بہترین تہذیب کے معمار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

وہ اسلام کا سنہری دور تھا، دولت کے انبار یا الف لیلیٰ کی داستانوں کی وجہ سے وہ سنہری نہیں بنا بلکہ نظریات کی قوت اور انسانی افکار کی آزادی کی سجاوٹ سے یہ سنہری دور کہلایا۔ جیسے جیسے سلطنت کی سرحدیں وسیع ہوتی گئیں ویسے ویسے یونانی، ہندوستانی، زرتشت، بودھ اور ہندو تہذیبوں کے نظریات سے اس کا باہمی ربط بھی ہوا۔ عالمی نظریات کو سمجھنے اور ان کا ترجمہ کرنے کا سلسلہ یوں تو منصور کے دور سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اس عمل کو ہارون اور مامون کی جانب سے زبردست حمایت حاصل ہوئی۔

مامون نے ''بیت الحکمۃ'' کے نام تراجم کا الگ محکمہ قائم کیا۔ وہ ہمیشہ علماء، فضلاء اور حکماء سے گھرا رہتا تھا۔ اس نے تمام محکموں کے لئے انتہائی دانا وزیروں کا انتخاب کیا جو کہ اہل برمک تھے۔ بڑے بڑے جج، قاضی، ڈاکٹر، شعراء، موسیقار، فلاسفر، حساب دان، مصنف، سائنسدان، مہذب لوگ اور فقہ کے علماء اس کے درباریوں میں سے تھے۔ ابن حیان (انتقال 815ء) جو کہ کیمسٹری کی سائنس (علم الکیمیا) کا موجد تھا، ہارون کے دربار سے وابستہ تھا۔ ترجمہ کرنے والے اسکالروں میں مسلمانوں کے علاوہ عیسائی، یہودی، زرتشت اور ہندو بھی شامل تھے۔ یونان سے سقراط، ارسطو، پلاٹو، گیلان، ہپوکرٹیس، آرکمڈیس، یوکلید، پٹولمی، ڈیموستھیس، اور پیتھا گوریس کی تخلیقات آئیں۔ ہندوستان سے ایک وفد آیا جو اپنے ساتھ برہما گپت کے سدھانتھ، ہندوستانی عدد، صفر کا تصور اور ایورویدک طب لے آیا۔ چین سے کیمیاء گری کی سائنس، کاغذ سازی کی ٹکنالوجی، مسلک، ظروف سازی جیسے فنون آئے۔ زرتشت اپنے ساتھ ملکی نظم ونسق، زراعت اور آبیاری کے علوم لے آئے۔ مسلمانوں نے علم کے ان تمام سرچشموں سے اکتساب فن حاصل کیا اور دنیا کو الجبراء، کیمسٹری، اور معاشرتی سائنس اور لامحدود علم حساب کا تصور دیا۔

مسلمان دوسری تہذیبوں کا سامنا پر اعتمادی سے کیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ انکا عقیدہ وایمان پختہ تھا۔ وحی کے ذریعہ جو کچھ نازل ہوا مسلمانوں کو اس پر مکمل ایمان تھا۔ اسی اعتماد سے انہوں نے دوسری تہذیبوں کا سامنا کیا، جو کچھ انہیں معقول اور جائز نظر آیا اسے اپنایا اور اسلامی قالب میں ڈھال کر اپنے ہی عقیدہ کی شکل وصورت میں اسے نچوڑ لیا۔ اسلام مرد اور عورت دونوں کو علم سیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ فطرت

سے فطرت کے مظاہر سے، اس پر قابو حاصل کرنے کے ذرائع سے تاکہ وہ علم ودانش میں اعلیٰ مقام حاصل کریں۔ ﴿عنقریب اہم انہیں اپنی نشانیاں آفاقِ عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی حتی کہ ان پر کھل جائے حق کی بات﴾ (حٰم السجدۃ 41 -53) اسی دور میں ہم اسلامی تہذیب کے اعلیٰ ترین دانشوروں کو ابھرتے ہوئے دیکھتے ہیں جنہیں حکیم کہا جاتا ہے۔ حکیم کا مطلب ہے دانش ور، اسلام میں سائنسدان کا مطلب ایک ایسا ماہر نہیں جو فطرت کو صرف ظاہری نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ ایک ایسا دانشور ہے جو فطرت کو باطنی نگاہ سے بھی دیکھتا ہے اور اپنے علم و تجربات کو ظاہر و باطن دونوں سے جوڑتا ہے اسے اسلامی نقطۂ نظر سے سائنسدان اور حکیم کہا جاتا ہے۔ حکیم کے کھوج کی منزل صرف علم برائے علم نہیں، بلکہ تخلیقی عمل میں جاری وساری اس اکائی کو پانا اور اس باطنی رشتہ کو اجاگر کرنا ہے جو خدائے تعالیٰ کی عظمت اور شان رفعت کا مظہر ہے۔

ہارون رشید نے جس طرز عمل کو مشروع کیا اس کے بیٹے مامون نے اسے مکمل کرنے کی کوششیں کی مامون بذات خود ایک عالم تھا اس نے علم طب علم فقہ علم الکلام کی تعلیم حاصل کی تھی وہ حافظ قرآن بھی تھا اس نے قسطنطنیہ اور ہندوستانی بادشاہوں کے درباروں میں اور چین کے شہزادوں کے پاس اپنے وفود بھیجے اور ان سے درخواست کی کہ وہ وہاں کی کلاسیکی علوم وفنون کی کتابیں روانہ کریں۔ ساتھ ہی وہاں کے علماء اور فنکاروں کو بھی بھیجیں اس نے مترجمین کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں بڑے بڑے انعامات نوازا۔ اس دور کی کہانی کا بہترین مظہر اس زمانے کی عظیم شخصیات کی کہکشاں سے صاف عیاں ہے۔ اسلام کا پہلا فلاسفر ''القندی'' (انتقال 873ء) اس زمانے میں عراق میں کام کر رہا تھا مشہور زمانہ اخیافی دان الخوارزمی (انتقال 863ء) مامون کے دربار سے وابستہ تھا الخوارزمی حساب کے مسائل کو اعشار متواتر کے ذریعہ حل کرتا تھا یہی طریق کار آج کے اس دور میں ''الگوریتم'' (Al gorithons) کی بنیاد ہے اس نے کچھ عرصہ تک بغداد میں تعلیم حاصل کی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کا بھی سفر کیا تھا۔ الخوارزمی، الجبراء لفظ کا موجد ہے عربی زبان میں الجبر کا مطلب ہے قوتِ عمل غالبانہ اور ضرب دینا اس نے اسلامی دنیا میں ہندوستانی عددی طریقہ کار کو رائج کیا یہاں سے یہ طریقۂ کار یوروپ پہنچا وہاں یہ عربی عددی طریقۂ کار کہلایا۔ اس نے

حساب میں اعشاریہ کا قانون رائج کیا اور فلکیات میں تجربی طریقۂ کار کو ایجاد کیا۔ تجربی کا مطلب ہے وہ علم جس کی بنیاد پیمائش پر رکھی گئی ہے اس نے جغرافیہ اور فلکیات پر کئی کتابیں لکھیں اس نے کرۂ ارض کے قوس کے فاصلہ کی پیمائش کا طریقۂ کار بھی ایجاد کیا۔ دنیا آج بھی الخوارزمی کو یاد کرتی ہے اس کے ایجاد کردہ ''الگورتمس'' سائنس اور انجینئرنگ کے ہر شعبہ میں آج کے اس جدید دور میں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

ہارون اور مامون کے دور میں ہونے والی دانشوری کی یہی وہ دھما کہ خیز اٹھان تھی جس نے سائنس کو دوسرے تمام علوم سے آگے لا کھڑا کر دیا۔ سائنس سے شرابور اسلامی تہذیب اس دانشوری، علوم وفنون سے مالا مال پورے پانچ سو سالوں تک دنیا کے لئے علم کا گہوارہ بنی رہی۔ بغداد میں تراجم کا طویل سلسلہ چلا، نتیجۂ کئی عظیم سائنسدان وجود میں آئے جیسے کہ علم الاعضاء (Physiciay) کا ماہر الرازی (انتقال 935ء) مورخ المسودی (انتقال 956ء) ماہر علم الاعضاء (فزیشین) بوعلی سینا (انتقال 1037ء) ماہر طبیب (فزیشین) الحازن (انتقال 1039ء) مورخ البرونی (انتقال 1051ء) ریاضی دان عمر خیام (انتقال 1132ء) اور فلسفی ابن رشد (انتقال 1198ء)

مامون رشید اور ہارون رشید کا دور تضادات سے بھی بھرپور رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں اس جیسا کوئی اور کشمکش بھرا زمانہ نہیں گذرا جس کی دہری شخصیت رہی ہو ایک مائل بہ نیکی تھی تو دوسری مائل بہ بدی۔ یہ بات بھی بالکل صاف ہے کہ مسلمانوں نے خود ہی اپنی تاریخ اپنے افکار اپنے طرز عمل اور اپنی طرز فکر کے ساتھ ایسا دہرا معیار اپنایا ہے۔

ایک طرف تو مسلمان اپنے شاندار کارناموں پر فخر کرتے ہیں تو دوسری طرف ان افکار کو مکمل طور سے مسترد کرتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ کارنامے سرانجام دیئے گئے۔ مسلمان اس دور کے سائنسدانوں اور فلسفہ دانوں کو موجب افتخار سمجھتے ہیں۔ خصوصیت سے مغرب کے ساتھ جو مناظرے ہوئے ان مناظروں میں مسلمان اپنے سائنسدانوں پر فخر کا اظہار کرتے رہے۔ لیکن دوسری جانب وہ اسی دانشورانہ طرز فکر کو یکسر مسترد کرتے ہیں جس کو ان فلسفہ دانوں اور سائنسدانوں نے تحقیقات وتصنیفات کی بنیاد بنایا۔

ہارون اور مامون کا دور، منطق کا زمانہ تھا، خصوصیت کے ساتھ مامون نے عقلیت پسندی کو مکمل طور

سے گلے لگا لیا تھا معتزلی اسلام کا عقلی ہتھیار ہیں۔ مامون نے معتزلہ عقیدہ کو سرکاری قانون قرار دیا۔ ہم نے اس سے پہلے گیارہویں باب میں اس بات کی تشریح کردی ہے کہ کس طرح معتزلی اپنے حدود سے باہر نکل گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس عقلیت کو وحیٔ الٰہی پر لاگو کردیا اور اس نظریہ کو تقویت دی کہ قرآن ''مخلوق'' ہے۔

عام فہم الفاظ میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے۔ جب علم کو پیشوا بنا کر کٹر انداز سے برتتے ہوئے منطق یا استدلال کو وحی سے برتر قرار دیا جاتا ہے تو ہر کوئی لازمی طور پر اس غلطی کا شکار ہوجاتا ہے۔ معتزلہ نے اپنے استدلال کے اس ہتھیار کو وحی پر لاگو کیا، وقت کی حقیقت یا علم طبیعیات کے طریقۂ کار سے اس کے تعلق کو سمجھے بغیر اس عمل کے دوران وہ چاروں شانے ہوگئے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنی غلطی کا سدھار کرلیتے بجائے اسکے وہ اس نظریہ کا دفاع کرنے لگے اور اس کی مخالفت کرنے والوں پر ظلم وستم برسانے لگے۔

مامون کے جانشین نے ان سرکاری عقائد کو انتہائی سختی سے نافذ کیا۔ اس کے لئے اس نے ظلم کا بھی سہارا لیا۔ لیکن علماء نے ''خلق قرآن'' کے نظریہ کو ماننے سے انکار کردیا۔ امام ابوحنیفہؒ اسی مسئلہ پر مامون کے ساتھ ساری زندگی اختلاف کرتے رہے اور اسی جدوجہد میں اپنی زندگی کے بیس سال جیل میں ہی گذار دیئے۔ امام احمد بن حنبلؒ قرآن کو تخلیقی قرار دینے والے کسی بھی نظریہ کے خلاف تھے۔ علماء کی جانب سے مسلسل اور زبردست مخالفت کی وجہ سے خلیفہ متوکل (انتقال 861ء) نے معتزلہ مسلک کو جاری رہنے والی سرکاری سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا۔ اس کے بعد عقلیت پسندوں پر ایک طوفان ٹوٹ پڑا۔ انہیں ایذائیں دی گئیں ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ الاشعری (انتقال 936) نے عقلیت پسندی اور ماورائیت سے مفاہمت کی راہ نکالنی چاہی اس کے لئے اس نے (Theory of Occasionalism) مشیت الٰہی کا نظریہ پیش کیا۔ (الاشعریہ) اشاری نظریات قبولیت عام اختیار کرگئے۔ مسلمانوں نے عقلیت پسندوں، فلسفہ دانوں اور سائنس دانوں کا دانشورانہ اندازِ فکر ترک کردیا۔ اور اسی کو سجا کر لاطینی مغرب کے سامنے پیش کیا جنھوں نے باہیں پھیلا کر اسکا پرجوش استقبال کیا اور اسلام کی اسی دانشورانہ طرز فکر کو جدید عالمی تہذیب کی بنیاد رکھنے کے لئے استعمال کیا۔

وہ اسلامی دنیا ہی تھی جس نے عقلیت پسند نظریات کو پروان چڑھایا، گلے لگایا، اس کے تجربات بھی کئے پھر اس سے الگ ہوگئی اسے اپنے آپ سے نکال کر دور پھینک دیا۔ ہارون اور مامون کے دور سے ہمیں ایک تاریخی سبق ملتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کو از سرنو توحید پرست اسلامی تہذیب کے دائرہ کے اندر لانا ہے ایک ایسے دانشوارانہ مکتبۂ فکر کی تعمیر ضروری ہے جس کی بنیاد احکام الٰہیہ اور توحید پر ہو۔ یہ سائنسی نقطۂ نظر عقیدۂ توحید کے مطابق وحی الٰہی کے ماورائے عقل ہونے کی تصدیق بھی کرے، معتزلہ کا یہ دعویٰ صحیح تھا کہ انسان خود آپ اپنی تقدیر کا مالک ہے لیکن وہ اس مقام پر لڑکھڑا گئے جب انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان کے فہم ودانش کی رسائی اللہ تعالیٰ کی وحی یا اس کے احکامات سے بھی پرے ہے۔ سچ تو یہ کہ انسان مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ انسان کو اپنی محنتوں کا پھل ربِّ کائنات کے کرم سے ملتا ہے۔ اسی کی مہربانیوں سے حاصل ہوتا ہے انسانی عمل کا نتیجہ کیا ہوگا اس کا کیا پھل ملے گا کوئی شخص اس کی بالکل صحیح پیشنگوئی نہیں کرسکتا۔ اشاریوں کا یہ لازمی اصول کہ خدائے تعالیٰ کی رحمت وقت کے ہر ایک لمحہ میں مداخلت کرتی ہے اور معاملات کو نپٹاتی ہے بالکل صحیح تھا لیکن یہ نظریہ غلط تھا کہ انسانی مرضی محدود ہے۔ انسانی ادراک اور انسانی مرضی تو تقریباً لامحدود ہے۔ لیکن یہ سب کچھ فنا ہوجاتی ہے، ختم ہوجاتی ہے اسکا کوئی وجود ،کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔ اس اعلیٰ وبرتر وماورائے ادارک خدائے بزرگ وبرتر کی لامحدودیت کے سامنے بس وہی باقی رہتا ہے باقی سب فانی۔

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيهَا فَان وَيَبْقىٰ وَجهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلالِ وَالإکْرَام﴾

تیراہواں باب

کلاسیکی دور میں فلسفہ اور سائنس کا عروج

قرآن مجید کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آسمانوں اور زمین کی کنجیاں عطا کردی ہیں۔ ''کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین وآسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں'' (لقمان: 20)۔

اپنی تاریخ کے سنہرے دور میں مسلمانوں نے ان کنجیوں کا استعمال فطرت کے اسرار ورموز کو کھولنے کے لئے استعمال کیا اور ایک ایسی اعلیٰ تہذیب کی تخلیق کی جس پر دنیا آج بھی تعجب کرتی ہے۔ لیکن وہ اس کے بعد خود آپ اپنے حدود سے باہر ہوگئے۔ انہوں نے انہی چابیوں سے وحیٔ الٰہی کے اسرار کو کھولنے کی کوشش کی۔ نتیجۃً بری طرح ٹھوکر کھائے۔ اکثر اس کا ردِّعمل تشدد سے بھرا رہا۔ چابیاں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں اور فلسفیانہ درک وفہم کا دروازہ بند ہوگیا۔ وہ حضرات جو فطری سائنس کی جستجو میں لگے رہے انہیں صرف ظاہری طور پر برداشت کیا جاتا رہا۔ دراصل معاشرہ کے دانشور افراد پر تشددِعمل سے بچنے کے لئے ان حضرات سے زبانی ہمدردی اور مفاہمت جتاتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فطرت نے خود مسلمانوں کے لئے اپنے دروازے بند کر دیئے۔ اس طرح دنیا کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ نکل گئے اور دوسری تہذیبوں کی طرف منتقل ہوگئے۔

اسلامی طرزِ فکر ابتداء میں مکمل اور جامع تھی۔ اس نے فقہ، کلام، منطق، تصوف، سیاست، سماجیات، سائنس اور ٹکنالوجی کو گلے سے لگایا۔ اس کا طریقۂ کار بیک وقت عقلیت پسند بھی تھا اور تجرباتی بھی لیکن ہمیشہ اس کی باگ ڈور توحید کے ہاتھ ہی رہی۔ توحید کی اصل روح ہی سے اسکا ناتا برابر برقرار رہا اس سے بالکل ہٹ کر اس کو نہیں ہونا تھا اور نہ ہوا۔ بغداد میں بنو عباسیہ خلافت کے پانچ سوسالہ دور میں یعنی 750ء تا 1258ء تک مسلمانوں نے فطرت کے اسرار کو سمجھنے کے متعلق انتہائی بنیادی اہم اور کارآمد گوشوں

کو اجاگر کیا اور انہوں نے فطرت پر علم کے ذریعہ قابو پانے کی کوششیں کی اس کے لئے انہوں نے نہ تو اندھے عقائد کا سہارا لیا اور نہ ہی ضعیف الاعتقادی کا۔اس طرح سائنس کو مسلمانوں سے جو بھی فضیلت ملی اس نے خدا کی تخلیق کردہ کائینات اور انسان کے باہمی رشتہ کے متعلق ان بنیادی نظریات کو ہی تبدیل کر دیا جو کہ اس زمانے میں مروج تھے،سائنس اور ریاضی یونہی خلاء میں پروان نہیں چڑھتے۔وہ تو ان دانشورانہ ذہنی افکار کے چوکھٹے میں نشو ونما پاتے ہیں جو مذہب وعقائد سے متاثر ہوں۔مذہبی عقائد انسان کے مشاہدہ فطرت کے انداز نظر کو متاثر کرتے ہیں۔مثال کے طور پر مسلمانوں نے لامتناہی کا نظریہ پیش کیا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ماورائے ادراک سمجھتے تھے۔ایک ایسی تہذیب جو خدا کو ادراک کے دائرہ کے اندر ہی مانتی ہے لامتناہی کے اس تصور کو پیش نہیں کرسکتی تھی مسلمانوں نے الجبراء کی ایجاد کی اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ فطرت کے بے شمار نقش، ان گنت نمونے آخر کار ''وحدانیت'' کے سرچشمے سے ہی ابھرتے ہیں اسی طرح امریکہ کے ''مایا'' اور ہندوستان کے ہندوؤں نے اپنے طور سے صفر کی ایجاد کی۔ ہندوؤں کے کامیاب ہونے کا سبب زندگی اور موت کے دائرہ کے متعلق انکا عقیدہ ہے وہ یقین رکھتے ہیں کہ ہر دائرہ کے درمیان ایک آرام کا وقفہ یعنی ''شونیا'' ہوتا ہے جو عربی میں ''صفرہ'' اور انگریزی میں ''زیرو'' بن گیا۔امریکیوں کے ''مابان'' کے صفر کا تصور موسمیات کے تغیر کے چکر یا دائرہ پر تھا۔یہ امریکہ کے اولین مقامی قبائلیوں کے پر پیچ منقش کردہ دائروں سے پوری طرح واضح ہوجاتا ہے۔اسے امریکہ کے جنوب مغربی علاقہ میں پٹروگرفس کے مقام پر دیکھا جاسکتا ہے۔

اس باب میں ہم ان مسلمان مفکروں کو خراج عقیدت پیش کریں گے جنہوں نے انسانی تہذیب وتمدن کے بڑھتے قدم کو ایک نئی جہت بخشی۔ایک نیا رخ عطا کیا ان دانشوروں نے نہ صرف اسلامی تہذیب کی آبیاری کی بلکہ انسان کے علم کے خزانوں کو مالا مال کیا اور علم کی اس مشعل سے دوسری تہذیبوں کو بھی رہنمائی دی۔

محمد بن موسیٰ الخوارزمی جن کا انتقال 840ء میں ہوا خلیفہ مامون کے دور میں بقید حیات تھا یہ دور جو کہ اسلامی سائنس کے بام عروج کا دور تھا۔اس نے یونانی اور ہندوستانی ریاضی طرز فکر کے علم کا انضمام کیا اور علم الحساب کو اپنا ہی ایک الگ اور اعلیٰ طریقۂ کار عطا کیا۔اس نے حسابی تحلیل تنزلی طریقۂ کار ایجاد کیا

جس کی وجہ سے دنیا اسے آج بھی ادب سے خراج عقیدت پیش کرتی ہے آج بھی یہ عمل ''الگورتھمس'' کہلاتا ہے۔

اس طرح الخوارزمی ''الجبراء'' کا موجد اور آقا کی حیثیت سے مشہور ہے، اس نے (Analytical Solutions to Quadratic equations) مربعّی مساوات کا تحلیلی حل بھی پیش کیا۔ اور ''علم مثلث عدد'' (Trigonometric Sine) ''علم ممّاس'' (Tangent gunetions) کا ارتقاء کیا ''احصاء تفریقی'' (Concept of derentiation) کا تصور پیش کیا، ''فلکیاتی پہاڑے'' (astronomical tables) کونشو ونما دیا۔ ''گھڑیوں'' اور ''astno lab'' کے سلسلے میں تحقیقات کیں۔ خلیفہ مامون نے کرۂ ارض کے قوس کے درجہ کا زاویہ ناپنے کے لئے سائنسدانوں کی ایک جمعیت ترتیب دینے کا حکم دیا تھا، خود خلیفہ اس سائنسی جماعت کا بھی ایک رکن تھا۔

علی بن رباح الطبر ی انتقال 870ء یہودی والدین کا بیٹا تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا۔ آگے چل کر یہ اس کلاسیکی دور کا انتہائی سربرآوردہ طبیب یعنی ڈاکٹر بنا اس نے اپنے دور تک دنیا بھر میں جاری وساری طبی معلومات کا ایک ''مخزن العلوم'' (Encyclopaedia) ترتیب دیا جو کہ سات جلدوں پر محیط ہے۔ اس میں الطبر ی نے طبی اصول ''علم تشریح الاعضاء'' (Anotomy) ''علم خوراک'' (Dietics) انسانی جسم کے اعضاء کی مختلف بیماریاں اور ان کی وجوہات، ذائقہ اور رنگ مفرد دوائیں، طب اور موسم کا صحت پر اثر جیسے موضوعات کو بھی ترتیب دیا ہے۔ ایورویدک یعنی ہندوستانی طب پر بحث کرتے ہوئے اسے یہاں شامل کیا ہے۔

یعقوب ابن اسحاق القندی جن کا انتقال 873ء میں ہوا خلیفہ مامون کے دربار سے وابستہ تھا، اس نے موسیقی کے سائنس، علم الحساب، علم کیمیاء یعنی کیمسٹری اور فلکیات کے شعبوں میں انتہائی اہم معلومات کا اضافہ کیا۔ ایک معتزلی ہونے کی وجہ سے بغداد کے خلیفہ کی نظر خاص اس پر تھی اور جب المتوکل خلیفہ بنا تو اشعری کے ہاتھوں اس کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اس نے موسیقی کو ہم آہنگی دینے والی سروں کی لہروں کی تعداد کے درمیان میل تال، سروں کے زیروبم، سرود کے مرکب کی تشریح کی۔ اس نے مختلف عناصر کے کیمیائی خواص کو پہچانا اور اس موقف کو پیش کیا کہ بنیادی دھاتوں کو سونے میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ

موقف اس دور کے کیمیا گروں کے نظریات کے عین برخلاف تھا۔ یہ پہلا سائنسدان تھا جس نے مرکب زاویوں کی اس صحیح مقدار کا تعین کیا جس کی ضرورت بیماریوں سے شفاء دینے کیلئے انسانی جسم کو ہوتی ہے۔

محمد بن زکریا الرازی جن کا انتقال 930ء میں ہوا دسویں صدی عیسوی کے عظیم ترین طبیبوں میں سے ایک تھا۔ سب سے پہلے اسی نے چیچک اور چھوٹی چیچک کے درمیان فرق کو پہچان کر انکا موازنہ کیا۔ انسانی جسم پر خوراک اور دباؤ کے اثرات کو نمایاں کرنے والی اولین شخصیت یہی تھی۔ یونان اور اسلامی سرچشموں سے حاصل ہونے والی طبی علوم کی جامع طور سے تدوین کی۔ وہ ایک استفادی سائنس دان بھی تھا۔ اس نے کئی کیمیاوی ردعمل دریافت کئے۔ کیمیاوی عناصر کے خواص کو دستاویزی شکل دی۔ اس نے نامیاتی علم کیمیاء (organic chemistry) اور غیر نامیاتی علم کیمیاء (inorganic chemistry) کو الگ شعبوں کی شکل عطا کی۔ سب سے پہلے اسی نے گندھک کا تیزاب Sulphuric acid) تیار کیا۔ اس نے اپنے وسیع کیمیاوی علم کو مرکب دواؤں (compound medicine) کے وضع کرنے اور انہیں منضبط کرنے کے لئے استعمال کیا۔ رازی ایک معتزلی تھا اس کا نظریہ تھا کہ خلا اور وقت دونوں کو دوام حاصل ہے۔ دوسرے معتزلیوں کی طرح اس دور کے عام مسلمان اس کو بھی شک بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

ابوالحسن علی المسعودی جسکا انتقال 957ء میں ہوا اسلام کا پہلا مشاہداتی تاریخ دان تھا۔ یہ ایک معتزلی فلسفہ دان تھا۔ قاہرہ میں بنو فاطمہ کے دربار کا خدمت گذار تھا جہاں عقلیت پسندون کا بغداد کے بنو عباس کی بہ نسبت زیادہ کھلے دل سے استقبال کیا جاتا تھا۔ اس نے ایران ہندوستان، سری لنکا، ملایا، چین، مڈغاسکر، مشرقی افریقہ اور شمالی افریقہ کے اندرونی علاقوں کا دورہ کیا اور وہاں کے لوگوں اور علاقوں کے متعلق اپنے مشاہدات و تجربات کو بیس ضخیم جلدوں کی ایک دستاویزی شکل عطا کی۔ اس نے تاریخی عمل پر اپنے تنقیدی جائزوں کو بھی قلمبند کیا اور پانچ سو سال بعد آنے والے مغرب کے عظیم فلاسفر ابن خلدون کے منزل کی نشاندہی کی۔

ابوعلی الحسن ابن سیناء جن کا انتقال 1037ء میں ہوا قرون وسطی کا شاید عظیم ترین سائنسدان تھا۔ اس

کی پیدائش 980 میں بخارا کے قریب ہوئی۔ بچپن ہی سے وہ ذہین وفطین طالب علم تھا۔ سترہ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اس نے فلسفہ، طب، ریاضی اور قرآنی سائنس یعنی علم فقہ پر عبور حاصل کرلیا۔ اس کی صلاحیتوں نے اس دور کے سلجوقی سلاطین اور امیروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ یہ سلاطین اور امراء سیاسی قوت اور علمی سرپرستی دونوں کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ ابن سیناء کو یکے بعد دیگرے بخارا، خوارزم، حمدان اور اصفہان کے سلاطین کی ملازمت ملتی رہی۔ وہ اپنے بہترین یادگار کارنامے ''قانون فی الطب'' کے لئے دنیائے سائنس میں مشہور ہے جو کہ اس دور کے تمام طبی علوم کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ''قانون'' کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور چھ سو سال تک یہ کتاب یوروپ کی یونیورسٹیوں میں اہم ترین مرکزی درسی کتاب (Text Book) کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی۔

علمی دنیا کو اس کی اولین اور اہم ترین دین کی کافی طویل فہرست میں مندرجۂ ذیل علوم اور ریسرچ وتحقیقات بھی شامل ہیں۔ متعدی بیماریوں جیسے کہ دق کو تسلیم کرنا، طبی دوائیوں کی پہچان اور ان کی فہرست تیار کرنا، غذاء اور پانی کے ذریعہ بیماریوں کا پھیلنا، جسمانی صحت اور دماغی صحت کے درمیان کے رشتہ، طبی دوائیوں کی شناخت اور ان کی فہرست تیار کرنا، دماغی بیماری (meningitis) کی شناخت، بچوں کی صحت کی تشخیص، اور علم تشریح الاعضاء (Anotomy) جیسے علوم ابن سیناء کی ہی اولین دین ہیں۔ علاوہ اس کے ابن سیناء نے مندرجہ ذیل علوم کا بھی اختراع کیا۔ جیسے کہ موسیقی کا علم الحساب، ایک ایسا حساب کا آلہ (Calculator) تیار کیا جو کہ متحرک پیمانہ (Vernicer) سے ملتا جلتا تھا۔ تھرمامیٹر سے ملتا جلتا پیمانہ تیار کیا، مادہ کے عناصر (Elements) کی ہیئت کی تبدیلی کے متعلق تجربات کئے اور یہ ثابت کیا کہ ہیئت میں تبدیلی ناممکن ہے، قوت (Force) ''گرمی'' (Heat) توانائی (Energy) اور روشنی کی رفتار کے مختلف نظریات کی تشریح کی اس نے قرآنی احکامات اور مشاہداتی عقلیت پسندی کے درمیان رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی۔ رازی کے عقلیت پسندانہ نظریات کو بعد میں آنے والی مسلمان نسلوں نے کفر اور بدعت قرار دے دیا اس لئے اس کے اثرات ایشیاء سے زیادہ مغرب میں پائے جاتے ہیں۔

ابوریحان البرونی جسکا انتقال 1045ء میں ہوا یہ اسلام کے عظیم مورخوں اور جغرافیہ دانوں میں سے ایک ہے۔ یہ خراسان میں پیدا ہوا، عمر کی ابتداء میں ہی اس نے علم طبعیات (Physics) علم ریاضی (Mathematics) اور علم الکلام پر عبور حاصل کرلیا۔ بہت جلد اس نے سلطان محمود غزنوی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔

ہندوستان پر حملہ کے دوران سلطان نے اس کو اپنے ساتھ رکھا۔ البرونی کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ اس نے ہندوؤں سے علم ریاضی حاصل کیا۔ یہاں کے مذہب، فلسفہ اور سماجیات کا گہرا مطالعہ کیا اور ان مشاہدات کو اپنی معرکتہ الآراء تصنیف ''کتاب الہند'' میں قلمبند کیا۔ ہندوستان کے قرونِ وسطی کے متعلق تمام معلومات اور علوم کا ذریعہ تقریباً البرونی کی یہی تصنیفات ہیں۔ ہندوستان سے واپسی کے بعد اس نے ''قانون مسودی'' تصنیف کی اس میں اس نے ہندوستان اور یونانی علم حساب کے درمیان ربط پیدا کیا۔ اس نے ہندوستانی اعداد کے طریقہ کار پر بحث کی اور اعشاریہ کے فائدہ مند ہونے کی جانب نشاندہی کی۔ وہ علم فلکیات میں تجرباتی طرز کا موجد ہے اس نے اس بات پر زور دیا کہ ستاروں کی رفتار کو مشاہدے کے ذریعہ جانچا جانا چاہئے۔ اس نے زمین کے گھومنے کے متعلق صریح بحث کی اور کئی شہروں کا طول بلد اور عرض بلد کا بالکل صحیح حساب کیا۔ اس نے آواز اور روشنی کی رفتار کا موازنہ کرتے ہوئے اس کے بارے میں مدلل بحث کی ہے اور مختلف کنوؤں کے درمیان پانی کے بہاؤ کیلئے ''آبی مرکبات'' (Hydro dynamics) کے ذریعہ ثبوت فراہم کئے۔ آگے چل کر لکھی جانے والی ایک اور کتاب میں اس نے ہندوستانی ایورویدک دواؤں اور مروجہ عربی طب دونوں میں اشتراکیت کی ابتداء کی۔

غیاث الدین ابوالفتح عمر الخیام جن کا انتقال 1123ء میں ہوا خراسان کے نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اسلامی دنیا کے مشرقی علاقوں میں واقع علم وادب کے گہواروں جیسے نیشاپور، سمرقند، بخارا، اور اصفہان کا سفر کیا اور علم حاصل کیا وہ اپنے دور کے عظیم ماہرین ریاضیات و ماہرین فلکیات میں سے ایک تھا اس کا عظیم کارنامہ تھا جلالی کیلنڈر کی ایجاد جو حالیہ سالوں تک اسلامی دنیا میں استعمال میں رہا۔ عمر خیام کا ایجاد کردہ کیلنڈر آج دنیا میں استعمال ہونے والے ''گریگوری کیلنڈر'' سے زیادہ صحیح اور درست ہے۔ الجبرا اور

اقلیدس (جیومیٹری) دونوں طریقۂ کار کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے تیسرے درجہ کے ہندسوں (Third degree equations) کا گہرا مطالعہ کیا اور انکا جواب اور حل بھی پیش کیا۔ عمر خیام ''بنامئیل ایکسپرشن'' (Binomial Expresion) کا موجد ہے اور ''بنامیل'' شکلِ ہندسی (Bihomial Thearem) کی تشکیل اسی نے کی۔ اس نے مختلف مادوں کے درمیان متناسب وزن (Relative weight) پر تجربات کئے اور مختلف مادوں کا بالکل ٹھیک ''وزن مخصوص'' (gravity) دریافت کیا۔ لیکن آج دنیا میں عمر خیام اپنی رباعیات کے لئے مشہور ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں انگریزی میں اس کے ترجمہ کے بعد اس کی شہرت دنیا بھر میں پھیل گئی۔ یہ رباعیات آئینہ ہیں عمر خیام کے انتہائی گہرے احساسات کا اس کے فہم وذکاء کا اور آئینہ ہیں اسلامی تصوف کی روح کا۔

ابوعبداللہ محمد الادریسی جسکا انتقال 1166ء میں ہوا اسپین کا رہنے والا تھا۔ اس نے قرطبہ میں علم حاصل کیا۔ اسکا دور بڑا پر آشوب زمانہ تھا جب کہ صلیبیوں نے اسپین، فلسطین اور شمالی افریقہ پر حملے شروع کر رکھے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ اسی وقت سسلی اور جنوبی اٹلی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر عیسائیوں کے قبضہ میں آچکے تھے۔ عربوں کے علم کی شدید مانگ تھی۔ سسلی کے بادشاہ روجر دوم نے آگے بڑھ کر کئی مسلمان سائنسدانوں کو اہم عہدے دیئے۔ ان میں سے ایک الادریس بھی تھا۔ اسی وجہ سے اسکو اپنے وقت کے اکثر مسلمانوں کے غیض وغضب کا سامنا کرنا پڑا جو یہ سمجھتے تھے کہ اسکی وجہ سے دشمن کو آسانی ہو رہی ہے۔ الادریس جغرافیہ کے میدان کا شہسوار تھا اس نے یہاں کئی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اس نے ایشیاء، یوروپ اور شمالی افریقہ کے بارے میں تمام معلومات جمع کئے اور ایک ایسے نقشہ کی تشکیل کی جو کئی صدیوں تک ایک اعلیٰ میعار مانا جاتا رہا۔ اس کے علاوہ انسانوں، درختوں، جانوروں اور موسمیات کا بھی باریک بین مشاہد تھا۔ ان کے اطوار وخصائل کا گہرا مطالعہ کرتا۔ اس نے درختوں کے طبی خصائل وفوائد کے متعلق چھان بین کی۔ یونان، ہندوستان، ایران اور افریقہ سے ان کے متعلق ضروری جانکاری حاصل کر کے ان معلومات کو اکھٹا کیا اور قدرتی دواؤں کے ذریعہ بیماریوں کے علاج کے لئے انتہائی قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔

عبدالولید محمد بن رشد جسکا انتقال 1198ء میں ہوا دنیا کا وہ عظیم ترین فلاسفر ہے جسے ارسطو کے بعد

دنیا نے جانا اور پہچانا۔اس نے اسپین کے ایک علمی خاندان میں جنم لیا۔ اس دور کے اعلیٰ دانش وروں سے علم حاصل کیا قرطبہ کی سب سے بہترین لائبریری تک اس کی رسائی تھی۔اس وقت اسپین شورشوں میں گھرا ہوا تھا اس لئے ابن رشد نے مراکش کے شاہ ابویعقوب کے دربار میں اپنے کام وکاج کو منتقل کیا اس کے کئی عقلیت پسند نظریات سے شاہ مراکش ناراض ہوا تھا۔اس کی کتابوں کو جلا دیا اور اس کے دربار میں آنے پر پابندی لگادی۔ارسطو کے بارے میں ابن رشد نے جو تبصرے کئے ہیں انہی تبصروں کی وجہ آج دنیا اسے جانتی ہے۔ یہ تبصرے تین مختلف سطحوں پر لکھے گئے۔اول ایک خلاصہ دوسرے درمیانی نقاب کشائی اور تیسرے مکمل جامع تبصرہ۔ اسکی کتابوں کے لاطینی زبان میں تراجم ہوئے۔عقلیت پسندانہ نظریات کو مغرب تک پہنچانے کا ذریعہ ابن رشد ہی بنا۔اسلامی دنیا جو معتزلہ کے چند ایک عقائد سے تو بدظن تھی ہی اب اس نے ابن رشد سے بھی منہ پھیرلیا۔ یہ عظیم انسان اسلامی دنیا میں اپنے سائنسی کارناموں کے علاوہ معرکتہ الآ راء تصنیف ''تحفظ التحفظ'' کی وجہ سے مشہور ہے جو کہ امام غزالیؒ کی ''تحفظ الفلاسفة'' پر ایک مناظرہ ہے۔ ابن رشد نے مسلمانوں میں سائنسی اور فلسفیانہ فکر کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے اس سے منہ موڑلیا اور تصوف کی باطنی دنیا میں غرق ہوگئے۔اسی روحانیت میں انہوں نے قوت حاصل کی اور اسی میں سکون کی دنیا ڈھونڈ نکالی۔ابن رشد نے فلسفہ کے علاوہ علم طب پر بیس کتابیں لکھیں اور سائنسی میدان میں بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

ناصرالدین الطّوسی ایک فلاسفر بھی تھا، متکلم بھی اور طبیب بھی۔اس کی تصنیف ''اخلاق ناصری'' نے اسلامی تہذیب وتمدن پر گہرا اثر ڈالا۔ ہندو پاک کی مغلیہ سلطنت پر اس کتاب کا اثر بہت گہرا رہا۔ یہاں تک کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں اس کتاب کا پڑھنا درباریوں کے لئے لازمی تھا۔

ترکوں کا عروج

خلاصہ

تاریخ کی آبیاری کے لئے نہ صرف مفکّر انسانوں کی ضرورت ہے بلکہ عملی کردار والوں کی بھی ضرورت ہے۔آٹھویں اورنویں صدی عیسوی میں عربوں،ایرانیوں،اسپینیوں اورافریقیوں نے اسلام کوفکرو دانائی سے سجایا تو دسویں صدی عیسوی میں ترکوں نے اسے بنیادی توانائی فراہم کی جس نے اسلامی تہذیب کو ازسرنو تابندگی عطا کی۔کردار کے ایسے غازی مرداورعورتیں فراہم کیں جنہوں نے اس شمع کو پورے ایک ہزار سال تک منور کئے رکھا۔یہ ترک ہی تھے جنہوں نے سیاست وطاقت کے محورکوخلافت سے سلطانیت میں بدل دیا۔

دسویں صدی عیسوی کے دوران وہ ترک ہی تھے جنہوں نے بنوفاطمہ کے چیلنج کے مقابلہ میں بنوعباسیہ کے عقائد کا دفاع کیا۔گیارہویں صدی عیسوی میں انہوں نے صلیبیوں کے خلاف ایک مضبوط ڈھال کو فراہم کیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں یروشلم کے دروازے پر منگولوں کا زورتوڑ دیا تیرہویں صدی عیسوی میں اسلامی تہذیب کو آگے بڑھنے کے لئے اناطولیہ اورمشرقی یوروپ کے دروازے کھولے گیارہویں تا چودھویں صدی عیسوی کے دوران اسلامی تاریخ میں خاتون فرمانرواؤں کا اضافہ کیا۔تیرہویں صدی عیسوی میں انہوں نے تیمورلنگ کے برپا کردہ بربادیوں کے بعدتاتاریوں سے مشرق وسطیٰ واپس چھینا پندرھویں صدی عیسوی میں بازنطینی صدر مقام قسطنطنیہ پر 1453ء میں قبضہ کیا۔وسط یوروپ کی طرف یورش کی

1526ء میں ویانا کا محاصرہ کیا اور اس کے بعد پھر ایک بار 1683ء میں اس کا محاصرہ کیا۔ یوروپ اور اشیاء میں پورے پانچ سو سالوں تک فوجی حیثیت سے غالب رہے۔ اسپینیوں کے حملوں کے خلاف شمالی افریقہ کے مسلمانوں کا دفاع کیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں اور پرتگالیوں کو بحر ہند میں آگے بڑھنے سے روکا سولہویں صدی عیسوی میں ہی مسلم دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں لفظ ''غازی'' کو ایک انتہائی باوقار اور باعزت تصور دیا۔ بلند نیلے حسین میناروں کے ذریعہ دنیا کو ایک انوکھا معماری حسن بخشا، صنم جیسے استاذان فن معمار پیدا کئے۔ اسلام کے سیاسی جسم کو تصوف کی قوت بقاء سے از سر نو پائیند گی دی۔ دنیا کو ایک ایسی حکومت دی جو ایک ہزار سال تک شان و دبدبہ سے سب پر حاوی رہی جو انسانی بادشاہت کا طویل ترین دور ہے وہ سلطنت عثمانیہ ہے۔

چودھواں باب

ترک اثر آفرینی کے مرکزی کردار

گذشتہ ملینیم (ہزار سال) میں تین اہم ترین تبدیلیٔ مذاہب کے واقعات ہوئے جنہوں نے یوروپ وایشیاء کی تقدیر پر مہر لگا دی۔ پہلے جرمن باشندوں نے لاطینی چرچ کو قبول کیا، دوسرے ترک اسلام کی گود میں آگئے اور تیسرے روسی مشرقی کلیسا کے زیر سائے آگئے- پرانی دنیا کی گذشتہ ہزار سالہ تاریخ انہیں جشن آمیز تبدیلیٔ مذاہب کا ایک ضمیمہ ہے-

دنیا کی اس بازی گاہ میں چارل مین (Chalemagne) نے پہلا داؤ کھیلا۔ اسکے فرانس کے تخت پر بیٹھنے تک مشرقی بحیرۂ روم کے علاقہ کے تاریخی وجغرافیائی حالات کافی بدل چکے تھے۔ بازنطینی مصر اور شام کو مسلمانوں کے ہاتھوں گنوا چکے تھے اور شمالی اٹلی میں لامبارڈوں نے ان پر پورا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ پاپائے روم اب بازنطینی فوجی طاقت پر بھروسہ نہیں کرسکتا تھا- 751ء میں پاپائے روم نے بازنطینیوں کے دائرۂ اثر سے الگ ہونے کا اعلان کرتے ہوئے 'پینن'' (Penin) کو مقدس رومی سلطنت کے بادشاہ کی حیثیت سے نامزد کیا- یہ چارل مین کا پیشرو تھا۔ چرچ اور ملک کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس نے کرولین شہنشاہیت (Carolingian) کی بنیاد رکھی یہ اقدام آگے چل کر مغربی یوروپ کو دور جاہلیت سے جگانے کی جانب نقش اول بنا-

چارل مین نے رومی سلطنت کے اس خطاب کو انتہائی سنجیدگی سے قبول کیا- 778ء میں اس نے اسپین میں مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی-سوائے بارسیلونا کی سرحدوں کے اس کو کہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ یہاں سے اس نے جنوب مشرق کا رخ کیا اور لامبارڈ حکومت کو روند ڈالا۔ جہاں بہت بڑا خزانہ اس کے ہاتھ آیا-جس کا استعمال اس نے اپنی دوسری مفتوحات کے لئے کیا۔ پھر اس نے شمالی مشرق کی جانب نگاہ مرکوز کی اور شمالی جرمنی پر قبضہ کرلیا۔ اپنے عروج کے دور میں چارل مین

شہنشائیت نے فرانس، جرمنی، آسٹریا اور شمالی اٹلی پر مکمل قبضہ کرلیا۔

بالکل اسی دور میں مشرقی جرمنی کے باشندے آسٹروگوتھ الحاد پرست تھے۔ چارل مین بار بار ان پر حملے کرتا رہا اور آخر کار بزورِ قوت انہیں عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جب وہ کامیاب حملے کے بعد واپس ہوتا تو لوگ ان پر مسلط کردہ مذہب کے خلاف بغاوت کرتے اور چارل مین اور زیادہ وحشیانہ انداز سے ان پر حملہ آور ہوتا-782ء میں صرف ایک سال میں اس نے چار ہزار جرمن باشندوں کا قتل عام کیا۔ وسطی اور شمالی جرمنی پر مکمل قابو پانے کے لئے اسے ایک طویل عرصہ لگا حتی کہ 804ء تک اس نے اس علاقہ پر مکمل قبضہ حاصل کرلیا۔لیکن ان جرمن باشندوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لئے ایک سوسال کا طویل عرصہ لگا اور اسی کام پر فرانکش اور کلیسا کی پوری فوجی طاقت لگی رہی۔ عیسائی بننے کے بعد دسویں صدی عیسوی کی ابتداء سے ہی جرمن باشندوں نے اپنی طاقت مغربی یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے فراہم کی اور گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کی صلیبی جنگوں کے ہراول دستہ بنے رہے۔

دوسرا اہم ترین واقعہ تھا ترکوں کا قبول اسلام۔ یہ عمل دوسو سال تک 800ء سے 1000ء تک جاری رہا۔ ترک ایسے قبائل کا مجموعہ تھے جو سطح مرتفع وسط ایشیاء کے وسیع علاقوں میں آباد تھے۔ چھٹویں صدی عیسوی میں انہوں نے ترکستان میں ایک چھوٹی سی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جب اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو ترک باشندے منگولیا اور روس سے لے کر ایران کی سرحدوں تک بکھر گئے- کچھ لوگ بستیاں بنا کر آباد ہوگئے۔لیکن ان کی اکثریت خانہ بدوش قبائل کی زندگی گذارتی رہی۔ یہ لوگ اکثر چین اور ایران پر حملے کرتے رہتے تھے۔ان کو ترکی زبان نے اور اپنے فروعی عقیدہ نے آپس میں متحد کر رکھا تھا- 737ء میں مسلمانوں نے چینیوں کے خلاف طلاس کی جنگ جیت لی اور چین کی منگ شہنشاہیت و اسلامی خلافت کے درمیان طلاس اور آمو دریاؤں کو سرحد قرار دیا۔خراسان کے سرحدی علاقے خلافت میں شامل کر لئے گئے۔ یہ علاقہ انتہائی ترقی یافتہ بن گیا اور یہاں سمرقند اور بخارا جیسے عظیم شہر وجود میں آئے- یوں تو خلافت اسلامیہ نے ترکوں کو دور رکھا۔لیکن وہ اچھے فوجی اور ماہرین جنگ کی حیثیت سے مشہور تھے- اسی شہرت کی وجہ سے بغداد اور صوبائی فوجوں میں ان کی بڑی مانگ تھی اس طرح ترک اقتدار کے مرکزی کھیل میں ایک بار پھر شامل ہوگئے-

اسلام دنیا کے پردے پر توحید کی برتری کا اعلان کرتے ہوئے نمودار ہوا۔اسی ماورائے ادراک فلسفہ

نے 622ء تا 664ء کے درمیان یعنی آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر حضرت علیؓ بن ابی طالب کی شہادت تک اسلامی تاریخ کو جوش اور ولولہ سے بھر دیا۔ توحید نے اسلام کو وہ توانائی عطا کی جس کی وجہ سے وہ تاریخ کے پردے پر مرکز نگاہ بن گیا۔ لیکن بنوامیہ کے عروج کے ساتھ اس میں تبدیلی آ گئی۔ حضرت معاویہؓ اسلام کے پہلے فوجی امیر تھے۔ آپؓ کے بعد خاندانی حکومت کا رواج شروع ہوگیا۔ اور خلافت اکثر اوقات خداترسی کی بجائے، فوجی طاقت کے بل بوتے پر پنپتی رہی۔ وہ زمانہ سپاہیوں کے عروج کا زمانہ تھا، ترکوں میں ایسی فوجی قابلیت تھی کہ وہ مقابلے کے اس اکھاڑے میں اتر سکتے تھے۔ بہادری، ثابت قدمی اور انصاف پسندی کے فطری رجحان کی شہرت رکھنے والے یہ ترک بہترین شہسوار اور جنگجو تھے۔ لیکن ان کی بنیادی خصوصیت جو ان کی ترقی کی مددگار رہی، وہ تھی ان کی قبائلی وابستگی اور اپنے آقا سے وفاداری، ترکوں کا قبول اسلام کا عمل، کچھ آہستہ ہی رہا اور کافی غور وخوض کے ساتھ ہوتا رہا لیکن جب ایک بار وہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوگئے تو وہ انتہائی سرعت کے ساتھ عربوں وایرانیوں کو ہٹا کر اقتدار کے مرکزی کردار بن گئے۔ اور اس مقام پر آٹھ سو سالوں تک حاوی رہے۔ جب تک کہ اقتدار کے لئے بازی کا طرز بدل نہیں گیا۔ اٹھارویں صدی میں یوروپ کے بیوپاری دنیا پر حاوی ہونے کے لئے ابھرے پھر انیسویں صدی میں انتہائی چالاکی کے ساتھ ان کی جگہ یوروپ اور امریکہ کے بنک کاروں نے لے لی۔

عباسی خلیفہ المعتصم نے سب سے پہلے ترک محافظ دستے کی تشکیل کی۔ اس کی مملکت میں ایک طرف پرانے عرب امراء تھے تو دوسری جانب اقتدار کی جانب بڑھتے ہوئے ایرانی تھے۔ خلیفہ نے ان دونوں کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے ایک ترک دستہ قائم کیا۔ لیکن ترکوں کے عزائم کچھ اور ہی تھے۔ المعتصم کے جانشین کمزور اور نااہل تھے جس کی وجہ سے بغداد میں خلافت تیزی کے ساتھ سیاسی طاقت سے محروم ہوتی گئی۔ دور دراز کے صوبہ جات پہلے تو خودمختار بنے انہوں نے آزادی کا اعلان کردیا۔ اغلبیوں نے مغرب یعنی جدید الجبریاء اور مراکش میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس دوران ترک فوجی عہدوں کے ذریعہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھے کئی صوبوں پر ترک گورنر نامزد ہوئے۔ متوکل (847 تا 861) کے دور تک ترک محافظ دستے بغداد میں اقتدار کے درمیانی کارندے بن گئے تھے۔ 868ء میں احمد بن طولان نامی ایک ترک نے قاہرہ پر اپنا اقتدار

جمالیا۔اور مصر میں بنوطولونیہ سلطنت کی داغ بیل ڈالی-933ء میں ایک اور ترکی قبیلہ اقشد انے بنوطولونیہ کو اقتدار سے بے دخل کیا اور خود حاکم بن گیا-969 ء میں بنوفاطمہ سے شکست کھانے تک یہی حاکم اعلیٰ رہے۔ ایک ترکی جنرل جواہر کی کمان میں ہی فاطمی فوجوں نے قاہرہ پر فاتحانہ یلغار کی۔

ادھر مشرق میں سمنیوں نے خراسان پر 874ء سے 999ء تک حکومت کی۔اس حکومت کا صدر مقام بخارا تھا۔سمنیوں نے ایک بہترین تمدن کو پروان چڑھایا جس کی بنیاد شہروں میں صنعت وحرفت کے فروغ پر رکھی گئی۔ یہ تمدن شہری صنعت وحرفت، زراعت اور عظیم درسگاہوں کے لئے مشہور ہے۔ادھر طاہریوں نے نیشاپور میں عروج حاصل کیا اور وہ اقتدار اور وقار کے لئے سمنیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہ دونوں ریاستیں عباسی خلافت کے نام سے ہی حکومت کرتی رہی تھیں۔لیکن آزادانہ حیثیت سے امور سلطنت چلا رہیں تھیں۔انہوں نے خود اپنے الگ سکے رائج کئے، جمعہ کے خطبات میں ان کے امراء کا نام لیا جاتا رہا۔ 921ء کے اسی دور میں ترک یلغار قبائل نے اسلام قبول کیا۔ یہی یلغار ترک عربوں اور یہودیوں کے ساتھ مل کر یورپ میں غلاموں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ان غلاموں کو دریائے والگا کے کنارے سے مشرق وسطیٰ لے جایا جاتا اور بیچا جاتا۔اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ حال ہی میں اسکانڈینیویا (Scandinavia) میں بڑی تعداد میں عباسی دور کے سکے دریافت ہوئے ہیں- 961ء میں بحیرۂ کیسپین (Caspian Sea) کے قریب آباد اُغوز خاندان نے اسلام قبول کیا جو کہ سلجوق قبائل کے آباء تھے۔ترکوں نے اسلام کے پیغام کو ملک روس میں پہنچایا۔ یہاں تک کہ ماسکو اور کیو اس پیغام سے مانوس ہوئے۔لیکن 988ء میں جب ترک بلغاریوں نے روسی امیر لاڈمیر کو اسلام کا پیغام دیا تو اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بجائے اس کے اس نے مشرقی کلیساء (Eastern Orthodox) مذہب اختیار کیا۔یہی وہ دور تھا جبکہ قسطنطنیہ کے بازنطینی بھی اسی مذہب کے چیمپئن تھے۔اس طرح عمل کی بازی گاہ تیار ہوئی۔ادھر روسی اور مشرقی سلادیوں نے مشرقی کلیسا کو اپنایا۔ادھر ترک اسلام کے آغوش میں آئے جرمنیوں نے رومن کیتھولک چرچ کو قبول کیا۔دنیا کی بازی کا نقشہ ابھر آیا-

پندرھواں باب

جنگ منزیکرٹ

ترک دنیا کے اسٹیج پر طوفانی رفتار سے وارد ہوئے۔ ان کی شاندار پیش قدمی تین فیصلہ کن واقعات کی رہین منت ہے جو کہ تاریخ کے اہم موڑ کی نشاندھی کرتے ہیں۔ وہ واقعات یہ ہیں اول تو 833ء میں عباسی خلیفہ المعتصم کا ترک محافظ دستہ تشکیل دینا ہے۔ دوم 999ء میں بخارا میں پنپنے والی ترک سمنی حکومت کا خاتمہ اور سوم منزیکرٹ کی جنگ جو کہ اگست 1072ء کو ہوئی۔

المعتصم کے بعد بغداد میں بنو عباس انتشار کا شکار ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے نا اہل وارثوں کے ایک سلسلے نے خلافت کو کھوکھلا کر دیا۔ ایک عظیم الشان سلطنت جس کی سرحدیں بحر اوقیانوس سے لے کر دریائے سندھ کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اب اس پر وہ حکومت کرنے کے قابل نہ تھے۔ ترک محافظ دستے نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور اقتدار کے دلال بن بیٹھے- 861ء سے 870ء تک ترکوں نے تین خلفاء کو تخت پر بٹھایا اور پھر انہیں معزول کر دیا۔ بغداد کی کمزوری نے مقامی ریاستوں کو سر اٹھانے کا موقع فراہم کیا- 850ء کے آتے آتے مراقش اور الجیریا میں اغلبوں نے خود اپنے سکے ڈھالنے شروع کر دیئے۔ 868ء میں ایک ترک فوجی جنرل احمد بن طولان نے مصر اور شام پر قبضہ جمایا اور طولونی خاندان کی حکومت کی داغ بیل ڈالی- اثنا عشری مسلک کے بنو بویہ نے سنی بنو عباس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور 945ء میں عراق پر قبضہ کر لیا۔ اور بغداد کو اپنے زیر فرمان کر لیا۔ 900ء میں سمنیوں نے خراسان پر قبضہ کیا اور اپنا اقتدار وسط ایشیاء کے دریاء اوکسوس سے لے کر ایران کے مرکزی حصہ تک قائم کر لیا۔ مشہور ریشم شاہراہ کے ذریعہ چین اور ہندوستان کے ساتھ تجارت زور پکڑنے لگی تو ادھر دریاؤں کے کنارے کنارے

ہوتے ہوئے یوروپ کی سلطنت وائکنگ تک بھی یہ تجارتی قافلے پہنچے لگے ہر طرف تجارت فروغ پانے لگی جس کی وجہ سے سمنیوں کے زیر تسلط علاقہ میں دولت اور خوش حالی کا دور دورہ ہو گیا۔ سمنیوں نے سائنس کی سرپرستی کی۔ تہذیب وتمدن کو آگے بڑھایا۔ فارسی زبان کی ترقی وترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان زرین کارناموں کی وجہ سے سمنیوں کو تاریخ میں عزت سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کا اعلیٰ ترین سائنسدان ابن سینا نے خراسان میں سمنیوں کے زیر اہتمام اپنی تمام تر تحقیقات مکمل کیں۔ جب تک طاقتور اور اعلیٰ قابلیتوں کے حامل سمنی اقتدار کے مالک رہے۔ اس وقت تک انہوں نے اوکسس دریا کے اس پار بسنے والے ترک قبائل کو قابو میں رکھا۔ لیکن ایک طاقتور اندورنی خلفشار اسلامی دنیا میں باقاعدہ برپا ہوتا رہا جس نے اسلامی سیاسی دنیا میں سمنیوں کو کمزور کر دیا۔ دسویں صدی عیسوی کے اخیر تک قاہرہ کے شیعہ بنو فاطمہ اور بغداد کے سنی بنو عباس کے درمیان کشمکش انتہا درجہ پر پہنچ گئی۔ بنو فاطمہ نے سب سے پہلے شمالی افریقہ اور پھر مصر پر 969ء میں قبضہ کیا اس کے بعد شام اور حجاز میں بھی آگے پیش قدمی کی اس دور کے امراء اور سربراہانِ سلطنت نے بنو فاطمہ کی سرپرستی قبول کر لی یہاں تک کہ ملتان یعنی آج کے پاکستان کے امیر بھی بنو فاطمہ کے ہی زیر نگین رہے۔ سمنی امیر بھی اس سیاسی کشمکش سے محفوظ نہیں رہے۔ سمنی امیر نصر السعید جس نے 914ء سے 943ء تک بخارا پر حکومت کی۔ اس نے بنو فاطمہ کا ساتھ دیا۔ خراسانی عوام کی اکثریت سنی مسلمانوں کی تھی۔ انہوں نے سمنیوں کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی۔ سمنی حکومت عوام کی اکثریت کی ہمدردی گنوا بیٹھی۔ اس کے اقتصادی وجوہات بھی تھے۔ ہندوستان سے یوروپ کو اکثر تجارت براہ خلیج فارس ہوا کرتی تھی۔ قاہرہ میں قدم جمانے کے بعد بنو فاطمہ نے اس تجارت کا رخ کامیابی کے ساتھ براہِ بحیرۂ احمر موڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصری خوشحال بننے لگے۔ اور خراسان کے سمنیوں اور عراق کے بوویہ (Buyids) پر غربت کے بادل منڈلانے لگے۔ ادھر شمال کے ترکوں کو قابو میں رکھنے کے لئے فوجی اقدامات کا بھاری خرچ سمنی حکومت کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ دھیرے دھیرے اقتدار ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ آخرکار 999ء میں سمنی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

سمنیوں کے زوال کے ساتھ ہی خانہ بدوش ترک قبائل کا ایک سیلاب سا امڈ آیا-999ء میں قراقانی

نامی ترک قبیلے نے دریائے اوکسس کو پار کیا اور بخارا پر قبضہ کرلیا- 962ء میں غزنی میں الپتگین نے ایک طاقتور ترک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ترک قبائل ہر وقت مضطرب و بے قرار رہا کرتے اور اکثر اوقات آپس میں ایک دوسرے کو گھڑ سواری کے مقابلوں کی دعوت دیا کرتے۔ آنے والے دہے میں ایک فوجی سپہ سالار سبتگین نے 977ء میں غزنی پر قبضہ کرلیا۔ اسی سبتگین کا بیٹا محمود ہی تھا جس نے 1000ء سے 1030ء کے دوران ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ محمود نے ترک قبائل پر قابو پانے کی کوشش کی۔ انہیں خراسان میں دور دراز مقامات میں بکھیر دیا اور قبائل کو انہی مقامات میں سکونت اختیار کر لینے پر مجبور کیا۔ لیکن یہ کوشش رائیگاں ثابت ہوئی- 950ء اور 1000ء کے درمیان بحیرۂ کیسپیئن کے شمالی علاقوں میں آباد ''اوغوز'' قبائل کا گروہ اسلام میں داخل ہوگیا- یہ قبائل خراسان کے جنوب کی جانب ہجرت کر گئے۔ سلجوق نے اپنی سرداری میں ان اوغوز قبائل کو ایک زبردست جنگجو قوت کی حیثیت سے متحد کر دیا۔ سلجوق کے بیٹے ارسلان نے غزنی کے محمود سے جنگ چھیڑ دی جس میں کسی کو بھی فتح حاصل نہ ہوسکی لیکن جب 1030ء میں محمود کا انتقال ہوا تو حالات کا رخ مکمل طور سے سلجوقیوں کے حق میں ہوگیا۔

سلجوقی جان کی بازی لگا کر لڑنے والے جنگجو تھے، اپنے مذہب کے لئے لڑنا اور سر کٹا دینا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہی لفظ ''غازی'' کا اختراع کیا جو کہ آج تمام اسلامی زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ عربی لفظ غزہ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے جدوجہد، سلجوقی سنی العقیدہ تھے اس وجہ سے انہوں نے بنو فاطمہ سے محاذ آرائی کی۔ ادھر بغداد میں عباسی خلفاء ایک طرف بنو فاطمہ کے دباؤ میں تھے تو دوسری جانب بازنطینی حکومت کے۔ جب سلجوقی ابھرے تو بنو عباس نے خوشی کے ساتھ ان کی محافظت کو قبول کرلیا۔

اثنا عشری ایک جنرل بساسری کی قیادت میں عراق پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ بساسری نے مصر میں بنو فاطمہ کے خلیفۃ المستنصر کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تا کہ سلجوقوں پر روک لگائی جاسکے۔ اس دوران 1036ء میں تغرل بیگ ارسلان سلجوقی سلطنت کا وارث بنا۔ اور بغداد پر قبضہ کے لئے آگے بڑھا۔ سلجوقیوں اور بساسری کے درمیان ایک زبردست جنگ چھڑ گئی۔ 1060ء میں طغرل بغداد میں فاتحانہ داخل ہوا۔ بساسری کے انتقال کے بعد ایران اور عراق میں بنو فاطمہ کا زور ٹوٹ گیا۔ 1058ء میں عباسی خلیفہ قائم نے طغرل کو ''مشرق

ومغرب'' کا سلطان تسلیم کیا۔اسے حکومت کرنے کا حق عنایت کیا تا کہ وہ سنی عقیدہ کو سربلند کرے اور غیر مسلم دشمنوں سے امت مسلمہ کی حفاظت کرے۔

ترکوں نے خلافت کا خاتمہ تو نہیں کیا۔لیکن 1058ء میں انہوں نے اس کے کردار کو سلطانیت میں تبدیل کر دیا۔ یہ کردار فوجیوں کے دور سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوتا ہوا آج بھی اسلامی دنیا میں کئی جگہ برقرار ہے۔

ادھر مسلمانوں کے اندرونی خلفشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بازنطینیوں نے آرمینیا پر قبضہ جما لیا اور شام کے اندر دور تک گھس آئے۔جلد ہی انکا سامنا ترکوں سے ہوا۔ترک چراگاہوں کی مسلسل تلاش میں اناطولیہ تک پہنچ گئے تھے۔1063ء میں طغرل کا انتقال ہو گیا۔اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔اس کے بھتیجے الپ ارسلان نے سلجوقیوں کی سرداری سنبھالی۔ بازنطینیوں نے ترکوں کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ 1063ء سے 1070ء تک ان کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں جس میں بازنطینی شہنشاہ رومانوس ڈیاگونوس نے ایک زبردست فوج کی تشکیل کی۔ یونانی، روسی، فرانسیسی اور اطالوی کرایہ کے سپاہیوں پر مشتمل فوج نے الپ ارسلان کے خلاف ہلہ بول دیا۔1072ءویان جھیل کے کنارے منزی کرٹ کے مقام پر دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ فرانسیسی کرایہ کے سپاہیوں نے شہنشاہ سے جھگڑا کیا اور میدان جنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ بازنطینیوں کے ساکن دفاع اور ترکوں کے برق رفتار گھڑ سواروں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔سلجوقیوں نے بازنطینیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔شہنشاہ ڈیانوس گرفتار ہو گیا۔ یہ ترکوں کی فتح کا دن تھا۔الپ ارسلان صرف میدان جنگ کا بھی شہسوار نہ تھا بلکہ فتح کے بعد بھی ویسا ہی بہادر اور فیاض تھا۔اس نے بازنطینی شہنشاہ کو اپنی فوجوں کی حفاظت میں قسطنطنیہ واپس بھیج دیا۔

منزی کرٹ کی یہ جنگ ایک یادگار جنگ ہے جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔اس نے ایشائے کوچک سے یونانی قوت کا خاتمہ کر دیا اور ترکوں کی بستیوں کے لئے دروازہ کھول دیا۔ترک جو چراگاہوں کی تلاش میں لہر در لہر حملہ آور ہو رہے تھے۔اناطولیہ میں کافی دوری تک گھس گئے۔ یونانی زمیندار اور امراء جنہیں بازنطیوں نے ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔وہاں سے فرار ہو گئے۔دیہاتیوں نے اسلام قبول کر لیا اور ترکوں

کے ساتھ شامل ہوگئے۔ غازیوں کے مختلف رسالے ابھر آئے۔ کئی ایک نے مغرب میں قسطنطنیہ (جدید استنبول) کی جانب کافی گہرائی تک پیش قدمی کی کچھ شمال میں بحیرۂ اسود کی طرف آگے بڑھے۔ اب تو بس کچھ ہی دیر تھی کہ یہ غازی آبنائے داردانیلس کو پار کر کے یوروپ میں داخل ہو جاتے۔ الپ ارسلان نے وہ کارنامہ سرانجام دے دیا جسے 668ء میں امیر معاویہؓ انجام دینے میں ناکام رہے اور بغداد کے عباسی خلفاء چار سو برسوں تک جس کا صرف خواب ہی دیکھتے رہے۔ الپ ارسلان نے اناطولیہ کا دروازہ اسلام کی آماجگاہ کے لئے کھول دیا۔

منزی کرٹ کی شکست سے لاطینی مغرب میں خطرہ کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ شہنشاہ ڈیاگونس اور اسکے بیٹے الکزیس کی مدد کے لئے فریادیں رومن کلیسا کے ذریعہ بازگشت کرتی رہیں اور پچیس سالوں کے بعد پوپ پال دوم کے زیر اہتمام صلیبی جنگ کی صورت میں یہ نالے فریاد رس ہوئے۔

سولھواں باب

فدائی خنجر

جدید ممالک کے خفیہ جاسوسی اور قاتل ایجنسیوں کے قائم کرنے سے ایک ہزار سال پہلے ہی مشرق وسطیٰ اس فن میں ماہر تھا۔ اس فن کا موجد تھا حسن الصباح، ایک ایسا پراسرار کردار جس کے ہر پہلو پر رازوں کا ردہ پڑا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے متعلق جتنی صحیح معلومات ملتی ہیں اتنی ہی غلط معلومات کی بھی فراوانی بھی ہے۔

سلجوقیوں نے عالم اسلام کی طاقت کا اندرونی توازن بے شک سنیوں کے حق میں بدل دیا۔ بنو فاطمہ اور بوویہ دونوں کی مشرکہ فوجوں پر طغرل بیگ کی فیصلہ کن فتح اس رسہ کشی کا ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ اس فتح کے بعد بنو فاطمہ کی طاقت کا زور قاہرہ کی جانب لوٹ گیا۔ بغداد پر بنو عباس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ اس کے بعد اسلام کے صحیح عقیدہ کے اس تصور نے مکمل غلبہ حاصل کرلیا جو حنفی مسلک تھا اور جس پر اشاعرہ نظریات کا ہلکا سا لیپ چڑھا ہوا تھا۔ یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں کیونکہ جب ترکوں نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے حنفی مسلک اور اشعریہ فلسفیانہ نقطۂ نظر کو اپنایا۔

بغداد میں شکست و ریخت کا جواب بنو فاطمہ نے سنی اسلام کے خلاف ایک خفیہ اور ہلاکت آفریں جنگ سے دیا۔ یہ طریقہ کار تھا قتل کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا۔ اس قاتلانہ تحریک کا معمار تھا حسن الصباح۔ حسن الصباح اور نظام الملک دونوں ہم جماعت تھے۔ نظام الملک آگے چل کر سلجوقی دور میں وزیر اعظم کے عہدہ تک ترقی کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بھی سلجوقی نظام حکومت میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنا

چاہتا تھا لیکن ان عزائم کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے۔ یہ اس کے اپنے عقیدہ کا اثر تھا یا انتقام کی غرض کہ اس نے فاطمی مسلک اختیار کر لیا۔ قاہرہ کے فاطمی خلفاء کی مرضی اور انہی کے اشاروں پر اس نے اپنا خنجر سنی مسلک کے قائدین پر تان لیا۔

حسن الصباح ملک شام کے شمالی پہاڑوں میں پہنچا وہاں خفیہ پناہ گاہیں قائم کیں اور انھیں اپنا مرکز بنایا۔ ان پناہ گاہوں سے اس نے دہشت وخوف اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ اس خفیہ تاریخی تحریک کا محور خود حسن الصباح تھا۔ اس نے شیخ الجبل کا خطاب اختیار کر لیا اور باقاعدہ تنظیم بنائی۔ اس کے نیچے کا درجہ داعیوں کا تھا جنہیں اس تحریک کی تبلیغ کی تعلیم دی جاتی۔ داعیوں کے بعد تیسرا درجہ تھا فدائیوں کا جن کی تربیت کے لئے ایک صداقت نامہ تیار کیا گیا۔ صداقت نامے کے صحیح العقیدہ ہونے کا نشہ انکے دل ودماغ میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا وہ اپنے آقا کے کارندوں کی حیثیت سے کام کرتے۔

انہی تربیت یافتہ افراد کو اسلامی حکومت کے دور دراز علاقوں میں قاتلانہ حملوں کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ حسن الصباح کے گروہ کی سب سے نچلی سطح رفیقوں کی تھی۔ جب وہ اس تحریک میں شامل ہوتے انہیں صداقت نامہ اور اس کے صحیح عقیدہ ہونے کا نشہ دھیرے دھیرے پلا جاتا اور آئندہ کارروائیوں کے لئے آہستگی سے تربیت دی جاتی۔

انگریزی لفظ (Assasin) یعنی قاتل عربی لفظ حششین یعنی حشیش استعمال کرنے والے سے اخذ شدہ ہے۔ فدائین کو حشیش کے استعمال کا عادی بنایا جاتا تھا اسی نشے کی حالت میں وہ قتل بھی کرتے تھے۔ حشیش عموماً ہندوستان سے درآمد کی جاتی حالانکہ مقامی طور پر بھی تھوڑی بہت اگائی جاتی تھی۔ حشیش کو ہندوستان میں گانجا کہا جاتا ہے۔ یہ میروانا سے ملتا ہے اور آج بھی برصغیر میں اسکو اگایا جاتا ہے اور استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ قاتلانہ تحریک اور اس کے ماننے والوں کو فدائین بھی کہا جاتا تھا۔ ترکی میں یہ نثاری تحریک کہلاتی تھی۔ دونوں کا مطلب ہے اپنی تحریک کے مقصد کے لئے جان دینے پر آمادہ ہونا۔ عربوں نے ان فدائین کو ملاحدہ یعنی کافر کہا ہے۔

حسن الصباح نے اپنی مرکزی کمین گاہ کے قریب ایک وادی میں جنت کی طرح نظر آنے والا ایک

خوشنما باغ بنوایا۔جس میں پھلدار درخت تھے پھولوں کے باغیچے تھے اور سینکڑوں خوبصورت عورتیں تھیں۔ نئے شکار کو حشیش کے نشے میں غرق کر کے یہاں اس وادی میں لایا جاتا۔ جب خوبصورت عورتوں کے درمیان اس باغ میں وہ نوجوان آنکھ کھولتے تو یہ سمجھ بیٹھتے کہ وہ سچ مچ جنت میں آ گئے ہیں۔ یہاں انکے دماغ کی دھلائی ہوتی خفیہ قتل کے طریقۂ کار نہایت نپے تلے انداز میں انکے دل و دماغ میں ڈال دیئے جاتے۔ ان اشخاص کو اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اپنے آقاء کے احکامات کو مکمل طور سے بجالانے کا پابند بنایا جاتا۔ پھر ان مکمل دہشت گردوں کو بادشاہوں اور سلطاتین پر حملے کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا تاکہ سلجوقیوں کے ہاتھوں بنو فاطمہ کی شکست کا بدلہ لیا جاسکے۔

اب یہ قاتل سنی اسلام کے سربراہوں کے قتل میں جٹ گئے ،سینکڑوں امراء، وزیر اور سپہ سالاران قاتلوں کے خنجر کا شکار ہوئے یا فدائین کے زہریلے پیالے سے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ قتل کا شکار ہونے والی اہم ترین شخصیتوں میں سلجوق سلطان ملک شاہ کا وزیر نظام الملک بھی تھا۔ نظام الملک یقیناً اسلامی دنیا کے اعلیٰ ترین منتظمین حکومت میں سے تھا اس کی فارسی زبان میں لکھی گئی مشہور کتاب "سیاست نامہ" حکومت کا نظام چلانے کے طریقۂ کار اور سیاست پر ایک شاہکار کتاب ہے وہ نظام الملک ہی تھا جس نے سلجوقی حکومت کو استحکام بخشا۔ اس نے کئی یونیورسٹیاں قائم کیں۔ جہاں اس دور کے بہترین دماغ درس دیا کرتے تھے۔ اس نے شفاخانے بنوائے، سڑکیں اور نہریں تعمیر کروائیں، زراعت کی حوصلہ افزائی کی، فوج کو مضبوط کیا، محصول کی وصولی کیلئے اصول مرتب کئے، مالیاتی نظام کو منضبط کیا، چین اور ہندوستان کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا۔ سلجوق خوشحال ہو گئے اور بغداد ایک بار پھر دنیا کا اہم ترین شہر بن گیا۔ بغداد کے نظامیہ کالج میں درس دینے والی ایک اہم ترین شخصیت تھی امام الغزالیؒ جنھوں نے اپنے قلم کی طاقت سے اسلامی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔

اس زمانے کی یونیورسٹیاں صرف علم سیکھنے کی درسگاہیں ہی نہیں تھیں بلکہ اپنے سرپرست کے نقطۂ نظر کے پروپگنڈہ کے مراکز بھی تھے۔ بنو عباس اور بنو فاطمہ کی سیاسی رقابت، بغداد اور قاہرہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے نصاب سے صاف صاف جھلکتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ابھی حال تک امریکہ اور

روس کی یونیورسٹیوں کے سماجی سائنسی نصاب میں سوشلزم اور سرمایہ داری کے بارے میں پڑھایا جاتا جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے نفرت کی تعلیم دی جاتی۔ جامعہ الازھر 969ء میں قاہرہ میں قائم کی گئی۔ یہ نہ صرف علم کی ایک اعلیٰ درسگاہ تھی بلکہ بنو فاطمہ کے نظریات کے پروپگنڈہ کا مرکز بھی تھی، بغداد کا نظامیہ کالج نہ صرف سائنس، قواعد اور فقہ کی ایک درسگاہ تھا بلکہ سنی اسلام کے پروپگنڈہ کا مرکز بھی تھا۔ مثال کے طور پر الغزالیؒ جنکا انتقال 1111ء میں ہوا کی تحریروں میں بیک وقت ہم بنو فاطمہ کے موقف اور فلسفہ کے سیکولر چیلنج کے خلاف مناظرہ پاتے ہیں۔

1091ء میں نظام الملک کے قتل سے عالم اسلام کو ایک زبردست دھکا لگا۔ نہ صرف ایک اعلیٰ ترین منتظم سے سلجوقی حکومت محروم ہوگئی بلکہ اس کی وجہ سے وسیع سلجوقی سلطنت کی مخالف قوتوں کو جلد از جلد مرکز سے دور ہونے کا موقع بھی مل گیا۔ دوسرے اعلیٰ دماغ جو فدائین کے خنجر کا شکار ہوئے وہ تھے موصل کے امیر مودود 1127ء میں، زینگی 1146ء میں اور عطا بیگ عماد الدین، سلطان صلاح الدین ایوبی خود دو الگ الگ مواقع پر قاتلوں کے ان خنجروں سے بال بال بچے، سلطان محمد غوری جس نے دہلی فتح کیا، اس قدر خوش قسمت نہ رہا۔ وہ اسی قاتلانہ خنجر کا شکار ہوگیا اور یہ سانحہ کابل کے قریب 1206ء میں پیش آیا۔

سلجوقیوں نے بار بار ان قاتلوں پر حملے کیئے۔ لیکن ہر بار یہ قاتل بچ نکلے۔ آخرکار 1251ء میں منگولوں نے الغوخان کی سرداری میں قاتلوں کی اس سرزمین پر مکمل فتح حاصل کر لی اور انہیں انکی پناہ گاہوں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ مسلمانوں کے لئے کوئی زیادہ تسلی بخش بات نہ تھی۔ کیونکہ منگول اسلامی تہذیب کے دل بغداد کی تباہی کے راستے پر رواں تھے۔ منگولوں کے حملوں سے فرار ہوکر یہ قاتل شام اور عراق کے شمالی حصوں میں چھپ گئے اور حالیہ دور تک بھی ان کی تباہ کاریاں جاری رہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب عثمانیہ ترکوں کو شکست ہوگئی تو یہ علاقے برطانیہ کے زیر نگرانی آگئے۔

نظام الملک کے انتقال کے بعد سلجوقی حکومت کمزور ہوگئی۔ شہزادوں اور امیروں کے درمیان جھگڑوں نے سر اٹھایا جسکا نتیجہ کھلی جنگ کی شکل میں سامنے آیا۔ اسلامی سیاست کے اسی مردہ جسم میں 1096ء میں صلیبوں نے اپنا خنجر بھونک دیا۔

سترہواں باب

محمود غزنوی

تاریخ لامحدودطور پر لچک دار ہوتی ہے۔ایک فرد کا عمل آگے چل کر آنے والے ہزاروں افراد کی زندگی میں ارتعاش مچادیتا ہے۔محمودغزنوی کی اسلامی تاریخ میں انتہائی اہمیت ہے اس لئے کہ اس کی کارروائیوں نے اسلامی دنیا اور ہندوؤں کی دنیا کے درمیان باہمی عمل ردعمل اور مناظرے کا سلسلہ شروع کیا۔اس باہمی ردعمل اور کشمکش سے ایک ایسی تلخی پیدا ہوئی جس کو ہندو اور مسلم دونوں انتہاء پسندوں نے اور باہر سے آنے والے انگریزوں نے اپنے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا۔ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ کا کوئی بھی طالب العلم 1025ء کے ان واقعات کو جسے تقدیر نے لکھ دیا تھا،نظرانداز نہیں کرسکتا۔اس سال محمود نے ہندوستان میں سومناتھ کے مندر پر حملہ کیا اور اسکا بہت بڑا خزانہ لوٹ کر لے گیا۔حالات کے اصلی تناظر کا مطالعہ کرنے کے برعکس ہم عصر مؤرخوں نے برصغیر کے حالات کو دنیا میں اس دور میں گذرنے والے واقعات سے بالکل الگ کر کے دیکھا یہی وجہ ہے کہ اس کو اور اس کے کارناموں کو بالکل غلط سمجھا گیا اور اسے بت شکن کے نام سے پکارا گیا جو کہ بالکل صحیح نہیں ہے۔

تاریخ کی کسی بھی کسوٹی سے اس کو ناپا جائے تو محمودغزنوی کی شخصیت یقیناً بڑی قدآور شخصیت ہے اگر کوئی 1000ء میں زندہ رہ کر اس دور کے حالات پر نظر ڈالتا تو محمودغزنوی کو اس دور کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک قرار دیتا۔لاہور سے لے کر بغداد تک بحیرۂ فارس لے کر بحیرۂ کیسپین تک محمود کا

جھنڈا بغیر کسی چیلنج کے لہرا رہا تھا۔محمود سبکتگین کا بیٹا تھا۔سبکتگین الپتگین کا داماد تھا۔الپتگین ایک ترکی قبیلے کا مملوک یعنی غلام سپاہی تھا۔ یہ بخارا کے سمنی دربار سے وابستہ تھا۔ جب سمنیہ خاندان زوال پذیر ہوا تو الپتگین افغانستان کے پہاڑوں میں منتقل ہوگیا اور غزنی میں اپنی حکومت قائم کرلی۔سمنیوں نے الپتگین کو مغلوب کرنے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے-995ء میں الپتگین کا انتقال ہوگیا تو اسکا داماد سبکتگین تخت پر بیٹھا۔سبکتگین نے اپنی توجہ مشرق کی طرف مبذول کی اور دریائے سندھ کو عبور کرتے ہوئے پنجاب پر قبضہ کیا اور اسے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ قرار دے دیا۔سبکتگین کی فوجی کامیابیوں کو دیکھ کر بغداد کے عباسی خلیفہ قادر باللہ نے اسے ناصرالدولہ کا خطاب عطا فرمایا سنی اسلام کی حکومت کے جواز کا پروانہ خلیفہ کے جانب سے دیا جاتا تھا اور یہ پروانہ عالی حوصلہ اولوالعزم اور جاہ طلب شہزادوں اور سپاہیوں کو مختلف خطابات کی شکل میں دیا جاتا تھا سبکتگین ایک اعلیٰ ترین درجہ کا سپاہی تھا اس نے اپنی گرفت افغانستان،صوبۂ سرحد اور مشرقی پنجاب پر مضبوط کرلی۔

997ء میں سبکتگین کا انتقال ہوا تو اقتدار کے لئے اس کے دونوں بیٹے اسماعیل اور محمود کے درمیان رسہ کشی شروع ہوگئی۔ بلاشبہ محمود اپنے بھائی سے زیادہ باصلاحیت تھا اقتدار کی اس رسہ کشی میں وہ فتح یاب رہا۔ جب 999ء میں سمنی طاقت کا خاتمہ ہوگیا تو محمود سرعت کے ساتھ بڑھا اور خراسان پر قبضہ کرلیا۔وسطِ ایشیاء سے ایرانی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ ترکمان طاقت نے لے لی حالانکہ ایرانی اثر اندرونی طور پر فارسی زبان کی ترقی کے ذریعہ ان علاقوں میں جاری وساری رہا۔بغداد کے خلیفہ نے محمود کی حکومت کو سند عطا کرتے ہوئے اسے ''یمین الدولہ'' اور ''امین الدولہ'' کے خطابات سے نوازا۔ اب محمود نے اپنی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول کی۔ ہندوستان کے ساتھ اسکی باہمی تفاوت،عمل ردعمل کی وجہ سے ہی تاریخ میں محمود کی اہمیت مجسم ہوکر سامنے آتی ہے۔ہندوستان پر محمود کے حملوں کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کے عالمی تناظر کا بغور مطالعہ کیا جائے۔اس وقت عالم اسلام قاہرہ کے بنوفاطمہ اور بغداد کے بنوعباس کے درمیان منقسم تھا۔تو ادھر اسپین میں بنوامیہ اپنی ہی الگ خلافت کا حق جتا رہے تھے جس کی بنیاد قرطبہ میں رکھی گئی تھی-بنوفاطمہ شمالی افریقہ مصر شام وعرب پر قابض تھے۔بنوفاطمہ کے

ہمدردوں کی حکومت ملتان یعنی جدید پاکستان پر بھی تھی۔اور کچھ عرصہ کے لئے بخارا پر بھی رہی۔حقیقت تو یہ ہے کہ بنو فاطمہ نے بنو عباسی حکومت کا گھیرا کر رکھا تھا۔اس کے نتائج تجارت پر بھی محسوس ہو رہے تھے کیونکہ عباسی حکومت اس سلسلے میں بے بس ہوگئی تھی۔ بنو فاطمہ ہندوستان اور مشرق بعید سے ہونے والی انتہائی فائدہ مند تجارت کو بحیرۂ فارس سے بحیرۂ احمر کی طرف موڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہاں سے انہوں نے اس تجارت کو مصر کی راہ سے جنوبی یوروپ تک پھیلا دیا تھا۔علاوہ اس کے صحرائے اعظم کے جنوبی حصوں سے یعنی مغربی افریقہ سے سونے اور جوز کی فائدہ بخش تجارت بھی بنو فاطمہ کے علاقوں سے گذرنے لگی۔

بحیرۂ روم کی جانب جانے والے راستوں کے مسدود ہو جانے کی وجہ سے بغداد دھندلاتا گیا جبکہ قاہرہ متمول ہوتا گیا- وینس (Venice) کے بیوپاریوں نے اس دور کے قاہرہ کی دولت مندی کو اپنے حوالہ جات میں درج کیا ہے۔ مالیہ کا یکطرفہ بہاؤ دوسری جانب اطراف کے علاقوں میں جاری فوجی مہمات ان وجوہات کی بنا پر بغداد کے خلفاء انتہائی دباؤ میں آ گئے۔ بوویہ اثنا عشری بغداد کے اطراف واکناف کے علاقوں پر پچاس سالوں تک قابض رہے۔اس طرح تقریباً ایک صدی یعنی 969ء سے لے کر جب کہ بنو فاطمہ نے مصر کو فتح کیا 1056ء تک جب کہ بنو فاطمہ کو بغداد سے بھگا دیا گیا۔مسلمانوں کے اپنے اندرونی خلفشار کے دوران سنی انتہائی نازک دور سے گذرے۔عباسیہ خلفاء کی مالی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ انہیں سرکاری خزانے کے بڑے حصہ کو نیلام پر چڑھانا پڑا تا کہ اپنے اخراجات کو پورا کیا جاسکے۔ابن کثیر نے 1050ء کے آس پاس میں ہونے والے کم از کم ایسے ہی ایک نیلام کو قلمبند کیا ہے۔

سلجوقیوں نے عباسیوں کا دفاع کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ بنو فاطمہ کے صدیوں پر محیط دور حکومت کے باوجود شمالی افریقہ کی وسیع آبادی سنی المسلک ہی وابستہ رہی۔ یہ صورت حال ترکوں کی معرکہ آرائی کیلئے سود مند رہی۔

ضروری مالیہ کی فراہمی کیلئے ترکوں نے اپنی توجہ ہندوستان پر مرکوز کی۔ زمانۂ دراز سے ہندوستان میں دنیا بھر کا سونا جمع ہوتا آیا ہے۔ ہندوستان کی تیار کردہ مصنوعات، ہاتھی دانت، گرم مصالحہ جات کی بحیرۂ روم کے اطراف واکناف کے ممالک اور ان سے آگے علاقوں میں زبردست مانگ رہی ہے۔ان کی قیمت سونے کی شکل میں ادا کی جاتی- یہ سونا مغربی افریقہ کی کانوں سے نکل کر بحر عرب سے ہوتا ہوا برصغیر

ہند پہنچتا۔تجارت کا پلڑا ہمیشہ سے ہندوستان کی جانب ہی جھکتا رہا اس لئے کہ مصالحہ جات ہر سال اگائے جاتے جب کہ سونا کم ہی ملتا تھا۔اس طرح ہندوستان نے سونے کے بڑے ذخائر جمع کر لئے جو یا تو زیورات کی شکل میں محفوظ رکھے جاتے یا پھر ہندوستان کے طویل طول وعرض میں پھیلے ہوئے مندروں میں ذخیرہ اندوز کیا جاتا یہاں کی چھپی ہوئی دولت کے انبار بار بار حملہ آوروں کو دعوت دیتے رہے۔ یہ حملہ آور برصغیر پر حملے کر کے دولت کے خزانوں کو لوٹ کر لے جاتے رہے جس سے وہ اپنی فوجی مہمات کا خرچ اٹھاتے رہتے۔

سیاسی مرکزیت کو کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے تین شرائط لازمی ہیں۔اول ایک متحد کرنے والی طاقت یا تحریک ہو جو لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑ سکے۔متحد کرنے والی طاقت کوئی الہامی تصور یا غیر ماورائی عقیدہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ قبیلہ پرستی، وطن پرستی یا نسل پرستی پر مبنی قوت بھی ہوسکتی ہے جو کہ عوام کو متحد کر سکے۔دوم کسی بھی فوجی پیش قدمی کے لئے یہ ضروری ہے کہ دفاعی قوت بھی اسی قدر مضبوط و متوازن ہو۔سوم مرکزیت کے اس عمل کو برقرار رکھنے کے لئے دولت کی فراہمی بھی برابر ہوتی رہے۔

ایک ہزارویں صدی عیسوی کے لگ بھگ اسلام کے دو بڑے نظریات ایک دوسرے پر بنیادی طور پر برتری حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ یہ نظریات تھے سنی اور شیعہ ایک نظریہ کے حامل بغداد کے بنوعباس تھے اور دوسری جانب قاہرہ کے بنوفاطمہ حالانکہ ایک سو سال تک بنوفاطمہ کو فوجی برتری حاصل رہی۔لیکن دونوں میں کسی کو بھی اتنی فوجی برتری حاصل نہ تھی کہ ایک دوسرے کو شکست فاش دے دیتے۔ اس جارحانہ آپسی چپقلش کو برقرار رکھنے کے لئے دولت کی بھی ضرورت تھی۔بنوفاطمہ نے مسلم اسپین کے ساحلی شہروں پر اور رومن کیتھولک اٹلی کے علاقوں پر سونے چاندی کی تلاش میں حملے جاری رکھے وہ سلطان جو بنوعباسیہ کے حلیف تھے انہیں بھی دولت کی ضرورت تھی نہ صرف بنوفاطمہ کے خلاف حملوں کے لئے بلکہ دریائے اوکسس کے اس پار سے ہونے والے ترک قبائل کے حملوں کو روکنے کے لئے بھی دولت کے اسی حصول کے لئے انہوں نے مشرقی رخ کیا۔

ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کو اس پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ان حملوں کے پیچھے

نہ تو مذہب کارفرما تھا اور نہ ہی خاندانی حبّ جاہ کی ہوس۔ان حملوں کی اصل وجہ تھی سونے چاندی کو حاصل کرنا تاکہ اس دور میں جاری صحیح سیاست کی آبیاری ہو سکے محمود نے 1000ء سے 1030ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کیا۔ پشاور 1001ء، بھیرہ 1004ء، ناگرکوٹ 1007ء تھانیشور 1014ء ترائن 1018ء اور قنوج 1018ء یکے بعد دیگرے اس کے حملوں کا شکار ہوتے گئے اس کے مشہور ترین حملے وہ ہیں جو ہندوستان کے اندرونی حصّوں پر کئے گئے 1025ء میں ایسا ہی ایک بڑا حملہ اس نے سومناتھ شیوا مندر پر کیا۔ ہندوستانیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گئے۔محمود کی فوجوں نے اس مندر کے تمام خزانے لوٹ کر اپنے ملک پہنچا دیا، کچھ تاریخ دانوں نے اس واقعہ کا محمود کو بت شکن کے روپ میں پیش کرنے کے لئے استعمال کیا- اس سے بھی بھیانک بات یہ ہے کہ اسی حملے کو ایک ایسے اسلام کی صورت اجاگر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا- جو دوسرے مذہب کو کسی بھی حیثیت سے برداشت نہیں کرتا حالانکہ سچائی تو یہ ہے کہ سلطان محمود نے اپنے کامیاب حملوں کے باوجود ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ اس حقیقت کے باوجود تنگ نظر اور متعصب مؤرخوں نے محمود کو اپنے ہی نظریہ کے مطابق پیش کیا۔حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے سارے حملے صرف اور صرف دولت حاصل کرنے کے لئے تھے۔مشہور محقق عالم رومیلا ٹھاکر نے اپنے تحقیقی مقالہ ’سومناتھ‘ تاریخ کے حکایات ’’اسلامک وائس‘‘ اکتوبر 1999ء کے شمارہ میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں کئی مقامی راجہ ایک دوسرے کے مندروں پر حملے کیا کرتے تھے اور یہ بات ان دنوں عام تھی۔محمود غزنوی کے حملوں کو مذہبی رنگ انیسویں صدی عیسوی میں انگریز مؤرخوں نے دیا خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کو از سر نو لکھا 1843ء میں انگلینڈ کے ایوانِ عام میں (House of Commerce) افغانستان پر مجوزہ حملے پر بحث ہورہی تھی اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے لاریٹ ایڈن برونے کہا کہ محمود کے حملوں نے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔اپنے مختصر حملے کے دوران انگریزوں نے غزنی پر کچھ وقت کے لئے قبضہ کیا وہاں محمود کے مقبرہ پر لگا دروازہ اکھاڑ کر دھلی لے آئے اور یہ مشہور کر دیا کہ یہی وہ صدر دروازہ ہے جو محمود نے سومناتھ کے مندر سے اکھاڑا تھا اور اپنے ساتھ لے گیا تھا کچھ عرصے بعد تحقیق ہوئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ یہ صدر دروازہ مصر کے مملوک طرز تعمیر کا تھا اور ہندوستان

کی تعمیرات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

محمود نے 1020ء میں پنجاب پر اپنی گرفت مضبوط کی اور لاہور کو اس کا صدر مقام بنایا-1004ء میں اس نے ملتان کے فاطمیہ حکمران داؤد کو شکست دی اور اسے تخت سے معزول کر دیا۔اپنے دار الخلافہ غزنی کو اس نے مال و دولت سے سنوار دیا۔یونیورسٹیاں قائم کیں علماء اور سائنسدانوں کی سرپرستی کی، بے شمار شفاخانے تیار کئے اور عدل وانصاف سے بھرا نظامِ حکومت قائم کیا۔اس نے بغداد کے دربار میں بے شمار قیمتی تحائف بطورِ نذرانہ پیش کئے تا کہ وہاں سے سلطان کا پروانہ حاصل کر سکے لیکن وہاں سے اس کو اجازت نہیں ملی۔محمود فارسی زبان کا عاشق تھا اور عظیم شاعر فردوسی اس کے دربار کا ایک روشن ستارہ تھا اس دور کے مشہور عالم البرونی سلطان کے ہندوستان کے آخری حملہ کے دوران اس کے ساتھ تھا۔آج ہندوستان کے قرونِ وسطی کے تعلق سے جو کچھ بھی معلومات فراہم ہیں ان کا ماخذ اسی عالم البرونی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اس دور کا فلسفہ، اعتقادات، رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کے متعلق صحیح اطلاعات کا ماخذ یہی البرونی ہے۔البرونی نے معرکتہ الآ راء تصنیف ''کتاب الہند'' لکھی اس کتاب میں اس دور کے ہندو تہذیب وتمدن سائنس ریاضیات اور ٹکنالوجی کا انتہائی غیر متعصب انداز سے تذکرہ ملتا ہے۔المسعودی نے اس دور میں سنسکرت اور یونانی زبانوں کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا اس کی دوسری مشہور تصانیف ''قانون مسعودی'' اور ''قدیم مما لک کے واقعات'' ہیں۔

محمود ہندوستان کے معرکوں میں اس قدر مشغول رہا کہ اس کی شمالی سرحدیں کمزور پڑ گئیں اس وجہ سے ترکوں کو اندر گھس آنے کا موقع مل گیا-1000ء کے آس پاس ایک ترکی قبیلہ اوغوز نے دریاء اوکسس کو پار کیا۔محمود کو اس محاذ کے خطرے کا اچھی طرح احساس تھا اس نے اس قبیلہ کو خراسان میں مختلف مقامات پر بکھیر کر بسا دیا اس کا خیال تھا کہ بکیر دیئے جانے سے اس قبیلہ کی طاقت کمزور پر جائے گی اور ان کا اتحاد ختم ہو جائے گا- اس کی یہ تجربہ غلط نکلا- اوغوز قبائل میں سے ایک قبیلہ نے سلجوق کی سرداری کے ماتحت اپنی طاقت کو مجتمع کیا اور اگلے چالیس سالوں کے اندر خراسان اور افغانستان پر قبضہ کر لیا وہاں سے محمود کے وارثوں کو نکال باہر کیا۔سلجوقی سلاطین کے سلسلہ کی یہ ابتداء تھی-

نقشہ

محمود کے کامیاب حملوں نے ہندوستانیوں کی دفاعی قوت کی کمزوریوں کو ظاہر کیا ان کے دفاعی مورچوں کو توڑ دیا اور آگے چل کر شمال مشرق سے ہونے والے حملوں کے لئے راہ ہموار کر دی۔ محمود ایک اعلیٰ درجہ کا سپاہی تھا لیکن اس میں سیاسی بصیرت کی کمی تھی وہ ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں بھی ناکام رہا۔ یہ مرحلہ دو سو سالوں بعد قطب الدین ایبک اور مملوکوں کو سرانجام دینا پڑا۔

اٹھارواں باب

صلیبیوں کی یورش

تہذیبوں کے درمیان اس وقت ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جب ماورائے ادراک قدروں یا فلسفیانہ قدروں کے درمیان کشمکش شروع ہوتی ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ خدائے تعالیٰ شخصی طور پر عیسیٰ کے شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ اسلام کے اس عقیدے سے ٹکراتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ماورائے ادراک ہے۔ عیسائی دنیا کے لئے دنیا کا سارا تقدّس اور پاکی اس مقدّس صلیب میں جمع ہوکر رہ گئی ہے جس پر ان کے اپنے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا اسلامی دنیا کے لئے خدائے تعالیٰ کی توحید پر کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن نہیں حالانکہ اسلامی دنیا اس وقت بنو فاطمہ اور کٹر سُنیّت کے درمیان منقسم تھی لیکن اللہ کے متعلق دونوں کا نظریہ ایک ہی تھا مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے کو کافر قرار دینے لگے اور اس ماورائے ادراک نظریہ پر اپنا اپنا الگ تصور رکھتے ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے۔

صلیبیوں نے یوروپ کے دور جہالت کے بطن سے جنم لیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں جرمنی کے گوتھک وحشی قبائل نے یوروپ کو روند ڈالا۔ مغربی گوتھی قبائل اسپین اور جنوبی فرانس پر قابض ہوئے۔ مشرقی گوتھی قبائل نے اٹلی اور اس کے مشرقی علاقوں پر اپنا تسلّط قائم کیا۔ اس طرح علاقہ سے مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا۔ ہر طرف مقامی سرداروں اور زمین داروں کا راج قائم ہو گیا - چارل مین تقریباً 800ء کے دوران اور اس کے شاہی خاندان کے وارث کے دورِ حکومت کے ایک مختصر وقفہ تک ایسا محسوس ہوا کہ سارا یوروپ مقدس

رومن سلطنت کے زیر اہتمام متحد ہو جائیگا۔لیکن 850ء کے آتے آتے چارل مین کے وارث فرانس کے تاج پر قابض ہونے کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے۔یوروپ ایک بار پھر نراج اور افراتفری کی طرف پھسل گیا۔سویڈن کے وائیکنگ قزاق ڈنمارک سے لے کر اسپین تک یوروپ کے ساحلی علاقوں میں لوٹ مار مچانے لگے۔ادھر جنوب کی جانب اسلام کی ابھرتی ہوئی سلطنتوں نے اپنا اقتدار کا دائرہ روم تک پھیلا دیا۔جنوبی فرانس پر انکا قبضہ ہوگیا اور یہاں سے مسلمان افواج سویزرڈلینڈ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئیں۔جینوا کے اطراف پہاڑی درّوں پر قابض ہوئیں اور مغربی یوروپ سے ان کے درّوں کے ذریعہ گذرنے والوں سے راہداری وصول کرنے لگے۔الجیریا کے اغلبوں نے سسلی پر قبضہ جمایا اور اٹلی کے قلب پر حملے کرنے لگے۔دسویں صدی عیسوی میں اسپین کے عبدالرحمٰن دوم نے مغربی روم میں واقع جزیروں پر اپنا اقتدار جمایا تو ادھر بنو فاطمہ نے معز کی سرپرستی میں وسطی بحرِ روم پر اپنا تسلط قائم کیا۔ھُن قبائل نے مشرق سے حملہ کیا اور ہنگیری پر قبضہ کرلیا اس طرح مغربی یوروپ کو مشرق سے الگ کر دیا اور یوروپ ہر طرف سے کٹ کے رہ گیا۔

دوسوسالوں تک مشرقی یوروپ کی اہم تجارت غلاموں اور فریعنی اولن پر منحصر تھی۔وائیکنگ قبائل نے یوروپ کے اندر مسلسل حملے کرتے ہوئے غلاموں کو پکڑنا شروع کیا جو دریائے اولگا کے ذریعہ لائے جاتے تھے۔ان غلاموں کو بحیرۂ کیپسین کے اطراف موجود بازاروں میں مسلمانوں اور یہودیوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا تھا۔اسلام قبول کرنے کے بعد یہی غلام سلاطین کی فوجوں میں داخل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے سپہ سالار اور بادشاہ بن بیٹھے یہی مملوک کہلائے۔

باہری دنیا سے مکمل طور سے کٹ جانے کے بعد یوروپ کے لوگ باطن کی طرف متوجہ ہوئے۔عقلیت پسند رابطوں سے رشتہ منقطع ہونے کی وجہ سے یوروپی دماغ پر اسرار مافوق الفطرت دنیا میں کھو گئے۔جادوٹونہ نے عقلیت پسندوں کی جگہ لے لی۔تبرکات کی پرستش ہونے لگی۔مقدس ہستیوں کے مقابر اوران کے اجسام کے حصے زیارت گاہیں بن کررہ گئے،ایسی زیارت گاہوں سے یہ عقیدہ وابستہ ہوگیا کہ اس سے بیماریاں دور ہوتی ہیں اور کرشمے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔جہالت کے اندھیروں نے سارے بر

اعظم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اس خلاء کی درمیانی راہ کو پر کرنے کے لئے کلیساء آگے بڑھا اور اس دنیا کی قدرتی طاقتوں اور مافوق الفطرت طاقتوں کے درمیان ایک وسیلہ بن گیا۔یوں سمجھئے کہ کلیسا زندہ طلسمات کا ایک مخزن بن گیا۔جن کے ذریعہ ایک عام شخص بھی غیر مافوق الفطرت طاقتوں سے ہم کلام ہوسکتا تھا ہر طرف چرچ اور خانقاہیں ابھر آئیں۔گوتھ انتہائی سیدھے سادے اور دیہاتی لوگ تھے، کہ جادوئی قوتوں سے بہت جلد مرعوب ہو جاتے تھے۔ان گوتھ قبائل کو نویں صدی عیسوی کی ابتداء میں عیسائی بنایا گیا۔

لوگوں کے شوق کے مطابق انہیں آسمانی معافی نامے اور برأت نامے بانٹتے ہوئے کلیساء انتہائی امیر بن گیا۔گناہوں سے معافی، پیدائش وموت کے رسم ورواج سب کچھ کلیساء ہی سرانجام دیتا تھا۔جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ایک وسیلہ بن بیٹھا تھا۔اس وسیلہ اور رابطہ کو دنیا میں رام کرنا ضروری تھا تاکہ وہ دھرتی کے غریبوں کی فریادیں آسمانوں کے ان بڑے عہدہ داروں تک پہنچا سکے۔وقت کے ساتھ ساتھ کسانوں کی کمائی بھی کلیساء کے خزانوں میں پہنچنے لگی- خانقاہیں دولت مند ہوتی چلی گئیں- دولت کے آجانے سے ان خانقاہوں میں اپنی ہی نجی افواج رکھنے کی استعداد بھی پیدا ہوگئی۔راہبوں کی ایک ایک عبادت گاہ اور کلیساء کے حلقوں کے اطراف ایسی دیواریں تعمیر کی گئیں جو کہ چھوٹے موٹے قلعوں کی طرح ہوتیں۔اس دور کے شہزادے بھی ایسے مضبوط قلعوں کی تعمیر کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔اس لئے کہ ان کے پاس محصول کی وصولی کے ایسے ذرائع نہیں تھے، لامرکزیت اپنی انتہاء پر تھی۔راہبوں کی ہر ایک عبادت گاہ اور ہر ایک شہزادہ کی اپنی اپنی میراث ایک الگ حکومت بنی ہوئی تھی۔انہیں کسی مرکزی قوت کی طرف سے مداخلت کا کوئی خطرہ نہ تھا، وہ چیزیں جو قرون وسطیٰ کے یوروپ کے تخیل کو جوش کے جذبے سے بھر دیتی تھیں ان میں سب سے اہم اور مقدس مقام صلیب کا تصور تھا۔یروشلم جہاں عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے حضرت عیسیٰؑ مصلوب ہوئے- یروشلم کی وہ چرچ جہاں وہ صلیب رکھی ہوئی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ خود اٹھائے ہوئے چلے تھے مصلوب ہونے کے یہ سارے مقامات عیسائیوں کیلئے آسمانی تقدس کا درجہ رکھتے تھے۔یروشلم کا سفر کسی بھی شخص کو انتہائی باوقار اور باعزت مقام عطا کر دیتا تھا-

996ء میں جب پوپ گریگوری نے صلیبی جنگ کا اعلان کیا تو اس نے براعظم کے عوامی تخیل کو اس قدر جوش سے بھر دیا کہ ایسا جذبہ اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا ایسی بات نہیں تھی کہ عیسائی دنیا وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے چست و متحرک مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ابھی ان کے پاس ایسے وسائل نہیں تھے کہ وہ اسلامی دنیا کو چیلنج کر سکتے۔ یہ تو ابھی ایک خواب وخیال ہی تھا۔لیکن مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ خواب کلیساء کے لئے بے انتہاء فائدہ مند تھا۔عوام کے تخیل کو مافوق الفطرت باتوں میں الجھاتے ہوئے کلیساء کے خزانوں کو مفت میں بھرنے پر اکساتے ہوئے کلیساء اپنا الوسیدھا کرتا رہا۔

تین سو سالوں تک یورپ عالم اسلام سے برسر پیکار رہا۔ فرنچ، جرمن، انگریز، اطالوی، اسپینی، یونانی وغیرہ یوروپی باشندے لہر در لہر مسلمانوں کے علاقوں پر حملے کرتے رہے۔مقدس صلیب کے نام، مسلمانوں اور یہودیوں کا قتل عام کرتے رہے، دکھ درد اور موت کی نشانیاں بکھیرتے رہے۔ دونوں تہذیبوں کے درمیان یہ مسلح ٹکراؤ بحیرۂ روم سے لے کر اسپین اور اناطولیہ تک ایک وسیع محاذ پر پھیلا ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں کی ابتداء 996ء میں ہوئی۔ یروشلم کے لئے لڑی جانے والی پہلی صلیبی جنگ کے سو سال پہلے ہی صلیبی جنگ کی ابتداء ہو چکی تھی- پہلی لڑائی اندلس کے مرتفع پر ہوئی۔بنو امیہ کی خلافت کے بکھر جانے کی وجہ سے 1032ء میں عیسائیوں کو ایک سنہری موقع مل گیا۔صلیبیوں نے اسپین کے امیروں کے خلاف جنگ چھیڑ دی، مسلم آبادیوں کو دہشت زدہ کرتے ہوئے ان سے بے حد زیادہ محصول وصول کرنا شروع کیا- 1085ء میں تالیدو ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس شکست نے اسپین کے علماء کو بیدار کر دیا۔انہوں نے بحیرۂ جبل الطارق کے اس پار یوسف بن تاشفین کے ماتحت مرابطون کو دعوت دی کہ وہ آئے اور عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکے۔اب لڑائیوں کا مرکز اٹلی اور سسلی کی طرف مرکوز ہو گیا۔صلیبیوں نے یہاں حملے شروع کر دیئے۔اور 1050ء سے 1091ء تک جارحانہ حملوں کے بعد سسلی پر قبضہ کر لیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں بدلتے ہوئے حالات پہلی صلیبی جنگ کے آغاز کا سبب بنے۔اس کی پہلی کڑی تھی جنگ متری کرٹ (اگست 1072ء) اس جنگ میں سلجوقوں نے اناطولیہ میں بازنطینوں کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیا اس کی دوسری کڑی تھی- بغداد میں فدائین کے ہاتھوں نظام الملک کا قتل، 1091ء میں متری

کرٹ کی جنگ میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے بازنطینی شہنشاہ رومانوس کو قید کیا پھر آزاد کردیا۔ یونان کے عوام کو یہ مشروط اطاعت ناگوار گذری جب رومانوس قسطنطنیہ واپس ہوا تو اس کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا گیا۔ یونانیوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس انتشار کے دوران ترکی افواج نے اناطولیہ پر اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔

متزی کرٹ کی فتح کی وجہ سے ترک ان راستوں پر قابض ہوگئے جن کے ذریعہ یوروپ کے زائرین یروشلم کا سفر کرتے تھے۔ عربوں کے برخلاف ترک مشرقِ وسطی کی پیچیدہ سیاست کو ابھی مکمل طور پر سمجھ نہیں پائے تھے۔ کچھ ترک قبائل نے عیسائی زائرین پر محصول عائد کردیا۔ متزی کرٹ کی شکست سے جو آگ بھڑک رہی تھی۔ اس ٹیکس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ آخرکار 1081ء میں ایک انتہائی دولت مند امیر الیکشیئش کو بازنطینی شہنشاہ نامزد کردیا گیا۔ الیکشیئش ایک انتہائی زیرک سیاستدان تھا وہ مشرق میں سلجوقی علاقوں اور مغرب میں لاطینی صوبوں میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ سلجوقیوں کے درمیان ہونے والی شورش نے بہت جلد صلیبیوں کو اناطولیہ میں کھوئے ہوئے علاقوں کو پھر سے واپس حاصل کرنیکا موقع فراہم کردیا۔

1091ء میں فاطمی قاتلوں کے ہاتھوں نظام الملک کا قتل سلجوقیوں کے لئے بہت بڑا نقصان دہ حادثہ تھا- حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے سے مسلمانوں کا سیاسی نظام یوں بن کے رہ گیا تھا کہ خلیفہ یا امام ایک مرکزی محور کی طرح ہوتا اور عوام اس کے زیرنگران ہوتے۔ ترکوں کے دور میں سیاسی اور فوجی قوت کا مرکز خلفاء کے بجائے سلاطین ہوگئے۔ سلاطین اپنی طرف سے ریاست کے نظم ونسق کو سنبھالنے کے لئے وزیر اعظم کو نامزد کرتے جب بھی ریاست کا سربراہ عقلمند اور منصب کا اہل ہوتا تو ہر طرف امن وامان اور خوش حالی کا دور دورہ ہوتا جب بھی کوئی نا اہل سلطان بن جاتا تو شورشیں برپا ہوجاتیں کچھ سلاطین اور وزراء انتہائی زیرک دانشور تھے، کچھ نااہل تھے اور کچھ تو پرلے درجہ کے بدمعاش تھے-

سلجوقی سلطان ملک شاہ کا وزیراعظم نظام الملک بلاشبہ اسلامی تاریخ کے بہترین منتظمین اور مدبرین میں سے ایک تھا- اس کی قیادت میں سلجوقی سلطنت ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ کئی یونیورسٹیاں

قائم کی گئیں۔علم حاصل کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ حوصلہ افزائی کی جاتی ،طلبہ کو وظیفے دیئے جاتے ،زراعت اور تجارت دونوں ترقی پانے لگے،فوجی حیثیت سے سلجوق اتنے طاقتور تھے کہ انہوں نے شمالی عراق اور شام سے بازنطینیوں کو نکال باہر کیا-950ء سے لے کر 1050ء تک سنی فاطمی جھگڑوں کے دوران بازنطینیوں نے مسلمانوں سے جو علاقے چھین لئے تھے سلجوقیوں نے ان تمام صوبجات پر پھر سے اپنا جھنڈا لہرادیا۔ترکوں نے شام کے اندورنی علاقوں تک گھس کر 1085ء میں یروشلم پر قبضہ کرلیا، یروشلم اس وقت تک بنو فاطمہ کے تسلط میں تھا یروشلم پر 971ء سے لیکر بنو فاطمہ نے پورے سوسال تک حکومت کی تھی-1091ء میں نظام الملک کے قتل اور 1092ء میں سلجوقی شہنشاہ سلطان ملک شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی سلجوقی حکومت کا زوال شروع ہوگیا۔ملک شاہ نے شام کی گورنری اپنے بھائی طوطوش کو سونپی تھی ملک شاہ کے انتقال کے بعد جانشینی کے سوال پر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔پہلے یہ رسہ کشی ملک شاہ کی بیگم ترخان خاتون اور ملک شاہ کے دوسری عورت کے بیٹے برقیارخ کے درمیان ہوئی۔ترخان کے بیٹے کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ترخان خاتون نے رسہ کشی سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور برقیارخ تخت نشین ہوگیا،اس کے خلاف اس کے اپنے چچا طوطوش نے بغاوت کی برقیارخ کو شکست ہوئی اور مارا گیا۔طوطوش کا بیٹا رضوان الیپو صوبہ پر قابض رہا۔آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے درمیان یہی رضوان مسلمانوں کے لئے غدّار ثابت ہوا۔طوطوش کا ایک اور بیٹا دوقاق دمشق کا سربراہ بنارہا۔

سلجوقیوں کے زوال نے قاہرہ کے بنو فاطمہ کو آگے بڑھنے کا ایک اور موقع فراہم کیا۔معزؔ کے دور حکومت کے بعد مصر گیارہویں صدی کے اختتام تک صرف علاقائی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب اس کی طاقت بڑھ کر پورے علاقے کو متاثر کرنے لگی۔مصؔر کی افواج افریقی، بربر مصری اور ترکوں پر مشتمل تھیں یہ فوجی گٹ بندھنوں میں منقسم تھے۔ان کے درمیان آپسی تعلقات انتہائی کشیدہ تھے-1075ء میں وزیر اعظم بدرالجمالی نے اس صورت حال پر مکمل طور سے قابو پالیا اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا الافضل قاہرہ کا وزیر اعظم بنا سلجوقیوں کے زوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الافضل اپنی فوجیوں کے ساتھ شام میں آگے بڑھا اور 1095ء میں یروشلم پر پھر سے قبضہ کرلیا۔بنو فاطمہ کی فوجیں فلسطین اور لبنان کی سرحدوں

تک پہنچ گئیں-1096ء تک غازہ، جفا، عقرہ، اورتریپولی شہر فاطمیہ کے زیرِتسلّط آ گئے۔

بنو فاطمہ اور بنو عباس کے درمیان یہ دراڑ اتنی گہری تھی کہ 1098ء میں جب صلیبی فوجیں سلجوقی علاقوں میں آگے بڑھ رہی تھیں تو بنو فاطمہ ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے انھیں کے ساتھ معاہدہ کرنے میں لگے ہوئے تھے-سلجوقی شام کے دریاؤں کے عقبی علاقوں کے علاوہ عرب اور عراق پر بھی قابض تھے آرمینیائی عدسیہ پر قابض تھے اناطولیہ پانچ مختلف ترک قبائیلیوں کے درمیان منقسم تھا یہ قبائل تھے سلطوقد، منگوشد، دانشمند، روم کے سلجوق اور امارتِ سمرنا، اس طرح مشرقی بحیرۂ روم مقامی امیروں کے لئے شطرنج کی بازی گاہ بن کر رہ گیا تھا جہاں وفاداریاں صبح وشام بدلتی رہتی تھیں اس وقت جبکہ بنو فاطمہ اور سلجوق ایک دوسرے کے گلہ پر تلواریں تانے ہوئے تھے تا کہ امامت یا حقدار کا فیصلہ ہو سکے ٹھیک اسی وقت صلیبی نائیٹ لوہے کی زرہ پہنے گھوڑے پر سوار یروشلم میں درآیا اور اپنا خنجر اسلامی دنیا کے سینہ میں گھونپ دیا-

صلیبی جنگیں صرف مذہب کے لئے ہی نہیں ہوئی تھیں اس میں لوٹ مار کرنا اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کا عنصر بھی بہت حد تک شامل تھا۔ ابتدائی جنگوں کے دوران صلیبیوں نے اسپین میں مسلمانوں کی شان وشوکت ان کے مال ودولت کا مزہ چکھا تھا وہاں ان صلیبیوں نے 1032ء کے بعد آپس میں ہی لڑتے ہوئے مسلمانوں کو خوب لوٹا تھا-1085ء میں طولیدو پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں سے جو خزانے حاصل ہوئے تھے ان خزانوں نے صلیبی جنگجو سرداروں اور ان کی پشت پناہی کرنے والے کلیسا کی بھوک اور بڑھا دی تھی ۔قرونِ اولیٰ کا یوروپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا تھا۔ جادو طلسمات بزرگوں کے آثار کی زیارت وغیرہ ذرائع سے ہی دولت کمائی جا سکتی تھی اس طریقۂ کار سے کمائے جانے والی دولت کا اولین فائدہ کلیسا ہی کو ہوتا تھا کیونکہ تمام زیارت گاہوں اور آثار قدیمہ پر ان ہی کا قبضہ تھا۔ جادوٹونوں سے اور اندھے عقیدوں کے ذریعہ بیماریوں کو دور کرنے کا ڈھونگ رچاتے ہوئے اس دور کے خانقاہوں نے بہت دولت کمائی اور اپنی چاردیواریوں میں دولت کے انبار لگا دیئے۔ مواقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس دور کے بہترین دماغ خانقاہوں میں بھرتی ہونے لگے۔ ان کا مقصد نہ صرف مافوق الفطرت ذرائع کو اپنانا تھا بلکہ اس دور میں دولت مند بننے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ خانقاہوں میں ملازمت اختیار کر لی جائے-

دسویں صدی عیسوی تک کلیسا اس قدر دولت مند بن گیا تھا کہ صرف کلیسا ہی کسی بھی بڑی مہم کے لئے ضروری مال و دولت فراہم کرسکتا تھا چاہے وہ مسلم اسپین کے خلاف جنگ ہو یا یروشلم کے لئے صلیبی جنگ ہو۔ پوپ اربن جو کہ ایک آتش نوا سیاستدان تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یروشلم پر حملہ کرنے سے فوری طور پر کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ''یروشلم کو آزاد کرنے کی جنگ کوئی معمولی جنگ نہیں تھی'' وہ ایک عظیم حملہ تھا جو یورپ کی مافوق الفطرت قوتوں کے اتحاد سے اسراریت کی آخری منزل کو پانے کے لئے کیا گیا۔

صلیبی جنگیں عیسائی اور مسلمان دونوں کی تہذیب اور تمدن کے لئے ایک انقلابی نقطہ تھا صلیبی جنگوں کے دوران ہی یوروپ نے تخیلات اور تصورات کی دنیا کو خیر باد کہا۔ دنیا کو دیکھنے کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کو اپنا یا کلیساء کے حد سے زیادہ بڑھتے ہوئے دائرۂ اثر کو دور کیا اپنے لئے ایک ایسا راستہ اپنایا جو خود غرضانہ تھا دولت کا متلاشی تھا اور کلیساء کے احکام کو رد کرنے والا تھا یوروپ کو اس سے زبردست فوائد حاصل ہوئے۔ علم کے بہاؤ کے ذریعہ فوجی حکمتِ عملی سیکھنے کے ذریعہ انجینئرنگ ٹیکنولوجی اور اسلامی نظریات کو حاصل کرنے کے ذریعہ یہ تمام فوائد صلیبی جنگوں سے یورپ کو حاصل ہوئے۔

مسلمانوں نے یونانی علم کو جو ترقی یافتہ شکل عطا کی تھی اسے جدید خیالات کا جولباس پہنایا تھا علم کا وہ خزانہ سسلی اور طولیدو پر قبضہ کے ذریعہ عیسائیوں کے ہاتھ لگ گیا اسلام کی دانائی اس کے فنون لطیفہ، فن تعمیر کے ساتھ ساتھ ہندوستان سے حاصل کیا گیا علم ریاضی اور چینی ٹیکنولوجی بھی یوروپ کی دسترس میں آ گئیں پہلے اسپین میں پھر فرانس میں ایسے مدارس قائم کئے گئے جہاں عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہونے لگا اب ارسطو کی منطق، پیتھا گروس کا علم ریاضی ابن سینا کی انسائیکلوپیڈیا، الغزالی کا علم الکلام، اسحاق کا سنیات (Optics) اور علم طب، الخوارزمی کی الجبراء یوکلیڈ کا علم ہندسہ اور علم طب ہندوستان کا علمِ فلکیات اور علمِ عدد چینی برتن اور ریشم بنانے کی ٹیکنولوجی اب بخارا اور بغداد کی طرح پیرس اور روم میں بھی دستیاب تھی۔ مقبوضہ شہروں سے بے انتہاء دولت بھی ان کے ہاتھ آئی ایشیاء کے ساتھ تجارت کے راستے کھل گئے مشرق میں تیار ہونے والی بہترین اور لطیف کاریگری کے اشیاء یوروپ کے دلوں کو لبھانے لگی اٹلی کے ساحل پر وینس، فلورنس اور جنیوا جیسے خوشحال شہر آباد ہونے لگے۔

جب تہذیب وتمدن کو رخ بخشنے والے زاویۂ نگاہ اور طریقۂ کار بدلتے ہیں تو تہذیبیں بھی مائل بہ تبدیل ہوتی ہیں- یہ ممکن ہے کہ ان تہذیبوں کے ارتقاء کے دوران پیش آنے والے ان واقعات کی نشاندھی کی جاسکے جو کہ تہذیبوں اور تمدنوں کو ایک نیا موڑ یا جہت عطا کرنے میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔اکثر اوقات تہذیب وتمدنوں کے رخ میں ایسی تبدیلی انتہائی لطیف ہوتی ہے۔ایک نرم رو دریا کے موڑ کی طرح ایک طویل عرصہ میں دھیرے دھیرے رخ کی تبدیلی ظہور پذیر ہونے والے دریا کی طرح حالات کی اس تبدیلی کے دوران جو بھی واقعات پیش آتے ہیں ان واقعات کے دوران جو حالات اور معاون تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں ان کے پس منظر میں کچھ چھوٹے موٹے ہیرو بھی ابھرتے ہیں اور کچھ ان جانے بدمعاش بھی بسا اوقات معمولی حیثیت کی شخصیات بھی، انسانی معاملات میں اسی قدر فیصلہ کن ثابت ہوتی ہیں جس قدر کہ وہ عظیم شخصیات جن کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھتی ہے-

صلیبی جنگوں نے ایک ایسے انسان کی تخلیق کی جو اندرونی طور پر غدار اور دولت پسند جس کا جھکاؤ اللہ تعالیٰ کی ذات سے زیادہ سونے چاندی کی جانب تھا- ان تین سو سالوں کو کھنگالا جائے جب کہ یوروپ نے اپنے آپ کو مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ پر مسلط کر رکھا تھا تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان صلیبیوں میں سب سے اہم ترین شخصیت کس کی تھی۔ یہ شخصیت نہ تو انگلینڈ کے بادشاہ رچرڈ کی تھی اور نہ ہی پوپ اربن دوم کی جس نے پہلی صلیبی جنگ کے لئے تبلیغ کی لاطینی مغرب کی تہذیب کو بنیادی اور یکسر تبدیلی دینے والا شخص تھا ایک عمر رسیدہ اطالوی جسکا نام تھا ڈون ڈولواسی اس نے صلیبیوں کے مرکز نگاہ کو مقدس صلیب سے ہٹا کر قسطنطنیہ کے سونے چاندی اور دولت کے ڈھیروں کی جانب مرکوز کیا- چوتھی صلیبی جنگ کے دوران 1204ء میں اس نے یوروپ کے امراء اور جنگجو صلیبیوں کو سمجھایا کہ اس سرنگ کے آخری سرے میں یقیناً روشنی موجود ہے۔ یہ روشنی مقدس صلیب کی نہیں بلکہ بازنطینی دور کے جمع شدہ عظیم خزانہ کی ہے۔جدید مادہ پرست تہذیب کے بیج انہی صلیبی جنگوں کے دوران بوئے گئے اور ڈون ڈولواسی کو ہی اس موجودہ دور کی مادہ پرست تہذیب کا صحیح طور پر باوا آدم قرار دیا جاسکتا ہے-

ان جنگوں سے مسلمانوں کو سوائے آنسو اور دکھ درد کے رنج والم کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔یوروپ کے پاس

اسلامی تہذیب کو دینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا اسلامی تہذیب تو ترقی کے میدان میں یوروپی تمدن سے صدیوں آگے تھی لیکن ان صلیبی جنگوں نے اسلامی دنیا کی اندرونی متحرک طاقتوں کو ضرور متاثر کیا۔ انہی کی وجہ سے قاہرہ میں بنو فاطمہ کی حکومت جلد از جلد روبہ زوال ہوئی اور فوجی طاقت کا محور ترک بنے۔ اس دور کے دوسرے مسالک کے مقابلے میں سنی مسلک نے غلبہ حاصل کیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے اسپین سسلی اور سارڈینیا نکل گئے لیکن یروشلم پر انہوں نے اپنا قبضہ برقرار رکھا یہاں یہ یادداشت ضروری ہے کہ 1219ء لے کر 1261ء تک ہونے والے منگولوں کے حملے اور اگلی صلیبی جنگیں دونوں بیک وقت ایک ہی ساتھ ہوئیں۔

منگولوں اور صلیبیوں کے بیک وقت حملوں کا شکار اسلام اب اپنے باطن کی جانب راغب ہوا۔ الغزالی (انتقال 1111ء) نے پہلی بار کٹر پرست اسلام کے چوکھٹے میں صوفیانہ خیالات کی تخم ریزی کی۔ جب صلیبی جنگیں ختم ہوئیں اور عالم اسلام منگولوں کے حملوں سے کامیاب وکامران ابھرا تو پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیاء، جنوب مشرقی یوروپ اور جنوبی مغربی افریقہ میں اسلام پھیلتا گیا۔ یہ اسلام روحانیت پرست اور باطن کی طرف دیکھنے والا اسلام تھا۔ جس کی ظاہری ہیئت اس کلاسیکی اسلامی تہذیب سے الگ تھی جو کہ 665ء تا 1258ء تک برقرار رہی اور زیادہ تر علمی تجربی اور انتہاء پسندی سے دور تھی۔

انیسواں باب

یروشلم پر صلیبیوں کا قبضہ

اسلامی تاریخ میں شیعہ اور سنی نظریات کی ٹکر سے جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اس کی قیمت مسلمانوں کو یروشلم کو اپنے ہاتھ سے کھونے کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ صلیبی جنگیں جن کی ابتداء 996ء میں ہوئی یہ بین البراعظم حملے تھے جو اسپین سے لے کر فلسطین تک تین ہزار میل طویل سرحدوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس دور میں عالم اسلام کی مجموعی طاقت تین الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ترک بغداد کے بنو عباس کا پرچم تھامے ہوئے تھے۔ قاہرہ کے بنو فاطمہ شمالی افریقہ اور شام کو اپنے زیر نگیں رکھے ہوئے تھے، قرطبہ سے بنو امیہ اسپین پر حکومت کر رہے تھے۔

اسی دوران یورپ اور ایشیاء میں ایسی طاقتور قوتیں روبہ عمل تھیں جو حالات کا رخ موڑ سکتی تھیں۔ 1000ء تک جرمن باشندے مکمل طور سے عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ سویڈن کے وائکنگ باشندے وائیکنگ بحری قزاقوں کی حیثیت سے دوسو سالوں تک یورپ کو تباہ و تاراج کرتے رہے، وہ بھی جرمنیوں کے نقشِ قدم پر چل نکلے۔ جرمن قوم کے قبول عیسائیت سے یورپ کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا- 1020ء تک مسلمانوں کو جنوبی فرانس اور سوئٹزر لینڈ کے پہاڑی دروں سے نکال دیا گیا 1016ء میں جزیرہ سارڈینیا بھی مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا۔ پالرمو بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ 1091ء تک سارا سسلی قبضہ سے چلا گیا۔ اسپین میں بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ عیسائیوں کے لئے ایک چیلنج بھی تھا اور ایک کھلی دعوت بھی اسپین کے امراء آپس میں دست بہ گریباں تھے اور یکے بعد دیگرے عیسائی حملہ آروں کا شکار

ہوتے گئے- 1085ء میں وسی گوتھ کا صدر مقام طولیدہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ 1087ء میں بنو فاطمہ کا پرانا صدر مقام مہدیہ، جدید تیونیسہ، روند ڈالا گیا- 1090ء پر مالٹا پر صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا جس کی وجہ سے عیسائیوں کو شام اور فلسطین پر حملہ کرنے کے لئے ایک اڈہ مل گیا-

جب یوروپ بحیرۂ روم کے شمالی ساحلی علاقوں پر اپنی گرفت قائم رکھنے اور تاریک دور سے ابھرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ اسی وقت مسلمانوں کے تینوں دھڑے خلافت کے حصول کے لئے کھلے عام آپس میں جنگوں میں مشغول تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی کے دوران بنو فاطمہ مکمل طور سے محاذ آرائی میں مشغول رہے۔ انہوں نے ادھر مغرب میں اسپین کے بنوامیہ کے خلاف معرکہ آرائی جاری رکھی تھی تو ادھر مشرق میں شام کے ترکوں کے خلاف بھی بنو فاطمہ کی یورشیں ہوتی رہیں- 1057 میں جب سنی آبادیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا تو فاطمیوں نے انتقاماً سارے شمالی افریقہ کو تاخت وتاراج کردیا اور قیروان جو کہ اس زمانہ میں علم کا گہوارہ تھا اسے بھی برباد کردیا اس تباہ کن حملے کی وجہ سے الجیریا اور مراقش دوسو سالوں تک سے پھر سر اٹھا نہ سکے۔ 1077ء میں فدائی تحریک کا بانی حسن الصباح قاہرہ آیا اور اس نے بنو فاطمیہ کے دربار سے ایک خفیہ معاہدہ کیا- 1090ء میں حسن الصباح نے شمالی شام کے الاموت علاقہ پر قبضہ کیا اور اس مقام کو اپنی طرز کے فدائین کی تربیت گاہ کے طور پر استعمال کرنے لگا 1091ء میں ان قاتلوں نے سلجوقیہ کے وزیراعظم نظام الملک کو قتل کردیا۔ اس کے فوراً بعد 1092ء میں سلطان ملک شاہ کا انتقال ہوگیا۔ بنو فاطمہ نے سلجوقیوں کے اس انتشار کا فائدہ اٹھایا اور 1095ء میں یروشلم پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ جسے وہ دس سال پہلے ترکوں کے ہاتھوں کھو چکے تھے۔ مسلمان بٹ چکے تھے۔ بنو فاطمہ، بنوامیہ اور ترکوں کے درمیان وراثت کے لئے جھگڑے ہورہے تھے صلیبیوں کے پوپ اربن کے لئے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس کی کوشش اول تو یہ تھی کہ قسطنطنیہ کے کلیساء اور رومن کلیساء کے درمیانی اختلافات جو 1032ء میں شروع ہوئے تھے ان کو ختم کرے-

دوسرے یہ کہ مقدس صلیب اور مقدس تبرکات کو مسلمانوں سے پھر واپس حاصل کرسکے۔ 1095ء میں ایک جذباتی تقریر کے ذریعہ پوپ نے پہلی صلیبی جنگ کا اعلان کیا۔ پوپ ایک زیرک، سیاستدان اور بہترین مقرر تھا اس نے سارے جنوبی فرانس کا دورہ کیا لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا مقدس صلیب کی قسم کھلائی

اورانہیں یروشلم پرحملہ کرنے پراکسایااس کے بدلےاس نے وعدہ کیا کہ ان کوتمام گناہوں کی معافی مل جائی گی۔ان کے تمام قرضہ جات معاف کردیئے جائیں گے اور انہیں یقینی طور پر جنت بھی نصیب ہوگی۔ سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا بےشمار کاونٹ نائیٹ کسان اور کاریگر یروشلم کی جانب اس کوچ میں شامل ہوگئے۔یوں توصلیبی جنگیں ایک تربیت یافتہ فوج کے ذریعہ نہایت سوچے سمجھے حملے نہ تھے بلکہ یہ ایک عوامی تحریک تھی۔ابن خلدون کے مطابق پہلی صلیبی جنگ میں تقریباً نولاکھ افراد نے حصہ لیا۔ انسانوں کےاس ہمہ گیر شراکت نےصلیبی جنگوں کےفوجی طرزعمل پر بھی خاصہ فیصلہ کن اثر ڈالا ہے۔

صلیبی دومقامات پرجمع ہوئے اور وہاں سے آگے بڑھے ایک مقام تھا پیرس کےقریب بلوئیس اور دوسرا جرمنی میں کولون جنوب کا مجموعہ اٹلی کے ذریعہ گذرتا ہوا راہ میں اور زیادہ نوآموز افراد کواپنے جلو میں لیتا ہوا آگے بڑھا وینس کے لوگوں نے اس افرادی قوت کواٹلی کی ساحلوں سے بلقان کے ساحلوں تک اپنے جہازوں کے ذریعہ پہنچایا یہاں سے وہ قسطنطنیہ کی طرف آگے بڑھا شمال میں جمع ہونے والا گروہ ڈینوب کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے ہنگری کی زمین کو پار کرتا ہوا نیچے کی جانب آگے بڑھا بازنطینی شہنشاہ الیکٹیس آگے کی جانب کوچ کرتے ہوئے ان صلیبی عوام کی دیوانگی سے اچھی طرح واقف تھا اسی لئے اس نے دونوں گروہوں کواپنے صدر مقام سے دور ہی رکھا۔فوجیوں،کسانوں،دستکاروں اور مہم پسند افراد کا یہ جم غفیر قسطنطنیہ سے ہوتا ہوا اناطولیہ کی طرف بڑھا۔

صلیبی جنگوں کا سب سے تعجب خیز پہلو یہ ہے کہ ترکوں اور عربوں نے کوچ کرتے ہوئے ان صلیبیوں کا آگے بڑھ کر مقابلہ نہیں کیا،سلجوقیوں نے گذشتہ صدی میں اناطولیہ کے سطح مرتفع پر قبضہ کیا تھا لیکن اس کی چراگاہوں پر ابھی تک اپنی گرفت مضبوط نہیں کر سکے تھے اس سارے علاقہ کا دفاع زیادہ مضبوط نہیں تھا اس حملہ کے لئے وہ تیار نہیں تھے سلجوقیوں کے علاقے میں نکائیہ کے مقام پر پہلی جنگ ہوئی-1098ء میں ترکوں کی فوجی صلاحیت ان کے برق رفتار جھپٹنے والے گھوڑ سوار دستوں اور تیز رفتاری سے فوجوں کے تعین اور گھیر لینے کی صلاحیت پر منحصر تھی لیکن اس دیوانگی سے بھرپور مجموعے کے سامنے وقت پر وہ اپنی ان صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کر سکے-یوروپ والوں کے مقابلے میں وہ اپنی تیز رفتاری کا استعمال نہ کر سکے۔انھیں کوئی فائدہ

مند موقع بھی نہ ملا۔ میدان جنگ صلیبیوں کا رہا۔ سلجوقیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس شکست سے مقامی یونانی اور آرمینائی باشندوں کو مختلف شہروں کی فوجی چھاونیوں میں موجود ترکی فوجوں کے خلاف بغاوت کرنے کا موقع ملا۔ ایک ہی مہینے میں دوریلوم جو کہ جدید انقرہ کے قریب واقع ہے، ہاتھ سے نکل گیا۔ شمالی شام کے شہر انٹیوک پر بھی ایک مخبر کی دھوکہ دہی کی وجہ سے صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا۔ انٹیوک سے صلیبی گروہ دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہوگیا، ایک حصہ لبنان کی ساحلوں کی جانب آگے بڑھا۔ یہ علاقہ بنوفاطمہ کے قبضے میں تھا یہاں انہیں کسی بھی مزاحمت کا سامنا نہیں ہوا۔ دوسرا حصہ مشرقی لبنان، جس پر ترکی امیر قابض تھے سے ہوتا ہوا حمص کی جانب بڑھا۔ اس راہ میں صرف ہلکی سی مزاحمت ہوئی۔

ایسے وقت جبکہ حملہ آور فوجیں اناطولیہ میں آگے بڑھ رہی تھیں قاہرہ میں بنوفاطمہ صلیبیوں کے ساتھ مفتوح شدہ علاقوں کی آپسی تقسیم کے بارے میں بات چیت میں مشغول تھے 1092ء میں ملک شاہ کی وفات کے ساتھ ہی بنوفاطمہ نے دیکھا کہ فلسطین اور شام کے ان علاقوں کو واپس حاصل کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا ہے۔ جنہیں ترکوں نے ان سے چھین لیا تھا۔ بازنطینی جو اس علاقے کی پیچدہ سیاست کے درمیان صلیبیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ مسلمانون کی اپنی آپسی چپقلش سے خوب واقف تھے۔ 1097ء میں صلیبیوں نے قاہرہ کو ایک وفد بھیجا تاکہ سمجھوتے کی شرائط پر بات چیت ہو سکے۔ فروری 1098ء میں بمقام انٹیوک ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے جس کے تحت بنوفاطمہ کو طائرے اور صیدوں پر قبضہ مل گیا۔ لیکن 1099ء میں یروشلم کے مسئلہ پر بات چیت ٹوٹ گئی۔ لاطینیوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یروشلم کے دفاع کے لئے ضروری فوج تیار کرنے کے لئے قاہرہ کو دو ماہ کا وقت چاہئے۔ اسی لئے وہ اس شہر کی جانب جلدی جلدی بڑھنے لگے۔ 1095ء میں سلجوقیوں سے یروشلم چھین لینے کے بعد بنوفاطمہ نے اس شہر کی حفاظت کا کچھ زیادہ مضبوط انتظام نہیں کیا تھا۔ اس وقت صرف پانچ ہزار فوجیوں پر مشتمل فوج کی ایک ٹکڑی معمولی طور پر اس کی دفاع پر مامور تھی۔ بنوفاطمہ کو لاطینیوں کے ساتھ معاہدہ ہوجانے کا اس قدر بھروسہ تھا کہ انہوں نے اس چھوٹی سے فوج کے لئے کمک بھیجنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ شہر کے اندر تعنیات اپنے جاسوسوں کے ذریعہ ملنے والی اطلاعات کے مطابق صلیبیوں کو اس کمزوری کی مکمل جانکاری حاصل تھی۔ دس جون

1099ء کو یروشلم کی جنگ شروع ہوئی۔ صلیبی نقارہ بجاتے ہوئے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے ان کا عقیدہ تھا کہ صلیبی نعروں سے شہر کی دیواریں گر پڑیں گی۔ جب ایسا نہ ہوا تو قلعہ پر جارحانہ حملہ شروع ہوگیا۔ ابتدائی حملے ناکام ثابت ہوئے اس لئے کہ لاطینیوں کو جنگ کی انجنوں کی ٹکنالوجی کا علم نہیں تھا۔ لیکن جلد ہی قسطنطنیہ اور وینیس سے اس شعبہ کی امداد آ گئی جون کی سترہ تاریخ کو وینس سے بحری جہازوں کا ایک بیڑہ تازہ دم فوج لکڑی کے ستون اور تربیت یافتہ بازنطینی انجینئروں کے ساتھ جفہ آ پہنچا۔ یہ انجینئر قلعہ شکن گرز بنانے، قلعہ پر پشتہ بنانے اور پتھر پھینکنے کے بڑے غلیل تیار کرنے میں ماہر تھے۔ فنی معلومات کی فراہمی اور تازہ دم کمک نے محاصرہ کا رخ بدل دیا۔ مضبوط پشتے تعمیر ہوگئے۔ اور حملہ شروع ہوگیا۔

پندرہ جولائی 1099ء میں یروشلم پر صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا۔ الفلانسی رقم طراز ہے:

"وہ صلیبی رجب کے آخر میں یروشلم کی جانب بڑھے ان کے آنے سے پہلے ہی لوگ اپنے گھروں سے نکل بھاگے صلیبی سب سے پہلے رملہ میں گھسے اطراف کی کھڑی فصلوں کو برباد کیا۔ یہاں سے انہوں نے یروشلم کی طرف کوچ کیا۔ وہاں کے باشندوں سے مقابلہ شروع ہوا۔ انہیں چاروں جانب سے محصور کرلیا گیا۔ شہر پر حملے کے لئے ایک بلند ر مینارہ تعمیر ہوا اور اسے فیصل کے سامنے لایا گیا۔ اسی دوران انہیں خبر ملی کہ قاہرہ میں بنو فاطمہ کا وزیراعظم الاوضال ایک زبردست فوج کے ساتھ مصر سے نکل کر میدان جنگ کی جانب بڑھ رہا ہے۔ تاکہ ان کے خلاف جہاد کر کے انہیں تباہ کردے اور شہر کی حفاظت کرے اس خبر کے سنتے ہی صلیبیوں نے اور زیادہ جوش وخروش سے شہر پر حملہ کیا اور اندھیرا ہونے تک جنگ کرتے رہے۔ شام ہوتے ہی واپس ہوئے، شہر کے مکینوں کو خبردار کیا کہ دوسرے دن پھر ان پر حملہ ہوگا۔ رات کے اندھیرے میں شہر کے باشندے قلعہ کی دیواروں سے اترنے لگے۔ یہ دیکھ کر فرینک نے حملہ دوبارہ شروع کیا۔ آخرکار شہر کی فصیل کے ایک حصہ پر قدم جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ دفاع کرنے والے سپاہیوں کو وہاں سے مار بھگایا، شہر پر طوفانی انداز سے حملہ کیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ شہر کے بے شمار باشندوں نے حرم شریف میں پناہ لی جہاں انہیں قتل کر دیا گیا۔ کئی یہودیوں نے ہیکل اعظم میں پناہ لی۔ صلیبیوں نے اس سارے عبادت خانے کو پناہ گزینوں سمیت جلا کر خاک کر ڈالا۔ شعبان کی بائیس تاریخ کو بیت المقدس ان کے حوالے کر دیا گیا۔

لیکن صلیبیوں نے یہاں کے عبادت گاہوں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقبرہ کو تباہ وتاراج کر دیا۔ ابن کثیر کے مطابق صلیبیوں نے صرف یروشلم میں ہی ستر ہزار مسلمانوں اور یہودیوں کا قتل عام کیا۔ چند چھوٹے چھوٹے دفاعی شہروں اور دیہاتی آبادی پر مشتمل فلسطین کے جغرافیائی حالات کے مدِّ نظر قتل عام کی روداد صحیح ثابت ہوتی ہے۔ جب کبھی کسی علاقہ پر حملے ہوتے چھوٹی چھوٹی آبادیاں سمٹ کر قریبی قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتیں جس کی وجہ سے ان قلعہ بند آبادیوں میں بھاری اضافہ ہو جاتا۔ صلیبیوں نے حرمِ شریف کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور مسجد اقصیٰ کو ان کے اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنالیا۔

قاہرہ کے وزیر اعظم الافضال نے جب یروشلم کی شکست کی خبر سنی تو وہ جلد از جلد آگے بڑھنے لگا تا کہ شہر پر دوبارہ قبضہ کیا جا سکے مصر اب ایک مضبوط فوجی طاقت نہ تھا۔ معنیر کے دور میں جو فوجی طاقت اس کی تھی اس میں بہت کمی آ گئی تھی لیکن اس قدر بھی نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے ابتداءً پانچ ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ جو فوج کا کوچ شروع ہوا تو بڑھتے بڑھتے اس میں دس ہزار انفنٹری فوج کے علاوہ ہزاروں رضا کار جوق در جوق اس میں شامل ہو گئے۔ یہ فوج آبنائے سینائی تک کوچ کرتے ہوئے آئی اور غازہ کے قریب عسقلان کے مقام پر رک کر مزید کمک کا انتظار کرنے لگی جو بری راستوں سے آنے والی تھی عسقلان یروشلم سے پہلے بنو فاطمہ کا آخری مضبوط گڑھ تھا اس فوج کی آنے کی خبر لاطینی کیمپ تک پہنچی تو صلیبی جنگجو مصریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جنوب کی جانب آگے بڑھے اس نازک موقع پر الافضال کی عقل نے جواب دے دیا 12 / اگست 1099ء کو الافضال کے ڈیروں پر چھاپہ پڑا۔ مصریوں کی مضبوط فوج کے سامنے کوئی راستہ نہ بچا تھا فوج کو شکست ہوگئی الافضال اپنے چند محافظوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگا۔

یروشلم کی فتح کے بعد اس شہر پر حکومت کرنے کے معاملے پر لاطینی جنگجوؤں کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ جس کلیساء نے اس ساری مہم کا لائحہ عمل تیار کیا تھا اسی کلیساء نے اس نازک لمحہ میں دست اندازی کی اس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ ساری فتح پر کہیں پانی نہ پھر جائے صلیبی کسی مرکزی اقتدار سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے مفتوح علاقوں پر اسی نظامِ حکومت کو لاگو کیا جس سے وہ واقف تھے یعنی جاگیرداری نظام اور بالڈون کو یروشلم کے بادشاہ کی حیثیت سے نامزد کیا۔

بیسواں باب

صلاح الدین ایوبی اور جنگ حطین

صلاح الدین ایوبی اور جنگ حطین

آپس میں بکھری ہوئی اسلامی دنیا صلیبیوں کی مدافعت نہ کرسکی۔ صلیبوں نے بحیرہ روم کے مشرق علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کی اور وہاں جاگیردارانہ نظام کو لاگو کیا۔ سلجوقی افغانستان کے غزنوی اپنے مشرقی سرحدوں کی حفاظت میں مشغول تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنی مغربی سرحدوں پر بہت کم ہی فوج تعینات کر رکھی تھی۔ آمو دریا کے اس پار بسنے والے ترکی قبائل شمال مشرقی سرحدوں کے لئے مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ آگے بڑھنے والے صلیبوں کو مقامی طور پر کٹر پرست کلیساء اور آرمینی اقوام کی جانب سے قیمتی امداد ملتی رہی۔ وینس والوں نے سفری سہولیات مہیا کیں۔ ان کے مسلسل حملوں سے ۱۱۰۹ء میں تری پولی بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ ۱۱۱۰ء میں بیروت پر دشمن کا قبضہ ہوگیا ۱۱۱۱ء میں الپو کا محاصرہ ہوگیا۔ ۱۱۲۴ء میں "طائر" بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ خانہ جنگی میں الجھی مسلم دنیا نے صلیبوں کے حملوں پر سنجیدگی سے غور نہ کیا۔ انہوں نے عیسائیوں کے متعلق یہ سمجھا کہ یہ بھی ان امیروں کے ایک گروہ کلیساء کے اسقفوف یا مذہبی دھڑوں کی طرح ہیں جو کہ مشرق وسطی میں اقتدار کی بازی گاہ میں اپنا اپنا داؤ چلا رہے تھے

اس دوران مصر کی اندرونی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی فاطمی خلفاء کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگ دوڑ بہت پہلے ہی نکل گئی تھی اور درباری وزیر اقتدار کے دلاّل بنے ہوئے تھے صلیبیوں کے ہاتھوں مصری فوج کی کراری شکست اور یروشلم کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وزیر اعظم "الافضال" پھر سے فوج کی از سر نو تنظیم کرتا اور کھوئے ہوئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کرتا لیکن

وہ بھی قاہرہ کہ اقتدار کے ایوان میں جاری سیاسی بازیگری کے کھیل میں شامل ہوگیا ۱۱۰۱ء میں معمر خلیفہ موسیٰ کا انتقال ہوگیا تو الافضال نے خلیفہ کے کمسن لڑکے ابوعلی کو تخت پر بٹھایا اور بذات خود مصر کے سیاہ سفید کا مالک بن گیا لیکن یہ بات ابوعلی کو پسند نہیں آئی جب وہ بالغ ہوا تو اس نے الافضال کو مروا دیا ۱۱۲۱ء میں خود ابوعلی کا قتل ہوگیا۔

مصر میں طوائف الملو کی پھیل گئی۔ ابوعلی کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس کا چچرا بھائی ابومیمون خلیفہ بنا ۔لیکن اس کے اپنے وزیر احمد نے اسے معزول کر کے قید کر دیا۔ ابومیمون نے قید خانے میں سازش رچائی اور احمد کو مرواڈالا۔ ابومیمون کے بعد اس کا بیٹا ابومنصور تخت کا وارث ہوا۔ ابومنصور حکومت سے زیادہ شراب اور عورت کا رسیا تھا اس کا وزیر ابن سالار حکومت کا نظام چلاتا رہا لیکن اس کے سوتیلے بیٹے عباس نے اسے مروادیا اور خود وزیر بن بیٹھا-

قاہرہ کے بنوفاطمی بادشاہوں کے ہاتھ اقتدار کی باگ دوڑ نہ تھی وہ تو وزیروں کے ہاتھ کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ وزارت کی کرسی وہی ہڑپ لینا جو انتہائی ظالم اور طاقت ور ہوتا۔ ۱۱۵۴ء میں وزیر اعظم عباس کے بیٹے نصر نے خلیفہ ابومنصور کو قتل کر دیا۔ ابومنصور کی بہنوں کو قتل کی اس سازش کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے بالائے مصر کے گورنر رزق سے مدد کرنے اور نصر کو سزا دینے کی درخواست کی اور فلسطین کے فرانکون سے بھی مدد کی درخواست کی نصر جان بچا کر بھاگا لیکن فرانکوں نے اسے گرفتار کر قاہرہ واپس بھیج دیا جہاں اسے صلیب پر میخوں کے ذریعہ ٹھونک دیا گیا۔

مصر اس پکے ہوئے پھل کی مانند تھا جو توڑے جانے کے لئے تیار ہو صلیبوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مصر پر قبضہ کرنے کا مطلب ہے عالم اسلام پر کاری ضرب لگانا مقامی مورونائٹ اور آرمینی قومیں اسی منصوبے کا استقبال کرنے کے لئے تیار تھیں۔ مصر کے ذریعہ وہ ایتھوپیا کے عیسائیوں کی طرف جانے والی موصلاتی راہ کو کھول سکتے تھے جہاں سے ہندوستان کے ساتھ تجارتی روابط قائم ہو سکتے تھے۔ صلیبیوں نے مصر پر کئی حملے کئے ۱۱۱۸ء میں دمیطا پر قبضہ کرلیا۔ شہر کو تاخت وتاراج کرتے ہوئے قاہرہ کی جانب بڑھنے لگے۔ مصریوں نے ان حملہ آوروں کو پسپا کر دیا لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ فلسطین کا دفاع نہ کر سکے

۔فلسطین میں بنو فاطمہ کا آخری مضبوط گڑھ عسقلان ۱۱۵۳ء میں حملہ آوروں کے قبضہ میں چلا گیا۔

ادھر بنو فاطمہ انتشار کا شکار تھے تو ادھر سلجوقی غزنویوں کے حملوں اور ترکی قرہ قطائی قبائل کی یورشوں میں الجھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے تقریباً ایک صدی تک یروشلم پر صلیبیوں کا قبضہ برقرار رہا۔ آخرکار یوروپ والوں سے یروشلم کے دفاع کی ذمہ داری اناطولیہ اور شمالی عراق والوں کے کندھوں پر آن پڑی۔ آج اس علاقہ کو ترکی، عراق، شام اور ایران کے کرد (KURD) صوبہ جات کہا جاتا ہے۔ موصل کے ایک سلجوقی عہدہ دار مودود نے سب سے پہلے اس للکار پر لبیک کہا۔ ۱۱۱۳ء میں اس نے یروشلم کے بادشاہ بالڈون کو کئی معرکوں میں شکست دی۔ لیکن بنو ناطہ کے کرائے کے قاتلوں نے ۱۱۲۷ء میں ودود کا قتل کر دیا۔ ایک اور ترکی سردار زینگی نے مودود کے ادھورے کام کو سرانجام دینے کا بیڑہ اڈھایا۔ زینگی ایک بہترین سپاہی ہونے کے علاوہ حق پرست، انصاف پسند اور خداترس شخص تھا۔ زینگی نے عدیسہ شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس کی وجہ سے ایک نئی صلیبی جنگ چھڑ گئی جس میں جرمنی کے کونارڈ اور فرانس کے برنارڈ نے حصہ لیا۔ زینگی نے حملہ آوروں پر کاری ضرب لگائی اور حملہ آور جرمن و فرانسیسی فوجوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ لیکن اسی دوران اچانک نمودار ہونے والے دو واقعات نے یروشلم سے فرانکوں کو نکال باہر کرنے کے عمل کو فی الحال ٹال دیا۔ ۱۱۱۴ء میں ملحد ترکمان قرہ قطائی کے ہاتھوں دریائے آمو کے کنارے سلجوقیوں نے زبردست شکست کھائی۔ ۱۱۴۶ء میں بنو فاطمہ کے کرائے کے قاتل زینگی کو بھی قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

زینگی کے فرزند نورالدین نے اور زیادہ جوش و خروش سے اپنے باپ کے ادھورے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ مشرق وسطیٰ سے صلیبوں کو نکال باہر کرنے کے لئے نورالدین نے ایک منصوبہ بند جدوجہد شروع کی۔ نورالدین ایک خداترس، غیر متعصب اور اعلیٰ نسبی و شریف اقدار کا حامل شخص تھا اس غیر معین فوجی صورت حال کی وجہ لائق اشخاص کے لئے اچھے مواقع حاصل تھے اور غیر ترکی افراد انتہائی تیزی کے ساتھ ترقی کی سیڑھیاں پھلانگتے چلے گئے۔ ان میں دو عہدہ دار انتہائی نمایاں تھے ایک تھا صلاح الدین دوسرا تھا شیرکوہ جو کہ صلاح الدین کا چچا تھا۔ نورالدین کے عہدہ داروں نے منصوبہ بند طریقہ سے تمام شمالی عراق مشرق شام اور مشرقی اناطولیہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۱۵۴ء میں دمشق ان

کے ماتحت آ گیا۔ ایک وسیع علاقے پر قابض ہونے کے ناطے اس کے ہاتھ زبردست وسائل آ گئے نورالدین اب فلسطین کے صلیبیوں اور مصر کے بنو فاطموں سے ٹکر لے سکتا تھا۔

فلسطین کی مملکت مصر میں تھی جب تک بنو فاطمہ مصر میں برسر اقتدار تھے اس وقت تک صلیبوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنا ناممکن تھا۔مصر پر فتح حاصل کرنا انتہائی ضروری تھا۔۱۱۶۵ء کے دوران مصر میں وزیروں کے دو مخالف گروہ تھے ان میں ایک نے فرانکوں کو مصر کے معاملات میں دخل اندازی کی دعوت دی دوسرے نے نورالدین سے مدد کی درخواست کی نورالدین نے فوراً شیرکوہ کو مصر بھیج دیا ۱۱۶۵ء میں فرانک اور سلجوقی دونوں مصر میں ایک ساتھ نمودار ہوئے لیکن دونوں ہی اپنا ٹھوس رسوخ قائم کرنے میں ناکام رہے دو سال بعد ایک بار پھر شیرکوہ اپنے بھتیجے صلاح الدین کے ساتھ مصر میں داخل ہوا۔اس بار وہ دریائے نیل کے دہانے پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔بنو فاطمہ کا آخری خلیفہ مستعدی شیرکوہ کو اپنا وزیر اعظم نامزد کرنے پر مجبور ہو گیا ۱۱۶۹ء میں شیرکوہ کی وفات ہوگئی اور اس کی جگہ صلاح الدین وزیر مقرر رہوا۔

صلاح الدین وہ عظیم شخصیت تھی جس کا انتظار زمانے کو تھا اسنے مصر پر ہونے والے صلیبیوں کے پے در پے حملوں کا مقابلہ کامیابی سے کیا فوج کی اندرونی بغاوت کو فرو کیا اور مصر کو خانہ جنگیوں سے نجات دلا کر سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔بنو فاطمہ کی تین سو سالہ دور حکومت کے باوجود مصری سنی مسلک کے پیرو کار ہی رہے ۱۱۷۱ء میں صلاح الدین نے بنو فاطمہ کی خلافت کو ختم کر دیا۔خطبات میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا یہ تاریخ ساز تبدیلی اس قدر پرامن طریقہ سے عمل آئی کہ بنو فاطمہ کے خلیفہ مستعدی کو اس کا پتہ تک نہ چلا اور وہ چند ہفتوں بعد دار فانی سے کوچ کر گیا۔

ایک زمانہ میں بنو فاطمہ اس قدر طاقتور تھے ان کی حکومت اس قدر وسیع تھی کہ آدھی اسلامی دنیا ان کے زیر فرمان تھی مکہ مدینہ، یروشلم پر بھی ان کا اقتدار اعلیٰ تھا۔یہی بنو فاطمہ اب تاریخ میں گم ہو گئے سنی مسلک سے مزین تاریخ جس کے چمپئین ترک تھے وجود میں آئی فاطمیت کے خاتمہ کے ساتھ ہی سنی مسلم دنیا نے حملہ آور صلیبیوں کے خلاف کمر کس لی۔

مورخ اکثر اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ آیا انسان تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے یا اس کے حالات اور

ماحول تاریخ کا رخ بدلتے ہیں یہ بحث تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے مرد اور عورت کے عمل اوران کے ماحول کے درمیان ایک نامیاتی رشتہ ہوتا ہے وہ لوگ جو تاریخ ساز لمحات کو تراشتے ہیں وہ اپنی قوت ارادی سے کام لیتے ہیں حالات کے بہاؤ کو اپنی مرضی کی مطابق موڑتے ہیں اور ایسے زرین نقش قدم چھوڑ جاتے ہیں جن پر چلنا دوسروں کے لئے باعث افتخار ہوتا ہے لیکن وہ اسی لئے کامیاب ہوتے ہیں کہ حالات بھی ان کے موافق ہوتے ہیں۔آخر کار وہ تاریخ ساز لمحات آسمانی عنایت سے ہی مربوط ہوتے ہیں ایسا ہوگا یا ہونے والا ہے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا وغیرہ نہیں بلکہ فیصلہ کن تاریخی لمحات آسمان سے طے شدہ ہوتے ہیں۔

صلاح الدین شاید حضرت علیؓ ابن ابوطالب کے بعد سب سے نامور مسلمان فوجی ہے یہ ایک ایسی شخصیت ہے جس نے اپنے آہنی عزم سے تاریخ کو اپنے ہی سانچے میں ڈھال لیا اس کے مشہور ترین کارنامے ہیں شام اور فلسطین سے صلیبیوں کو نکال باہر کرنا اس سے بھی ایک اور اہم بات جسے تاریخ دان عموماً نظرانداز کردیتے ہیں۔وہ یہ ہے کہ اس نے وحدانیت کے پرستار اسلامی سیاسی ڈھانچہ کو فولاد کی طرح مضبوط کیا اسے اندرونی خلفشار سے پاک کیا جس کی وجہ سے کچھ عرصہ تک آنے والی مسلمان نسلوں نے دنیا میں پیش آنے والے تمام واقعات پر اپنے اثرات کی گہری چھاپ چھوڑی۔اس کا ذکر اکثر کم ہی کیا جاتا ہے کہ وہ صلاح الدین کے ہی ہم عصر تھے جنہوں نے نہ صرف یروشلم کو صلیبیوں سے نجات دلائی بلکہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی اور کچھ عرصہ کے لئے اسپین اور شمالی آفریقہ میں صلیبیوں کی فتوحات پر روک لگادی۔

بنوفاطمہ کی خلافت کے خاتمہ کے بعد اور مصر اور شام پر صلاح الدین کی گرفت مضبوط ہوجانے کی وجہ سے مشرقی بحیرہ روم میں طاقت کا توازن بھی مسلمانوں کے حق میں ہوگیا۔عرب اور یمن کے علاوہ شمالی عراق اور اناطولیہ بھی صلاح الدین کے قبضہ میں آگئے اب اس مضبوط طاقت کو صلیبیوں پر آزمانے میں کچھ ہی دیر کی بات تھی۔ایک لاطینی سردار ریناڈ ڈی چیٹلان اس چنگاری کو بھڑکانے کا باعث بنا ریناڈ لبنان اور فلسطین کے ساحلی شہروں کا بادشاہ تھا مشہور مورخ بہاؤالدین لکھتا ہے ”بدلعنتی ریناڈ بہت بڑا کافر اور ہیبت ناک شخص تھا۔اکثر اوقات جب کہ مسلمانوں اور فرانکوں کے درمیان جنگ بندی رہا کرتی تھی۔اس دوران اس نے اپنے

علاقوں سے گذرنے والے مصری قافلوں پر نہایت بیدردی سے حملہ کیا۔ اسے لوٹ لیا کاروان کے لوگوں کو گرفتار کیا۔ انہیں ایذائیں دی گئیں، گڑھوں میں پھینکا گیا یا پھر اندھیری گھٹاؤں پر قید کر دیا گیا جب قیدیوں نے احتجاج کیا اور کہا مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں فریقین جنگ بندی کا معاہدہ ہے اس طرح قیدیوں کو ستانا معاہدہ کی خلاف ورزی کے مترادف ہے تو اس نے طنزیہ کہا ''اپنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارو کہ آ کر تمہیں بچالیں'' صلاح الدین نے جب یہ بات سنی تو عہد کیا کہ وہ اس کافر کو اپنی ہی تلوار سے قتل کرے گا۔

اس دور میں یروشلم کی فرانکیہ سلطنت پر سابق بادشاہ آمورے کی بیٹی سبیلا اور اس کا شوہر گئی ڈی لوسیگنن حکومت کر رہے تھے۔ صلاح الدین نے گئی ڈی لوسیگنن سے کاروان کے لوٹنے کا معاوضہ اور افراد کی باعزت واپسی کا مطالبہ کیا۔ جس کو اس نے ٹھکرا دیا صلاح الدین نے اپنے بیٹے الافضال کو ریناڈ کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ اس کے صدر مقام کرک کا محاصرہ کر لیا گیا۔ جب فرانکیوں تک اس محاصرہ کی خبر پہنچی تو سب متحد ہو کر الافضال کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ دوسری جانب صلاح الدین اپنے بیٹے کی مدد کے لئے آگے بڑھا چار جولائی ۱۱۸۷ء کو دونوں فوجیں طبریٰس جھیل کے ساحل پر حطین کے قریب آپس میں ٹکرائیں صلاح الدین نے اپنی فوجوں کو صلیبیوں اور جھیل کے درمیان صف آرا کیا فرانکیوں نے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ صلاح الدین نے جنگی فراست سے کام لے کر کامیاب چالیں چلتے ہوئے انہیں گھیرے میں لے کر ان کا صفایا کر دیا۔ قیدیوں میں یروشلم کا بادشاہ ڈی لوسیگنن اور ساحلی شہروں کا بدمعاش بادشاہ ریناڈ بھی شامل تھے جو کہ اس معرکہ آرائی کا سبب بنا تھا تریپولی کا ریمنڈ اور طبریس کا ہگ جان بچا کر بھاگنے والے سرداروں میں شامل تھے۔ صلاح الدین نے گئی ڈی لوسیگنن کے ساتھ باعزت برتاؤ روا رکھا لیکن ریناڈ کا سر قلم کر دیا۔

شکست کھا کر بھاگنے والے فرانکن تریپولی کی طرف چلے۔ لیکن صلاح الدین نے انہیں سانس لینے کا موقع نہیں دیا۔ وہ تریپولی پر طوفان کی طرح چھا گیا۔ اس کے بعد عسکرہ کی باری تھی نابلس ، جریکو، رملہ، جفہ اور بیروت نے اپنے دروازے سلطان کے لئے کھول دیئے۔ صلاح الدین نے اب اپنی توجہ یروشلم کی طرف مبذول کی جسے مسلمان القدس کے نام پکارتے ہیں ساٹھ ہزار صلیبی سپاہی اس شہر کی

دفاع پر مامور تھے۔سلطان ناحق خون بہانا نہیں چاہتا تھا۔انہیں پرامن طور سے خودسپردگی کا موقع دیا اس شرط پر کہ مقدس مقامات تک آزادانہ طور سے جانے کے لئے راستے کھول دیئے جائیں۔مقدس مقامات سب کے لئے کھلے رہیں گے۔اس تجویز کوصلیبیوں نے ٹھکرادیا۔سلطان نے شہر کا محاصرہ کرلینے کا حکم دیا ساحلی علاقوں سے کمک ملنے کی کوئی امید نہیں تھی مایوس ہوکر دفاع کرنے والوں نے ۱۱۸۷ء میں ہتھیار ڈال دیئے۔صلاح الدین نے انتہائی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہتھیار ڈالنے والوں کے سامنے بہت ہی نرم شرائط رکھیں۔وہ یہ تھیں فرانک باشندے جوفلسطین میں ہی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے انہیں آزاد مرداورعورت کی حیثیت سے زندگی گذارنے کا موقع دیا جائے گا جولوگ یہاں سے ہجرت کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے تمام مال ومتاع ساتھ لے کر جاسکتے ہیں ان تمام ملک بدر ہونے والے افراد کوسلطان کا ذاتی تحفظ مہیا رہے گا۔مشرقی کلیسا کے یونانی اور آرمینیائی باشندوں کومکمل شہری حقوق کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں میں بسے رہنے کی اجازت دے دی گئی۔یروشلم کی ملکہ سبیلا اپنے مال ومتاع کے ساتھ جانے لگی اولادو شوہروں کے بغیر نکلنے والی ملکہ اوراس کی ساتھی عورتوں کے کرب وبلا اورتکالیفات دیکھا تو سلطان اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً ان تمام عورتوں کے شوہروں اور اولاد کو رہا کرنے کا حکم دے دیا تاکہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ بحفاظت سفر کرسکیں۔کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جب کہ سلطان اورخوداس کے بیٹے نے فدیہ ادا کیا اورقیدیوں کورہائی دلائی۔تاریخ نے صلاح الدین جیسے بہادر لیکن رحم دل فاتحین ہیروکوکم دیکھا ہے جنھوں نے شکست خوردہ دشمنوں کے ساتھ فراخدلانہ اورروادارانہ برتاؤ کیا اس کے برعکس ۱۰۹۹ء میں جب صلیبیوں نے یروشلم پر قبضہ کیا تھا تو وہاں کے عوام کے ساتھ انہوں نے جووحشیانہ قتل عام کیا وہ دنیا کے سامنے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔

یروشلم کی شکست سے یوروپ بھر میں ایک جنون سا پھیل گیا۔پوپ چارلس سوم نے نئی صلیبی جنگ کی آواز دی ساری لاطینی دنیا ہتھیاروں کے لیس ہوکر جنگ کے لئے تیار ہوگئی انگلینڈ کے بادشاہ رچرڈ شاہ جرمنی بربروسہ شاہ فرانس کے اغسطس نے خود اپنے اپنے ہاتھوں میں صلیب اٹھائی اور جنگ کے لئے تیار ہوگئے جہاں تک شام کے حالات کا سوال ہے کہ وہ سلطان صلاح الدین کے موافق تھے لیکن سمندر میں

صلیبیوں کو برتری حاصل تھی صلاح الدین نے مغرب کے سلطان یعقوب المنصور سے مدد مانگی اور اس سے درخواست کی کہ مغربی بحیرۂ روم کی ناکہ بندی کردی جائے لیکن وہ اندرونی طور پر صلیبیوں سے سانٹھ گانٹھ رکھتا تھا مغرب کا مطلق العنان بادشاہ لاطینی حملے کے خلاف عالمی محاذ بنانے کے لئے تیار نہ تھا سلطان صلاح الدین سے اس کا معاہدہ نہ ہوسکا اور صلیبی حملہ آور سمندر کے ذریعہ فوج اور رسد پہنچانے کے لئے مکمل آزاد رہے فلسطین کے لئے ہونے والی صلیبی جنگوں میں تیسری صلیبی جنگ جو کہ ۱۱۸۸ء سے ۱۱۹۱ء تک جاری رہی سب سے خوفناک جنگ تھی یوروپ کی افواج سمندری بیڑوں پر سوار آگے بڑھیں اور طیر بندرگاہ کو اگلے حملوں کی تیاریوں کا اہم مقام بنایا یروشلم کی طرف ان کی کوچ کی راہ میں پہلا بڑا دفاعی مرکز عسکرہ تھا تینوں یوروپی افواج نے اس کا شہر محاصرہ کرلیا ادھر سلطان صلاح الدین کمک لے کر آگے بڑھا تا کہ شہر پر دباؤ کم ہو سکے تو ایک طویل محاذ آرائی شروع ہوگئی جو دو سالوں تک چلتی رہی ایک دوسرے پر حملہ ہوتے رہے کئی مرتبہ مسلم افواج محاصرہ کو توڑ کر شہر میں داخل ہونے میں کامیاب بھی ہوئی تھیں رسد اور کمک کی بار بار فراہمی کی وجہ سے صلیبی محاصرہ کو طول دینے میں کامیاب رہے۔

اس کے بعد جو جنگ ہوئی وہ ایک یادگار تاریخی جنگ تھی یہ جنگ صلیب اور ہلال کے درمیان تھی سلطان صلاح الدین کی افواج ایک طویل محاذ پر پھیلی ہوئی تھی یہ محاذ شام کے پورے ساحل پر دراز تھا تا کہ ساحل سمندر کے عقبی حصہ کو صلیبیوں کے حملوں سے محفوظ رکھا جاسکے جرمنی کے بادشاہ باربروسا اناطولیہ کے ذریعہ ہوکر آگے بڑھا یہاں کے ترکوں نے ان کا کوئی خاص مقابلہ نہ کیا باربروسا نے اس دفاعی لائن کو توڑ دیا۔

اور جب وہ آگے بڑھا تو راستے میں ہی دریاء مسرف میں غرق ہوگیا اس کی موت کے بعد جرمن افواج بکھر گئیں اور تیسری صلیبی جنگ میں انہوں نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا عکرہ کا دفاع کرنے والی مسلم افواج نے صلیبیوں کا نہایت شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن ایک طویل محاصرہ نے انہیں تھکا دیا اور ان کی طاقت ٹوٹ گئی ۱۱۹۱ء میں عکرہ والوں نے ہتھیار ڈال دئے فاتح صلیبی ہتھیار ڈالنے کی شرائط کو پامال کرتے ہوئے شہر پر ٹوٹ پڑے محاصرہ سے بچنے والوں کا قتل عام کیا تواریخ میں آیا ہے کہ ہتھیار ڈالنے والی فوج کا خود شاہ رچرڈ نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ صلیبوں نے عکرہ میں کچھ وقت آرام کیا پھر ساحل سمندر کے

ساتھ ساتھ یروشلم کی جانب بڑھے صلاح الدین بھی ان کے ساتھ ساتھ کوچ کرتا رہا حملہ آور فوج پر اس نے گہری نظر رکھی ہوئی تھی ایک سو پچاس میل کی اس مسافت کے دوران دونوں افواج کے درمیان کئی خونیں جھڑپیں بھی ہوئیں جب صلیبی عسقلان پہنچے تو صلاح لدین کو اندازہ ہوگیا کہ اس شہر کا دفاع کرنا ناممکن ہے اس نے شہر کو مکینوں سے خالی کروادیا اور سارے شہر کو زمین بوس کر دیا۔

دونوں افواج کے درمیان فوجی تعطیل پیدا ہوگیا صلاح الدین زمین کے ذریعہ کمک پہنچانے والے تمام راستوں کی حفاظت کرتا رہا تو اُدھر سمندر پر صلیبیوں کا قبضہ تھا آخر کار شاہ انگلینڈ رچرڈ کو احساس ہوگیا کہ اس کا مقابلہ ایک فولادی انسان سے ہے اس نے امن کے لئے پیش رفت کی رچرڈ اور صلاح الدین کے بھائی سیف الدین کے درمیان ملاقات ہوئی ابتداء میں رچرڈ نے یہ مانگ رکھی کہ یروشلم کے علاوہ حطّین کی جنگ میں ہاتھ سے جانے والے تمام علاقے اس کو واپس کر دیئے جائیں لیکن اس مانگ کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔

اس موقع پر شاہ رچرڈ نے یروشلم میں امن کے لئے اپنی تاریخی تجویز پیش کی جس کے مطابق رچرڈ کی بہن صلاح الدین کے بھائی کی شادی سیف الدین سے ہوگی صلیبی دلہن کو بطور جہیز ساحلی علاقہ دے دیں گے صلاح الدین یروشلم اپنے بھائی کو دے دے گا دلھا دلہن دونوں مل کر اس سلطنت پر حکومت کریں گے جس کا صدر مقام یروشلم ہوگا اس طرح دو مذاہب کے درمیان خاندانی رشتہ استوار ہوگا صلاح الدین نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا لیکن کئی پادریوں اور فرانک باشندوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی شاہ رچرڈ کو یہ دھمکی دی گئی کہ اسے کلیسا سے نکال باہر کیا جائیگا اپنے ساتھیوں کی اس کوتاہ نظری سے تنگ آکر رچرڈ اپنے ملک واپس ہوجانا چاہتا تھا ۔آخر کار رچرڈ اور صلاح الدین کے درمیان صلح ہوگئی۔ معاہدہ کے مطابق یروشلم سلطان صلاح الدین کے زیر نگران ہی رہے گا لیکن تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق یہاں کی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کی آزادی ہوگی فرانک باشندوں کو ساحل سمندر کے کنارے حیفہ سے لے کر طیر تک چھوٹی سی پٹّی پر قابض رہنے دیا گیا فلسطین اور شام کا بڑا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ ہی میں رہا۔

تیسری صلیبی جنگ کے لئے یوروپ نے اپنی تمام توانائیوں کو یکجا کیا جس کا واحد مقصد تھا یروشلم پر

قبضہ لیکن یوروپ کی تمام طاقت اور تمام بادشاہ مل کر صرف ایک معمولی سے قلعہ عکرہ پر قبضہ کر سکے جس کی کوئی اہمیت نہ تھی صلاح الدین دمشق کو فاتحانہ انداز سے واپس لوٹا اس دور کہ تمام ہمعصر لوگوں نے اس کو بہادری اور شجاعت کی ایک اعلیٰ ترین علامت قرار دیا اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے جو اس سے پہلے بہت کم افراد سرانجام دے سکے- اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے- امت مسلمہ کو مشترکہ دشمن کے خلاف متحد کرنا اس نے اپنی بقیہ زندگی عبادت سخاوت اسکولوں کی تعمیر شفاخانوں کی تعمیر اور اپنی سلطنت میں عدل وانصاف سے حکومت کرتے ہوئے گزاری مجاہدوں کا سردار بہترین فوجی حکمت عملی رکھنے والوں کا شہزادہ سلطان صلاح الدین چار مارچ ۱۱۹۳ کو دنیائے فانی سے کوچ کیا- اسے دمشق میں دفنایا گیا ہے۔

اکیسواں باب

دہلی کی فتح

دہلی کی فتح

بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں کچھ عرصہ کے لئے اسلامی دنیا خلافت بغداد کے زیر تحت متحد ہوگئی یہ سیاسی اتحاد جوکہ اسلامی دنیا میں کم ہی نظر آتا ہے فوجی فتوحات کا باعث بنا مشرق وسطی میں فلسطین لبنان اور شام سے صلیبیوں کو نکال باہر کیا گیا۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس کے چار سال بعد ۱۱۹۱ء میں غزنی کے محمد غوری نے دریائے سندھ کو عبور کیا دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر ہندوستان فتح کرلیا۔ اس تاریخی فتح کے پانچ سال بعد ۱۱۹۶ء میں المحدث یعقوب المنصور نے الارقوس کی جنگ میں صلیبیوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ سارے کرۂ ارض پر تیس سالوں تک مسلمانوں کو کوئی للکارنے والا نہ رہا۔

جنگ حطین جوکہ ۱۱۸۶ء میں ہوئی اس کے چار سال بعد بالکل اسی قدر اہم ایک اور تاریخی جنگ لڑی گئی۔ یہ لڑائی پنجاب کے میدانوں میں ترائن کے مقام پر غزنی کے محمد غوری اور دہلی کے پرتھوی راج چوہان کے درمیان ہوئی اس جنگ سے دہلی پر سلاطین کی حکومت کے لئے راہ ہموار ہوگئی برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی شطرنج کی یہ پہلی چال تھی وہ قوم جس کی تعداد آج اس برصغیر میں چالیس کروڑ سے زیادہ ہے جو

کہ دنیا میں کسی بھی ایک علاقہ میں پائے جانے والے مسلمانوں کی تعداد سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

۱۱۹۲ء میں یہ طویل وعریض برصغیر ہند ایک منقسم شدہ علاقہ تھا آپس میں ایک دوسرے سے حسد کرنے والے راجپوت راجاؤں کی نفرت کا اکھاڑہ تھا چوہان خاندان کا شہزادہ اور محبت کا متوالہ پرتھوی راج دہلی اور اجمیر پر حکومت کررہا تھا کچھ اور آگے مشرق کی جانب قنوج کے علاقہ پر راجہ جے چند راج کررہا تھا۔اس کو پرتھوی راج سے نفرت تھی۔اس لئے کہ اس کی بیٹی نے باپ کی مرضی کے خلاف پرتھوی سے شادی کرلی تھی یہ بات راجپوت روایات اور عزت نفس کے خلاف تھی۔جے چند نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس کا بدلا لے کر رہے گا بنارس،اجین،بندیل کھنڈ،بنگال،مالوہ اور گجرات پر حکومت کرنے والے شہزادے آپس میں دست بہ گریباں تھے۔وسط ہندوستان میں راشڑ کوٹ کی حکومت تھی ادھر جنوبی ہندوستان میں چولہ،پانڈیا اور چیرہ کی خوشحال ریاستیں تھیں۔

وہ طوفان جن سے تاریخ ڈھلتی ہے سب سے پہلے مرد اور عورتوں کے دماغوں میں پلتے ہیں انسانی دماغوں،دلوں اور روحوں میں ہی سب سے پہلے نفسیانی خواہشات،جذبات،محبت اور نفرت،اقتدار پرستی اور ہوس پرستی،حرص اور ہوس کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے۔جب یہی معرکہ آرائی دنیا کے صفحات پر بکھرتی ہے تو حقیقتوں کی تخلیق ہوتی ہے تاریخ کا وسیع پردہ کھلتا جاتا ہے اور انسانی عمل کے لئے اور زیادہ مواقع فراہم کرتا جاتا ہے۔اس طرح تاریخ کا وہ فیصلہ ساز لمحہ جس نے افغانیوں کے لئے دلی کی فتح کی راہ ہموار کی وہ لمحہ تھا پرتھوی راج اور جے چند کی بیٹی کے درمیان محبت جس کی انتہاء جے چند اور پرتھوی کے درمیان محاذ آرائی پر ہوئی اسی محبت ونفرت کی کہانی نے وہ فیصلہ کن رول ادا کیا۔جس نے ہند کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

سندھ،منصورہ اور ملتان پر ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کی فتح کے بعد تین سو سالوں تک بغداد کی خلافت اور ہندوستانی راجاؤں کی سلطنتوں کی سرحدیں ساکن رہیں۔محمود غزنوی کے حملوں نے جو کہ ۱۰۰۰ء تا ۱۰۲۶ کے دوران ہوئے اس ساکن صورت حال کو مرتعش کردیا اور ہندوستان کی دفاعی کمزوریوں کو اجاگر کردیا راجپوت افواج کے مہیب لیکن دھیمی رفتار والے ہاتھی وسط ایشیاء کے برق رفتار اور گھیرا ڈال کر لپیٹ لینے والے گھڑ

سواروں کے سامنے بیکار ثابت ہوئے ۔محمود کے بعد شمال مغرب کی جانب سے کوئی بھی بڑے حملے نہیں ہوئے جس کی وجہ سے راجپوتوں نے ایک بار پھر وسطی پنجاب کے علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

یہ صورت حال اس وقت بدل گئی جب ہیرات اور کابل کے درمیان پہاڑوں میں بسنے والے افغان ترکمان نسل کے بہادر غور قبیلہ نے غزنویوں کو للکارا۔۱۱۷۳ء میں غیاث الدین غوری نے غور میں ایک آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی اور غزنی پر قبضہ کرنے کے بعد مشرقی صوبہ جات پر اپنے بھائی معیز الدین محمد غوری کو اپنا نائب مقرر کیا جفاکش، مضبوط، بہادر قوت ارادی اور قیادت کی صفات سے ابلتے ہوئے محمد غوری کی نظر ہندوستان کی جانب مرکوز تھی۔ ہندوستان اس قدر دولت مند تھا کہ کوئی بھی مہم پسند شہزادہ اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا لیکن سب سے پہلے اس کو افغان کے امراء اور افغانستان و پنجاب کے مسلمان شہزادوں سے نمٹنا تھا۔ ۱۱۷۷ء تک اس نے غوری سلطنت کی سرحدیں، ملتان، روچ، ڈیرہ اسماعیل خان اور سندھ کے کچھ حصوں تک وسیع کرلیں ۱۱۷۸ء میں اس نے گجرات کے پٹن پر حملہ کیا۔ جہاں اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اپنی توجہ شمال کی جانب کرتے ہوئے اس نے ۱۱۷۹ء میں پشاور اور ۱۱۸۸ء میں سیالکوٹ اور لاہور پر قبضہ کیا۔مشرق میں دہلی کی جانب اس کے کئی ابتدائی حملے ناکام رہے۔ کئی ایک مرتبہ وہ راجپوتوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوا اور فدیہ ادا کرکے رہائی حاصل کی لیکن ۱۱۹۰ء میں بھٹنڈا کے قلعہ پر کامیابی کے ساتھ قبضہ کی وجہ سے اسے ایک زرین موقع حاصل ہوگیا۔ اس کامیاب حملہ کے بعد برصغیر کی قسمت بدلنے والی کئی ایک جھڑپیں ہوتی رہیں۔

بھٹنڈا کا راجہ دہلی کے پرتھویراج چوہان کا حلیف تھا۔ معاہدہ کی رو سے پرتھوی کو دہلی سے نکل کر افغانوں کے مقابلہ کے لئے آنا پڑا محمد غوری کابل کی جانب واپسی کے سفر پر تھا اسی وقت اسے راجپوتوں کے حملہ کی اطلاع ملی وہ بھٹنڈا کے دفاع کے لئے واپس لوٹا اس کے باوجود کہ اس کی فوج کے کچھ گھوڑسوار دستے کابل کی طرف آگے بڑھ چکے تھے ۱۱۹۱ء میں ترائن کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا غوری نے انتہائی بہادری کے ساتھ جنگ کی لیکن ہندوستانی ہاتھیوں کے حملہ نے افغانیوں کے دفاع کو توڑ دیا غوری زخمی ہوگیا اور بڑی مشکلوں سے جان بچا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا اس شکست سے غوری

مایوس نہیں ہوا اس نے کابل میں اپنی بکھری طاقت کی پھر سے شیرازہ بندی کی اور دوسرے سال پھر حملہ آور ہوا اس مرتبہ کئی راجپوت شہزادے پرتھوی راج کی مدد کے لئے تیار تھے لیکن ادھر راجہ جے چند غوری کی مدد کے لئے آگے بڑھا اسے اپنی بیٹی کی عزت کا بدلہ جو لینا تھا پرتھوی سے ۱۱۹۲ میں دونوں فوجوں کی ٹکر دوسری مرتبہ ترائین کے میدان میں پھر ہوئی۔ ہندوستانی افواج نے ہاتھیوں کے ذریعہ آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ اب کی بار افغانیوں نے پیچھے ہٹنے کا ناٹک کیا۔ پھر برق رفتاری سے واپس پلٹے اپنے بازوؤں کو پھیلا کر لپیٹنے والے انداز جنگ سے پرتھوی راج کی افواج کے قلب کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ راجپوت فرار ہو گئے۔ پرتھوی راج قید ہو گیا اور قید خانے میں ہی اس کی موت ہو گئی۔

ترائن کی اس فتح نے محمد غوری کو ہندوستان کی قسمت کا مالک بنا دیا دہلی، اجمیر، اور اطراف کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے مملوک فوجی افسر قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا اور غزنی لوٹ گیا اسی دوران اس کے سپہ سالار دریائے گنگا کے میدانوں میں پھیل گئے اور انتہائی سرعت سے آگے بڑھے ۱۱۹۹ میں بہار پر قبضہ کیا تو ۱۲۰۲ء میں بنگال پر حملوں کی اس برق رفتاری اور ان کے فتوحات نے پانچسو برس پہلے اسپین میں موسیٰ اور طارق کے فاتحانہ کوچ کی یاد دلا دی قنوج کے راجہ جے چند نے جب دیکھا کہ مسلمان اس کی اپنی سلطنت سے بھی آگے بڑھ کر کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں تو وہ کافی فکر مند ہوا۔ اس نے مسلمانوں کی مزاحمت کی لیکن ایک مکمل جنگ کے بعد ۱۱۹۳ء میں وہ شکست کیا گیا۔ ۱۲۰۵ء تک دریائے گنگا کا سارا میدانی علاقہ غوری حکومت کے زیر ماتحت آ گیا۔

۱۲۰۲ء میں غیاث الدین غوری کا انتقال ہو گیا تو محمد غوری تخت پر بیٹھا۔ سلطان کا زیادہ وقت شمال کی جانب سے ہونے والے ترکوں کے حملوں کے سدباب کرنے میں گذرا۔ ۱۲۰۵ء میں اسے ایک ترک قبیلہ قرہ قطائی کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ یہ افواہ پھیل گئی کہ محمد غوری میدان جنگ میں مارا گیا۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب کے کھوکھروں نے مقامی راجہ کے زیر قیادت بغاوت کر دی یہ بغاوت اس قدر منظّم تھی کہ پنجاب غزنی اور دہلی سے کٹ گیا۔ ایک سنسنی خیز حملہ میں شمال سے محمد غزنوی نے اور جنوب میں دہلی سے قطب الدین ایبک نے پنجاب پر چڑھائی اور اس بغاوت کو کچل ڈالا۔ اس کامیاب مہم کے بعد جب محمد غوری

۱۲۰۶ءمیں کابل واپس لوٹ رہا تھا تو راہ میں ایک فاطمی کرایہ کے قاتل نے اسے دھوکہ سے قتل کرڈالا۔

دہلی کی فتح کے بعد اسلامی دنیا کی طاقت کا محور مشرق کی جانب منتقل ہونا شروع ہوا۔۱۲۱۹ءتا۱۲۶۱ کے دوران منگول حملوں اوراس کے نتیجہ میں وسط ایشاءاورایرانی حکومتوں کی تباہی کی وجہ سے اس عمل میں اور تیزی آ گئی۔اس برصغیر میں یکے بعد دیگرے کئی شاہی خاندانوں کی حکومت آتی رہی۔آخر کار اس کا نتیجہ رفیع الشان مغل سلاطین ۱۵۲۶تا۱۷۰۷ء کے سلسلے کو اقتدار پر لانے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان کے مسلمان بھی عربوں ایرانیوں،ترکوں اور آفریقیوں کے ساتھ عالم اسلام کے عوام کے جلو میں آ گئے ۔ بسا اوقات ملیشیاءاورانڈونیشیا کی عظیم الشان مسلم قوم بھی انہی کے شانہ بہ شانہ نظر آتی ہے۔برصغیر میں اسلام کی جڑیں گہری ہونے لگیں اس نے ہندوستان میں ایک نئ مسلم تہذیب وتمدن کو جنم دیا جو مسلمانوں اور ہندوں دونوں سے فیضاب ہوتی رہی۔ لاہور،دہلی،آگرہ،لکھنؤاور حیدرآباد میں ایسے اعلیٰ اسلامی علوم وفنون ، تہذیب تمدن ،فنون لطیفہ پروان چڑھنے لگے جن کی چمک دمک کے سامنے سمرقند،دمشق اور خیروان بھی ماند پڑ گئے۔آگے چل کر بیسوی صدی میں اس نے ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کی سلطنتوں کو جنم دیا۔

بائیسواں باب

چوتھی صلیبی جنگ

قسطنطنیہ کی بربادی

جب جلا بخشنے والا زاویہ فکر تبدیل ہو جاتا ہے تو تہذیبیں بھی تغیر پذیر ہو جاتی ہیں۔ وہ ماورائے ادراک یا آسمانی اخلاقی ضوابط جو بنیادی ڈھانچہ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں انہی سے انسان آپس میں روابط اور تعلقات استوار کرتے ہیں۔ کوئی بھی معاشرہ اپنے آپ کو کس طرح کسوٹی پر کستا ہے کس ترازو سے تولتا ہے کس معیار کو اپناتا ہے۔ اور دوسری تہذیبوں کے ساتھ وہ کس طرح تفاوت یا باہمی عمل ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ یہی وہ اخلاقی اصول ہیں جس کے معیار پر تاریخ میں کسی بھی تہذیب وتمدن کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔ پہلے زمین کی تشریح وتعریف یوں ہوتی تھی کہ وہ سپاٹ اور میدان نما ہے۔ اس تعریف کی وجہ سے جغرافیائی، سیاسی اور تاریخی حدود معین کردیئے تھے جب اس تعریف میں تبدیلی آگئی اور یہ آفاقی طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے تو بنیادی طور پر تہذیبوں کے باہمی تفاوت کے نظریہ میں تبدیلی آگئی۔ امریکہ دریافت ہوا، سمندروں کو مفتوح کرلیا گیا، تجارت کے طریقۂ کار میں تبدیلی آگئی پرانی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں ان کی جگہ نئی سلطنتوں نے لے لی۔

تاریخ کے وسیع وعریض تغیر پذیر منظر پر تہذیبوں کی بھی یہی پہچان ہے۔ اس راہ میں کچھ ایسے سنگ میل ہیں جو دور سے نظر آجاتے ہیں۔ یہ وہ نشانِ راہ ہیں جو ان تہذیبوں نے قائم کئے ہیں جنہوں نے بنیادی طور پر اور فوراً دکھائی دینے والے انداز سے اپنی تعریف یا گردان میں تبدیلی کی اور اپنے موڑ یا رخ کو بدل ڈالا۔ 1204ء میں صلیبیوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی تباہی و بربادی ایسا ہی ایک سنگ میل ہے۔ حقیقت تو

یہ ہے کہ یہی وہ سال ہے جبکہ لاطینی مغرب ایک نئے رخ پر چل پڑا۔1204ء سے پہلے صلیبیوں کی منزل مقصود صلیب اور یروشلم میں موجود مقدس مرقد مسیح کی دستیابی تھا۔اس تاریخ کے بعد انکا زاویہ نگاہ سونا اور دولت کا حصول بن گیا۔1204ء سے پہلے یوروپ کی طاقت وتوانائی کا اظہار تخیل پرستی اور خانقاہیت کے ذریعہ ہوا کرتا تھا۔سارا براعظم مطلق جہالت اور غربت میں ڈوبا ہوا تھا۔تجارت بالکل رک گئی تھی۔ گنڈا، طلسمات، جادو، ساحری مافوق الفطرت چیزوں سے ربط کا ذریعہ تھا اسی جہالت کا اولین فائدہ کلیساء کو ہوا کرتا تھا کیونکہ تعویذ گنڈے اور طلسمات وغیرہ کی تقسیم کا شرف اسی کو حاصل تھا۔

1204ء میں لاطینیوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد اس کی گلیوں، بازاروں کو تباہ کیا۔یادگاروں اور تبرکات کو برباد کر کے کلیساؤں میں عشائے ربّانی کی میزوں پر رقص کیا اور ان میں موجود زبردست دولت کو لوٹ لیا۔یہ صلیبی مختلف النوع گروہوں پر مشتمل لوگوں کا ایک گروہ تھا جس میں زیادہ تر فرانس کے نواب جرمنی کے کسان، اطالوی تاجر، اور لاطینی پجاری شامل تھے۔اس قدیم بازنطینی صدر مقام سے لوٹے گئے سونے اور چاندی سے وینیس، جنیوا اور فلورنس جیسی اطالوی شہری ریاستوں کو خوشحالی کی راہ پر گامزن ہونے کا موقع ملا۔اس طرح اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کے دور کی ابتداء ہوئی جو کہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں اپنی انتہاء پر پہنچ گئی۔1204ء کے بعد یوروپ کی تمام توانائی بنیادی طور پر اقتصادیات، تجارت اور ذاتی مفادات کے ذریعہ ظاہر ہوتی رہی۔وہ تہذیب جس نے نشاۃ ثانیہ کی تخلیق کی پھر آگے چل کر اصلاحات اور روشن خیالی کو اجاگر کیا وہ ایک سیکولر تہذیب تھی۔1096ء میں جس تہذیب نے پہلی صلیبی جنگ کے لئے آواز دی تھی اس میں اور اس تیسری صلیبی جنگیں کی تہذیب میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔1204ء کی چوتھی صلیبی جنگ کے بعد اور بھی کئی ''صلیبی جنگیں'' ہوئیں لیکن یہ یا تو مذہب کی چادر میں لپٹی ہوئی اقتصادی مفادات کی صلیبی جنگیں تھیں یا جنوب مشرقی یوروپ میں ترکوں کی فاتحانہ یورش کا جواب تھیں۔

1204ء کے تاریخ ساز واقعات کی ابتداء 1199ء میں پوپ انّوسنٹ سوم کی جانب سے صلیبی جنگ کے اعلان سے ہوئی۔وہ کلیساء جو اسپین میں الموحدین کے ہاتھوں مسلسل شکستوں کی ذلت سے دوچار تھا اسے یروشلم کا صلاح الدین کے قبضہ میں چلا جانا ناقابل برداشت تھا۔صلیبی جنگ کے اعلان پر ابتداء میں خاطر خواہ

جواب نہیں ملا۔ بارہویں صدی کے آخر میں یوروپ کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ کاؤنٹ بالڈون نے فرانس کے تخت کے اقتدار کو چیلنج کیا ہوا تھا۔ جرمنی میں تخت کے دو دعویدار تھے یہ تھے سوابیا کا فلپ اور برنسوک کا آٹو۔ وینیس نے مشرقی ایڈریاٹک پر اپنا اقتدار کھو دیا تھا۔ اسپین میں مسلمانوں نے صلیبیوں کو اسپین کی سرحدوں تک واپس دھکیل دیا تھا۔ فلسطین اور لبنان میں صلیبیوں کی نام نہاد موجودگی ایوبیوں کے رحم وکرم پر منحصر تھی۔ پوپ انوسنٹ نے صلیبی جنگ کے اعلان کے ذریعہ ایک تیر سے دو شکار کئے۔ ایک تھا آپس میں لڑنے والی یوروپی طاقتوں کو آسمانی منزل کو پانے کی طرف لے جانا اور دوسرا تھا کلیساء کے لئے دولت اکٹھا کرنا۔

یوروپ معاشی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا۔ از سر نو توانائی حاصل کئے ہوئے عالم اسلام کے خلاف نئی جنگ کے لئے تیار نہ تھا۔ مالی وسائل کی فراہمی کے لئے پوپ نے تمام عیسائیوں پر ٹیکس عائد کیا۔ لیکن عوام نے اس کو پسند نہیں کیا اور فلسطین کی طرف ایک اور کوچ کے لئے کوئی ماحول پیدا نہ ہو سکا۔ لیکن جلد ہی حالات تبدیل ہو گئے۔ چنگاری بھڑک اٹھی، 1199ء میں شمالی فرانس میں بمقام ''ایری سر آئسن'' میں منعقدہ ایک مقابلہ کے دوران دو نواب طبوت اور لوئس نے صلیب اٹھا کر صلیبی جنگ کا اعلان کیا۔ دونوں ساتویں لوئس کے پوتے تھے انہیں لوگ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی فرانس کے کئی نواب امراء اور نائٹ اس فہرست میں شامل ہو گئے۔ 1200ء میں کامپین کی کونسل میں یہ فیصلہ ہوا کہ صلیبی فلسطین کے لئے سمندر کی راہ سے کوچ کریں۔ لیکن نہ ہی حکومتوں کے پاس بحری بیڑہ تھا نہ ہی کلیساء کے پاس۔ اس لئے انہوں نے وینیس سے مدد مانگی۔ اس لئے کہ اطالوی ساحل پر واقع یہی واحد ریاست تھی جس کے پاس مدد کے بہم پہنچانے کے لئے وافر وسائل تھے۔

وینس کو سفارت بھیجی گئی۔ وینس کے باشندے شمالی یوروپ کے صلیبیوں کے برخلاف بالکل الگ طبیعت کے مالک تھے وہ تو تاجر تھے اور ہر کام میں نفع حاصل کرنے کی سوچتے تھے چاہے یروشلم کی فتح جیسے انتہائی جذباتی اور مذہبی معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔ مصر اور شام کے ساتھ 1000ء اور 1100ء میں ان کی تجارت زوروں پر تھی۔ وینس پر ایک منتخب شدہ مجلس شوریٰ جسے ڈاگے کہا جاتا تھا کی حکومت تھی۔ 1201ء میں اس کا سربراہ ہیزیکو ڈانڈولو تھا جو کہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا جس کی عمر تقریباً اسی سال تھی ڈانڈولو انتہائی

نکتہ رس سیاسی بصیرت رکھنے والا جادو بیان مقرر۔ جابر اور سخت گیر حکمران تھا اس نے تاجرانہ تمدن کو ایک دیوتا کی طرح مکرم و محترم بنا دیا تھا یہ وہ تاجرانہ تمدن تھا جو صدیوں سے مشرقی بحیرۂ روم کے ممالک میں قز ّاقی اور تجارت کے روپ میں جاری وساری تھا۔ ڈانڈولو نے صلیبی نوابوں کے ساتھ انتہائی سخت سودے بازی کی بیس ہزار پیادہ سپاہیوں، ساڑھے چار ہزار جنگجو نائیٹ اور ان کے گھوڑوں کو سمندری راہ سے لے جانے کے لئے اس نے پچاسی ہزار چاندی کے مارک طلب کئے۔ پوپ نے اس پر رضامندی ظاہر کردی۔ ایک معاہدہ پر دستخط ہوگئے اور صلیبی جنگجو وینس میں جمع ہونا شروع ہوگئے۔

لیکن سارے یوروپ سے آئے ہوئے تمام نوابوں اور نائیٹوں کے جیبوں کو خالی کرنے اور گھریلو اشیاء کو فروخت کرنے کے باوجود انتیس ہزار چاندی کے مارک سے زیادہ سکّے جمع نہ ہوسکے۔ ڈانڈولو نے دیکھا کہ وہ سنہری موقع آ گیا ہے جس سے فائدہ بے دردی کے ساتھ اٹھانا ضروری ہے۔ اس نے معاہدہ کے مطابق چار سو بحری جہاز تعمیر کرکے ان کے حوالے کردیئے تھے جس معاہدہ کی تکمیل اس نے کردی تھی اس کے اجر کے بدلے میں ڈانڈولو نے ایک تجویز رکھی جس کی رو سے صلیبی مشرقی اڈریاٹک (آج کا کروشیا) پر واقع زارا شہر پر قبضہ کرنے میں اس کی مدد کریں۔ وینس کے لئے زارا شہر عرصہ دراز تک انتہائی اہم رہا ہے۔ کروشیا اور بوسنیا کے جنگلوں سے ان کی اہم ضرورت جلانے کی لکڑی اسی زارا بندرگاہ سے فراہم ہوسکتی تھی۔ 1201ء کے اس دور میں زارا ایک عیسائی شہر تھا یہ ہنگیری کے مطلق العنان بادشاہ کے زیر تحویل تھا جو کہ خود عیسائی تھا اور پوپ کے ماتحت صلیبی جنگوں میں شریک تھا۔ ڈانڈولو کی یہ تجویز سن کر پوپ کے غصّہ کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا لیکن صلیبی جنگ کی کمان کررہے پشتیوں اور کلیساؤں کے نائبین نے ڈانڈولو کا ساتھ دیا۔ ایک اعلیٰ مقصد کی حصولی کے لئے یہ مقصد تھا زارا شہر کو لوٹنا اور اس لوٹ کی آمدنی سے یروشلم کی بازیابی کے لئے صلیبی جنگ کو جاری رکھنا۔ زارا پر طوفانی حملہ ہوا۔ قبضہ کے بعد اسے بری طرح لوٹا گیا۔ ویسے کلیساء نے اس لوٹ کے خلاف کچھ آواز تو بلند کی لیکن زارا سے لوٹی جانے والی اشیاء میں سے کچھ بھی واپس نہیں کیا گیا۔ چاہے وہ کلیساء میں جلائے جانے والی چاندی کی ایک شمع ہی کیوں نہ ہو نہ تو مذہبی حملہ آور وینیسیوں نے لوٹایا اور نہ ہی پوپ کے ان نمائندوں نے جو اس لوٹ مار میں ان کے شریک تھے۔

ڈانڈولو کی فطرت تھی لوٹ مار اور غارت گری کے ساتھ زندگی گذارنا۔ ایک اور یادگار تاریخی موقع اس زیرک شخص کے ہاتھ لگ گیا۔ 1185ء میں بازنطینی شہنشاہ اسحاق کو اس کے اپنے بھائی الکسیئس نے تخت سے معزول کر دیا۔ اسکو اندھا کر کے اندھیرے غار میں قید کر دیا۔ اسحاق کا بیٹا جسکا نام بھی الکسیئس تھا جان بچا کر جرمنی بھاگا۔ جرمنی کی ملکہ افرین اسکی بہن تھی۔ چچا کے خلاف مدد کی درخواست کے لئے وہ یہاں سے روم گیا۔ پوپ نے فوراً احساس کرلیا کہ کلیسائے قسطنطنیہ کو کلیسائے روم کے ماتحت لانے کا زرّین موقع آ گیا ہے۔ قسطنطنیہ پر ایک بااثر بادشاہ کی حکومت تھی۔ پوپ کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا کہ قسطنطنیہ سے ہوکر یروشلم جانے کا زمینی راستہ بھی کھولا جاسکتا ہے۔ پوپ کی شہ پاکر ڈانڈولو کا بحری بیڑہ قسطنطنیہ کی جانب بڑھا۔ جس پر 20,000 بیس ہزار فرانسیسی، اطالوی اور جرمن صلیبی سوار تھے۔ یہ صلیبی عیسیٰ مسیح کی محبت سے زیادہ اقتدار اور دولت کی حرص سے مخمور تھے۔

یوروپ کا طرز فکر اب بدل چکا تھا۔ تعویذ گنڈوں، جادو، تخیلات کی دنیا کی بجائے اب ایک ایسی دنیا تھی جس کی محرک لوٹ مار کے ذریعہ ملنے والی دولت تھی۔ لوگوں کے دماغوں میں اب مقدس صلیب کی محبت نہ تھی۔ بلکہ سونے کی چمک بس گئی تھی۔ قسطنطنیہ کا دفاع انتہائی مضبوط تھا۔ اس کے قلعہ کی دیواریں یوروپ میں سب سے اونچی تھیں۔ اس کے سنہرے دروازے کے اطراف تنگ آبنائے پر ایک پل بنا ہوا تھا جو مضبوط فولادی زنجیروں سے بندھا رہتا تھا۔ اس پل کو جب چاہے اوپر اٹھایا جاسکتا تھا اور وقتِ ضرورت لنگر انداز کیا جاسکتا تھا۔ ڈانڈولو کافی عرصہ تک وینیس کے سفیر کی حیثیت سے اس شہر میں رہ چکا تھا۔ وہ اس سے اور اس کی دفاعی نظام سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے دفاعی نظام کا کمزور ترین پہلو سنہری دروازہ ہی ہے۔ وینیس کے جہاز پر کاٹنے والے آلات نصب کئے گئے اور اس فولادی زنجیر کو کاٹنے کا حکم دیا گیا۔ شہر پر سمندر کی راہ سے حملہ ہوا، خود بوڑھے ڈونڈولو نے اس کی سربراہی کی اور 12/اپریل 1204ء کو طوفانی انداز سے اس پر قبضہ کرلیا۔ نوجوان الیکسیئس کو اس کے تخت پر بٹھایا گیا۔ یہ تخت نشینی روم کے زیر ماتحت ہوئی اور اس شرط پر ہوئی کہ وہ چار لاکھ سونے کے سکوں کی خطیر رقم بطور تاوان ادا کرے گا۔ الیکسیئس یہ رقم اکٹھا نہیں کرسکا اس نے حملہ آوروں کو نکال باہر کرنے کی کوشش کی۔

اسے شکست ہوگئی اور سارے شہر کو لوٹ لیا گیا۔

اس شہر کی تباہی و بربادی اور لوٹ مار کی داستاں بیان سے باہر ہے۔ ہزاروں مردوں کو قتل کیا گیا، عورتوں کی آبروریزی کی گئی۔ بازنطینی دربار کے تقریباً ایک ہزار سالوں سے جمع شدہ خزانے کو لوٹ لیا گیا۔ صلیبیوں نے یہاں کے کلیساؤں میں گھوڑے دوڑائے اور انہی گھوڑوں کی لید سے ناپاک کیا۔

کلیساء سانتا صوفیہ کے ہال کو رقص گاہ میں تبدیل کیا گیا۔ تباہیوں کی عروج کے دوران ایک فاحشہ نے اسقفِ اعظم کی کرسی پر بیٹھ کر انتہائی شہوت بھرا گیت گایا۔ بازنطینیوں کی عفت لاطینی گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالی گئی۔ بازنطینی شہنشاہیت کے خزانے مغرب کی طرف روم اور وینیس کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ بازنطینوں کی راکھ سے مشرقی اٹلی کی قزاق حکومت نے جنم لیا۔ معاشی نقطۂ نظر کی ابتداء ہوئی۔ بازنطینی سونے نے اس معاشی نظریہ کو بقا عطا کیا۔ آگے چل کر اس نے نشاۃ ثانیہ کو جنم دیا۔ ایک تہذیب دفن ہوگئی دوسری تہذیب پیدا ہوئی جس کی قسمت میں کرۂ ارض پر فوقیت حاصل کرنا لکھا تھا۔ تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔ اب دنیا پرانی دنیا نہ رہی۔

تیئسواں باب

سلطنت عثمانیہ کا آغاز

سلطنت عثمانیہ کے سوتے ترک عصبیت اور غزہ کے اسلامی جذبہ میں پائے جاتے ہیں۔ غزہ کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا۔ ابن خلدون نے عصبیۃ لفظ کو قبائل کے اتحاد کے لئے ایک ضروری عنصر قرار دیا ہے جو قبیلوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ صحرائی باشندوں اور سرد صحرائی میدانوں کے خانہ بدوشوں میں یہ جذبہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ ترک وسط ایشیاء کے مرتفائی علاقے، سنکیانگ، منگولیا اور قزاقستان کے سرحدی علاقوں کے باشندے تھے۔ ان میں عصبیہ کی یہ خوبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے منگول بھائیوں کی طرح ترک بھی گھوڑسوار و خانہ بدوش تھے، جو چراگاہوں میں گھومتے رہتے اور صرف کچھ دیر سستانے اور توانائی حاصل کرنے کے لئے خیمہ زن ہوتے۔ وہ اپنے آقا کے ساتھ وفاداری، بہترین گھوڑسواری اور اعلیٰ ترین جنگجویانہ صلاحیتوں کے لئے مشہور تھے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جب اسلام دریائے آمو کے کناروں سے آگے بڑھا تو ترک بھی اس کے آفاقی فلسفہ سے آشنا ہوئے اور اس نئے مذہب سے ہم آغوش ہوئے۔ کئی ترک عباسی خلافت کی فوجوں میں ملازمت کرنے لگے۔ اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے کئی ایک ترقی کرتے کرتے فوج کے اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچے اور نویں صدی عیسوی کے وسط تک بغداد میں بادشاہ گر بن چکے تھے۔ اسی صدی کے آخر تک انہوں نے بغداد میں عباسی خلافت کی جگہ سلاطین کو اقتدار اعلیٰ کا مرکز بنا دیا۔ گیارہویں صدی میں سلجوقیوں کا عروج ترکوں کے اقتدار کا انتہائی نقطہ بنا۔ 1071ء میں بازنطینیوں پر سلجوقیوں کی فتح

دنیا کی تاریخ کا اہم موڑ تھا جس نے اناطولیہ پر ترکوں کے حملوں کے لئے راہیں ہموار کر دیں۔ ہلاکو خان کے نمودار ہونے اور 1258ء میں عباسیہ دور کے خاتمہ تک بازنطینی قبضوں والے اناطولیہ کے علاقوں پر ترکوں کا دباؤ برابر برقرار رہا۔ منگولوں کی یورش کے دوران اس پر روک لگ گئی۔ ہلاکو خان نے اناطولیہ میں دریائے دجلہ اور فرات کے بالائی علاقوں کو فتح کرلیا اور ترکوں کو آگے مغرب کی جانب پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اناطولیہ کے اکثر علاقوں نے منگولوں کی بالا دستی کو تسلیم کرلیا۔ منگول امراء نے مقامی صوبوں پر حکومت کے لئے اپنی جانب سے صوبہ دار مقرر کئے۔

ترک ایک ایسی قوم تھی جو منگولوں کی بالا دستی کو عرصہ تک برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ عین جلوت کی جنگ 1261ء کے بعد منگول اقتدارِ زوال پذیر ہوگیا۔ دوسری جانب ترک اقتدار کی منزل کی جانب بڑھنے لگے۔ گیارہویں صدی میں ہی ترک موثر دستوں کی شکل میں منظّم ہونے لگے جس کی قیادت انکے امیر کے ہاتھ تھی ان دستوں کا بنیادی مقصد بازنطینیوں پر حملے کرنا تھا۔ اسی تنظیم سے اسلامی روح غزہ کی شکل میں کارگر ہونے لگی۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے ترک آوارہ گردی کرنے والے خانہ بدوشوں کا گروہ تھے۔ وہ پرانے دور کے ان خانہ بدوشوں کے مثل تھے جو سکونت پذیر اور تہذیب یافتہ ممالک کی سرحدوں پر چھاپہ مارا کرتے تھے۔ لیکن اسلام کی آغوش میں آنے کے بعد وہ نہ صرف فاتح بن گئے بلکہ وہ عالمی حکومت اور عالمی تہذیب وتمدن کے جنم داتا بن گئے۔ قبیلہ پرستی اور نسل پرستی کی تنگ ذہن عصبیت کی جگہ اسلام کے وسیع النظر عالمی بصارت نے لے لی۔ وہ جو غزوہ میں حصہ لیتے غازی کہلائے۔ آج بھی دنیا بھر کی وہ ساری زبانیں جنہیں مسلمان بولتے ہیں ان سب میں غازی کا ایک ہی مخصوص مطلب۔ غازی کا مطلب ہے بہادر، طاقتور، عاجزی پسند، ذاتی مفاد سے بالاتر، مخیرّ ارادے کا پکا، اعلیٰ مقاصد کے لئے اڑ جانے والا مجاہد ہے۔ اس دور میں غازیوں کے الگ الگ گروہ ہوا کرتے تھے کوئی بھی ایک گروہ سے دوسرے گروہ کو آزادی کے ساتھ آجا سکتا تھا۔

یہی وہ غازی ہیں جنہوں نے مشرق وسطیٰ میں ترکوں کو تقویت عطا کی اور انہیں یوروپ کے قلب تک

پیوست کردیا۔مغربی حملوں کے دوران انہی غازیوں میں سے عثمان غازی ’بے‘ بن کر ابھرے ’بے‘ ترکی زبان کاایک لفظ ہے جس کا مطلب ہے مقتدر، قائد عثمان کے گھرانے کو عثمان عالی کہا جاتا اور جس حکومت کی بنیاد اس نے ڈالی اسے سلطنتِ عثمانیہ کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک درویش شیخ عید بالی نے عثمان عالی کو غازی بنایا۔ 1301ء تک اس کی حکومت کے حدود اِشک شہر سے برصہ تک پھیل گئیں اور اب وہ بازنطینی حکومت کے پرانے صدر مقام ازنک کی جانب بڑھا بازنطینی شہنشاہ نے اس خبر کے سنتے ہی سزالون کے زیر اہتمام ایک فوج بھیجی تاکہ ازنک پر بڑھتے ہوئے دباؤ کو کم کرسکے ترکوں نے اس فوج کو یلکوا کی جنگ میں (1301ء) شکست دی۔ یہ فیصلہ کن فتح عثمانیہ سلطنت کا ایک اہم ترین موڑ تھا عثمان کی شہرت عالمِ اسلام میں چاروں طرف پھیل گئی اور غزوہ جنگ کے لئے بے شمار رضا کار جوق در جوق اس کی طرف آنے لگے۔

ترکوں نے اس فتح کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھ کر ازنک اور بُرصہ شہروں کے اطراف کے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور دونوں شہروں کو دوسری طرف سے کاٹ دیا۔ عثمان کے بیٹے عورخان نے 1326ء میں بُرصہ پر قبضہ کرلیا۔ 1331ء میں ازنک پر بھی ترکوں نے فتح کا جھنڈا لہرا دیا۔ عورخان مالی شہنشاہ مانسا موسیٰ اور ہندوستان کے محمد بن تغلق کا ہمعصر تھا۔ 1333ء میں ابنِ بطوطہ نے بُرصہ کا سفر کیا۔ اس نے لکھا ہے یہ ایک بہت خوبصورت شہر ہے۔ خوبصورت مساجد، بازار، مدارس سے بھرا ہوا ہے۔ عثمانیہ ترکوں کے غازیانہ جوش اور ولولہ نے ابن بطوطہ کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بازنطینیوں کے خلاف کئی حملوں میں عورخان کے ساتھ رہا۔ اس زمانے میں اناطولیہ کے حالات عالم اسلام کے اس پار اسپین کے حالات سے بالکل برعکس تھے۔ مشرقی بحیرۂ روم میں غازیوں کے فاتحانہ کوچ نے انہیں بازنطینی کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن 1333ء میں شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی اسپین کو فتح کرنے کی آخری کوشش مکمل ناکامیاب رہی۔

عورخان کی مغرب کی جانب پیش قدمی جاری رہی۔ 1345ء میں کراسی کے صوبہ پر قابض ہوگیا۔ اب براعظم یوروپ اس کے سامنے تھا 1346ء میں اس نے یونانی شہزادی تھیوڈرا سے شادی کی۔ یہ اس دور کی رسم تھی جب کبھی ترکوں کے حملوں کے آثار ہوتے تو ان کو حملوں سے باز رکھنے کے لئے بازنطینی اپنی بیٹیوں کی شادیاں ان کے امیروں سے کردیا کرتے تھے۔ لیکن یہ غرض مند شادیاں ترکوں کو روک نہ سکیں۔

مغرب کی طرف پیش قدمی کی ذمہ داری عورخان کے بڑے بیٹے سلیمان کے ذمہ عائد کی گئی۔ 1354ء میں سلیمان نے گلی پولس کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔اسی سال انقرہ پر بھی فتح حاصل ہوگئی۔ 1356ء میں جب ایک حادثہ میں سلیمان کی موت ہوگئی تو قیادت اس کے بھائی مراد کو ملی۔ مراد نے آگے بڑھ کر طوفانی حملہ کیا اور 1357ء میں ایڈرین کو فتح کرلیا۔خطرے کا احساس ہوتے ہی پوپ اربن پنجم نے 1366ء میں صلیبی جنگ کا اعلان کیا۔لیکن اس اعلان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ترکوں کی پیش قدمی جاری رہی-1385ء میں صوفیہ پر قبضہ کرلیا تو 1386ء میں نیش اور 1387ء میں سلونیکا پر یونان کی شہزادی اور بازنطینی شہنشاہ نے ترکوں کے خلاف محاذ آرائی کو فضول جانا۔دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ترکوں کو اپنا حلیف بنانے کی پیشکش کی-1365ء-1366ء کے دوران بلغاریہ کے بادشاہ شیش مین نے لاطینی صلیبیوں اور ہنگری والوں کے مشترکہ حملے کے خلاف ترکوں کی مدد مانگی-1373ء میں بازنطینی شہنشاہ جان پنجم نے سلطان مراد کی سرپرستی قبول کرلی اور اس کے ایک ماتحت کی حیثیت سے بلقان کی جنگوں میں حصہ لیا۔جان کا بیٹا انڈربونکس چہارم ترکوں کا فرمان روا بن کر قسطنطنیہ کا بادشاہ بنا رہا-

مشرق میں عثمانیوں نے دوسری چھوٹی چھوٹی ترک ریاستوں کے خلاف مہمات جاری رکھیں۔اپنے آپ کو سلجوقیوں کے جانشین پیش کرتے ہوئے انہوں نے سواس اور کرامان کے قائدوں کے خلاف جنگ کی اور اس جدوجہد میں کامیاب بھی رہے-1387ء میں مراد نے سلجوقیوں کے اولین صدرمقام قونیا پر حملہ کیا کرامان کے امراء کو شکست فاش دی اور اناطولیہ کے سارے علاقہ پر قابض ہوگیا۔لیکن اس دوران بلقان کا محاذ کافی گرم رہا-1386ء میں سربیوں نے کھلی بغاوت کردی-بوسنیا اور بلغاریہ کے بادشاہوں نے اس کا ساتھ دیا-1387ء میں سلطان مراد نے سب سے پہلے بلغاریہ پر چڑھائی کی۔ بلغاریہ پر قابض ہوگیا اور اس کے بادشاہ شیش مین کو جلاوطن کردیا-جون 1389ء میں مراد کا سامنا سربیا کی فوجوں سے کوسوو کی میدانِ جنگ میں ہوا۔ایک خونریز جنگ ہوئی۔سربیوں کو شکست ہوئی اور ترکوں کے خلاف بلقان میں آخری معرکہ آرائی کا خاتمہ ہوگیا۔کوسوؤ کی جنگ میں مراد خود زخمی ہوا اور ان زخموں سے جانبر نہیں ہوسکا-مراد کا بیٹا بایزید اسکا جانشین بنا جسے ترکی میں یلدرم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے-

1389ء میں اپنے انتقال تک مراد نے اناطولیہ اور جنوب مشرقی علاقوں پر مشتمل عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس عظیم سلطنت میں صرف قسطنطنیہ ایک جزیرہ کی طرح برقرار رہا اس لئے کہ بازنطینی بادشاہوں نے ترکوں کی فرمانروائی تسلیم کر لی تھی۔ سیاسی مرکزیت کی ابتداء ہو چکی تھی جو کہ آنے والے دور میں پورے مشرق وسطی، شمالی افریقہ اور جنوب مشرقی یوروپ کو اپنے گھیرے میں لینے والا تھا۔ غازیوں کے جوش اور ولولہ نے فتح یابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے جس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی وہ صدیوں پر محیط رہی۔ سترہویں صدی عیسوی تک دنیا میں سب سے بڑی فوجی طاقت کی حیثیت سے اسکا دبدبہ برقرار رہا۔

ایک اسلامی سلطنت ہونے کے ناطے مذہبی رواداری مختلف مذاہب وطن، نسل کے لوگوں کو پہلو بہ پہلو پر امن زندگی کے مواقع عطا کرنا اس حکومت کا اولین اصول رہا۔ اس نے شمالی افریقہ وسط ایشیاء اور جنوب مشرقی یوروپ کے عوام کو پورے چھ سو سالوں تک سیاسی استحکام بخشا۔ دنیا کی لکھی گئی تمام تواریخ میں سب سے طویل اور پر امن دور رہا ہے۔

مغرب اور اسپین

خلاصہ:

اسلامی تاریخ کی سیر گاہوں کے بدلتے تناظر میں مغرب کو اپنا ہی ایک الگ راستہ بنانا تھا، لیبیا کا صحرائے اعظم مغرب کو مصر اور سوڈان سے جدا کرتا ہے۔ بنو امیہ نے اسپین میں ایک درخشاں تہذیب کی تخلیق کی جس میں سائنس وتمدن دونوں بہ یک وقت ارتقا پذیر رہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی اس کے سایے تلے پانچ سو سالوں تک عموماً پرامن زندگی گذارتے رہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہ تہذیب روبہ زوال ہونا شروع ہوگئی اس کی وجہ یہ تھی کہ اسپینی مسلمانوں نے خانہ بدوشانہ سادہ زندگی کی جگہ شہری عیش وآسائش کو ترجیح دے دی۔ 996ء میں صلیبیوں نے جنگ کا آغاز کیا ان کا پہلا حملہ اسپین پر ہوا۔ اور انہوں نے یکے بعد دیگرے ایک ایک شہر پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور آخر کار 1236ء میں قرطبہ پر فتح حاصل کر لی۔ اس دوران اسلامی تاریخ میں نظریاتی مسابقت کا جو تصور تھا اس آپسی مسابقت نے دسویں صدی عیسوی میں شیعہ فاطمیوں کو جنم دیا جو مغرب سے اٹھے آدھی اسلامی دنیا پر قبضہ کیا اور مصر کی سرزمین کو خوشحالی وعلم کا گہوارہ بنا دیا۔ فاطمیوں کے اس نظریاتی چیلنج کا مقابلہ بغداد کے عباسیوں اور قرطبہ کے امویوں نے کیا۔ فاطمی، عباسی اور اموی ہر ایک الگ الگ طور سے اپنے آپ کو تمام مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیتے رہے۔ اس طرح اس دور میں بیک وقت خلافت کے تین دعویدار رہے۔ دانشورانہ طور سے ان حالات اور اس دور کے نظریات کا سامنا کرنے کے لئے الغزالیؒ کے فن مناظرہ کو بھڑکایا۔ انہوں نے علم الکلام کو تصوف میں مدغم کیا، فلسفہ اور فاطمی باطنیت کو ٹھکرایا۔ اس طرح امام الغزالیؒ نے بنیادی طور پر اسلامی تاریخ کے دھارے کو ہی موڑ دیا۔ فوجی حیثیت سے حالات بالکل الگ تھے۔ ان حالات نے مسلمانوں کو یوروپ پر حملہ سے باز رکھا۔ جبکہ

یوروپ اس طرف شمال کی جانب سے وائیکنگ کے حملوں اور لوٹ مار کا شکار ہو رہا تھا۔ ادھر مغرب میں فاطمیت کے ردعمل کے طور پر گیارہویں صدی عیسوی میں مشرقی افریقہ سے سنی انقلاب کا جنم ہوا جو کہ مرابطوں کی شکل میں ابھرا جس نے آخرکار بنو فاطمہ کو اقتدار سے بے دخل کیا اور تقریباً ایک سو سالوں تک صلیبیوں کو اسلامی سرحدوں سے دور رکھا۔ بارہویں صدی عیسوی میں مرابطون کو المحد ثین نے اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ انہوں نے نئی اصلاحات اور معتزلہ نظریات کے نعروں کے سہارے اقتدار سنبھالا لیکن المحد ثین مالکی مسلک کے سنی علماء کے ساتھ مفاہمت کرنے میں ناکام رہے۔ یوروپ کے حملوں کے خلاف اسپین کا دفاع کرتے کرتے وہ انتہائی خونین معرکوں میں گھر گئے اور آخرکار 1212ء میں ''لاس نواس ڈی طلوسہ'' کی جنگ میں صلیبیوں کے ہاتھوں مکمل شکست سے دوچار ہوگئے۔

چوبیسواں باب

فاطمیہ کا فتح مصر

969ء میں بنو فاطمہ کا مصر پر قبضہ کر لینا اسلامی تاریخ کا ایک معین کردہ لمحہ ہے۔اس نے اسلامی دنیا میں اس وقت تک جو کچھ بھی مرکزیت باقی تھی اسے برباد کر دیا۔اسپین کے امویوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ خود الگ سے اپنی خلافت کا اعلان کریں، مغربی افریقہ میں طاقتور مرابطون انقلاب شروع ہوا۔ مسلمانوں کے لئے وہ ایک آخری اور فیصلہ کن موقع تھا جبکہ وہ یوروپ پر حملہ کر سکتے تھے۔بنو فاطمہ کی وجہ سے یہ بہترین لمحہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ان کی طرف سے ہونے والی نظریاتی اشتعال انگیزی کے سلسلے کا جواب آخرکار 1111ء میں امام الغزالیؒ کی پرجوش فصاحت بیانی سے مل گیا۔فاطمیت نے اسلامی حکومت کی سرحدوں کا جو مرکزی دروازہ کھول دیا تھا تو اسی وجہ سے 1099ء میں صلیبیوں کو یروشلم پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔آخرکار جب فاطمی تاریخ کے مرکزی کردار کی حیثیت سے الگ ہوئے تو انتہائی کینہ پرور اور انتقام پرور انداز سے ہٹے۔اسی بدلہ لینے کے جذبات کی شدت سے مخمور باطنی فرقہ کے حشیشین اور قاتلوں کے عروج کا باعث بنتے ہوئے وہ تاریخ کے اسٹیج سے دور ہوئے۔انہوں نے جو قتل کئے اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ان کا اہم ترین نشانہ نظام الملک طوسی (انتقال 1092ء) تھا، شاید حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد یہ اسلامی تاریخ کا سب سے قابل ترین منتظم تھا۔ان قاتلوں نے اپنے خنجر سے اسلامی دنیا کے سیاسی ڈھانچہ پر کارگر وار کیا اور اسے تباہ کیا۔

ہم نے پچھلے ابواب میں ان سیاسی حالات کا تجزیہ کیا ہے جو شیعان علیؓ کی جدوجہد کی خصوصیت رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ شیعہ تحریک بھی آپ خود امامت کے جانشینی کے سوال پر کئی گروہوں میں بٹ گئی۔ اہم ترین نفاق امام جعفر صادق ؒ کے بعد ہوا۔ جب انکے بڑے بیٹے امام اسمٰعیلؒ کا انتقال انکی اپنی زندگی میں ہی ہوگیا تو چھٹویں امام جعفرؒ نے اپنے دوسرے بیٹے امام موسیٰ کاظمؒ کو ساتویں امام کی حیثیت سے اپنا جانشین نامزد کیا۔ شیعہ کی اکثریت نے اس نامزدگی کو قبول کرلیا۔ لیکن ایک چھوٹے سے طبقہ نے اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور امام اسمٰعیلؒ کو ہی ساتواں امام تسلیم کیا۔ یہی فاطمی شیعہ یا سباعی کہلائے۔ مسلمانوں کے دو طاقتور طبقے آغا خانی اور بوہرے اسی بنی فاطمہ کا حصہ ہیں جنہوں نے مشرقی افریقہ اور ہندو پاک کی سیاست میں اہم رول ادا کیا ہے۔ عباسی جنگی حکومت 750ء سے لے کر 1258ء تک رہی۔ انہوں نے اپنے مسلک سے اختلاف رکھنے والے شیعوں پر امویوں سے زیادہ تشدد روا رکھا۔ کسی بھی قسم کی سیاسی کامیابی سے ناامید ہوکر شیعہ تحریکیں زمیں دوز ہوگئیں۔ اس باب میں ہمارا مرکز نگاہ صرف فاطمی تحریک ہے۔ کئی تاریخی تبدیلیوں کے سنگم نے فاطمی تحریک کی مدد کی۔ نویں صدی عیسوی میں افریقہ، یوروپ اور ایشیاء کے وسیع علاقے اس کی مرکزیت کے تحت آگئے جسکی وجہ سے تجارت میں بے انتہاء ترقی ہوئی۔ عوام خوشحال ہوگئے۔ بڑے بڑے شہر ابھر آئے پرانے قصبوں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ لوٹ مار کرنے والے خانہ بدوش قبائل سے بچنے کے لئے دیہی آبادی شہروں کی جانب ہجرت کرنے لگی۔ شہری زندگی کی آسائشوں کی طرف جھکاؤ کا عمل تیز ہونے لگا ساتھ ہی ساتھ ایشیاء اور افریقہ میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ نومسلم اپنے ان آقاؤں کے مظالم سے پناہ حاصل کرنے کے لئے شہروں کا رخ کرنے لگے جو کہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ایشیاء میں دمشق، بغداد بصرہ، کوفہ، ھمدان، اصفہان، حیرات، بخارا، سمرقند، کاشغر، افریقہ میں فسطاط، سجل ماسا، طاہرت، خیروان، اوداغوست اور تدمکا، یوروپ میں سوسا، قرطبہ اور طولید و تجارت کے مراکز بن گئے۔ مسلمان بیوپاریوں نے ہندوستان کے ملیبار، افریقہ کے رنجبار، چین کے کیانٹون جیسے دور دراز علاقوں میں اپنی تجارتی نوآبادیاں یعنی کالونیاں قائم کر رکھی تھیں۔ تجارتی سرگرمیوں میں تیزی سے اضافہ کی وجہ سے تیار شدہ مال کی کھپت بھی بڑھنے لگی۔ پیتل کی نقاشی،

سونے کے زیورات، زرجفت شدہ سلک، نازک قالین، لوہے اور فولادی اشیاء کی مانگ خصوصیت کے ساتھ زیادہ تھی اپنے نظریات کی تبلیغ کے لئے بنی فاطمہ نے سب سے پہلے انہی پیشہ والوں کو اپنا نشانہ بنایا۔

861ء میں خلیفہ المتوکل کو اسکے اپنے ترک محافظوں نے ہی قتل کر دیا۔اس قتل کے بعد عباسی خلافت کی فوجی اور سیاسی طاقت کافی حد تک کمزور ہوگئی۔ترکوں کے عروج سے اسلام کے سیاسی قصر میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوا۔

ابتداء میں خلفاء نے ان ترکوں کی خدمات حاصل کیں۔تا کہ عربوں اور ایرانیوں کے درمیان طاقت کے توازن کو برقرار رکھا جا سکے۔لیکن آگے چل کر انہی ترکوں نے عربوں اور ایرانیوں کو ہی بے دخل کر دیا اور خود خلافت کی قسمت کے مالک بن گئے۔مکتفی کے بعد جس کا انتقال 908ء میں ہوا خلفاء ترک سپہ سالاروں کے مہرے بن کے رہ گئے۔سلطنت کے دور دراز صوبیداروں کو جب بغداد کی سیاسی کمزوری کا احساس ہوا تو انہوں نے آزادی کا اعلان کر دیا اور مقامی شاہی خاندانوں کی حکومت قائم کر دی۔حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے پڑپوتے ادریس نے 788ء میں مراقش میں شیعہ سلاطین کے سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔ 800ء کے بعد ایک عرب سپہ سالار الاغلب اور اس کے وارثوں نے الجیریا اور تونیسیہ میں اپنا آزادانہ اقتدار قائم کیا۔868ء ایک ترک سپہ سالار ابن طولون نے مصر پر قبضہ کیا اور طولونیہ خاندان کی حکومت قائم کی۔مشرق میں ایک سپہ سالار طاہر حسن نے مامون اور امین کی خانہ جنگی میں مامون کا ساتھ دیا تھا۔اس کو خراسان پر آزاد حکومت قائم کرنے کا پروانہ دے دیا گیا-922ء میں بنو طاہر نے بغداد کے ساتھ کسی بھی ظاہری دکھاوے کے تعلق کا طوق اُتار پھینکا اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ 932ء میں ایک ایرانی نژاد بویہ نے ایران و عراق کی سرحدوں پر ایک طاقتور سلطنت کے شاہی سلسلہ کی بنیاد رکھی۔ بنی بویہ نے جو کہ اثناعشری شیعہ تھے بہت جلد کوفہ اور بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ 945ء میں وہ بغداد پر قابض ہو گئے اور خلیفہ کو مجبور کیا کہ وہ اقتدار کی باگ ڈور علویوں کے ہاتھ سونپ دے۔لیکن انہوں نے عباسیوں کا مکمل خاتمہ نہیں کیا اس کے دو وجوہات ہیں۔اول تو یہ کہ اس وقت امامت کے قابل کوئی شخصیت نظر نہیں آ رہی تھی جو کہ تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو۔دوسری وجہ تھی ترکوں کی فوجی طاقت جو کہ دھیرے دھیرے طاقتور فوجی

عنصر کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ بنی بویہ کو ان کے ردعمل کا خوف تھا جو کچھ ہو بنی بویہ عالم اسلام پر سیاسی غلبہ کے اس قدر قریب پہنچ گئے تھے کہ اثناعشری کبھی بھی اقتدار اعلیٰ کے اس قدر قریب نہیں ہو پائے تھے۔

بنی فاطمہ کی کامیابی کا شاید سب سے اہم سبب حکومت کے اندرونی حلقوں کی بدعنوانی اور رشوت ستانی ہے۔ یہی سبب سب سے قابل اعتماد ہے۔ ہارون الرشید کے دور حکومت کے بعد بغداد کی شان وشوکت خیرہ کن بن گئی۔ وہ دن اب خواب وخیال ہو گئے جب کہ اولین دور کے خلفاء کی زندگی جفاکش وسادہ ہوا کرتی تھی۔ گذرے ہوئے دور میں خلیفہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے بذات خود مدینہ سے یروشلم تک کا سفر کیا تھا۔ اس شہر کی کنجیاں لینے کے لئے اپنے نوکر کے ساتھ صرف ایک ہی اونٹ پر باری باری سفر کرتے ہوئے حضرت علی بن ابی طالبؓ تو چند کھجوروں کی غذاء پر کئی دن روزہ سے رہ جاتے۔ اس کے مقابلہ میں نویں صدی عیسوی کے خلفاء ہزاروں مصاحب کے گھیرے میں سونے کی پالکیوں میں سفر کیا کرتے تھے۔ دکھاوے کے لئے ظاہری شان وشوکت کے لئے فضول رسوم پر بے دریغ خزانہ لٹاتے تھے۔ خواجہ سراؤں اور ناچنے والیوں سے گھرے رہنے والے ان خلفاء کے دربار قسطنطنیہ کے بازنطینی درباروں یا ان ایرانیوں کے درباروں سے شان وشوکت میں کچھ کم نہ تھے جنہیں مسلمانوں نے اقتدار سے ہٹا دیا تھا۔ اب خلفاء کی حکومت اسلام کے اس ابتدائی دور کی طرح نہ تھی جبکہ الہامی اصولوں سے وفاداری برتی جاتی تھی اب تو اسلامی سلطنت کو سیاسی مصلحت پسندی اور جابرانہ طاقت نے آپس میں متحد کر رکھا تھا۔ شمالی افریقہ میں دیہی بربر آبادی اور شہروں میں سکونت پذیر عربوں کے درمیان تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ فارس میں ترکوں نے ایرانیوں کو اقتدار کے ایوانوں سے نکال باہر کر تو دیا تھا لیکن ایرانی اور اعرابی دونوں انہیں زبردستی گھس آنے والے دخل اندازوں کی حیثیت سے گری ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ رشوت خوری عام تھی، اب وقت آ گیا تھا کہ انقلابی تحریک اٹھے۔ وہ انقلاب بنو فاطمہ کے روپ میں ابھرا۔ اس انقلابی فاطمی ائمہ کی قیادت نے ایک نئے دور کے آغاز کا وعدہ کیا۔

حضرت امام جعفرؒ کے ایک سو سال بعد تک فاطمی تحریک اسلامی قصر سیاست کی تہہ میں ابلنے کے لئے بے قرار ایک بہتے ہوئے لاوے کے دھارے کی طرح رواں تھی اور یہ انقلاب نویں صدی کے دوسرے

حصے میں اس افق سے اُس افق تک بیک وقت سینکڑوں ابلتے لاوے آتش فشانوں کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس تحریک کا معمار تھا عبداللہ بن میمون ۔ یہ ابوالخطاب کا شاگرد تھا۔ابوالخطاب نے ایک زمانہ میں حضرت امام جعفرؒ کی رہنمائی میں تعلیم حاصل کی تھی۔

لیکن خلیفہ منصور نے ''تقیہ'' کے متعلق اس کے نظریات کو بدعتی اور کافرانہ قرار دے کر اسکو مروا دیا۔ تقیہ کا مطلب ہے اگر جاں کا خوف ہو یا اگر سخت زخمی ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے حالات میں ظاہری طور پر اپنے اصل عقائد سے انکار کیا جا سکتا ہے۔جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے فاطمیہ نے حضرت امام جعفرؒ کے اس فرمان کو ماننے سے انکار کر دیا تھا جس کے ذریعہ انہوں نے امام کاظمؒ کو ساتویں امام کی حیثیت سے نامزد کیا تھا۔بجائے اس کے انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام اسمٰعیلؒ کا انتقال نہیں ہوا بلکہ وہ صرف روپوش ہوئے ہیں۔

اسماعلیہ کے ان روپوش ائمہ کے شجرہ کا کوئی پتہ نہیں چلتا حتی کہ 875ء میں اس کی اتباع کرنے والوں یعنی کرامتین نے ابوعبداللہ کی سرکردگی میں یمن پر قبضہ کرلیا۔ابوعبداللہ نے یمن کو اپنا صدر مقام بنا کر بدوؤں اور یمنیوں پر مشتمل ایک فوج تشکیل دی۔903ء میں اسنے دمشق پر چڑھائی کی اور وہاں کے باشندوں کا قتل عام کیا۔923ء میں بصرہ کو روند ڈالا۔اس نے بصرہ سے مدینہ جانے کی راہوں پر حاجیوں کے قافلوں پر حملے شروع کئے اور ہزاروں مرد،عورتوں اور بچوں کو جو کہ عازمین حج تھے قتل کر ڈالا۔928ء میں ان فوجیوں نے مکہ پر حملہ کیا،کعبۃ اللہ میں تباہی مچائی اور اپنے ساتھ حجر اسود بحرین لے گئے جہاں انہوں نے اپنا مستقر اعلیٰ بنایا ہوا تھا۔ حجرِ اسود بائیس 22 سالوں تک وہیں رہا اور آخرکار فاطمیہ خلیفہ منصور کے حکم پر 950ء میں اسے مکہ واپس کیا گیا۔بغداد کی افواج نے تیزی سے آگے بڑھ کر دمشق پر پھر سے قبضہ جما لیا۔لیکن اس دوران کرامتین تحریک شمالی افریقہ میں پھیل گئی۔

آج کے تونیسہ،الجیریا اور مراقش کے علاقوں کو عرب مغرب الاقصیٰ کے نام سے پکارتے تھے۔اکثر اس علاقہ کو صرف مغرب کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔مغرب وہ خطہ ہے جس کے ساتھ مسلم اسپین اور جنوب مغربی یوروپ کی قسمت وابستہ رہی۔یہ علاقائی دائرہ تاریخی طور پر بیرونی طاقتوں کے خلاف اکثر اوقات بغاوتوں اور شورشوں کی سلگتی بھٹی رہا ہے۔ان بغاوتوں کے پس منظر میں کچھ کچھ یہ سچائی شامل ہے

کہ پہاڑی بربروں اور صحرائی سہناجیوں کی روح آزادصفت رہی ہے اسی کا مظہر یہ بغاوتیں رہی ہیں۔ رومی بھی انہیں زیرِنگیں نہیں کر پائے تھے اسی لئے وہ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں اکثر قلعہ بند رہے۔ وہیں زندگی گذارتے رہے لیکن اٹلس کے پہاڑوں کے اندرون دخل اندازی نہ کر سکے-اوراب عربوں کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی-

شہروں میں زندگی گذارنے والے عربوں اور چراگاہوں کے باسی بربروں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی پائی جاتی تھی۔کلاسیکی اسلامی تہذیب بنیادی طور پر شہروں کی پرداختہ رہی ہے۔لوگ قصبوں اور شہروں کی جانب چلے آتے، کچھ تحفظ حاصل کرنے کے لئے اور کچھ معاشی مواقع کی وجوہات کی بناء پر۔ ان شہری عربوں کی تنگ مزاجی اوراقتدار کے مظاہرہ کی وجہ سے بسا اوقات بغاوتیں ابھرتی رہتی تھیں۔ اس وقت کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے والے ان نئے نظریات کا افریقی عوام نے استقبال کیا جوکہ آمرانہ قوتوں کے خلاف ان کے غم وغصہ کا اظہار تھا۔مثال کے طور پر 900ء میں ایک فارسی خارجی رستم مغرب چلا آیا اور یہاں اس نے اپنا مرکز قائم کیا۔اس نے عباسی اقتدار کے علمبردار بنواغلب امیروں کو للکارا۔ مقامی بربراورسنہاجہ باشندوں کی مدد سے رستم ''سجل ماسا'' پر خارجی شاہی سلسلہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ خارجی ایک انتہا پسند فرقہ تھا ان کے نظریات سے اتفاق نہ کرنے والوں کا قتل ان کے نزدیک واجب تھا۔انکا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کا قائدہونے کا حق صرف سنی یا شیعہ کو ہی حاصل نہیں ہے-خلافت پر ہرایک فرد کا حق ہے چاہے وہ عربی ہو کہ عجمی بظاہر یہ جمہوری موقف بربروں کے کانوں کو بھلا لگا۔خاندان رستم کی حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک خارجیوں کے اثرات رکھنے والے چھوٹے چھوٹے علاقہ باقی رہے۔ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ شمالی وسطی افریقہ میں 1350ء تک خارجی قومیں باقی رہیں۔ ایک امریکی سیاح جان اسکولے نے اس قوم کے باقی ماندہ لوگوں کا ذکر کیا۔وہ اپنے سفرنامہ میں الجیریا میں ''غرواجہ'' کے اطراف بسنے والی قوم کے بارے میں لکھتا ہے۔

''عبادی مسلک کے ماننے والے............تنگ نظر،سخت دل مسلمان گیارہویں صدی میں جنوب کی طرف بھگادیئے گئے............ٹمبکٹو کا راستہ،،مصنف جان اسٹولے ناشر وکٹر گولناکس لندن 1956ء۔

اطلس کے جنوبی خطہ میں طاقتور سنہاجہ صدیوں سے اپنی بھیڑوں کی گلہ بانی کرتے آزادانہ گھومتے رہتے تھے۔اپنے آباءواجداد کی طرح اور بربر قوم اور عربوں کے درمیان طاقت کے دلال بنے ہوئے تھے اس طرح مغرب میں اقتدار کا ایک تکونا سابن گیا بربر،عرب اور سنہاجہ باشندوں کے درمیان جس طرح فارس اور وسط ایشیاء میں عربوں ، ایرانیوں اور ترکوں کے درمیان تعلقات کا تکونا بن چکا تھا۔کبھی کبھار افریقہ میں طاقت کے اس تکونے کے درمیان تیسرا عنصر بھی شامل ہوجاتا تھا وہ تھا سوڈانیوں کا جو کہ صحارہ کے زیریں خطہ میں آباد تھے انہیں اقشدیوں اور بعد میں فاطمیوں نے اپنی افواج میں بھرتی کیا تھا۔

شمالی افریقہ میں فاطمیہ طرز کے انقلاب کے لئے حالات سازگار ہو چلے تھے۔اغلبی حکمران حکومت کے معاملات سے زیادہ شراب اور شباب میں دلچسپی لینے لگے تھے۔قانون اور امن وامان کی حالت اس قدر خراب ہوچکی تھی کہ لوگ مہدوی کے نزول ہونے اور امن وامان بحال کرنے کی دہائی دینے لگے تھے۔ 907ء میں ابوعبداللہ جوکہ عباسیوں کے ہاتھوں دمشق گنوا چکا تھا۔شمالی افریقہ کی جانب عازم سفر ہوا۔ صرف اپنے اخلاق کی مقناطیسیت اور قوت مباحثہ کے ذریعہ طاقتور قطامہ قبیلہ کو فاطمی عقائد کا مقلد بنا دیا۔ 909ء میں اغلبی حکمراں زیادۃ اللہ کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ابوعبداللہ نے سلمانیہ پر چڑھائی کردی اور اغلبوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ شام میں رہائش پذیر فاطمی امام عبیداللہ کو دعوت دی جائے۔عباسیوں کے خفیہ جاسوس ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے ان سے بچتے بچاتے انتہائی مصیبتیں اٹھا کر آخرکار عبیداللہ مغرب پہنچ گئے۔انہیں سجلماسہ میں گرفتار کرلیا گیا۔لیکن ابوعبداللہ ایک طاقتور فوج کے ساتھ آگے بڑھا اپنے تجربہ کار ناصح وآقا عبیداللہ کو آزاد کرادیا اور یہ اعلان کردیا کہ جس مہدی کا عرصۂ دراز سے انتظار تھا وہ یہی عبیداللہ ہیں یہی امام مستور یعنی چھپے ہوئے امام ہیں یہی پہلے فاطمی خلیفہ ہیں۔

پہلے فاطمی خلیفہ عبیداللہ المہدی ایک قابل سپہ سالار، باصلاحیت منتظم اور چالاک لیکن بے رحم سیاست دان تھے۔ان کی رعایا چونکہ سنی عقائد سے وابستہ تھی اس لئے اکثریت رکھنے والے سینوں سے وہ رواداری برتتے تھے۔جدید تیونیسہ کے قریب انہوں نے اپنا نیا صدر مقام مہدیہ تعمیر کیا۔انہوں نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ تھا ابوعبداللہ کا قتل تاکہ آگے چل کر انکا کوئی مدمقابل نہ رہے۔تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

ابوعبداللہ کا بھی وہی انجام ہوا جیسا کہ ابومسلم کا ہوا تھا جس کا انتقال 750ء میں ہوا جس کو عباسیوں نے اقتدار سنبھالتے ہی قتل کر دیا۔ الجیریاء اور تیونیسیہ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد وہ مراقش کی طرف بڑھے اور دم توڑتی ہوئی ادریسیہ شاہی حکومت کو نکال کر باہر کیا(922ء)۔لیکن ان کی نظریں تو شمال مغرب میں اسپین اور مشرق میں مصر کے خوشحال ممالک پر گڑھی ہوئی تھیں۔

مراقش پر بنی فاطمہ کے قبضہ نے اسپین کے طاقتور اموی حکمران عبدالرحمٰن سوم کو چونکا دیا۔ وہ اسکا جواب دینے پر مجبور ہوگیا۔اسپین کے حکمران قرطبہ میں اپنی خلافت کا اور اسپین وشمالی افریقہ میں سنی اسلام کے محافظ ہونے کا اعلان کر دیا اس طرح بیک وقت خلافت کے تین دعویدار ابھر آئے یعنی اسپین میں قرطبہ،افریقہ میں مہدیہ،ایشیاء میں بغداد۔

934ء میں عبیداللہ کا انتقال ہوگیا۔ اسپین اور مصر پر فتح کے اس خواب کو پورا کئے بغیر انکا بیٹا عبد القاسم ایک مذہبی انتہاء پسند تھا اس نے اپنے طرز کے اسلام کو جبراً ہر ایک پر لادنے کی کوشش کی۔اسے صرف اس لئے یاد کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک زبردست بحری بیڑہ تعمیر کیا اور فرانس اٹلی اور مصر پر حملے کئے۔ان مہمات کے اخراجات سے نمٹنے کے لئے محصولات میں اضافہ ضروری ہوگیا۔حد سے زیادہ بڑھائے گئے محصولات کے خلاف بربروں نے بغاوت کردی۔اس بغاوت کا نشانہ سجلاسمہ تھا جو کہ خارجیوں کا مضبوط گڑھ مانا جاتا تھا۔بغاوت میں تیزی آتی گئی اور اسپین کے امویوں کی تائید بھی حاصل ہوگئی۔ابوالقاسم مہدیہ میں محصور ہوگیا۔ جہاں 946ء میں اسکا انتقال ہوگیا۔ 947ء میں اس کے بیٹے منصور نے سنہاج والوں کی مدد سے بغاوت کو فرو کرڈالا۔امویوں اور مراقشیوں کو سبق سکھانے کی نیت سے اس نے مغرب پر طوفانی حملہ کیا۔راہ میں جو کچھ ملا اسے روندتے ہوئے بحراوقیانوس کی ساحلوں تک جا پہنچا۔سوائے موریطانیہ کے شمالی افریقہ پر اس کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ابن خلدون کے مطابق فاطمیہ اور سنہاجیہ نے مغرب پر جو حملہ کیا اور تباہیوں،بربادیوں کی جو داستان چھوڑی اس کی وجہ سے مغرب پھر کبھی سر نہ اٹھا سکا۔شمالی افریقہ کے شہروں کی طاقت پورے طور سے ختم کردی گئی۔ان بربادیوں کی وجہ سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا شاید اسی سے مرابطون کا انقلاب نشوونما پایا جس نے جلد ہی مغربی افریقہ اور اسپین کو اپنے

دامن میں سمیٹ لیا۔بنو فاطمہ نے معز جس کا انتقال 975ء میں ہوا کے ماتحت اعلیٰ ترین کامیابیاں حاصل کیں۔معز نے سب سے پہلے اپنی توجہ مغرب کی طرف مرکوز کی۔ادھر اسپین کا اموی سربراہ عبدالرحمٰن سوم عیسائیوں کے ساتھ معرکہ آرائیوں میں مشغول تھا اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معز نے موریطانیہ پر قبضہ کرلیا۔سیوٹا تا نجیر سطح مرتفع کے چھوٹے سے علاقہ کو چھوڑ کر مغرب کے تمام علاقہ پر اپنا قبضہ کرلیا۔جب طاقتور اسپینیوں نے مغرب کی جانب اس کی پیش قدمی روک دی تو معز نے اپنی توجہ مشرق کی طرف مبذول کی یہاں کے حالات اس کے لئے سازگار تھے۔بغداد پر 945ء میں بویہ کے قبضہ کی وجہ سے بنو عباس اس قدر کمزور ہوگئے تھے کہ بنو فاطمہ نے مصر پر قبضہ کے لئے اسے ایک سنہری موقع تصوّر کیا اس وقت مصر اقشدیوں کے فوجی تسلّط کے ماتحت تھا یہ ایک ترک قبیلہ تھا جس نے طولینیوں کو 933ء میں اقتدار سے بے دخل کیا اور خود بغداد کے بنو عباس کے نام سے حکومت کررہے تھے۔اناطولہ کریٹ اور شام پر بازنطینی حملوں کی وجہ سے بحیرۂ روم میں عباسیوں کی طاقت اور کمزور ہوگئی۔بنی فاطمہ نے بربروں، سنہاجوں اور سوڈانیوں پر مشتمل ایک لاکھ سے زیادہ فوج کے ساتھ ترک سپہ سالار جواہر الرومی کی سرکردگی میں حملہ کیا۔ 969ء میں دریائے نیل کے ساحلوں پر خونین جنگوں میں اقشیدیوں کو شکست دے دی۔

فاتح فاطمی مصر میں داخل ہوئے اور فسطاط کے قریب 969ء میں ایک نئے صدر مقام کی بنیاد رکھی اس کا نام انہوں نے القاہرہ رکھا۔مصر پر قابو پانے کے بعد معز کی فوجیں شام میں پھیل گئیں۔اور 973ء میں دمشق پر قبضہ کرلیا۔بہت جلد مکہ اور مدینہ بھی اس کے زیر فرمان آگئے۔تقریباً ایک سو سالوں تک قاہرہ کے آزاد فاطمیوں کا نام مکہ اور مدینہ کے مقدس ترین مساجد میں جمعہ کے خطبات میں لیا جاتا رہا۔ان پورے سو سالوں کے دوران بغداد کے بنو عباس کا نام ان خطبات سے غائب رہا۔

یہ ضروری تھا کہ بنی فاطمہ ایشیاء کی فتح کی بھی کوششیں کرتے تاکہ ان کے نظریات کے مطابق عالمی اسلامی حکومت قائم ہو جس کی باگ ڈور فاطمی ائمہ کے ہاتھ ہو اور اس کی کوشش میں انہیں ناکام ہونا ہی تھا ان کی ناکامیوں کے کئی وجوہات ہیں۔بنو فاطمہ کا ایک باغی گروہ کرامتی بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ سنیوں کے ساتھ اگلی صف کے فاطمیوں کا سلوک انتہائی نرم ہے انہوں نے جس انقلاب کا خواب دیکھا تھا وہ پورا نہ

ہوسکا۔ بجائے اس کے فاطمیوں نے اپنی سنی رعایا کے ساتھ کام چلاؤ تعلقات قائم کر لئے۔ سوائے دو چار قابلِ استثناء واقعات کے اسی وجہ سے ناراض کرامتیوں نے شام میں فاطمیوں پر کئی ایک حملے بھی کئے اور دو مرتبہ مصر پر بھی حملہ کیا۔ انہیں زبردست شکست کھا کر واپس ہونا پڑا لیکن شام کے شمال میں جنگی اہمیت کے راستوں پر ان کا قبضہ برقرار رہا اور اس طرح وہ فاطمیوں کی جانب سے ایشیاء پر یورش کو کامیابی کے ساتھ روکتے رہے۔

دوسری وجہ تھی بویہ جو کہ عراق اور فارس پر قبضہ جمائے ہوئے تھے انہوں نے نظریاتی اختلاف کی وجہ سے فاطمیوں کا مقابلہ کیا۔ وہ فاطمیوں کو بے وفا اور غدّار سمجھتے تھے کیونکہ انہوں نے امام جعفرؒ کے بعد امام اسماعیل کی اتباع کی تھی حالانکہ بویہ بغداد پر قابض تھے لیکن انہوں نے سنیوں کے ساتھ کام چلاؤ تعلقات بھی قائم کر لئے تھے اور عباسیوں کو اقتدار سے دور بھی نہیں کیا تھا۔ تیسری وجہ از سر نو منظّم شدہ بازنطینی شہنشاہیت تھی جس نے اپنا طاقتور بحرہ بیڑا تعمیر کیا اور بارہا مشرقی بحیرۂ روم میں عباسیوں اور فاطمیوں کے اقتدار کو چیلنج کرتے رہے۔ تیسری وجہ تھی ایران اور وسط ایشیاء میں سلجوقیوں کی موجودگی، سلجوقی جو کہ ترک تھے فیصلہ کن طور پر عباسیوں کے حق میں تھے اس طرح طاقت کا توازن راسخ العقیدۃ اسلام کی طرف جھکا رہا۔

فاطمیوں کی زیر نگرانی مصر ترقیوں کی راہ پر گامزن ہوگیا نیل کی وادی اب ایک صوبہ نہیں رہ گئی تھی جو دور دراز واقع بغداد کو محصول ادا کرتی تھی اب وہ ایک وسیع سلطنت کا مرکز تھی جس کی سرحدیں دریائے فرات سے لیکر بحیرۂ اوقیانوس کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی تھی براعظم افریقہ اور براعظم ایشیاء کی بانہوں پر سوار ہوکر مصر اب شمالی افریقہ اور یورپ سے ہندوستان اور مشرق بعید کی جانب جانے والی تجارتی راہوں پر قابو رکھتا تھا گھانا سے مصر کی جانب سونے کا بہاؤ ہونے لگا جس کی وجہ سے مصری سِکّہ مضبوطی حاصل کر گیا۔ قاہرہ کے بازار مشرقی افریقہ ہندوستان، انڈونیشیا، چین کی مصنوعات سے بھرے پڑے تھے اِسکندریہ ایشیاء کے باہمی تبادلہ کا مرکز بن گیا اور عالمی سطح کا تجارتی مرکز ہوگیا طایر کے ولیم جیسے یوروپی سیاح مصر کی خوشحالی کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ مصر کی نزدیکی سے فائدہ اٹھا کر وینس کے اطالوی تاجر امیر بن گئے وینس کی دولت اور اقتدار میں اضافہ ہوا آگے چل کر ہونے والی صلیبی جنگوں میں جس کے آثار افق پر صاف دکھائی

دے رہے تھے ،ان کو اہم رول ادا کرنا پڑا مصر اور شمالی افریقہ جب ہاتھ سے نکل گئے تو بغداد پر کافی بُرا وقت آ پڑا۔ فاطمیوں اور بازنطینیوں نے بغداد کو بحیرہ روم سے کاٹ کے رکھ دیا۔اب بغداد کو چین اور ہند کے ساتھ تجارت کے لیے صرف بری دستوں پر منحصر ہونا پڑ رہا تھا۔مالی خسارہ کا مطلب ہے سیاسی اقتدار میں بھی خسارہ اور بغداد کے خلفاء مالیات کی فراہمی کے لیے اب زیادہ تر ترک سلاطین پر بھروسہ کرنے لگے۔یہ سلاطین دولت کی تلاش میں بار بار ہندوستان پر حملے کرنے لگے ۱۰۰۰ء اور ۱۰۳۰ء کے درمیان سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ مرتبہ حملہ کیا خلافت کی سرحدیں بغداد سے چند میل کے فاصلہ سے زیادہ نہ تھیں چونکہ اسلام کی ابتداء سے ہی فتویٰ دینے کا اقتدار علماء نے اپنے ہاتھ لے لیا تھا خلافت مسلمانوں کے گمشدہ اتحاد کی ایک نام نہاد علامت بن کے رہ گئی تھی سیاسی وسماجی حالات کا یہ پیمانہ سلجوقی ترکون کے عروج کے لئے ایک بنا بنایا زینہ ثابت ہوا یہ ترک خانہ بدوشی سے اٹھے اور ایشیاء کے آقا بن گئے۔

۹۹۶ء میں معز کا انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا العزیز مصر کا خلیفہ بنا وہ ایک پختہ کار حکمران اور اعلی درجہ کا منتظم تھا اس نے ایک مشہور مالیاتی نظام کے ماہر یعقوب بن خِلّص کو اپنا وزیر اعظم بنایا خلص نے حکومت کے دور دراز علاقوں کا مالیاتی نظام انتہائی قابلیت سے چلایا اس نے محصولات یعنی ٹیکس میں کمی کی تجارت کو بڑھاوا دیا، سکہ کو مستحکم کیا جس کی وجہ سے سلطنت خوشحال ہوگئی العزیز نے از سر نو منظّم ہونے والے بازنطینیوں اور اسپین کے امویون کے حملوں کی روک تھام کے لئے طاقتور بحری بیڑا تعمیر کروایا اس نے بربروں اور سوڈانی فوجیوں کے ساتھ طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ترک فوجیوں کو بھی اپنی فوج میں شامل کیا یہ وہ فیصلہ تھا جس کی وجہ سے آگے چل کر ترک فاطمی شاہی سلسلہ کو ختم کر کے خود حکومت کے مالک بننے میں کامیاب ہو گئے۔

العزیز کا وارث الحاکم ۹۹۶ میں خلیفہ بنا۔یہی وہ سال تھا جب کہ پوپ گریگوری پنجم نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگون کا آغاز کیا۔الحاکم ایک سنکی شخص تھا،اس نے اپنے قائم مقام برجاوان کو قتل کر دیا۔راستوں میں عورتوں کے چلنے پھرنے پر پابندی عائد کر دی، راتوں کو تجارت کرنے پر روک لگا دی۔ عیسائی اور یہودی اقلیتوں پر مظالم ڈھائے اور ۱۰۰۹ء میں کلیساؤں اور یہودی معبدوں کو مسمار کرنا شروع

کردیا۔اس کے والد نے ایک عیسائی سے شادی کر کے جس بے پرواہی کا مظاہرہ کیا تھا یہ اسی کا ردعمل تھا سنی مسلمانوں نے اس پر الزامات بھی لگائے کہ اپنی فوج کے ایک حصہ کی خرابیوں کو بھی وہ نظرانداز کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ الحاکم کی یہ ساری کاروائیاں اسی کا ردعمل ہوں۔شاید وہ اپنے درمیان بسنے والے عیسائیوں سے بدگماں بھی تھا کیونکہ ۹۹۶ میں ہی صلیبیوں نے شمالی افریقہ پر حملے شروع کر کے صلیبی جنگ کی ابتداد کر دی تھی۔

فاطمی ایک وسیع سلطنت پر تسلط رکھتے تھے۔لیکن بارہا انہیں اپنی رعایا کی اخلاقی دیانت داری اور مذہبی عقاید کے معیار سے مفاہمت کرنا پڑا۔قوم میں غالب اکثریتی رائے سنی اسلام کی تھی جو ہمیشہ سے قرآن، سنت الرسول اور صحابہ کے اجماع کے اصول پر متفق رہے۔یہی متفقہ اصول وہ مرکزی محور تھا جس کے اطراف اسلامی تاریخ گھومتی رہی۔حالانکہ کبھی کبھی مختلف الرائے کے دائرے بھی اہمیت جتاتے رہے۔ الحاکم کے سامنے دو چیلنج تھے۔آگے عیسائی یوروپ کا قومی چیلنج تھا تو پیچھے اس کو فاطمیون کے بڑھتے ہوئے مظالم کی وجہ سے سنیوں میں پنپتے والی بے چینی اور اضطراب کا سامنا تھا۔اس کا باپ العزیز ایک مصالحت پسند شخص تھا اس نے عیسائی عورت سے شادی کر کے باہمی روادارانہ راہ اپنانے کی کوشش کی تھی لیکن الحاکم سنیوں اور اثنا عشریوں کو فاطمیت اختیار کرنے کے لیے جبر کرنے لگا ان پر ظلم ڈھانے لگا۔۱۰۰۴ میں قاہرہ میں ایک دارالحکمہ قائم کیا گیا تاکہ فاطمی داعیوں کو ضروری تعلیم سے آراستہ کیا جاسکے۔تمام عالم اسلام میں فاطمی پرچار بہت زوروں پر تھا۔یہاں تک کہ آج کے پاکستان کے ملتان پر بھی اس وقت بنی فاطمہ کی حکومت رہی تھی،۱۰۵۸ میں کچھ عرصہ کے لئے بغداد کے قرب و جوار پر بھی انکا قبضہ رہا۔ایسی تمام کوششوں کا فوری جواب بغداد سے ملا جہاں کے عباسی خلیفہ قائم نے بنی فاطمہ کو علانیہ غدار قرار دے دیا۔

۱۰۱۶ میں دو فاطمی داعی حمزہ اور درزی ایران سے قاہرہ آئے۔انہوں نے تبلیغ کی کہ وہ آسمانی روح جو کہ حضرت علی ابن ابو طالبؓ اور دوسرے ائمہ میں تھی اب وہی روح یا ارواح الحاکم کے جسم میں بیکوقت حلول کر گئی ہیں اس طرح وہ خود اپنے آپ کو خدا کا مظہر قرار دینے لگا (نعوذباللہ)

نقشہ

مصر کے سنی مسلمانوں کو اس قسم کی تبلیغ سخت ناگوار گذری اسی لئے سنیوں کے خوف سے درزی بھاگ کر لبنان کی پہاڑیوں میں چھپ گیا جہاں کے باشندوں نے اس کے نظریات کا استقبال کیا اس طرح درزی کے پیروکار درروز آج کل لبنان اور شام میں پائے جاتے ہیں وہ الحکم کو خدائے تعالی کا مظہر مانتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کے خاتمہ پر اس کا پھر سے ظہور ہوگیا۔

اسلامی تاریخ میں سیاسی ظلم کے خلاف ردعمل کے طور پر نجات دہندگی کا تصور ایک عام عمل رہا۔ یہ عقیدہ کہ سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے لئے ایک امام مہدی کا نزول ہوگا، اسلامی دنیا میں جہاں تہاں الگ الگ روپ سے سر اٹھاتا رہا ہے۔ امام مہدی کے نزول کا عقیدہ سارے سنی اسلامی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ اثنا عشری اور اسمعیلی بھی اسے مانتے ہیں۔ لیکن یہ عقیدہ سوڈاں، ایران اور ہندوستان میں زیادہ شدت سے سر ابھارتا رہے ہے، انیسویں صدی عیسوی میں جدید سوڈان میں مہدی کا ظہور، انیسوی صدی میں ہی مشرقی آفریقہ میں عثمان دان فدائی کی تحریک، ہندوستان میں مہدی عقیدہ کی تحریک، اثناعشریوں کے بارہویں امام، سبائیوں کے ساتویں امام کا غائب ہوجانا یہ ساری تحریکیں اس کی مثالیں ہیں۔ نجات دہندگی کی اپنی اندھی گہری کھائیاں ہیں۔ اکثر مسلمانوں نے اس

نجات دہندی کو توحید کے حدود میں ہی برتا جس کی وجہ سے وہ اسلام کی مرکزی دھارے میں ہی رہے، روح کے حلول کر جانے والے فاطمی موقف کو جسے الحکم نے پیش کیا تھا سنی مسلمانوں نے کافرانہ عقائد کہہ کر مسترد کر دیا۔

الحکم کے ظلم کی وجہ سے بنی فاطمہ کا زوال تیزی سے ہونے لگا۔ مستنصر جسکا دور حکومت ۱۰۳۶ سے ۱۰۹۶ تک رہا، اس کے دور حکومت میں خانہ جنگیوں نے سر اٹھایا۔ فوج میں بربروں، سوڈانیوں اور ترکیوں کے درمیان رسہ کشی ہونے لگی۔

۱۰۴۶ء میں حجاز الگ ہوگیا اور مکہ و مدینہ کی مقدس مساجد کے خطبات سے فاطمی بادشاہوں کے نام نکال دیئے گئے۔ ۱۰۵۱ میں مرابطون انقلاب نے مغرب کو نگل لیا۔ ۱۰۹۰ء تا ۱۰۹۴ء کے دوران مصر زبردست قحط کا شکار ہوگیا جس کی مثال صرف بائبل میں ہی ملتی ہے، جس کی وجہ مصر کی مالی حالت خراب ہوگئی، صلیبی ابتداء سے ہی اسپین میں سرگرم تھے، یہاں سے وہ شمالی آفریقہ میں داخل ہوئے اس کے بعد مشرقی بحیرہ روم میں آگے بڑھے، ۱۰۷۲ میں سسلی کے پالیرمو پر صلیبی قابض ہوگئے۔ ۱۰۹۱ تک سسلی پر بازنطینی کامل طور سے حاوی ہوگئے۔ فاطمیہ کے اولین صدر مقام مہدیہ پر سمندر کی جانب سے حملہ ہوا۔ اسی دوران ادھر شام کے پہاڑی علاقوں کے لئے ترکوں اور بنی فاطمہ کے درمیان جنگ جاری تھی۔ سلجوق نے دمشق پر دوبارہ قبضہ کیا اور ایک بار پھر العریش کے علاقہ تک بنو عباس کا اقتدار قائم کر دیا۔ طغرل بے اور الپ ارسلان نے مصریوں کے قبضہ سے مشرق وسطیٰ کا سارا علاقہ واپس حاصل کر لیا۔ صرف عکرہ اور یروشلم پر وہ قابض نہ ہوسکے۔ فاطمیوں کا قبضہ اب صرف چھوٹے سے مرتفائی پٹی پر رہ گیا جو کہ یروشلم سے ہوکر گذرتی تھی۔ بنی فاطمہ اور سلجوقیوں کے درمیان اس آپسی محاذ آرائی کی وجہ سے مسلمان ان صلیبوں کے خلاف متحد محاذ نہ بنا سکے جنہوں نے ۱۰۹۹ء میں فاطمی فوج پر حملہ کر کے ان کے ہاتھ سے یروشلم چھین لیا۔ شکست کھا کر پیچھے ہٹنے والے فاطمیوں نے قتال کو بدلہ کا ذریعہ بنالیا۔ حسن صباح کے زیراہتمام قاتلوں کی زیرزمین تحریک نے اپنے چغہ میں چھپے مخفی خنجر کے ذریعہ چن چن کے مسلمان قائدین کا قتل کیا اور سلجوقیوں پر قہر ڈھایا۔

مستنصر کے بعد جس کا انتقال ۱۰۹۶ء میں ہوا فاطمی دربار قتل وغارت گری کا ایک طویل سلسلہ پیش کر

نے لگا۔ اقتدار وزیروں کے ہاتھ منتقل ہوگیا۔ جو سازشوں وقتل کے ذریعہ اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ۱۱۷۱ء میں آخری فاطمی خلیفہ العاضد کا انتقال ہوگیا۔ صلاح الدین نے فاطمی شاہی خاندان کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ مصر ایک بار پھر بنی عباس کے زیرنگیں آ گیا۔

تہذیبیں آپس میں ماورائے ادراک تصورات سے ہی متحد رہی ہیں۔ پہلے چار خلفائے راشدین کے بعد اسلامی تہذیب بلند تر توحید کے نظریہ سے ہٹ گئی۔ فاطمی اسی اعلی وعرفی تصورات کو ایک بار پھر اسلامی دنیا میں لے آنے کے وعدہ پر ہی برسر اقتدار آئے۔ انہوں نے آدھی اسلامی دنیا پر قبضہ بھی کرلیا لیکن وہ ایک وسیع سنی اسلامی دنیا پر حکمراں کرنے والا ایک اقلیتی طبقہ ہی بن کر رہے۔ اسپین کے امویوں نے انہیں چیلنج دیا۔ صحرا کا زیریں حصہ عباسی اقتدار کا وفادار رہا۔ ان تمام مخالف عناصر کے باوجود مصر میں فاطمیوں کے اقتدار نے اسلامی تہذیب کی ترقی میں ایک نیا سنگ میل قائم کیا۔ قرطبہ، قاہرہ اور بغداد کے بادشاہ خلافت پر دعوی جتاتے رہے اور ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے رہے یہ مقابلہ تھا یونیورسٹیاں قائم کرنے، علم کی اشاعت کرنے فنون لطیفہ اور تہذیب وتمدن کو ترقی دینے کا۔ ۹۶۱ء میں بنی فاطمہ نے جامعہ الازھر قائم کیا جو کہ دنیا میں اعلی تعلیم کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے۔ ہم یہاں یہ بھی تذکرہ کیئے دے رہے ہیں مراقش والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فیض میں قائم شدہ جامعہ قیروان دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے۔ اسے ۸۱۲ء میں قائم کیا گیا۔ بغداد، بخارا، سمرقند، نیشاپور، قاہرہ، پالیرمو، خیروان، سجلماسہ قرطبہ اور طولیدو کی یونیورسٹیاں اعلی ترین دماغوں اور استادوں کو اپنے اپنے یہاں لے آنے میں ایک دوسرے سے مسابقہ کر رہی تھیں فن کاروں، دستکاروں کو اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کرنے کے لئے اکسایا جاتا۔ مصر میں تیار شدہ ذربفت، پیتل کاری، دستکاری کی چیزوں کی مانگ سارے یوروپ اور ایشیاء میں تھی، وہ سسلی ہی تھا، جہاں سے اسلامی نظریات اور علوم یوروپ تک پہنچے۔ اسلامی تصورات کو یوروپ میں لے جانے میں اسپین کا رول بھی کچھ کم نہیں یہاں تک کہ صلیبی جنگوں کی انتہا کے دوران بھی لاطینی شہنشاہ مسلمان دانش وروں کو اپنے دربار کی زینت بنائے ہوئے تھے۔ سسلی کے بادشاہوں کے لیے مصر میں بنے صندوقوں میں دفنایا جانا بڑے فخر اور شان کی بات تھی۔ سسلی کے بادشاہ راجر دوم نے نہ صرف پالیرمو یونیورسٹی کو قائم رکھا

جس کو مسلمانوں نے قائم کیا تھا۔ بلکہ اس نے مشہور جغرافیہ دان الا دریس کو بھی اپنے دربار میں رکھا اس کی سرپرستی کی۔الا دریس اپنے دور کا مشہور دانش ور تھا۔

اسلامی تاریخ اس ولولہ انگیز اور پر جوش نظریہ سے بھری پڑی ہے جس کا مقصد ہے ایک ایسی آفاقی قوم کی تخلیق جسے حرام وحلال اور اچھے برے کی تمیز ہو،اور اللہ تعالی کی ذات پر یقین رکھنے والی ہو۔لیکن اس تصور کی تشریح کئی الگ الگ طریقوں سے ہوئی ہے۔شمالی آفریقہ میں بسنے والی بنی فاطمہ کا دعویٰ ہے کہ امامت کا شجرہ نسب صرف امام اسمعیلؒ سے ہی جاری ہے۔کرامتیوں کا تعلق بھی بنو فاطمہ سے ہی تھا۔لیکن وہ انتہاء پسند تھے انکا عقیدہ تھا کہ ان کے اپنے اسلامی نظریات کو مسلمانوں پر زبردستی لاگو کیا جائے اور ضرورت پڑے تو اس کے لئے طاقت کا استعمال بھی کیا جائے۔ بنی بویہ اثنا عشری تھے اور امامت کے اس نسب پر عقیدہ رکھتے تھے جنکا شجرہ امام موسیٰ سے جاملتا ہے اور پھر سنی تھے جن کی بے انتہا اکثریت تھی جو کہ سارے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے یہ سنی مسلمان بغداد کی خلافت کو ہی مانتے رہے۔دسویں صدی عیسوی کے دوران ان مختلف تصورات کا سیاسی و مذہبی میدان میں تصادم ہوتا رہا۔اسی ابتر صورت حال سے نپٹتے ہوئے صرف ترک کامیاب و کامران ابھرے، فاطمی امامت اور عباسی خلافت دونوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔انہوں نے مسلمانوں کا نیا سیاسی و مذہبی قصر تعمیر کیا لیکن اس دور میں ہونے والے مظالم نے آفریقہ میں ایک اور انقلاب کو جنم دیا، وہ ہے مرابطون انقلاب، جو الغزالیؒ کے مناظرہ کو متحرک کرنے اور جلا بخشنے کا باعث بنا،اس دور میں مسلمان اسلام کو جس نظریہ سے دیکھتے تھے الغزالیؒ نے اس نقطہ ءنظر کو ہی یکسر بدل ڈالا۔مختلف نظریات رکھنے والوں کی آپسی دشمنی کی وجہ،اندرونی رسی کشی کی وجہ سے یوروپ کو فتح کرنے کا جو آخری موقع مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا وہ جاتا رہا۔نویں اور دسویں صدی عیسوی کے دوران یوروپ تخیلات کے دور میں کھویا ہوا تھا۔ ہر طرف تعویزوں اور جادوٹونوں کے سوداگروں کا زور تھا جاگیرداروں اور نوابوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں پھیلی ہوئی تھیں ۸۱۱ء میں چارل کے مرنے کے بعد اس کے کردلین وارثین فرانکش سلطنت کے تخت کے لئے آپس میں لڑنے لگے،شمالی کی جانب سے وائکنگ کے حملے جاری تھے، حالت یہ تھی کہ جنوب کی جانب سے اگر حملے ہوتے تو یوروپ کسی بھی طرح سے اپنا دفاع نہیں کر پاتا تھا،اس

طرح اس وقت یوروپ فوجی طور پر غیر محفوظ تھا۔ فاطمیوں، عباسیوں اور امویوں کے آپسی باہمی جارحانہ کاروائیوں کی وجہ وہ زرین موقع ہاتھ سے نکل گیا جو تاریخ کے جھروکوں نے اسلامی دنیا کو دیا تھا۔ سسلی پر بنی اغلب کی فتح، پھر اس کے بعد ۸۴۶ء میں اٹلی پر ان کے حملے، ان کی لگاتار یورشوں سے مسلمان بنی اغلب کی سربراہی میں روم تک پہنچ گئے تھے، جنوبی یوروپ میں مسلمان پس اسی قدر آگے تک جا پائے فاطمی ،عباسی، اموی اور بنی بویہ کی فوجیں آپس ہی میں ٹکرا کر اپنی طاقت کو ختم کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان یوروپ میں اس سے آگے بڑھ نہ سکے۔

پچیسواں باب

اسپین اور عبدالرحمٰن سوم

اسپین اور عبدالرحمٰن سوم

تین، انتہائی شخصیتیں دسویں صدی عیسوی میں اسلامی دنیا پر حاوی رہے۔ یہ ہیں اسپین میں عبد الرحمٰن سوم، مصر میں معز اور ایشیاء میں محمود غزنوی۔ اولین دو شخصیتیں بحیرۂ روم کے علاقوں کے تاریخی واقعات کے بہاؤ کا رخ طے کرتے رہے جبکہ محمود غزنوی کا وسط ایشیاء اور برصغیر و پاک کے حالات پر فیصلہ کن اثر رہا۔

عبدالرحمٰن سوم اسپین کے اموی حکمرانوں میں سب سے قابل اور باکمال حاکم تھا۔ کم عمری میں قرطبہ کے علماء کی زیرنگرانی بہترین تعلیم حاصل کی۔ اپنی دانش وری کی وجہ سے علماء کا اصلی شہزادہ بنا اور علمی حلقوں میں مقبول ہوگیا۔ اسکے اخلاق اور مثالی برتاؤ کی وجہ سے درباری اور عوام دونوں اس کے فرمانبردار بن گئے۔ اسپین کا حکمران بننے کے بعد اس نے سب سے پہلا جو کام کیا وہ تھا ان تمام محصولات کا خاتمہ جو شریعت کے خلاف ہوتے تھے۔ یہ ٹیکس شاہی محل کے شاہانہ اور فضول اخراجات کو پورا کرنے کے لئے لاگو کئے گئے تھے اس حرکت کی وجہ سے کاشت کاروں اور تاجروں دونوں حلقوں کا مکمل اعتماد اسے حاصل ہوگیا۔ دوسرا اہم کام یہ کیا کہ اس نے اطاعت قبول کر لینے والے تمام باغیوں کی عام معافی دے دی۔

۹۱۲ میں جب تئیس ۲۳ سالہ نوجوان کی حیثیت سے عبدالرحمٰن تخت نشیں ہوا تو اسپین مرکزی اقتدار کی

کمزوری کی وجہ سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ جب عبدالرحمٰن تخت نشین ہوا تو اس بات کو پورے دوسو سال گذر چکے تھے جب کہ طارق اور موسیٰ جبل الطارق پر اُترے اور توحید کے نام پر اسپین کو فتح کیا۔ دسویں صدی عیسوی کے آتے آتے یہاں کے سرداراور امراء اللہ تعالیٰ کی محبت سے زیادہ دولت کے نشے میں ڈوب گئے تھے اب قبائلی عصبیت اور دولت کا لالچ انہیں آسمانی احکامات سے زیادہ بھانے لگا تخت پر بیٹھتے ہی اس نوجوان کو دواہم چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلا چیلنج تھا عرب امراء یا اشراف کا وہ طبقہ جو کہ وسی گوتھ کے قدیم پائے تخت طولیدہ کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھا۔ دوسرا بنی فاطمہ کا فوجی نظریاتی چیلنج تھا بنی فاطمہ کے دل میں اسپین کو فتح کرنے کی جو تمنا تھی وہ خواہش راز کی بات نہیں تھی۔

عرب امراء کی جانب سے جو چیلنج تھا وہ شمالی آفریقہ کی جانب سے ہونے والے حملوں کا فطری نتیجہ تھا۔ مسلم افواج لہر درلہر اسپین پر اترتی رہیں اور اپنے اپنے قبائلی سردار کی خواہش کے مطابق مختلف صوبوں میں قیام پذیر ہوتی رہیں۔ ''اس طرح سارا گوسا پر،، بنی ہود کا اقتدار تھا تو ذوالنون کے قبائلی طولیدہ میں بس گئے تھے۔ بنی عبداد سولے مین طاقتور فریق تھے، بربر غرناطہ پر قابو رکھتے تھے اور مشرقی یوروپ کے نووارد ''سلیوو یلنسیہ'' اور بحیرۂ رووم کے ساحلوں پر بس گئے۔ قرطبہ کا دربار اپنے اپنے قبائل سے وفاداری رکھنے والے افراد سے بھرا پڑا تھا۔ دھیرے دھیرے مختلف قبائل کے یہ سردار مخصوص مراعات کے حامل ہوگئے ان مراعات کو چھوڑنے کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔ صحراؤں کے جنگی سرداروں کی سخت محنت کشی اور سادہ طرز زندگی کی جگہ اب شہروں کے عیش وآرام سے بھرپور امیروں کی سی طرز زندگی نے لے لی۔ قرطبہ کا دربار دھیرے دھیرے ان مراعات شدہ افراد کا قیدی بن گیا۔ اس لئے جب عبدالرحمٰن نے محصولات ختم کر کے ان درباریوں کے مراعات کو موقوف کیا تو فوراً ایک بغاوت بھڑک اٹھی۔ خصوصیت کے ساتھ طولیدہ کے امراء زیادہ خفا تھے۔ جب سے طولیدہ کی بجائے قرطبہ پایہ تخت قرار پایا تھا ان کے دلوں میں قرطبہ کے خلاف نفرت کا لاوہ پک رہا تھا عبدالرحمٰن نے ہر ایک بغاوت کا خاتمہ انتہائی سختی سے کیا۔ جب اس نے تمام قبائلی سرداروں پر فتح حاصل کرلی تو پھر شکست کھانے والے ہر ایک امیر کے ساتھ فیاضانہ اور روادارانہ سلوک اختیار کیا جس کی وجہ تمام سردار اور امیر اس کے فرمابردار بن گئے۔ بویا سترو، بادیجوز،

زامورو، سمنکاس، اوسما اور طولیدہ ان تمام چھوٹی چھوٹی اور داخلی طور پر خود مختار ریاستوں کی بغاوتوں پر یکے بعد دیگرے قابو پالیا گیا- اس کے بعد اس نے اپنی توجہ شمال کی عیسائی علاقوں کی جانب مبذول کی- ان عیسائی سرداروں نے سرحدی علاقوں کے امیروں پر کئی بار حملہ کیا تھا اور سرحدی علاقوں کو تباہ و تاراج کر دیا تھا۔ عبدالرحمٰن نے لیون، کیسٹلے، ناورے،، غالیسیا اور آلوا پر بہترین طریقہ سے منصوبہ بند حملے کئے اور انہیں خراج دینے پر مجبور کر دیا-

لیکن فاطمی چیلنج اور زیادہ خطرناک تھا۔ فاطمیوں کا یہ نظریہ تھا کہ امام اسماعیلؒ کے ماننے والے ہی امت اسلامیہ کی امامت اور قیادت کی میراث کے اصل حقدار ہیں- اس لئے وہ بغداد کے عباسیوں اور قرطبہ کے امویوں کے انتہا پسند دشمن تھے- ۹۲۳ء تک انہوں نے سارا شمالی آفریقہ فتح کر لیا۔ مراقش اور الجیریا سے اِدریسی حکومت کا خاتمہ کیا اور اب ان کی نظر اسپین پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک غدار سردار عمر بن حفصون نے عیسائیت قبول کر لیا اور قرطبہ کی حکمرانی کو عام چیلنج دینے لگا۔ اس نے نہ صرف فاطمیوں سے مدد مانگی بلکہ شمالی عیسائی ریاستوں سے بھی امداد کی درخواست کی۔ عبدالرحمٰن اس وقت اپنے ادریسی حلیفوں کی امداد میں لگا ہوا تھا جو کہ فاطمیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے تھے۔ اس بغاوت کی وجہ سے اسے شمالی آفریقہ سے مجبوراً اپنی افواج کو ہٹانا پڑا۔

بنو فاطمہ نے عمر بن حفصون کی امداد کے لئے اپنا ایک بحری بیڑہ روانہ کیا لیکن عبدالرحمٰن کی بحری افواج نے اسکا راستہ روک کر اسے تباہ کر دیا۔ عمر بن حفصون اسپین کے مشرقی پہاڑوں میں پھنس گیا اور امن کی بھیک مانگی۔ عبدالرحمٰن نے اسے معاف کر دیا اور اپنی اطاعت گزار ایک چھوٹی سی ریاست کی سرداری اسے عطا کر دی۔

جب قبائلی اثرات کے ختم ہو گئے تو عبدالرحمٰن نے دیڑھ لاکھ جنگجو سپاہوں پر مشتمل ایک با قاعدہ پیشہ ورفوج ترتیب دی جو کہ شاید اس دور میں دنیا بھر کی سب سے بہترین فوج تھی۔ لیکن اس نے اس قبائلی طاقت کو تباہ کر دیا جو کہ اسپین کی اموی حکومت کی دوسو سالوں سے آبیاری کرتی چلی آ رہی تھی۔ ابن خلدون کا خیال ہے کہ قبائلی طاقت کے خاتمہ کی وجہ سے ہی آخر کار قرطبہ میں اسپینی خلافت کے خاتمہ کی ابتداء ہوئی۔

شمالی آفریقہ میں فاطمی خطرہ باقاعدہ سر پر منڈلا رہا تھا، ۹۱۰ء میں فاطمی عبیداللہ نے اپنے آپ کو مہدی اور تمام مسلمانوں کا خلیفہ قرار دے دیا۔ اس دور میں بغداد کی عباسی خلافت انتشار کا شکار تھی اور ترکی فوجی جنرلوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ ایران کے بنی بویہ عباسیوں کی حکومت کے اصل حکمران بن گئے تھے۔ بس صرف اپنا نام خلافت پر نہیں لکھوایا تھا۔ اس بات کے آثار پورے طور سے ظاہر تھے کہ بنوعباس فوجی اور سیاسی اقتدار کھو چکے تھے۔ ۹۲۹ میں عبدالرحمٰن نے اپنے آپ کو خلیفہ قرار دے کر امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ اصل میں یہ شمالی آفریقہ میں بنی فاطمہ کے سیاسی وفوجی عروج کا جواب تھا۔ اس طرح دسویں صدی عیسوی میں خلافت کے تین دعویدار ابھرے۔ ۹۵۳ء معز کے اقتدار سنبھالنے کے بعد جب اسنے ۹۶۹ء میں مصر پر قبضہ کرلیا تو طاقت کا توازن فاطمیوں کے حق میں ہوگیا۔ فاطمی افواج نے شمالی آفریقہ میں اسپینی حکومت کے مضبوط مراکز پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرنا شروع کیا۔ سیوٹا کے قریب ایک چھوٹی سی پٹی کو چھوڑ کر معز نے سارے شمالی آفریقہ کو فتح کرلیا۔ فاطیوں نے اندلس پر قبضہ کرنے کے خواب کو نہیں بھلایا تھا، وہ اسپینی جزیرہ نما کی اموی حکومت کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی بغاوت کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ ۹۵۵ء میں عبدالرحمٰن کی بحری افواج نے معز کے ان جہازوں کا راستہ روکا جو اندلس کے باغیوں کو امداد فراہم کررہے تھے اور چند جہاز غرق کردیئے جوابی حملہ کے طور پر معز نے سسلی میں اس کے گورنر حسن بن علی کو حکم دیا کہ وہ اسپین کے المیر اساحل پر یورش کرے اور اسے تباہ وبرباد کردے۔

اسپین کے امویوں اور مصر کے فاطمیوں کی باہمی دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں کا جنوبی یوروپ کو فتح کرنے کا آخری موقع برباد ہوگیا۔ نویں صدی عیسوی کے دوران فرانس کی کیارولین' شہنشاہیت کے بکھر جانے کے بعد یوروپ سیاسی انتشار کا شکار تھا۔ نارڈک وائکنگوں کے وحشیانہ حملوں کی وجہ سے شمالی اور وسطی یوروپ تباہ ہوگیا تھا۔ شمال کی جانب سے ہونے والے ان حملوں کی وجہ سے یوروپ جنوب کی طرف سے بھی کمزور ہو چکا تھا اور کسی بھی حملہ آور کے لئے نوالۂ تر ثابت ہوسکتا تھا۔ لیکن سنی امویوں اور شعیہ فاطمیوں نے اپنی طاقت یوروپ پر مرکوز کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ میں ضائع کی۔ سچ تو یہ ہے کہ بحیرۂ روم میں طاقت کے دو الگ الگ مراکز بن چکے تھے۔ جن کی ایک بنیاد قرطبہ میں تھی تو

دوسری قاہرہ میں، ان الگ الگ مراکز نے عیسائی بادشاہوں کو ان دونوں کو ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑا کرنے کا موقع فراہم کیا۔قسطنطنیہ کے یونانی بادشاہ کو کریٹ اور سسلی کے محاذ پر بنی فاطمہ کا سامنا تھا اس نے دونوں مسلم طاقتوں کے درمیان کشمکش کا احساس کرلیا اور اسپین کے عبدالرحمٰن سوم کے دربار میں اپنی سفارت بھیجی- جرمنی ،فرانس کے بادشاہوں اور اطالوی جزہ نما کے جاگیرداروں نے بھی اپنے اپنے سفیر دربار میں بھیجے اسپین جس کی قیادت عبدالرحمٰن کے ہاتھ تھی-اب وہ اسپین شمالی آفریقہ،جنوبی یوروپ اور مشرقی وسطی کے سیاسی وجغرفیائی تناظر کا اہم ترین بازی گاہ بن گیا-

نقشہ

عبدالرحمٰن ایک ماہر جنگجو، اعلی منتظم،عظیم معمار اور ایک انصاف پسند حکمران تھا، اس نے اسپین میں علاقائی سرداروں اور عرب قبائل کے آپسی بے کار لڑائیوں کا خاتمہ کیا تھا۔اسپین کو ایک سیاسی فوجی مرکزیت عطا کی، خیروان ،قاہرہ، بغداد، بخارا کے دانش وراس کے دربار میں جمع ہوگئے۔اس کے اپنے ذاتی کتب خانے میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں جمع تھیں۔ بادشاہ وقت کی دیکھا دیکھی امرائے سلطنت میں بھی اپنے اپنے ذاتی کتب خانوں کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔کوئی بھی قلم کار ادیب اور استاذ بیکار نہیں تھا۔عبدالرحمٰن کے زیر قیادت قرطبہ دنیا بھر کا سب سے بڑا وسیع المشرب،تمام مذاہب کا احترام کرنے والا عالمی شہر بن گیا جس کی

آبادی دس لاکھ سے کچھ اوپر ہی تھی۔ شہر میں ایک لاکھ سے زیادہ مکانات اسی ہزار سے زیادہ تجارت کے مراکز سات سو سے زیادہ مساجد اور سو سے زیادہ غسل خانے تھے، پختہ سڑکیں تھیں اور ان پر باقاعدہ نگرانی رکھی جاتی تھی۔ یہاں کے بازار دنیا بھر کے اشیاء سے بھرے رہتے تھے اور اندلوسی تاجر یوروپ و ایشیاء کے دور دراز علاقوں میں بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ زراعت پر خصوصی توجہ دی گئی جس کی وجہ سے اسپین زرعی جنت بن گیا۔ عبدالرحمٰن نے قرطبہ کے جامع مسجد کی توسیع کی اسے سجایا سنوارا۔ مدینۃ الزھرا اس کی مشہور ترین تعمیرات میں سے ایک ہے۔ یہ قرطبہ سے دو میل کی دوری پر تمام تر سنگ مرمر سے تعمیر کردہ ایک شہر تھا۔ یہ شہر اس قدر خوبصورت تھا کہ لوگ دور دراز علاقوں سے دیکھنے آتے اور مبہوت رہ جاتے۔

عبدالرحمٰن نے اپنے ملک پر تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ انتہائی رواداری سے حکومت کی۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی قانون کے تحت یکساں حقوق حاصل تھے۔ جہاں تک انصاف کا سوال ہے اس کے سامنے عوام اور شاہی گھرانے والے سب برابر تھے، جب اِس کے ایک بیٹے پر حکومت سے غداری کے لئے مقدمہ چلا اور ججوں نے سزا سنائی تو اس نے اپنے خاندان کی رائے کے برخلاف اس بیٹے کو سزائے موت دے دی۔ جب سزا دے دی گئی تو عبدالرحمٰن اس قدر غمزدہ ہوا کہ اس کے بعد کسی نے اس کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

۹۶۱ء میں عبدالرحمٰن سوم کی وفات ہوئی اسکو مدینۃ الزھرہ میں دفنا یا گیا۔ اس کے دور حکومت میں اسپین میں اسلامی تہذیب عروج کے انتہا پر پہنچ گئی اس سنہرے دور کا یہ عہد ساز زمانہ تھا۔

چھبیسواں باب

مرابطون انقلاب

مرابطون انقلاب تاریخ اسلام کی چند ایک صحیح معنوں میں عوامی تحریکوں میں سے ایک تحریک ہے، اسکا جنم افریقہ کی کوکھ سے ہوا اور اس نے دو براعظموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، افریقہ و اسپین کے تاریخی ارتقاء میں فیصلہ کن رول ادا کیا۔ یوروپی اور مسلم دانش وروں نے اسکا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ابن خلدون نے اقوام کے عروج وزوال کے نظریہ میں اسی کے بنیادی اصول کو اپنایا ہے۔ ابن خلدون کے مطابق ''عصبیہ'' (بنیادی یکجہتی) کی بنیاد پر ہی تہذیبوں کی گرفت مضبوط ہوتی ہے، اس گرفت کو مضبوط کرنے والے اقدار صحرائی خانہ بدوشوں میں بدرجہء اتم پائے جاتے ہیں۔ یہ خانہ بدوشی عامل کا کردار ادا کرتے ہوئے پرُانی تہذیبوں پر قابو حاصل کرتے ہیں، ان تہذیبوں میں نیا خون بھرنے کے علاوہ ایمانداری، راست بازی، بہادری، سچائی کی پاسداری جیسی صحرائی قبائلی خوبیاں بھی ان میں سموتے ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ وہ کسی علاقہ یا مقام پر سکونت پذیر ہو جاتے ہیں، شہر کے باسی بن کر پھر شہر کے گناہ بھرے ماحول میں یہ بھی رنگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے زوال انہیں آ گھیرتا ہے، صحرائی حملوں کی نئی لہر ایک بار پھر اس زوال پر روک لگاتی ہے، یہ ابن خلدون کا نظریہ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کا اسلامی شمالی آفریقہ اور اسپین اپنی سادگی اور سچائی کو شہروں کے گناہوں بھرے عشرت کدوں میں کھو بیٹھے۔ مرابطون انقلاب وہ صحرائی قبائلی

لہر ہے جس نے شہری بگاڑ پر قابو پالیا اور صحرائی عصبیت سے اسے ایک بار پھر سنوار دیا۔

اینجل جو کہ مارکسی تصورات کے معماروں میں سے ایک ہے وہ مرابطون انقلاب کو اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس کا نظریہ تھا مفلس صحرائی سنہاجہ قبائل شہر کے امیر اور اخلاقی طور پر تباہ حال لوگوں کو سزا دے کر ان کی دولت پر قبضہ کرنا چاہے تھے۔ جرمن مورخ میاکس وبر کا خیال ہے کہ صحرائی قبائل کی بغاوت اقتصادی اور مذہبی دونوں پہلوؤں کی حامل تھی۔

''ہمارا نظریہ ہے کہ مسلم معاشروں کے عروج وزوال کے اسباب قوم کے باطنی جدلیات میں پائے جاتے ہیں، اسلامی تاریخ، ایمان کے محور کے اطراف گھومتی ہے۔ اپنی زندگیوں کو اپنے ایمان کے احکامات کے مطابق سنوارنا وہ واحد تحریک ہے جو بار بار مسلمانوں میں ابھرتی رہی ہے۔ ایسی تحریکوں میں بھی جہاں جدوجہد کا بنیادی سبب بیرونی عمل ہی کیوں نہ رہا ہو جیسے کہ انیسویں صدی عیسوی میں یوروپی نوآبادیات کے خلاف مغربی آفریقہ کی جدوجہد یا بیرونی استعماریت کے خلاف جدوجہد بھی کیوں نہ ہو یہ تمام تحریکات مذہبی لبادے میں ہی لپٹی ہوئی تھیں''۔

اس عالمی جدوجہد کا ماخذ صرف ایک ہے وہ ہے ایسے خالص اسلامی معاشرہ کا قیام جسکا بنیادی مقصد حرام سے اجتناب اور حلال سے قربت ہو۔ اس سعی اور جدوجہد کے لیے رہنما اصول وہی ہیں جن کا ماخذ قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جن پر تمام امت کا اجماع ہے، ایسی تحریکات بھی جو کہ بیرونی اسباب کی چنگاری سے بھڑکتی ہیں۔ ان کی جدوجہد کا وجود بھی آخر کار ایمان والوں کے اجماع میں جا کر ضم ہوتا ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں مغرب بے چینیوں سے بھرپور تھا۔ پچھلی صدی میں مصر کے بنی فاطمہ کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم سے ابھی وہ سنبھل نہ پایا تھا۔ عربوں بربروں کی اکثریت نے جو کہ سنی تھے بظاہر فاطمی حکومت کے سامنے سر توجھکا دیا لیکن انہوں نے دل سے اسے قبولیت کا درجہ نہیں دیا اس دوران انتہا پسند خارجیوں نے جنوبی الجیریا میں اپنی حکمرانی قائم کر لی اور بے شمار افراد کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو گئے فاطمی اور خارجی دائرہ کے افراد نے عقائد کی تبدیلی کے لئے جب حد سے زیادہ دباؤ بڑھانا شروع کیا تو اس کی وجہ سے سنی اسلام کا مرکز حرکت میں آ گیا اس طرح فاطمی اور

خارجی تحریکات نے جو نظریات پیش کئے تھے جس کی قبولیت کے لئے وہ جدوجہد کرتے تھے اس کا سامنا کرنے لئے یہ مرابطون انقلاب اٹھا، جو کہ اصلاحات کی تمنا رکھنے والے اور سنی اسلام کی سر بلندی چاہنے والے عوام کی خواہشات کا آئینہ تھا۔ سنی اسلام ان کے دلوں کی آرزو تھا۔

موریطینیہ کا علاقہ جہاں سنہاجہ بستے ہیں، اس مرابطون تحریک کا گہوارہ بنا۔ لفظ مرابطون رباط سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے سرحد کی حفاظت کرنے والا قلعہ ۱۰۳۵ء میں سہناجہ کے قائد یحیٰ بن ابراہیم نے حج ادا کیا۔ مکہ سے واپسی پر اس نے خیروان کی عظیم درسگاہ میں قیام کیا جو کہ مالکی مسلک کے فقہ کا مضبوط گڑھ ہے۔ یحیٰ بن ابراہیم نے یونیورسٹی کے منتظم اعلی ابوعمران الفارسی سے درخواست کی کہ ان کے کسی شاگرد کو موریطینیہ بھیجا جائے۔ ابوعمران نے اپنے ایک پرانے شاگرد عبداللہ بن یٰسین کا انتخاب کیا واپسی پر ان کا کاروان الجیریا کے ان علاقوں سے گذرا جہاں خارجی جیسے باغی حریف جماعتوں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ عبداللہ بن یٰسین کو بہت تشویش ہوئی اس نے عہد کیا کہ وہ مغربی افریقہ میں سنی اسلام کو از سر نو بحال کرنے کے لئے جدوجہد کرے گا۔

مغرب بے اطمنانی سے شرابور تھا اور اس بہترین موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرابطون نے اس علاقہ میں تیزی کے ساتھ اپنی گرفت مضبوط کر لی ۱۰۵۱ء تک خیروان کے مغرب کا سارا علاقہ ان کے زیر تسلط آ گیا۔ انتظامی سہولت کے لئے عبداللہ بن یٰسین نے، سینگال، موریطینیہ اور جنوبی مراکش پر مشتمل جنوبی حصہ کو سیدھے اپنے زیر انتظام رکھا اور شمالی اور بحیرہ روم کے نشیبی علاقوں کو اپنے چچیرے بھائی یوسف بن تاشقین کے زیر کمان دیا۔ اس وقت شمالی آفریقہ ایک سیاسی اتحاد کے عمل سے دوچار تھا تو ادھر اسپین بکھرنے کے عمل سے دوچار تھا۔ اس بات کو اب تو پورے تین سو سال گذر چکے تھے جب طارق اپنی فوج کے ساتھ جبل الطارق پر اترا تھا، یوروپ اور آفریقہ کو الگ کرنے والے آبنائے کو جن کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا انہیں آگ لگا دی تھی اور فوج کو یہ حکم دیا تھا کہ توحید کے نام آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

وہ ایمان جس نے ۷۰۷ء میں طارق کو یوروپ کے اندر گھس جانے کی طاقت عطا کی تھی ۱۰۵۱ء کے آتے آتے کمزور پڑ چکا تھا اور اس کی جگہ سیاست اور موقع پرستی نے لے لی تھی ۱۰۳۲ء میں اموی خلاف ختم

ہوگئی ان جگہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم سلطنتیں ابھر آئیں جو اپنی اناء اور اقتدار کے لئے آپس میں ہی الجھی ہوئی تھیں۔ ایمانی عقائد نے جو اتحاد بخشا تھا جو بھائی چارگی دی تھی ان کی جگہ قبائلی اور خاندانی مفاد پرستی نے لے لی تھی۔ وہ اعلی اور برتر عقیدے جس کی بنیاد صرف اور صرف توحید پر ہے اس کی جگہ خاندان یا قبیلہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح اسپین اب ایک ایسے شیشے کی طرح تھا جس میں بال آچکا تھا جو کہ اب چور چور ہونے کے لئے تیار تھا۔

اس دوران یوروپ میں ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن دوم نے یروشلم کی آزادی کے لئے صلیبی جنگوں کا اعلان کر دیا۔ صلیبیوں نے سب سے پہلے اسپین، سسلی اور شمالی آفریقہ پر حملہ کیا۔ قرطبہ میں خلافت کا خاتمہ اور اسی دوران فاطمی اقتدار کا زوال، ان حالات نے یوروپی طاقتوں کو اپنی قوت کے مظاہرہ کرنے کا بہت ہی اچھا موقع دے دیا۔ روجر دوم نے سسلی پر قبضہ کرلیا جس کی وجہ سے فلسطین پر حملے کے لئے ایک ضروری اڈہ فراہم ہوگیا۔ ۱۰۶۰ء میں صلیبوں نے شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں پر حملہ کیا لیکن مرابطون کے عروج کی وجہ سے صلیبی فتح ہونے والے علاقوں پر اپنی گرفت برقرار رکھ نہ سکے۔ لیکن یہ تو صرف ضمنی حملے تھے۔ پہلی خونین صلیبی جنگ تو اسپین کی سرزمین پر لڑی گئی۔ فلسطین، شام اور شہر یروشلم پر حملہ کرنے سے پچاس سال پہلے اسپین ہی پہلا ملک تھا جہاں ہلال اور صلیب کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔ یہیں اولین خونین جنگوں میں ہلال وصلیب ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئے۔ جب صلیبوں نے اپنا کھاتہ تیار کیا تو تین سو سالوں بعد سب سے پہلے اسپین پر فتح یاب ہوئے اور وہ اسلام کی آغوش سے نکل گیا صلیبیوں کا اولین کھاتہ یہیں کھلا۔

اسپین میں صلیبی جنگوں کی ابتداء ۱۰۱۷ء میں ہوئی کلیساء نے برگنڈی فرانس کے سورماؤں کو اکٹھا کیا اور مقامی صلیبیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے اسپین میں گھس پڑے۔ ۱۰۲۶ء میں سانچو نے کیسٹلے پر قبضہ کیا اور اسے اپنی سلطنت کا صدر مقام بنالیا۔ اس کے بعد فرڈیناڈ اول: ۱۰۲۷ء میں لیون پر فتح یاب ہوا۔ ۱۰۶۳ء تک سانچو نے دریائے ڈیورہ کے شمالی حصہ پر اپنا اقتدار کامل طور سے قائم کرلیا۔ یہ علاقہ لزبن سے بحیرہ روم کے ساحل پر واقع بارسلونا کے میڈرڈ تک قوس کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ۱۰۶۵ء میں اس کی موت ہوئی لیکن اس وقت تک فرڈیناڈ نے سرگوسا، طولیدو، سویلے اور بڈے جوز کی مسلم ریاستوں

کوخراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔لیکن ابھی یہ تو صرف ابتداء تھی۔اس کے بیٹے الفانسو چہارم کے دور حکومت میں ہی عیسائیوں نے زبردست پیش قدمی کی۔۱۰۸۵ء میں الفانسو نے قدیم شہر طولیدو پر قبضہ کرلیا۔ اس قدیم صدر مقام کی بڑی لائبریریاں اور درسگاہیں عیسائیوں کے ہاتھ آ گئی۔''طولیدو سے ابھرنے والی دانشورانہ تحریک اس سلسلے کا اولین باب تھا جس کے ذریعہ قرون وسطیٰ کے یوروپ کو جو کہ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا جہالت کے ان اندھیروں سے آزادی ملنے والی تھی''۔

طولیدو کی شکست کی وجہ سے ردعمل کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا- یوروپ میں مسرتوں کی لہر دوڑ گئی مسلم اسپین میں خطرے کی گھنٹیاں لگیں۔لیکن مسلمان ریاستیں آپس میں ہی فضول دشمنی میں الجھی ہوئی تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ عیسائیوں کے خلاف متحد ہو کر مزاحمت نہ کر سکے۔اسی دوران مرابطون انقلاب شمالی افریقہ سے سرعت کے ساتھ گذرتے ہوئے اسپین کے در پر دستک دے دیا تھا۔مرابطون جس خالص ایمان کی حمایت کا بیڑہ لے کر اٹھے اس کی زبردست گونج اسپینی مسلمانوں کو سنائی دینے لگی۔اندلس کی آبادی امیروں کی جانب سے عائد کردہ ظالمانہ محصولات کے بوجھ تلے کراہ رہی تھی، یہ محصولات انہوں نے شان وشوکت سے سجے درباروں کے اخراجات پورے کرنے اور عیسائی حکومتوں کو اخراج ادا کرنے کے لئے عائد کرر کھے تھے۔علماء نے اس بات کا احساس کرلیا کہ اب صرف ایمان کی تازگی سے ہی صلیبیوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔اندلس کے تمام علماء سویلے میں اکٹھا ہوئے اور امیروں پر دباؤ ڈالا کہ وہ مرابطین سے مدد مانگیں،طولیدو کے ہاتھ سے نکل جانے کے ایک سال بعد ۱۰۸۶ء میں سویلے غرناطہ اور بدے جوز کے امیروں نے یوسف بن تاشقین کے پاس ایک سفارت بھیجی اور مداخلت کی درخواست کی-

مرابطون تحریک کے شمالی پہلو کے قائد یوسف بن تاشقین ،اسپین کے حکمرانوں کے آپسی اختلافات سے اچھی طرح واقف تھا۔ پہلے تو اس نے ان جھگڑوں میں کود پڑنے سے بچنا چاہا۔لیکن علماء کی جانب سے بار بار کی جانے والوں درخواستوں کی وجہ سے وہ پگھل گیا۔۱۰۸۶ء میں اس اسی ہزار فوج کے ساتھ آبنائے کو پار کیا۔ بربروں،سہناجاؤں اور افریقیوں پر مشتمل اس کی افواج شمالی آفریقہ کے معرکوں کی وجہ سے،جنگوں کیلئے مکمل طور سے تیار ہونے کے علاوہ ایمان کی دولت سے بھی سرشار تھیں۔ان میں سے کچھ فوج ٹمبکٹو اور

گاوا جیسے دور علاقوں سے آئی تھیں۔ابن خلدون کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں جو فوجی چالیں سکھائی تھیں مرابطون افواج انہیں کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔وہ ایمان کے استحکام کے لئے لڑ رہی تھیں،اور فتح یاب ہونے تک پیچھے پلٹنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔سویلے،غرناطہ اور بدے جوز کی افواج بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئیں۔اس طرح مسلمان سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔

اس دوران الفانسو چہارم اور اس کے صلیبی سورما سارا گوسا کو تاخت وتاراج کررہے تھے۔مرابطون کی آمد کے بارے میں سنتے ہی وہ مڑ کر آگے بڑھ آیا۔دونوں افواج کا آمنا سامنا بدے جوز کے قریب ضلاّ قہ کے میدانوں میں ہوا۔اب تک یوروپ کے سورماؤں کو زبردست زرہ پوشی کا فائدہ حاصل تھا۔لیکن یوسف بن تاشقین اپنے ساتھ ترک تیر اندازوں کو لے آیا تھا جن کے ساتھ طاقتور کوساک کمانیں تھیں۔ آفریقی افواج نے ہپو کی ہڈیوں سے بنی ڈھالیں پہنی ہوئی تھیں فولاد سے بنے لمبے نیزوں سے مسلح ہوکر افریقی طبل جنگ کی آوازوں کے ساتھ جب انہوں نے دیوانہ دار حملہ کیا تو دھرتی کانپ اٹھی،آسمان لرز اٹھا زبردست جنگ چھڑ گئی۔صلیبیوں کو خوفناک شکست فاش ہوئی ان کی ۸۰۰۰۰(اسی ہزار) فوج اور ۲۰۰۰۰(بیس ہزار) سورما موت کے گھات اتار دیئے گئے۔الفانسو چہارم بذات خود زخموں سے چور چور ہوگیا لیکن اپنے محافظ کے ساتھ رات کی تاریکی میں بچ کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔اس فتح کے بعد مال غنیمت کے لئے اسپینی امیر ایک بار پھر آپس میں الجھ پڑے۔اسپین کے مسلمان امیروں کی اس دنیا پرستی سے مایوس ہوکر یوسف بن تاشقین واپس آفریقہ لوٹ گیا۔

الفانسو چہارم نے مدد کے لئے عیسائی یوروپ کی جانب توجہ مبذول کی۔ایک سال کے اندر ہی وہ ایک بار غارت گری پر اتر آیا۔اس کا لائق فوج سالار السڈ عربی لفظ یا سدی یا السید سے ماخوذ ہے،راڈریگو ڈیاز ڈی بوار، نے سرگوسا اور ویالنسیا پر قبضہ جمایا۔اس کے دوسرے سورما گادسیا جمینیز مسلمانوں کے علاقوں کو تباہ وتاراج کرتا ہوا سویلے تک پہنچ گیا۔سویلے کا امیر معتمد ایک عالم اور مذہبی شخص تھا وہ عیسائیوں پر روک لگا نہ سکا مایوسی کے عالم میں اس نے ایک بار پھر شمالی آفریقہ کی جانب مدد کے لئے نظر کی۔

۱۰۸۹ء میں یوسف بن تاشقین نے دوسری مرتبہ اسپین میں دخل اندازی کی سویلے،غرناطہ، ملاگا،

مرسیہ اور بدے جوز کے امیروں نے اپنی اپنی جانب سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ جنگ کی تیاریاں ہو چکیں۔ السڈ، الفانسو چہارم سے آن ملا اور دونوں مرابطون کے ڈیروں کی جانب بڑھے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اندلسی امیروں کے درمیان ایک بار پھر فساد شروع ہوگیا۔ ان تقسیم شدہ افواج کے ساتھ یوسف بن تاشقین صلیبیوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ آفریقہ لوٹ آیا۔ اب کے اس نے فیصلہ کرلیا کہ ان اندلسی امیروں کو بے دخل کر کے اسپین کو مرابطون سلطنت میں ضم کرلے گا۔

۱۰۹۰ء میں یوسف بن تاشقین نے تیسری مرتبہ یوروپ کے اندر دخل ہوا۔ اس نے سب پہلے غرناطہ اور ملگا کے ان امیروں کو اقتدار سے اتارا جنہوں نے عین جنگ کے موقع پر اس سے غداری کی تھی۔ المعتمد نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا کہ اب اس کی باری ہے۔ اپنی امارت کو محفوظ رکھنے کے لئے اس نے الفانسو چہارم کے ساتھ معاہدہ کی پیش کش کی۔ لیکن مرابطون نے اس کے قاصد کو راہ میں ہی گرفتار کرلیا۔ المعتمد کو اس کے اہل خاندان کے ساتھ شمالی آفریقہ جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ ۱۰۹۵ء میں وہ شہر اغمت میں قلاش ہوکر مرگیا۔ وہ تاریخ میں ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی غمگین شاعری سات سو سال بعد مغل شہنشاہیت کے آخری تاجدار بہادر شاہ کی شاعری سے ملتی جلتی ہے۔

نقشہ

مرابطون نے اندلس فتح کرلیا۔ شمال میں وہ طولیدہ تک پہنچ گئے تو مشرق میں بارسلونا تک ان کا قبضہ

تھا۔الفانسو چہارم اوراس کے صلیبی سورما یکے بعد دیگرے شکست کھاتے گئے۔لیکن السڈ باقاعدہ یوسف بن تاشقین کے خلاف ڈٹا رہااور بحیرہ روم کے ساحلوں کی جانب مرابطون کے بڑے حملے کا کامیابی ساتھ مقابلہ کیااورانہیں ساحلوں تک پہنچنے سے روک دیا۔۱۱۰۶ء میں یوسف بن تاشقین کا انتقال ہوگیا۔۱۱۰۹ء میں الفانسو چہارم نے بھی آخری سانس لی۔

یوسف بن تاشقین اورالفانسو چہارم کے درمیان جنگ جاری تھی جب اسی دوران فلسطین میں پہلی صلیبی جنگ اپنی انتہا پرتھی جس کے نتیجے میں آخرکار۱۰۹۹ء میں یروشلم ہاتھ سے نکل گیا۔گیارھویں صدی عیسوی میں اسپین میں جاری سماجی بگاڑ اورعیش کوشی کے خلاف مرابطون ایمان کی پاکیزگی وروئیدگی کے عروج کی نمائندگی کرر ہے تھےانہوں نے اندلس کے مسلمانوں کومزید ایک سوسالوں تک بچائے رکھااور صلیبیوں کو پائیرانیس کے پہاڑوں کےاس پارفرانس میں دھکیل دیا۔آفریقہ کی کوکھ سے ابھرنے والے یہ مرابطون نہ ہوتے توصلیبی،مشرقی بحیرہ روم،شام،مصراورفلسطین میں مسلمانوں کواورزیادہ نقصان پہنچا چکے ہوتے۔مرابطون انقلاب کے معماروں میں سےایک یوسف بن تاشقین کواسپینی صلیبوں کے خلاف اسلامی دنیا کادفاع کرنے والی اہم ترین شخصیت کی حیثیت سے ہمیشہ یادکیاجاتارہاہے۔

ستائیسواں باب

اور قرطبہ جاتا رہا

لفظ ''صلیبی جنگ'' سنتے ہی مسلمانوں کے ذہن میں یروشلم اور صلاح الدین ایوبی کا تصور ابھر آتا ہے ۔جبکہ اولین صلیبی جنگ کا مرکزی کردار یروشلم ہی تھا لیکن ایک وسیع نقطہءنظر سے دیکھا جائے تو یہ دو تہذیبوں قرون وسطی کی عیسائیت اور اسلام کے درمیان راست ٹکراؤ تھا اس ٹکراؤ میں اسپین اور شمالی آفریقہ کے واقعات بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں نے یروشلم پر پھر سے قبضہ جما لیا اور مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط برقرار رکھا۔قرون وسطیٰ کے یوروپ نے اسپن اور پرتگال میں فیصلہ کن سبقت حاصل کرلی۔ان علاقوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانا ایک ایسا سانحہ ہے جسکا اثر تاریخ عالم میں آگے چل کر رونما ہونے والے واقعات پر مکمل طور سے پڑا۔

۹۲۹ء تا ۱۰۳۲ء تک قرطبہ میں اموی خلافت کے زیر نگین اسپین ایک تہذیب یافتہ اور شہری معاشرہ بن گیا۔اور فنون لطیفہ،سائنس اور تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے میدان میں وہ دنیا کی قیادت کررہا تھا۔مردانگی، بہادری،قوت، روحانیت' قیادت اور اتحاد جیسی بنیادی خصوصیات شہری زندگی کی آسائشوں میں کھوگئیں یہی وہ خصوصیات تھیں جنکی وجہ سے اسپینی مسلمانوں نے شمال کی جانب سے درپیش عیسائی خطرہ کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ وہ اس میں کامیاب وکامران بھی ہوئے ۔وقت کے ساتھ تنزلی نے اپنے قدم جما لئے اور ۱۰۳۲ء میں اموی خلافت بکھر گئی اسپین کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گیا سرگوسہ،طولیدو،سولے،ملاغا،غرناطہ،المیریا،

دینیہ،اورویلنسیہ پر بالکل معمولی سی فوجی طاقت رکھنے والے امیر حکمران بن گئے اموی خلافت کا زوال عیسائی صلیبیوں کے لئے ایک اشارہ تھا کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنی کاروائیوں کا آغاز جنوب میں بھی کر دیں۔

خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور اس انتشار کی وجہ سے اسپین کے وسیگوتھ سلسلے کا قدیم صدر مقام طولیدو ۱۰۸۵ء میں کیاسٹیلے کے الفانو چہارم کے ہاتھوں میں آ گیا-

اندلس کی چابی شمالی افریقہ کے ہاتھ تھی مغرب میں اٹھنے والی اصلاحی تحریکوں کی وجہ سے مسلم اسپین اِستفادہ حاصل کرتا رہا۔ بربر ومملوک محافظوں کے ذریعہ مغربی حکومتوں میں نیا خون شامل ہونے کی وجہ سے بھی مسلم اسپین مسلسل فائدہ حاصل کرتا رہا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں مرابطون انقلاب آندھی کی طرح شمال مغربی افریقہ پر چھا گیا اور اندلس کے جزیرہ نما میں داخل ہوگیا اسپین میں مرابطون کی دخل اندازی شروع ہوگئی یوسف بن تاشفین کی سرکردگی میں مسلمانوں نے اپنا کھویا ہوا کافی علاقہ حاصل کرلیا اور اندلس کے بڑے علاقے پر ایک بار پھر حکمران ہوگئے لیکن شمالی افریقہ کے حالات نے ایک بار پھر اسپین کو بہت زیادہ متأثر کیا۔

۱۰۹۹ء میں پہلی صلیبی جنگ میں یروشلم کے ہاتھ سے چلے جانے سے مغرب میں ایک نئی اصلاحی تحریک نے جنم لیا۔۱۱۳۰ء تا ۱۱۴۰ء کے دہے میں المحد ثین نے مرابطون کو بے دخل کیا اور شمالی افریقہ میں اپنی جگہ مستحکم بنالی،مغرب میں ہونے والا یہ انتشار صلیبیوں کے لئے اک اشارہ تھا، پوپ یوگین سوم نے دوسری صلیبی جنگ کا اعلان کیا اس نے تین فوجی محاذ کھولے،شام کے خلاف دمشق پر،شمالی آفریقہ میں تریپولی پر، یوروپ میں اندلس پر حملے شروع کردئے دمشق اور تریپولی نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کرکے صلیبیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا لیکن ادھر لزبن (عربی زبان کا ھشبونلہ) مفتوح ہوگیا صلیبیوں نے ۱۱۴۵ء میں شمالی پرتگال پر قبضہ کرلیا۔

المحد ث نے پچاس سالوں تک عیسائیوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔۱۱۸۷ء میں جب سلطان صلاح الدین نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کرلیا تو مسلم دنیا فوجی حیثیت سے اعتماد باہمی ربط اور عروج کی جانب بڑھنے لگی۔۱۱۹۲ء میں ادھر مشرق میں محمد غوری نے دھلی پر فتح حاصل کی۔مغرب میں ۱۱۹۶ء میں

الارکوس کے میدان جنگ میں الموحدین نے صلیبیوں کو عبرت ناک شکست دی لیکن یہ باہمی میل اور ربط کافی دیر تک برقرار نہ رہا الارکوس کی جنگ کے بعد جلد ہی شمالی افریقہ داخلی انتشار کا شکار ہوگیا تیرھویں صدی عیسوی کے پہلے دہے میں جنوبی مراقش میں چھوٹی چھوٹی حقیر سلطنتوں نے الموحدین کی جگہ لے لی نتیجہ یہ ہوا کہ الموحدین کو افریقی ساحل کے قریبی علاقوں سے نفری اور مالی فراہمی کم ہوگئی عیسائی اسی قسم کے موقع انتظار میں تھے۔۱۲۱۲ء میں لیون، کیاسٹلے، پرتگال اور اراگون کی مشترکہ افواج نے الموحدین پر حملہ کردیا۔ انہیں فرانس اور جرمنی کے صلیبیوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔صلیبیوں نے الموحدین کے خلاف لاس نواس ڈی طلوسا کی جنگ میں فیصلہ کن فتح حاصل کی۔

ایشیاء میں بھی حالات انتہائی سنگین ہوگئے۔چنگیز خان نے ۱۲۱۹ء لے کر ۱۲۲۲ء تک وسط ایشیاء اور ایران کو تاخت وتاراج کردیا۔ بغداد پر بھی خطرے کے بادل منڈلانے لگے ایشیاء کے اہم شہروں کی بربادی کا مطلب تھا مسلمانوں کی فوجی طاقت کا زوال اب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے مدد کرنے سے بھی قاصر رہ گئے۔اس تاریخی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائیوں نے منگولوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف آپسی تال میل اور اتحاد کی تجویز پر رکھی منگول خان قویوق کے سامنے باہمی معاہدہ کی تجاویز کے ساتھ سفارتیں بھیجی گئیں۔۱۲۴۵ء میں ایک فرانسیسی جان ڈی پلانو کارپینی نامی سفارتکار منگولوں کے صدر مقام قراقرم پہنچا اور فوجی امداد کے وعدوں کے ساتھ واپس ہوا عین اس وقت جب چنگیز خان بخارا اور سمرقند میں قتل کا بازار گرم کر رہا تھا۔جرمن افواج نے ۱۲۱۸ء تا ۱۲۲۱ء کے دوران مصر پر حملہ کیا اس طرح اب عالم اسلام منگول صلیبی اتحاد کی وجہ سے دوطرفہ حملوں کا شکار تھا یہ مکمل حملے تھے جس کا واحد مقصد تھا مسلمانوں کی سلطنتوں پر قبضہ کرنا اور مسلمانوں کا مکمل صفایا کردینا۔

لاس نواس ڈی طولوسہ کی جنگ کے بعد اندلس میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تیزی سے زوال پذیر ہونے لگا۔منگولوں کی تباہیوں اور صلیبیوں کے حملوں نے عالم اسلام کو زبردست نقصان پہنچایا۔مشرق سے ایسی کوئی کمک نہیں آرہی تھی جس کے ذریعہ صلیبیوں کے دباؤ کو کم کیا جاسکتا۔۱۲۳۰ء تک منگول گھوڑسوار مشرقی اناطولیہ میں گھس چکے تھے اور دوسری طرف دہلی کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔اسپین میں

سیاسی زوال نے طوائف الملو کی کو ہوادی اور مقامی امیر ایک دوسرے کے خلاف عیسائی طاقتوں کے ساتھ اتحاد کرنے اور اپنوں ہی کو برباد کرنے پر تل گئے۔صلیبیوں نے خوشی خوشی انکا ساتھ فوجی امداد کی شکل میں دینا منظور کرلیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ بھی دوسرے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں انکا ساتھ دیں کیاسٹیلے، اراگون اور پرتگال کی سلطنتون نے بچے کچے مسلم اسپین پر حملہ کرنے اور اسے محکوم بنانے کے لئے ایک سازش ترتیب دی۔ ۱۲۰۰ء میں ویلنسیہ پر قبضہ ہوگیا، ۱۲۳۰ء میں جنوبی بالیارک بھی دشمنوں کے قبضہ میں چلے گئے۱۲۳۲ء میں امویہ خلافت کا پائے تخت قرطبہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۲۴۸ء میں سویلے پر قبضہ کرلینے کے ساتھ ہی یہ فتح مکمل ہوگئی اب صرف غرناطہ باقی تھا جس کا حاکم الاحمر تھا وہ سرگوسہ کے ناصری قبیلہ کا ایک شہزادہ تھا وہ غرناطہ پر اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کے لئے کیاسٹلے حکومت کا باج گذار بن گیا۔اسلامی دنیا پر ہونے والی بربادیوں کا تجزیہ کرنے کے لئے اسپین اور ایشیاء دونوں کے واقعات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھنا ضروری ہے۔۱۲۱۹ء سے ۱۲۶۰ء کے درمیان آدھی سے زیادہ سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔قزاخستان، کرغستان اور ترکستان، ازبکستان، تاجکستان، آزربائجان، سنکیانگ،، فارس، افغانستان، مغربی پاکستان، ترکی، عراق، کویت، شام، جارجیہ، روس اور ایشیاء کو چک ان تمام مما لک کی سرزمینوں کو مکمل طور سے برباد کردیا گیا۔اسپین پر پوری طرح سے قبضہ ہوگیا۔سمرقند بخارا، حیرات، غزنی اصفہان اور بغداد تباہیوں کی منہ بولتی تصویر بن گئیں،صلیبیوں نے منگولوں کے ساتھ جغرافیائی سیاست پر مبنی حلیفانہ معاہدہ کیا تھا جس کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانا۔ ۱۲۶۰ء کے آتے آتے منگلولوں،صلیبیوں اور آرمینا کی متحدہ افواج یروشلم کی دروازے پر کھڑی تھیں اب صرف حجاز اور مصران کے آگے تھے۔یقیناً گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

نقشہ

جبکہ اسپین کا دشمنوں کے ہاتھ چلے جانا مسلمانوں کے لئے ایک عظیم المیہ تھا لیکن اس کے برخلاف اس سے عیسائیوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا۔ اسلام کے وہ علوم جو انہوں نے یونان ہندوستان اور فارس سے حاصل کر کے ان پر دانائی اور دانشوری کا روغن چڑھایا تھا، ان علوم کو ارتقاء کو بلندیوں پر پہنچایا تھا وہ علوم اسپین اور سسلی کے ذریعہ یوروپ کے دامن میں پہنچ گئے۔ ۱۰۸۵ء میں طولیدو کی فتح کے بعد یوروپ نے جن دانشورانہ تبدیلیوں کو دیکھا ان کی فہرست کوئی بھی آسانی کے ساتھ تیار کر سکتا ہے۔ ۱۱۲۶ء میں آرک بشپ ریمنڈ نے طولیدو میں ترجمہ نگاری کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ۱۱۳۲ء میں روجر دوم نے مسلمان علماء اور فضلاء کو سسلی آنے کی دعوت دی مشہور زمانہ جغرافیہ دان الادریسی اسی دربار سے وابستہ تھا۔ ۱۱۵۰ء میں پیرس یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی اور ۱۱۶۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ۱۲۰۰ء میں کیمرج

یونیورسٹی وجود میں آئی۔۱۲۰۴ میں فرانس کا چارٹریس کیتھوڈرل مکمل ہوا۔۱۲۱۵ء میں سلمانکا یونیورسٹی وجود میں آئی۔۱۲۵۸ء میں روجر بیکن آکسفورڈ میں درس دے رہا تھا اس طرح یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ علم کے وہ معیار جن کی آبیاری بغداد، قاہرہ اور سمرقند میں ہوئی۔یہی علم کے خزانے طولیدہ اور پالرمو کے ذریعہ عیسائی یوروپ تک پہنچ گئے۔

''اندلسی جزیرہ نما کی شکست صرف ایک فوجی سانحہ نہیں تھا یا ایک تاریخی واقعہ نہ تھا بلکہ یہ اس سے بھی بہت آگے کی بھی بات تھی۔۱۴۹۲ء میں مسلمانوں کے نکال باہر کرنے تک یوروپ کو جنوب مغرب تک ہی روک دیا گیا تھا۔اسپین اور پرتگال کی فتح نے یوروپ کی توانائیوں کو آزاد کیا اور اب وہ بحرالکاہل میں مہم جوئی کے لئے آزاد تھے۔اس طویل سمندر کے گہرے نیلے پانیوں کے اس پار افریقہ کا سنہرا ساحل تھا امریکہ جانے والی راہیں تھیں اور بحر ہند کے دولت کے انبار تھے''۔اندلس کی شکست کی بازگشت صدیوں سے گونج رہی ہے اس بازگشت میں پنہاں ہے یوروپ کا امریکہ کو دریافت کرنا، مغربی افریقہ سے غلاموں کی تجارت کو فروغ دینا اور آخر میں ایشیاء کو نوآبادی بنایا جانا۔

اٹھائیسواں باب

غرناطہ کی شکست

مسلمانوں میں یہ بات اب بھی مشہور ہے غرناطہ کے اطراف پھیلی البجاروکی پہاڑیاں آج بھی ہر صبح روتی ہیں، ترستی ہیں، اذان سننے کے لئے۔ اور قرطبہ کی مسجد ساری رات جاگتی ہے کسی مومن کے سجدے کے انتظار میں۔ آج بھی اندلس کے نام سے، وطن واپسی کی یاد سے مسلمان بے دریغ آنسو بہانے لگتے ہیں۔ وطن کی یاد اور وطن واپسی ایک بیماری کی طرح ہے جو انہیں لگی ہوئی ہے وہ اس سنہرے دور کو یاد کر کے آنسوؤں کی برسات شروع کر دیتے ہیں جبکہ آئبیریا کا جزیرہ نما، ہر صبح عبادتوں کے روح پرور آوازوں سے گونجتا تھا۔ رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صبح وشام بھیجے جانے والے درود وسلام سے فضائیں معمور ہو جاتی تھیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اسپین کے لئے جس قدر جنگیں ہوئیں۔ اتنے مقابلے کسی اور ملک کے لئے نہیں ہوئے۔ یہ جدوجہد پانچسو سالوں تک جاری رہی جب جنگوں کا خاتمہ ہوا تو 1492ء میں غرناطہ کی مساجد سے اذانوں کی آواز آخری مرتبہ بلند ہوئی۔ مسلمانوں نے مغرب کے تاج کا انتہائی بیش قیمت ہیرہ کھودیا اس کے بعد جلد ہی عیسائیوں نے انہیں ایذائیں دینی شروع کیں، یہودیوں کے ساتھ انہیں بھی ملک بدر کیا گیا۔ اس سرزمین سے جسے مسلمانوں نے مغرب کا باغ تصور کیا تھا انہیں نکال باہر کیا گیا، ان کی یادگاروں کو زمین بوس کیا گیا، مساجد تباہ کی گئیں۔ لائبریریوں کو جلایا گیا ان کی عورتوں کو غلام بنا کر یوروپ کے درباروں میں بھیجا گیا۔ وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا ایک سنگِ میل، ایک

اہم واقعہ جس نے مکمل طور سے اور بنیادی طورر پر رونما ہونے والے واقعات کے دھارے کو تبدیل کر دیا۔

غرناطہ کی شکست صرف ایک دن میں نہیں ہوئی نہ ہی ایک ہی وار میں اسکا خاتمہ ہوا۔ بلکہ یہ ایک زوال پذیر معاشرے کی آخری سانس تھی، جس نے عیسائی یوروپ کے مسلسل حملوں کے خلاف دفاع کرنے کی ساری قوت گنوادی تھی۔ موذن کے اذانوں کی جگہ کلیساؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہونے سے کافی پہلے بوعبداللہ یعنی ابوعبداللہ، غرناطہ کے آخری امیر نے الپجاروکی پہاڑیوں پر کھڑے ہوکر، نیچے اپنے اس صدر مقام پر، جسے اس نے کھودیا تھا، آخری نظر ڈالی اور بے اختیار رو پڑا۔ اسپین سیاسی حیثیت سے بھی فوجی اور تمدنی طور پر بھی اب تھکی اور ہاری ہوئی طاقت تھا۔ امیر خانہ جنگی میں مبتلا تھے، ہر ایک شاہی خاندان سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا- بیٹا باپ کے خلاف تھا تو باپ بیٹے کے خلاف، مذہبی اداروں کے درمیان کشیدگی اپنی انتہاء پر تھی، رشوت خوری کا بازار گرم تھا، سرکاری منتظم قتل وغارت میں مشغول تھے۔ بدامنی تھی اور بیرونی حملے تھے، تباہی وتاراجی کا سارا سامان یہاں ہورہا تھا۔ غرناطہ کی شکست ایک ایسے ڈرامے کا آخری پردہ تھا جو بذات خود ختم ہو چکا تھا اس پردے کو تو گرنا ہی تھا۔ آخر کار اس گھن لگے، دیمک لگے، ماحول کے پروردہ مسلمانوں کا خاتمہ ہونا ہی تھا۔

مغرب ایک وسیع علاقہ تھا، اس میں موجودہ جدید ممالک مراقس، الجیریا، تیونیسیہ، سینگال، سنے گمبیا، اسپین اور پرتگال شامل تھے۔ یہ مصر اور دریائے نیل کے دہانے سے لیبیائی صحرا کو جدا کرتا تھا تو یوروپ سے پائے نیرس پہاڑوں کے سلسلے اسکو الگ کرتے تھے۔ سوڈان کے صحرائے اعظم سے ہوتے ہوئے کوہ آپس کے یہ بلند سلسلے جو کہ اندلسی مرتفع میں شاخوں کی طرح پھیل جاتے ہیں- پہاڑوں کے ان سلسلوں نے دونوں براعظمی علاقوں کی جغرافیائی خصوصیات کو آپس میں باندھ رکھا ہے- یہ جغرافیائی سلسلے مراقس سے ہوکر گذرتے ہیں- اس کی آخری حد اندلسی ہے تو دوسری حد افریقہ یعنی تیونیسیہ ہے- اس وسیع علاقہ میں ایک الگ قسم کے باشندے بستے ہیں۔ یہ علاقہ اندلسی ہسپانوی، مسلم، عیسائی، عرب اور شمالی افریقہ کے نوآبادکاروں کا وطن رہا ہے تو کوہ اٹلس کے سلسلے بربروں کا مسکن رہے۔ کاہل عربوں کی اکثریت جو کہ زیادہ تر ساحلوں پر ہی آباد رہے ان کی بستیاں بھی بربروں کے ساتھ ساتھ بستی چلی گئیں-

جنوب میں تاریخی طور پر اہم قبائل بستے تھے یہ قبائل تھے سنہاجہ، زناٹا اور نفزاوا، یہ قبائل ان علاقوں کی چراگاہوں میں آزادانہ گھومتے تھے بنو ہلال جیسے دوسرے طاقتور قبائل اس علاقہ کے منظر نامے کو پوری طرح مکمل کرتے تھے چونکہ مغرب کافی حد تک یک وتنہا علاقہ تھا ایک ایسا علاقہ جو اسلامی دنیا سے الگ تھلگ تھا اس لئے اس کو اپنی سیاسی قسمت آپ خود آزمانی تھی۔

1492ء میں گذرنے والے حالات کا جائزہ لینے کے لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کی ابتداء سے ہی ہونے والے مکمل حالات کا جائزہ لیں، فلسطین میں جاری صلیبی جنگ 1186ء میں جنگِ حطین میں صلاح الدین کی فتح کے ساتھ ختم ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغرب میں المحد ث کا اقتدار اپنے انتہاء کو پہنچ گیا تھا-1196ء میں الارکوس کی جنگ میں المحد ث ابو یوسف نے صلیبیوں کے خلاف بڑی فتح حاصل کی اس کے بعد صلیبی ایک بار پھر مجتمع ہوئے اور خوفناک انداز سے واپس آئے۔ لاس نواس ڈی طولوسا کی جنگ میں صلیبیوں کی ایک بڑی فوج نے 1212ء میں المحد ث کو شکست دے دی یہ شکست کتنی بڑی تھی اس کا اندازہ جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں کی تعداد سے ہو جاتا ہے۔ مسلم مؤرخ لکھتے ہیں کہ المحد ث کی جانب سے 6 لاکھ سپاہیوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ اس میدانِ جنگ میں ڈیڑھ لاکھ مسلمان شہید ہوئے جبکہ اس زمانے میں سارے مغرب کی آبادی صرف تیس لاکھ تھی اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ کے جسمانی طور پر مضبوط تقریباً ہر ایک فرد نے اس جنگ میں حصہ لیا اور انکا ایک چوتھائی حصہ اس جنگ میں کام آ گیا۔ المحد ث کے امیر الناصر جس نے امیر المومنین کا خطاب اپنایا تھا اس جنگ کے بعد بہت دلبرداشتہ ہو کر واپس ہوا۔ مراقش کے ایک محل میں اپنے آپ کو قید کر لیا اور 1213ء میں جلد ہی وفات پا گیا۔ کیاسٹیلے، اراگون اور پرتگال نے احساس کر لیا کہ تاریخی موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ تینوں نے متحدہ محاذ بنا کر مسلم اسپین کی فتح کے لئے کمر کس لی یکے بعد دیگرے بڑے بڑے شہر مغلوب کر لئے گئے۔ 1236ء میں اموی خلافت کا صدر مقام قرطبہ ان کے قبضہ میں آ گیا۔ 1248ء میں سویلے جاتا رہا اب صرف غرناطہ باقی رہ گیا تھا ناصری شاہی سلسلہ کے فرد محمد ابن احمد نے 1238ء میں غرناطہ پر قبضہ کیا، وہ کیاسٹیلین بادشاہ کا باج گذار بن کر اپنے تخت کو بچانے میں اب تک کامیاب رہا تھا۔

1333ء تک غرناطہ کیاسٹیلے کی ایک باج گذار ریاست بن کر رہی۔اس سال ناصری امیر یوسف اول نے کیاسٹیلے کو خراج دینا بند کر دیا اور جنگ کو عیسائی علاقوں تک لے جانے کی کوشش کی۔

شمالی افریقہ میں المحد ث حکومت تین ٹکڑوں میں بٹ گئی مراقش میں میرینی امیر اقتدار پر تھے الجیریاء میں زینی اور تیونیشیا میں حفصی برسرِ اقتدار آئے۔المحد ث کا صدر مقام دھیرے دھیرے ختم ہو گیا اور اس کی جگہ تین علاقائی صدر مقام وجود میں آئے میکنیس میرینیوں کا صدر مقام تھا- زینیوں کا صدر مقام لیم سین اور حفصیوں کا تیونس تھا المحد ث شہنشاہیت کی یاد اس قدر گہری اور تازہ تھی کہ تینوں سلطنتوں نے کئی مرتبہ ایسی ہی بڑی سلطنت قائم کرنے کی کوششیں کی جس میں مغرب کا سارا علاقہ شامل ہو۔اس طرح کی پہلی کوشش کرنے والے، حفصی تھے 1236ء میں حفصی امیر یحیٰی اول نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے وارثوں میں سے ہے- اور اس نے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا المنتصر تخت کا جانشین بنا-

ادھر دور بغداد کے حالات نے المنتصر کو ایک تاریخی موقع عطا کیا- 1258ء میں جب ہلاکو خان نے بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد اسے تباہ و برباد کر دیا تو اسلامی دنیا قیادت کے لئے شمالی افریقہ کی طرف دیکھنے لگی- 1260ء سے 1261ء تک ایک سال کے مختصر عرصہ کے لئے دنیائے اسلام نے المنتصر کو خلیفہ تسلیم کر لیا- سارے اسلامی مما لک میں اسکے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ لیکن یہ تو صرف مختصر سے وقت کے لئے تھا۔ کیونکہ مصر کے مملوک سلطان بیبرس نے 1261ء میں قاہرہ میں عباسی خلافت کو از سرِ نو قائم کیا۔ اس کا ایک مقصد فلسطین کی جانب کوچ کرنے والی اسکی اپنی افواج کو حوصلہ بھی دینا تھا۔ یہ افواج فلسطین میں 1261ء میں منگولوں کو روکنے کی آخری مایوس کن اور خطرناک کوشش میں عین جلوت کے میدان جنگ کی طرف رواں تھیں-

خلافت کے قاہرہ کو منتقل ہونے کی وجہ سے اسلامی تاریخ کی مرکزیت مشرق کی طرف پھر سے منتقل ہو گئی۔المنتصر کو ایک سال کی خلافت کے لئے بھاری قیمت چکانی پڑی 1260ء میں فرانس کے لوئیس نہم نے حملہ کر کے کچھ عرصہ کے لئے ٹیونس پر قبضہ کر لیا اس کے ذہن میں یہ غلط تصوّر آ گیا تھا کہ المنتصر کو

شکست دے دی جائے تو یہ اسلام کے خاتمہ کا پیش خیمہ ہوگا اس عرصہ کے دوران صلیبیوں اور منگولوں کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہو چکا تھا جس کا مقصد تھا اسلامی دنیا کو مکمل طور سے فتح حاصل کر لینا۔ لوئیس نہم بے شمار حملے کرتا رہا اسکے باوجود شمالی افریقہ پر وہ قبضہ نہیں جما سکا اس کے حملوں کو بار بار پیچھے ڈھکیلا جاتا رہا۔ بالآخر 1270ء میں ٹیونس کے محاصرہ کے درمیان ہی اس کی موت ہوگئی-1212ء میں لاس نواس ڈی طولاسہ کی شکست کے کئی اندرونی اسباب تھے اور یہ اسباب سیاسی مذہبی اور اقتصادی تھے اسپین کے امیروں اور شمالی افریقہ کے المحد ثین کے درمیان کافی بدگمانی تھی اس کی وجہ سے میدانِ جنگ میں دونوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک تال میل نہ ہو سکا۔

المحد ث کے دربار میں بھی مذہبی اداروں اور وزیروں کے درمیان باقاعدہ ٹھنی ہوئی تھی۔ المحد ث علماء اور وزیر اعظم جامی کے درمیان تو کھلے عام جھگڑے ہوئے اور علماء نے وزیر اعظم کو نکالنے کا مطالبہ کر دیا۔ اس جھگڑے کے دوراز کار اثرات کو المحد ث کے دربار کے انتظامی طریقۂ کار کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے۔ امیر سلطنت کا سربراہ تھا۔ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے اس نے انتظامی امور کو چلانے کا پروانہ وزیر اعظم کو دیا ہوا تھا تو عدالتی اختیارات مکمل طور سے سرقاضی کے ذمہ تھے۔ انتظامی وفوجی اور عدالتی محکمہ کے درمیان ہونے والی رسہ کشی تباہ کن ثابت ہوئی۔ جدید اصطلاح میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ادارے کے دو نائب اپنی نئی مصنوعات مارکیٹ میں لانے سے پہلے ہی آپس میں ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ ریاست کی مالی حالت انتہائی نازک تھی اور افراط زر اپنی انتہاء پر تھا۔ جس کی وجہ سے رشوت خوری کا بازار گرم تھا-1210ء میں عیسائیوں کے خلاف جنگ کے لئے اسپین جاتے ہوئے المحد ث نے فیض اور سیوٹا میں قیام کیا۔ رشوت خوری کی سزا کے طور پر اس نے دونوں گورنروں کے سر کٹوا دیئے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ المحد ث نظریاتی اعتبار سے معتزلی نظریات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ جس کی وجہ سے علماء کی نظر میں وہ کافی مشکوک تھے-صلیبیوں کے خلاف صرف ایک ڈھال کے طور پر انہیں برداشت کیا جا رہا تھا ورنہ صحیح معنوں میں علماء کی تائید انہیں حاصل نہیں تھی۔

اگلے دس سالوں کے لئے (1248ء تا 1328ء) مغربی بحیرۂ روم میں طاقت کا توازن قائم ہوگیا۔

عیسائیوں کی جانب کیسٹلے، آراگان اور پرتگال تھے۔ مسلمانوں کی جانب مرینی، زینی، حفصی اور غرناطہ تھے۔ جنوب کا بنی بلال قبیلہ بھی ان جھگڑوں میں بارہا دخل انداز ہوتا رہا۔ سیاسی وفاداریاں بدلتی رہیں۔ کسی مسلمان امیر کا اپنے دوسرے امیر کے خلاف عیسائیوں کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کرنا یا کسی عیسائی بادشاہ کا اپنے ہم عصر عیسائی بادشاہ کے ساتھ محاذ آرائی کے لئے مسلمان امیر کا ساتھ لینا ایک عام بات تھی۔ اس دوران مرینیوں، حفصیوں اور زینیوں کے درمیان اقتدار کے لے رسہ کشی ہوتی رہی۔ دھیرے دھیرے مرینیوں کو دونوں حریفوں کے خلاف بالادستی حاصل ہوتی گئی۔ 1269ء میں مرینی امیر یعقوب نے مراکیش پر قبضہ کرلیا اور 1274ء میں سجلماسہ پر تسلط جمالیا۔ غرناطہ پر کیسٹلے نے حملہ کردیا۔ غرناطہ کی درخواست پر یعقوب نے آبنائے جبل الطارق کو پار کیا اور 1272ء میں یسیجاہ کے میدان جنگ میں عیسائیوں کو عبرتناک شکست دی۔ 1279ء میں مرینی بحری افواج نے کیسٹلے اور پرتگال کے متحدہ بحری بیڑی کے خلاف فتح حاصل کی۔ اس دوران جبکہ یعقوب غرناطہ کی امداد کرنے میں لگا ہوا تھا، تو ادھر زینی حفصیوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ غرناطہ کا امیر مرینیوں کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے غداری پر اتر آیا۔ اس نے کیسٹلے کی افواج کی مدد سے 1291ء میں طارقہ شہر پر قبضہ کرلیا۔ 1295ء میں غرناطہ نے مرینیوں کے خلاف سیوٹا میں بغاوت کرادی، اسپین کے بے وفا امیروں سے تنگ آ کر مرینی یعقوب نے اپنی ساری توجہ شمالی افریقہ پر مرکوز کردی۔ 1307ء تک اس نے پورے مغرب پر اپنا تسلط جمالیا سوائے مشرق میں انتہائی دوری پر واقع افریقہ کے اس حصہ کے جسے آج جدید تیونس کہا جاتا ہے۔

امیر علی اور امیر ابوعنان (1331ء تا 1357ء) کے دور حکومت میں مراقش کے مرینی اپنے اقتدار کے انتہائی عروج پر پہنچے۔ مرینی امیر ابوعنان نے ہی مشہور مسلم سیاح ابن بطوطہ کی سرپرستی کی۔ اس زمانے میں مغرب میں اسلامی اتحاد ایک بار پھر ابھر آیا۔ 1340ء کے مرینیوں کے مراقش نے کیسٹلے کے بحری بیڑہ کو شکست دے کر طارفہ کا محاصرہ کرلیا۔ کم از کم اس دوران غرناطہ اور مراقش کے مرینیوں کے درمیان گہرا میل جول تھا۔ غرناطہ کے یوسف اول نے کیسٹلے کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکا اور امداد کے لئے آبنائے کے اس پار مرینیوں سے مدد مانگی۔ لیکن 1341ء میں کیسٹلے اور فرانس اٹلی اور انگلینڈ کے صلیبیوں

کی افواج نے مرینیوں اور غرناطہ کی مشترکہ افواج کو شکست دی۔اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اب مغربی بحیرۂ روم میں طاقت کا توازن عیسائیوں کے حق میں ہوگیا۔

تقریباً 1190ء کے دوران جب فلسطین میں صلیبی جنگیں ختم ہوئیں تو بحیرۂ روم میں طاقت کا توازن پورے طور سے الٹا گھوم گیا۔ایک طرف ترک اناطولیہ اور جنوب مشرقی یوروپ میں آگے بڑھ رہے تھے۔تو دوسری جانب اسپین اور شمالی افریقہ میں عیسائیوں کو بالادستی حاصل رہی-اسپینوں کے منہ کو تو خون لگ گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر 1244ء میں مراقس کے الغیر اس پر قبضہ کرلیا-مغرب میں امیر علی کو اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کی راہ میں دو روکاٹیں تھیں۔پہلی وجہ تھی کالی پلیگ جس نے اس کی پوری حکومت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس سے پہلے 1346ء سے لےکر 1360ء تک مشرق وسطیٰ اور یوروپ میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔جبکہ کالی بلیگ کی وجہ سے بے شمار لوگ موت کے شکار ہوئے اور مالیات کی وصولی ٹھپ ہوگئی۔ دوسری وجہ تھی ہلال قبیلہ کا بار بار بغاوت کے لئے سر اٹھانا، چار سال بعد بنی ہلال نے خیروان کے میدانِ جنگ میں امیر علی کو ہی شکست دے دی۔اس طرح اسکے متحدہ مغرب کے خواب کا خاتمہ ہوگیا-

اب حالات کا رخ مکمل طور سے صلیبیوں کے حق میں ہوگیا۔1335ء میں ترپولی (لیبیا) پر کچھ عرصہ کے لئے جینوس کا قبضہ رہا۔1390ء میں فرانس نے مہدیہ یعنی تیونیسیہ پر حملہ کیا۔1399ء میں کیسٹلے نے مراقش میں طیتواں کو تباہ کردیا۔1415ء میں مراقش کے ہی سیوٹا پر پرتگال قابض ہوگیا۔ ہوسکتا ہے کوئی ان شکستوں کو اور ادھر عثمانیہ ترکوں کے یوروپ میں فتح یابیوں کو باہم ملاکر دیکھنے کو کوششیں کریں جبکہ بایزید اول نے 1389ء میں کوسووکی جنگ میں سربیوں کو شکست دی اور سربیہ، بوسینیا، البانیہ اور سکوپجے پر قبضہ کرلیا پھر اس سے اور آگے بڑھ کر نیکوپولس کی جنگ میں صلیبیوں کی مشترکہ فوجوں کو مکمل طور پر پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔سیوٹا اور الغسا راس دونوں کے عیسائیوں کے ہاتھ میں چلے جانے سے آبنائے جبل الطارق کے اس پار غرناطہ اور مراکش کے درمیان مواصلاتی رابطہ ٹوٹ گیا غرناطہ کی گردن میں پھندا کستا چلا گیا-

چودھویں اور پندرہویں عیسوی کے دوران مغرب کی تنزلی اور اس کے منتشر ہوجانے کے بارے

میں اکثر مؤرخین خاموش ہیں۔ ابن خلدون 1332ء سے لیکر 1406ء تک اس دور انتشار کے دوران شمالی افریقہ میں رہا۔ اس کی پیدائش تیونس میں ہوئی جو کہ اس وقت حفصی امارت کا ایک حصہ تھا جسے افریقی کہا جاتا تھا۔ ابن خلدون کو مغرب میں سفر کرنے کے موقع حاصل ہوئے۔ اس طرح مقامی سلطنتوں کے عروج وزوال کے اسباب کو دیکھنے اور ان پر غور کرنے کے کا موقع ملا۔ اس کی نوجوانی کا کافی عرصہ مغرب میں گذرا۔ بعد کے برسوں میں وہ مصر ہجرت کر گیا۔ جہاں اس نے مملوک حکومت کے سفیر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1400ء میں دمشق کو تیمور لنگ کے سپرد کرنے کے بارے میں بات چیت کے لئے مملوکوں نے ابن خلدون کو ہی نامزد کیا تھا۔

ابن خلدون کو بجاطور پر عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے تہذیبوں کے عروج وزوال کے عام نظریات مرتب کئے۔ یہ نظریات اس کے مغرب کے حالات کے مشاہدات پر مبنی تھے۔ اس کے مطابق ہمیشہ سے ہی شہروں کے مکین اور خانہ بدوشوں کے درمیان کشیدگی رہا کرتی تھی۔ تاریخ اسی کشیدگی کی تحریک سے آگے بڑھتی ہے۔ خانہ بدوشوں میں ''عصبیۃ'' کی خاصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ جس کا عام فہم مطلب ہے ''جمیعت'' کے ساتھ جذباتی لگاؤ اور وفاداری۔ اس کے برخلاف شہری نظام زندگی جماعت کی قدر کم ہی کرتا ہے اور اس سے وفاداری کے احساس کو تباہ کر دیتا ہے۔ ابن خلدون کے مطابق اقتدار کا مطلب ہے سیاست، عصبیۃ سیاسی اور فوجی تنظیم کا جواز بنتا ہے جس کی وجہ سے خانہ بدوش شہر کے کاہل مکینوں پر غالب آتے ہیں، کامیاب ہوجاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ فاتح خانہ بدوش بھی جب شہروں میں جاتے ہیں تو شہری زندگی کے عادات واطوار کو اپنا لیتے ہیں اور پھر اس کے بدلے میں خانہ بدوشوں کی ایک نئی لہر اٹھتی ہے جو انہیں بہالے جاتی ہے۔ اسی طرح 'عصبیہ' سیاسی اقتدار کی کنجی ہے اور وطن اور سلطنتوں کی تعمیر کا ضروری جز ہے۔ یہ وہ خمیر ہے جو کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے اور افراد سے قربانی مانگتا ہے تاکہ تاریخ ساز کارنامے سرانجام دے سکیں۔ جب عصبیۃ تحلیل یا برباد ہوجاتا ہے تو پھر تہذیبوں کا وہ خمیر بھی کمزور ہوجاتا ہے۔ جو انہیں اتحاد کی لڑی میں پروتا ہے اور اس طرح وہ منتشر ہوجاتی ہیں معدوم ہوجاتی ہے۔

یہ نظریہ تہذیبوں کے عروج وزوال کے اسباب کو بیان کرنے کے لئے بنیادی عنصر کے طور پر اکثر وبیشتر استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن ابن خلدون کا یہ نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے میل نہیں کھاتا، یہ نظریہ کافی مشکلات پیش کرتا ہے۔اسلام عصبیت کے خلاف ہے جس کی بنیاد رنگ، نسل اور وطن پر رکھی گئی ہو۔''ہم نے وطن اور قبیلے اس لئے بنا دیئے ہیں تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو، اس لئے نہیں کہ تم ایک دوسرے کو حقیر جانو''(القرآن ۴۹-۱۳)۔اسلام ایک عالمی معاشرہ کی تشکیل دینا چاہتا ہے جہاں حلال اور حرام کی تمیز ہو اور جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھے۔یہ قوم رنگ، نسل اور وطنیت کے جذبات کو اسلام کے نظریات میں ڈھال کر انہیں آفاقیت میں گم کر دیتا ہے۔

ابن خلدون کا یہ نظریہ بھی سچ ہے کہ عصبیت عام عوام کو بڑے نتائج حاصل کرنے پر اکساتی ہے جو کہ ملک وسلطنت کی تعمیر میں دستگیری کرتے ہیں۔لیکن یہ بھی سچ ہے ایسے ملک جو''عصبیت'' سے تعمیر ہوئے ہیں بنیادی طور سے جارح اور وسعت پسند ہوتے ہیں۔وہ اپنے پڑوس کے لئے غارت گر بن جاتے ہیں۔ دوسرے ممالک اور قبائل سے اپنے آپ کو برتر واعلیٰ سمجھنے لگتے ہیں۔ہٹلر کا جرمنی اس کی ایک تازہ اور اچھی مثال ہے۔نازیوں نے جرمن عصبیت کی بنیاد پر ملک کی تعمیر کی۔ایسی وطن پرستی کو ہوا دی جو دوسری نسلوں سے جرمن نسل کو ہی برتر مانتا تھا۔اس جذبہ کی وجہ سے وہ وقتی طور پر یوروپ پر حاوی ہو گئے۔لیکن زمانے نے دیکھا کہ نازی جرمنی بکھر گیا۔جزوی طور پر اس لئے بھی کہ دوسرے ممالک جرمنی کو برتر ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اگر فلسفیانہ انداز سے اسے دیکھا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ عصبیت، فرد کو اس کی خود پرستی سے جدا کر دیتی ہے اور یہی خود پرستی وطنیت یا نسل پرستی کے ہاتھوں بلند وبالا فیصلوں اور دیواروں میں بند ہو جاتی ہے۔اس طرح انسان خود پرستی کی اپنی قید سے نکل کر نسل، قبیلہ یا وطن پرستی کا قیدی بن جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام انسانیت کو نہ صرف فرد کی شخصی انا سے آزاد کرتا ہے بلکہ وطنیت، نسل پرستی اور قبیلہ پرستی کی قید سے بھی رہائی دلاتا ہے۔اسلامی تہذیب کے آخری حدود جہاں بھر کے اقوام ہیں۔تمام نسلیں قبیلے اور ممالک اس تہذیب کے دائرہ میں آتے ہیں۔ابن خلدون کے فلسفہ کا سب سے مشکل پہلو یہ ہے کہ اس میں داخلی تجدید کا گوشہ نہیں رکھا گیا ہے جب کوئی قبیلہ یا ملک ایک خاص طرز زندگی اختیار کر لیتا ہے، اپنی

عالی حوصلگی کھودیتا ہے۔شہر کے عیش و آرام میں کھوجاتا ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ دوسرے سے مات کھا جائے جو اس سے زیادہ نسل پرست ہو۔مشاہدہ اس کے نظریہ کے خلاف جواز فراہم کرتا ہے۔

نقشہ

دنیا کے عالمی مذاہب فرد کی تجدید کے امکان پر زور دیتے ہیں۔لیکن اسلام فرد اور ملک دونوں کی باطنی تعمیر نو کے لئے راہ معین کرتا ہے۔فرد اور ملک دونوں انحطاط کا شکار ہوتے ہیں لیکن اللہ کے کرم اور مہربانی کے باعث اپنے آپ کو زوال پذیر طاقتوں کے جنگل سے چھڑا کر پھر سے اپنی تجدید کر کے بلندیوں کی منزل کی جانب گامزن ہو جاتے ہیں۔اس انحطاط کو روکنے کے لئے اور باطن کی از سر نو تجدید کے لئے ہر صدی میں کسی نہ کسی مجدد کا ابھر آنا، ایک ایسا تصور ہے جو اسلامی دنیا میں اکثر پایا جاتا ہے۔صدی کے بعد صدی آتی رہی، مغرب میں المحدث سے لے کر نائیجر کے عثمان دان فدایون اور سوڈان کے مہدی تک ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی زندگی کی از سر نو تجدید اور اسلامی تہذیب کی پھر سے صف بندی کی کوششیں ہوتی رہیں۔از سر نو بیداری کی روح پھونکنے یا باطنی تجدید کا یہی امکان مسلمانوں کی اجتماعی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

غرناطہ کی شکست کے اسباب میں علاقائی، اقتصادی، تمدنی، مذہبی اور نظریاتی یہ سارے عناصر شامل ہیں۔اندلس میں ہونے والی مسلسل جنگوں کی وجہ سے مغرب میں افرادی کمی آ گئی۔صلیبی جنگیں دراصل تہذیبوں کا ٹکراؤ تھا جس میں یوروپ پورے پانچسو سالوں تک بار بار اسلامی دنیا پر یورش کرتا رہا۔یہ محاذ آرائی، یہ جنگ، یہ صف بندی شمالی افریقہ کے اندلسی جزیرہ نما سے لے کر مصر، فلسطین، شام، اناطولیہ اور سسلی سے ہوتا ہوا یوروپ کے جنوب مشرق تک پھیلی ہوئی تھی۔اندلس یوروپ کے لئے انتہائی پیچیدہ مسائل پیش کرتا رہا۔مغرب کا ہر وہ قائد چاہے وہ حفصی ہو کہ مرینی، جس کسی نے بھی امیر المومنین کا خطاب اختیار کیا وہ قائد کی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا کہ عیسائیوں کی یورشوں کے خلاف اندلس کا دفاع کرے۔اندلس ایک پھسلن کی طرح تھا۔آئبیریا کے جزیرہ نما کی سیاست موقع پرستی کا شکار رہی، اندلس کے مسلمان اپنی مدافعت کرنے کی قوت کھو چکے تھے۔صلیبی حملہ آوروں سے اندلس کو بچانے کی پوری ذمہ داری ان شمالی افریقہ کے فوجیوں پر آ پڑی تھی۔ان جنگوں کی وجہ سے مغرب کی افرادی قوت خون سے نہاتی رہی۔

وہ لڑائی جو کہ میدانِ جنگ میں نہیں ہاری جا سکی وہ بیماری کے میدان میں شکست کھا گئی۔1346ء تا 1360ء کے دوران شمالی افریقہ پر خصوصیت کے ساتھ کالی پلیگ کا زبردست حملہ ہوا۔گاؤں در گاؤں تباہ و تاراج ہو گئے، لاکھوں لوگ موت کی نیند سو گئے، سیاست اور تمدن دونوں اس تباہی کا شکار ہوئے۔

1360ء میں لوئس نہم کی سرد گی میں حملہ کرنے والی تمام کی تمام صلیبی افواج تیونس کے دروازے پر کالی پلیگ کی وجہ سے دم توڑ گئیں۔

آبادی کی کمی کی وجہ سے زرعی پیداوار بھی گھٹ گئی۔ جب غذائی پیداوار میں کمی آئی تو کئی قبائل جو شہروں میں بس گئے تھے وہ بھی خانہ بدوشی پر مجبور ہو گئے۔ اس کا اثر ملک کی مالی حالت پر پڑنے لگا اور ادھر اندلس میں جاری مسلسل جنگوں کی وجہ سے ملک کے خزانے خالی ہو گئے۔ ابتداء میں یعنی مرابطون اور المحد ث کے دورِ حکومت کے دوران (1050ء تا 1212ء) اندلس میں جمع شدہ دولت سے ان جنگوں کے اخراجات پورے ہوتے رہے۔ لیکن جب اندلسی جزیرہ نما کا بیشتر حصہ 1085ء سے 1248ء کے دوران عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا تو دولت کا یہ سرچشمہ سوکھ بھی گیا، ایک غریب مغرب مکمل طور سے تیار شدہ افواج کی یورشوں کو برداشت نہ کر سکا۔ سیاسی مرکزیت کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ افواج کو تیار رکھنے کے لئے سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی افواج پھیلے ہوئے سیاسی نظام کو متحد رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مغرب اقتصادی انحطاط کا شکا ہوا تو اسکے بکھرنے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔

جب اندلس کی دولت ختم ہو گئی تو مغرب کے امیر مالیات کی حصولی کے لئے اٹلی کی شہری سلطنتوں کے ساتھ تجارت کرنے کی جانب راغب ہوئے۔ المحد ث نے جینوا کے ساتھ تجارتی مراعات کا ایک معاہدہ کیا۔ 1236ء میں حفصیوں نے وینیس اور جینوا کے ساتھ معاہدہ کیا۔ 1265ء میں حفصی حکمران المنتصر نے فرانس اور سسلی کو خصوصی مراعات سے نوازا۔ بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ یہ تجارت جہاں ساحل پر بسنے والے چند بیوپاریاں کے لئے خوشحالی کا پیغام تو لے آئی لیکن اس سے سلطنت کے امیروں کے اقتدار میں کمی بھی آئی کیونکہ اب انہیں مالیات کے لئے ان بیوپاریوں پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ جینوا کے بیوپاری اکثر جاسوسوں کا رول ادا کرتے رہے وہ اپنے ساتھی اسپینوں کو خفیہ سیاسی، فوجی اور سماجی معلومات اکٹھا کر کے پہنچایا کرتے رہے۔ ان معلومات سے صلیبیوں کو بہت فائدہ ہو رہا تھا۔ صحرا کے اس پار جنوب میں سوڈان تک جانے والی تجارتی شاہراہیں ابھی تک بحال تھیں۔ لیکن یہ شاہراہیں مغرب کی جانب سجلماسہ سے ہو کر گذرنے لگیں علاوہ اس کے ایک اور مرکزی شاہراہ غات اور خیروان سے بھی ہو کر جاتی تھی۔ تجارتی قافلے

اسی راہ سے گذرتے جو کہ پرامن ہوتی اور اسے اپنا لیتے۔ گہرے کالے بادلوں میں روشنی کی ایک جھلک بھی دکھلائی دیتی تھی، مغرب میں سیاست کے الگ الگ محور قائم ہو گئے، سیاست مختلف خانوں میں بٹ گئی تو اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے والے امیروں کی یہ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں دانشوروں اور فنکاروں کی ارضی جنت بن گئیں۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ 1250ء سے لے کر 1350ء تک کلچر اور ثقافت ترقی کرتی رہیں۔لیکن دراصل یہ تہذیب اندلس کی ہی رہین منت تھی۔ثقافت کی جڑوں کا اپنی ہی زمین میں پھیلنا ضرور ہے۔اسی کے ذریعہ تہذیب کی نشوونما ہوتی ہے۔مستعار لیا ہوا تمدن ایک ایسے درخت کے مانند ہوتا ہے جس کی جڑیں نہیں ہوتی اور ہوا کا ایک ہی جھونکا اس کو اکھاڑ پھینک دیتا ہے۔جب اندلس ہاتھ سے نکل گیا تو اس کے ساتھ ہی شمالی افریقہ کی ثقافت وتمدن کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

علاوہ اس کے اسپینی مہاجروں کے اثرات بسا اوقات مثبت نہیں تھے۔شمالی افریقہ کی بہ نسبت اندلس کے لوگوں کی طرز فکر مذہبی تعصّبات سے بلند تھی شاید یہ ان کے مختلف مذاہب کے میل جول سے تعمیر ہونے والے تمدن کا نتیجہ تھا جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی سب مل جل کر حصہ لیتے تھے۔ اندلس کے یہ مہاجر سیاست کو مذہب سے الگ چیز سمجھنے لگے تھے وہ اکثر میرینی مراقشی اور حفصی درباروں میں جھگڑے کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے اور اپنی بقا کے لئے شمالی افریقہ کے ان درباروں کو اور طاقت ور بنو ہلال قبیلے کو آپس میں ٹکرایا کرتے تھے۔

حکمرانی کے جواز کا نہ ہونا مغرب کے منتشر ہونے اور اندلس کے ہاتھ سے چلے جانے کا اہم ترین سبب تھا۔حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد سے اسلامی تاریخ کا مرکزی مسئلہ یہی ''جواز'' تھا۔ ایک حکمران اور طرز حکومت کو اگر جائز ہونے کی سند مل جاتی تو اسے عوام کی پرجوش حمایت حاصل ہوتی۔

تہذیب کی تعمیر کے لئے ایسی حمایت بہت ہی ضروری ہے۔اس کے برخلاف جب حکومت ناجائز ٹھہرتی ہے تو اسے ہمیشہ للکارا جاتا ہے اور ایسی حکومت ہمیشہ طاقت کے سہارے ہی بقا پاتی ہے۔شیعہ فاطمی، سنی، مرابطون، معتزلی اور المحدث اس بات سے اچھی طرح واقف تھے۔ان میں سے ہر ایک شاہی سلسلے نے اپنی اپیل کو مذہبی اصطلاح میں رنگ کر اسلام کے دائرہ کار کے اندر اسے جائز قرار دینے کی کوششیں

کیں۔ اس طرح فاطمی اپنے نسب کو حضرت علی بن ابی طالبؓ سے ملاتے تھے۔ مرابطون کا دعویٰ تھا کہ ان کی تحریک فاطمی جبر کے خلاف سنی اصولوں کے تجدید کے لئے ہے اور خارجی والمحدث کا دعوی تھا کہ ان کے اصطلاحات اقلیت پسند ہیں اور حکومت کی بنیاد دلیل اور عوامی رائے پر ہونی چاہیئے۔

مغرب میں مرکزی حکومت کے ختم ہوجانے سے سیاسی وراثت کا مسئلہ کافی اہمیت اختیار کرگیا۔ حکمران امیر اپنی حکومت کو مذہبی حیثیت سے جائز قرار دینے میں ناکام رہے۔ ان سے پہلے فاطمی، مرابطون اور المحدث بھی اسی طرح ناکام رہے تھے۔ دھیرے دھیرے سیاست مذہب سے دور ہوتی چلی گئی۔ مذہبی اصولوں سے سیاست کا جدا ہونا ہی اندلس کی شکست کا اہم ترین سبب تھا۔ سلاطین کے دربار خوشامدیوں کے اڈے بن گئے تھے جب کبھی کوئی امیر معمولی سا معرکہٗ جیت لیتا یا چھوٹی سے یادگار تعمیر کرلیتا تو مورخ اور شعراء ان امیروں کی شان میں قصائد کے دریا بہادیتے۔ مغرب میں آفاقی اسلامی قوم کی تعمیر کا خواب اب چکنا چور ہو چکا تھا وہ دن نہیں رہے کہ ایسے خواب دیکھے جاسکتے۔

اعلیٰ تر جدوجہد کا سرچشمہ بلند تر خیالات یا تصورات ہی ہوتے ہیں وہ مضبوط ایمان ہی ہے جو کہ عظیم تصورات کو قوتِ نمو بخشتا ہے، جس سے قربانی کی روح بیدار ہوجاتی ہے۔ جدوجہد کی عظمت جاگ اٹھتی ہے۔ فرد کی اناء کو ماورائی قوت کے تابع کرنے والے تصور کے بغیر عظیم مشترکہ کامیابیاں ناممکن ہیں۔ ایک ماورائے ادراک تصور کے بغیر عوام کے ہجوم جنگل کی آگ کی طرح ہوتے ہیں جو ان کی راہ میں آنے والی ہر چیز کو جلا کر خاک کردیتی ہے۔ لیکن جب وہ ایک باہمی نظریہ سے بندھ جاتے ہیں تو ایک ایسی طاقتور لیزر شعاع کی طرح ہوجاتے ہیں جو تاریخ کی پرشکوہ عمارت پر اپنا فرمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت کردیتی ہے۔ اعلیٰ وعرفی تصورات ہی وہ سریش وہ سیمنٹ وہ طاقت اور وہ قوت ہیں جو کہ عوام کو متحدر کھتے ہیں۔ یہی اقدار ایک اعلیٰ تہذیب کی بنیاد اور تاسیس ہوتے ہیں۔

اسلام کی کوکھ میں توحید کا تصور چھپا ہوا ہے جو فرد کو اپنی اناء سے رہائی دلاتا ہے اسے ایک آفاقیت کی نمو بخشتا ہے۔ توحید خدا پرست تہذیب کو جنم دیتا ہے، جہاں تمدن، فنون لطیفہ، سیاست، عمرانیات سب کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب مکمل رغبت سے، پورے طور سے اس سے لو لگانے سے ہی پھوٹتے ہیں۔ جب مسلمان

توحید کے مرکز سے دور ہوگئے تو تاریخ پر اپنا کوئی نقش چھوڑنے کے قابل نہ رہے۔ حکمرانی کا جواز بس ایک لنگڑا بہانہ بن کے رہ گیا، جو صرف طاقتور کے سر باندھا جاتا تھا۔ حکمران، سپاہی، تاجر، اہل قلم اور علماء سب کے سب اس غلطی میں مشترکہ طور پر شامل ہیں۔ مغرب کے مذہبی علماء، خطیب سب مذہب سے دور سیاست کے اس دھارے میں بہہ چلے۔ جو کوئی بھی اقتدار کا حامل ہوتا بس اسی کا نام جمعہ کے خطبات میں لیا جاتا۔ المحدث کے منتشر ہو جانے کے بعد ہی سنی اسلام کا تصور ایک بار پھر دنیا میں مقام پا سکا، لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ دنیا کی تاریخ کی کشش کا مرکزی نقطہ مغرب سے دور نکل گیا۔

مغرب کی اکثریت نے مالکی مسلک کو اپنایا ہے تو ایشیاء کی مسلم اکثریت نے حنفی مسلک کو اپنایا، ان دونوں کے تاریخی تجربات کے درمیان موزانہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اسلام کے ماننے والوں نے ایک ہی بنیاد پر الگ الگ شاندار عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ ان کی تعمیر میں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی چھوڑی ہوئی روحانی اور دانشورانہ وراثت کو استعمال کیا گیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کے مسلک کے ذریعہ ایشیاء کے مسلمانوں کے ہاتھ وہ آلات دیئے وہ بلند خیالی عطا کی جن کے ذریعے وہ تاریخ کے دھارے میں اپنی الگ راہ بنا سکے۔ ترکوں نے حنفی مسلک کو اپنایا۔ جب بنی فاطمہ نے دسویں صدی عیسوی میں عباسیوں کو للکارا تو ترک عباسیوں کے علمبردار اور محافظ بن گئے۔ سلجوقیوں اور غزنویوں نے ملتان یعنی پاکستان اور بغداد یعنی عراق جیسے دور دراز علاقوں میں بھی فاطمی تسلط کی تلوار کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حنفی مسلک کے ماننے والے نویں اور دسویں عیسوی کے دوران اعلیٰ افکار کو اپنے میں رچا لینے، بسا لینے کی قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھے نظریات کی اس جنگ میں کامیاب و کامران ابھرے۔ اس طرح اشاعریوں نے دسویں صدی عیسوی میں معتزلہ افکار پر غلبہ حاصل کر لیا۔

یہ اشاعری اثرات حنفی ایشیاء کے افکار میں گھل مل گئے۔ الغزالی جنکا انتقال 1111ء میں ہوا، اکے نظریات بھی بالکل اتنی ہی آسانی کے ساتھ اس میں ضم ہوگئے۔ جب 1219ء تا 1301ء کے دوران منگول طوفان اٹھا اور ایشیاء کا ایک بڑا حصہ اس کی بربادیوں کی نذر ہو گیا تو صوفیانہ نظریات ظفریاب ہوئے، اسلام حد درجہ روحانیت پسند بن گیا، صوفیانہ تصورات بھی حنفی مسلک کا ایک خاصہ، ایک حصہ یا جز بن گئے۔ اس

وقت جبکہ صفوی اور مغل شاہی سلسلے کی بنیادی پڑی اور جبکہ عثمانیہ ترک اپنے نقطۂ عروج پر تھے اس وقت سہولویں صدی عیسوی کے دوران جو اسلام ابھرآیا وہ مدینہ، کوفہ، بغداد، بخارا اور سمرقند سے بہنے والے عظیم نظریات وتصورات کا سیمابی آمیزش تھا۔ اسی سیمابی آمیزش سے اس دور کی قدآور شخصیتیں ابھریں۔ وہ شخصیتیں تھیں۔ غزالیؒ ، حافظؒ، رومیؒ، عبدالقادر جیلانیؒ ،معین الدین چشتیؒ ، بہاؤالدین نقشبندیؒ، احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ محدثؒ اور محمد اقبالؒ۔ اوراسی سیمابی آمیزش کا پروردہ اسلام ہے جسکو آج تک ترک، پاکستانی، ایرانی، ہندوستانی، بنگالی اور وسط ایشیاء کے مسلمان گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔

مالکی مسلک کے حامل مغرب کے تجربات اس سے بالکل الگ ہیں۔ پورے تین سوسالوں تک فاطمی، مرابوطون اور المحد ث نظریات کے سامنے مالکی مسلک دبا سا جارہا تھا۔ آخرکار جب 1230ء میں اس مسلک نے آزادی کے ساتھ اپنے آپ کو اظہار کیا تو سیاسی اقتدار مغرب کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ سیاسی اور فوجی برتری پرتگالیوں اوراسپینوں کے ہاتھ آ گئی۔ ایک مختصر سے عرصہ کیلئے مغرب کو عثمانیہ سلطنت کا تحفظ حاصل رہا۔ اس کے بعد یہ باگ ڈور فرانس اور اطالیوں کے ہاتھ آ گئی۔ چودہویں صدی میں آخرکار مغرب نے صوفیانہ نظریات کو اپنا تو لیا۔ لیکن یہ یوروپی افکار سے اپنے تحفظ کے لئے اپنائی جانے والی طرزفکر تھی۔ جن تجربات کے دور سے حنفی ایشیاء گذرا ان سیمابی آمیزش اور ارتقاء پذیر تصورات سے مالکی مغرب کا گذر نہیں ہوا۔ انہی وجوہات کی بنا پر چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں مغرب انتہائی تیزی سے سیاسی، عمرانی اور تمدنی انتشار کا شکار ہو گیا۔

1453ء میں جب ترکوں نے استنبول پر قبضہ کیا تو اسی دوران مغرب میں حالات نے انتہائی سرعت کے ساتھ کروٹ لی۔ پوپ نکولس پنجم نے نئی صلیبی جنگ کے لئے آواز دی۔ ادھر مشرقی محاذ پر ترکوں کی ابھرتی ہوئی طاقت یوروپ کی متحدہ طاقت سے بھی کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ جبکہ مغربی محاذ پر ایک الگ ہی کہانی تھی۔ 1456ء میں پرتگال نے القصر کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اوراسے اپنا اڈہ بنا کر بحرالکاہل سے لگے سارے مراقشی ساحل پر حملہ کرنے لگے۔ 1469ء میں تانجیر پر پرتگال کا قبضہ ہو گیا۔ 1471ء تک مراقش کے نقشہ سے مرینیوں کا صفایا ہو گیا۔ اس طرح یہ علاقہ انتشار کا شکار ہو گیا۔ عام طور سے انتشار کا شکار شمالی

افریقہ غرناطہ کی امداد کرنے سے قاصر تھا۔ 1469ء میں پوپ کے مشورہ پر اراگون کی شہزادی ازبیلا نے کیاسٹیلے کے فرمانروا فرڈینینڈ سے شادی کر لی اس طرح سلطنتِ اسپین وجود میں آئی اس وقت غرناطہ پر ابوالحسن علی کی حکومت تھی جو ایک قابل، جری اور بہادر امیر تھا۔ شاید کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اسپین کی تاریخ پر اپنے کارناموں کے نشان ضرور چھوڑتا لیکن مغرب کی عام صفت کی طرح اس کا دربار بھی اندرونی سازشوں اور اقرباپروری کا بری طرح شکار تھا۔ 1482ء میں فرڈینینڈ نے الحمراء پر حملہ کیا یہ شہر غرناطہ سے بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ابوالحسن نے انتہائی شجاعت کے ساتھ شہر کا دفاع کیا لیکن اسے چھوڑ کر درمیان ہی میں واپس آنا پڑا اس کے اپنے بیٹے ابوعبداللہ، جس کو اسپینی بوعبدل کے نام سے پکارتے ہیں، کی بغاوت کی خبر اسے مل گئی تھی۔

ابوعبداللہ میں نہ تو اس کے باپ جیسی بہادری تھی اور نہ ہی قوت برداشت اور دیانتداری، باپ اور بیٹے کے درمیان ہونے والی لڑائی غرناطہ کے افواج کو اور زیادہ کمزور ہو گئیں۔ 1883ء میں ملاغہ پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا جیسے ہی کیاسٹیلے کی افواج صدر مقام کی طرف بڑھیں ابوالحسن کے بھائی الزغال نے نہایت بہادری اور پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا، لیکن بوعادل بار بار شہر کے دفاع کو کمزور کرتا رہا۔ 1483ء میں صفر شہر بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ فرڈینینڈ قرطبہ واپس آیا۔ آخری حملے کے لئے اسی ہزار افراد پر مشتمل فوج تیار کی۔ 1490ء میں وہ پھر پلٹ کر اپنے میزبانوں کے سر چڑھ دوڑا۔ محاصرہ کے لئے "سانتافے" یعنی ''مقدس شہر'' کی تعمیر کی اس طرح غرناطہ اور بیرونی دنیا کے تمام رابطوں کو منقطع کر دیا اب جو بھی مزاحمت تھی وہ بالکل مایوسانہ تھی۔ آخرکار بھوک سے بدحال ہو کر تین جولائی 1492ء کو غرناطہ والوں نے اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا۔

بنوامیہ کی ایک زمانے کی طاقتور ریاست اندلس پر اب ہلال کی جگہ صلیب کا تسلط ہو گیا ایک سلطنت مر گئی اس کی جگہ دوسری سلطنت نے لے لی۔ غرناطہ کے سپردگی کے معاہدہ میں عبادت کی آزادی اور ہجرت کرنے کی آزادی کی شرط بھی شامل تھی۔ لیکن چھ سال کے اندر ہی معاہدہ کو ترک کر دیا گیا۔ ظالم بشب چمنیز کی ہدایات پر بے کس و مجبور آبادی پر ظلم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔ 1492ء کے دوران

یہودیوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔اب مسلمانوں کی باری تھی ان کے سامنے دوراستے رکھے گئے یا تو عیسائیت قبول کرلیں یا ملک چھوڑ کر شمالی افریقہ چلے جائیں جو لوگ کلمۂ شہادت پڑھنے کی جرأت کرتے ان کی زبانیں کھینچ کر انہیں لٹکا دیا جاتا۔مسلمانوں کے گھرانوں کو پانی کی سربراہی بند کر دی گئی تاکہ وہ نماز سے پہلے وضو نہ کر سکیں مسلمان بچوں کو زبردستی کیتھولک اسکولوں میں داخل کر دیا گیا۔مسلمانوں کی عورتوں کو غلاموں کی حیثیت سے یوروپ کے بازاروں میں کھلے عام بیچا گیا،اس ظلم سے تنگ آ کر غرناطہ کے مسلمانوں نے ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق آخری جنگ کی ٹھان لی۔بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ 1496ء، 1501ء، 1568ء، 1609ء کے دوران ہر ایک بغاوت کو انتہائی بے رحمی سے کچل دیا گیا۔ آخرکار 1609ء میں مسلمانوں کا آخری قافلہ ایک شکستہ کشتی پر سوار ہوا اور مراقش کی جانب رواں ہو گیا۔ اندلسی مسلمانوں کا باب ختم ہوا۔ پر وہ گر گیا،امریکہ کے ساحلوں پر لنگر انداز ہونے والے اولین کشتیوں پر سوار لوگوں کے قافلے سویلے سے آئے تھے۔اس میں کئی مرد عورتوں اور بچوں کے نام اسلامی ہیں۔

افریقہ میں اسلام

خلاصہ

اسلام افریقہ میں اس وقت داخل ہوا جب مکی کافروں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ کرام کا ایک گروہ حبشہ ہجرت کر گیا۔ آنے والی صدیوں میں اموی دور حکومت کے دوران اسلام مصر اور شمالی افریقہ میں سیلاب کی طرح داخل ہوا اور سوڈان کے اندرونی مقامات تک پہنچ گیا۔ اس سے اور آگے سواحل تک اسلام تجارت، لین دین اور آپسی شادیوں کے ذریعہ پہنچا۔ اس عمل نے افریقی معاشرہ کو آفاقی مذہب کا روپ عطا کیا، آسمانی قانون دیا اور بین الاقوامیت کا رکن بنایا۔ اسلام کی آفاقیت سے اتحاد کی جلا پا کر مالی اور سونگھے جیسی عظیم سلطنتوں کا جنم ہوا۔ دریائے نائجر کے کنارے کنارے ٹمبکٹو، گاؤ اور جنین جیسی رفیع الشان درسگاہوں کی تعمیر ہوئی۔ ساحل بحر ہند کا اہم ترین تجارتی مرکز بن گیا جس کی حدیں جنوبی افریقہ کے شفون سے لے کر ملیشیاء کے ملاکا تک پھیل ہوئی تھیں۔ مصر اسلامی تہذیب کا مرکز قرار پایا اور مغرب اسلامی دنیا کی قسمت کا ہراول دستہ بن گیا۔

انتیسواں باب

افریقہ میں اسلام کا داخلہ

دنیا کے تمام براعظموں میں افریقہ ہی ایک ایسا واحد براعظم ہے جسکی آبادی کا اکثریتی حصہ اسلام کا پیروکار ہے۔ افریقہ نے اسلامی دنیا کو اسکا پہلا موذن بلال بن رباحؓ عطا کیا۔ اس کے عظیم ترین مورخ ابن خلدون کا بسیرا یہاں رہا اور اس کے مشہور ترین سیاح ابن بطوطہ کی جائے پیدائش بھی یہی براعظم ہے۔ اسلامی دنیا کی چند صحیح معنوں میں عوامی تحریکوں میں سے ایک مرابطون تحریک کو اس نے جنم دیا۔ جنوب مغربی یوروپ میں مسلم سیاسی فوجی اقتدار کا پرچم سربلند رکھنے کے لئے ضروری نفری تعداد اس نے فراہم کی۔ صلیبیوں اور منگولوں کے ساتھ تاریخی جدوجہد کے دوران اس نے اسلام کی بقاء کے لئے سونے کے دریا بہا دیئے۔ اس نے اپنی انسانی توانائیوں، موسیقی، فنونِ لطیفہ، تمدن اور تاریخ سے یوروپ اور ایشیاء کو مالا مال کردیا۔ اس کے باوجود یہ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ مسلمانوں کی افریقی تاریخ پر کس قدر کم توجہ دی گئی۔ سچ تو یہ ہے چین اور انڈونیشیا کے ساتھ ساتھ افریقہ کو بھی مسلم مورخین نے بالائے طاق ہی رکھا جیسے کہ افریقہ بس مشرق وسطی کا ایک حاشیہ بردار ہو اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ 250 ملین مسلمان افریقہ میں بستے ہیں یعنی مسلم آبادی کا بیس فیصد حصہ اور انڈونیشیا، ملیشیاء اور چین میں بھی 250 ملین مسلمان آباد ہیں۔ اس کے باوجود یہ توجہ کے مستحق نہ ہوئے۔

اس عدم توجہی کے لئے ہوسکتا ہے کہ کئی تاویلات پیش کی جائیں۔ مشرق کے علمی حلقوں نے زیادہ تر اسلام کے مشرق وسطائی کردار پر توجہ مرکوز کی ہے۔ اس کے بنیادی عرب عنصر کا زیادہ خیال رکھا ہے ترکی

اور ایرانی عناصر کوصرف تزئین کے لئے استعمال کیا ہے۔ سچ تو ہے کہ افریقی مسلمانوں کی تاریخ بھی اسی طرح سے نظر انداز کی گئی جس طرح کہ عمومی طور پر افریقہ کے ساتھ تاریخ دانوں نے کیا ہے۔ شاید یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یوروپی اقوام نے افریقہ کواس کی تاریخ سے محروم کرنے کی جانی بوجھی سازش کی ہے تا کہ وہاں کے عوام کواپنے ماضی سے دور کیا جائے۔ جبکہ افریقہ کی یہ تاریخ یوروپ کے قرون وسطیٰ کی تاریخ سے کم تابناک نہیں ہے۔ بحر اوقیانوس کے ذریعہ کی جانے والی براعظمی غلاموں کی تجارت کے لئے اور کیا جواز فراہم کیا جاسکتا ہے وہ تجارت جس کے ذریعہ ایک کروڑ مردوں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر جہازوں میں زبردستی لادکر بھیجا گیا۔ بات یہی ہوسکتی ہے کہ افریقی عوام کی تاریخ کو گمنامی میں دھکیلا جائے۔ ایک پورے براعظم کوغلام بنانے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے اسے انسانیت کے درجہ سے نیچے گرایا جائے۔ افریقہ کو''تاریک اعظم'' کہا گیا جو کہ تاریخی اورتہذیبی ارتقاء سے بالکل محروم ہے۔ نوآبادیاتی دور میں مسلمان دانش ور بھی اسی مغرب کی اندھی تقلید کرتے رہے کہ افریقہ کا کوئی تہذیبی اور تاریخی ورثہ نہیں ہے۔ ابھی حالیہ زمانہ کے دوران ہی اسلامی تاریخ کے لئے افریقی مسلمانوں کی دین کے بارے میں توجہ دی جارہی ہے۔ یقیناً افریقی مسلمان اس کے بجاطور پر حقدار ہیں۔

افریقہ ایک طویل وعریض براعظم ہے۔ ایشیاء کے بعد دوسرا نمبر اسی کا ہے۔ یوروپ سے یہ پانچ گنا بڑا ہے یہ دنیا کے سب سے بڑے اور ویران ریگستانوں اور گھنے جنگلات کا مسکن ہے۔ صحراء کا وسیع ریگستان بحیرۂ روم کی دنیا سے افریقہ کے دوسرے حصوں کو جدا کرتا ہے۔ دریائے نیل سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا مشرقی صحراء سے گذرتا ہے، اپنے اطراف کے چھوٹے سے خطہ کو ہری بھری زندگی دیتے ہوئے مصر کے مغرب میں لیبیاء کا عظیم صحراء ہے جہاں زندگی کی نمو تقریباً ناممکن ہے سوائے بحیرۂ روم کے ساحل سے لگی چھوٹی سی پٹی کے۔ کوہ اٹلاس کے سلسلے شمال مغربی علاقوں پر محیط ہو کر الجیریا اور مراقش کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے آگے اسپین کے اندر بڑھ جاتے ہیں۔ بحیرۂ روم سے لگے افریقی علاقوں کے جنوب میں وسیع چٹیل، لق ودق صحرائے اعظم واقع ہے جو کہ کرۂ ارض کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ناقابل برداشت صحراء ہے۔ یہ تیس لاکھ سے زیادہ مربع میل پر محیط ہے جو کہ ریاست ہائے متحدہ کے برابر ہے۔

صرف چند ایک اچھی طرح جانے پہچانے تجارتی راستے اس بنجر علاقہ سے گذرتے ہیں۔ یہی راستے بحیرۂ روم اور صحراء کے عقبی افریقی علاقوں کے درمیان تہذیبی روابط کی کڑی ہیں۔ موریطینیہ، مالی، الجیریا، نائجریا، چاڈ، لیبیاء، مصر اور شمالی سوڈان جیسے جدید ممالک یا تو مکمل طور سے یا جزوی طور پر صحرائے اعظم کے اندر ہی واقع ہیں۔ صحراء کا جنوب اسی قدر وسیع ہری بھری چراگاہوں اور زرعی زمینات پر محیط وسیع علاقہ جسے اس علاقہ کے کئی عظیم دریا سیراب کرتے ہیں۔ مغرب میں دریاء نائیجریا اور دریا سینیگل تو مشرق میں دریائے نیل اور اس کی معاون ندیاں، یہی علاقہ تاریخی طور پر مشہور سوڈان ہے جو کہ رقبہ میں امریکہ کے برابر ہے۔ آج اس علاقہ میں سینگال، گامبیا، گنی، بساؤ، مالی، بالی، مالٹا، نائجیریا، نائیجر، کیمرون، چاڈ، سوڈان، ایتھوپیا اور صومالیہ کے جدید ممالک آباد ہیں۔ یہاں ہم قاری پر یہ واضح کرینا چاہتے ہیں کہ تاریخی سوڈان مصر کے جنوب میں واقع جدید سوڈان سے الگ ہے۔ تاریخی سوڈان کافی وسیع وعریض علاقہ ہے جو کہ صحرا کے جنوب میں بحیرۂ اوقیانوس سے لے کر بحرِ ہند تک کے پورے علاقے پر محیط ہے۔ مشرق کے ایتھوپیائی کوہستان اور خطۂ زمین ایک بار پھر صومالی چراگاہوں اور صحراء میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ جنوب کی جانب خطِ استواء کی طرف سفر کرتے جائیگا تو ان علاقوں کو گھنے جنگلات میں ضم ہوتے ہوئے دیکھئے گا۔ یہ جنگلات کئی سومیل تک مغربی افریقہ میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن چلتے چلتے انتہائی دشوار گذار اور ناقابل گذر علاقہ ملتے ہیں جو کہ کانگو کے نشیبی زمینات سے لے کر زائرے، کینیا اور یوگینڈا تک دائرہ کئے ہوئے ہیں۔ بحیرۂ روم اور بحر ہند کے ساحلوں سے ابھر کر آنے والی تہذیب وتمدن کے اثرات حالیہ دور تک انہی جنگلات کے حدود تک پہنچے تھے۔ خط استوا کے جنوب میں افریقہ کا جنوبی علاقہ ہے جو کہ جنگلاتی علاقہ جات سے دھیرے دھیرے تبدیل ہوتا ہوا چراگاہوں اور قابل کاشت خطۂ ارضی میں تبدیل ہوجاتا ہے اور آخر میں آج کا جدید جنوبی افریقہ واقع ہوا ہے۔

افریقہ کی تاریخ اس کے جغرافیائی حالات اور خصوصیات سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ مصر جو کہ ایشیاء وافریقہ کے سنگم پر واقع ہوا ہے نیل کی وادیوں کی اولاد ہے۔ فرعون کے زمانے سے ہی نیل کے وادیاں اس علاقہ کو سیاسی تمدنی اور عمرانی استحکام بخشتی رہی ہیں۔ نیل کے ''فلاحین'' دنیا کے سب سے پرانے تمدنی

سلسلہ کے اکائی ہیں۔ بیرونی دنیا کے لئے مصر ہمیشہ سے افریقی تمدن، سائنس اور فنکارانہ تخلیق کی گذرگاہ رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران مشرقی بحیرۂ روم میں یونانی فکر کے ارتقاء میں افریقی دانشوری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ اس محور کے مرکز پر بیٹھا ہوا ہے جو کہ بحیرۂ روم کی تہذیب کو بحر ہند کے تمدن سے جوڑتا ہے۔ یہ ایشیاء کے لئے ایک عظیم پل رہا ہے اور اس کے تاریخی اثرات شام کے کوہساروں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بدلے میں مصر نے ہمیشہ سے ایشیاء کے فاتحین کی توجہ اپنی جانب مبذول کی ہے۔ چھٹویں صدی قبل مسیح کے دوران فارس کے حملے، پہلی صدی قبل مسیح میں روم کے حملے، ساتویں صدی عیسوی میں عرب اسلامی حملے اور آخر میں تیرہویں صدی عیسوی میں صلیبیوں اور منگولوں کے متحدہ محاذ کے حملوں کی کوششیں یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں۔

مغرب میں اٹلاس کے کوہسار بربروں کا مسکن ہیں جنہوں نے صدیوں سے بیرونی اثرات کا مقابلہ کیا ہے یہاں کے زمینی اور بحری تجارتی گذرگاہیں اندرونی طور پر بحیرۂ روم کے خطوں کو مربوط کرتی ہے۔ مغرب اور مصر دونوں ہی روم کی سلطنت کا ایک حصہ تھے۔ ساتویں صدی عیسوی کے دوران جب اموی افواج ایشیاء افریقہ اور یوروپ کو روندتی ہوئی چلی گئیں تو یہ سارے علاقے اسلامی سلطنت کے زیرنگیں آگئے۔ ابتداء میں اسلامی سلطنت نے اپنا دائرہ اثر ساحلوں کے قلعہ بند شہروں تک محدود رکھا، اندرونی علاقہ جات کے عوام تک ان کے اثرات نہیں پہنچ سکے۔ نتیجۃً مغرب میں ہمیشہ سے شہری سکونت پذیر آبادی اور اندرونی علاقوں کے خانہ بدوشوں کے درمیان ایک تناؤ برقرار رہا۔ کلاسیکل اسلامی دور کے دوران یعنی 700ء سے لیکر 1250ء تک اسپین اور جنوب مغربی یوروپ کی کنجی مغرب کے ہاتھ رہی۔ جب بھی بربروں کے ساتھ اتحاد برقرار رہا۔ اسلامی افواج اسپین اور فرانس کے قلب تک فتح یاب ہوتی رہیں۔ اور جب بھی اٹلاس کے پہاڑوں میں شورش بپا رہی۔ اسلامی افواج کی پیش رفت یا تو رک گئی یا واپس آنے پر مجبور ہوگئیں۔ گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران مغرب میں ہونے والے انتشار نے کافی حد تک مسلم اسپین کی قسمت کو متاثر کیا۔

سوڈان کی چراگاہوں، ڈھلانوں، اور زرعی خطوں میں مختلف النوع اقوام آباد ہیں جن کی اپنی ہی ایک

الگ شاندار تاریخ رہی ہے۔ گذری ہوئی صدیوں کے دوران اپنی آزادی پر نازاں تواریغی باشندے مغرب اور مغربی سوڈان کے درمیان رابطہ کی کڑی تھے۔ ادھر کچھ اور جنوب میں سنے گمبیا کے سوننکے، ولوف اور منڈنی کا آباد تھے۔ مغربی نائیجر کے دہانے پر بمبارا، فلبے اور موسّی، شمالی نائیجریا میں طاقتور ہاؤسا فلانی سکونت پذیر تھے۔ مشرقی نائیجیریا اور کیمرون میں کنوری، مشووا، سارا تھے اور چاڈ خطے میں بگرامی آباد تھے۔

بحیرۂ روم سے سوڈان کا رابطہ کاروانوں کے شاہراہوں کے ذریعہ برقرار تھا۔ قدیم زمانے سے ہی پانچ اہم راستوں کی اپنی شناخت برقرار رہی ہے۔ پہلا راستہ مراقش ہوتا ہوا مراکیش، موریطینیہ اور سنے گمبیا کی طرف جاتا ہے۔ دوسرا راستہ مشرقی مراقش کے ڈوڈ جا سے شروع ہوکر مغربی الجیریا کے بیجار سے گذرتے ہوئے قدیم تہذیبی مرکز مالی کے ٹمبکٹو پر ختم ہوتا ہے۔ تیسری گذرگاہ الجیریا کے تمن رسیٹ، نائیجر کے آغاویز سے ہوتے ہوئے آخرکار نائیجریا کے کانو پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ چوتھی شاہراہ اہم تجارتی مرکز دریائے نائیجر کے نشیبی علاقوں کو شمالی نائیجریا کے کانو، چاڈ کے انجامِنا سے جدید سوڈان کے العبید سے گذرتے ہوئے آخرکار بحیرۂ احمر تک جا پہنچتی ہے۔ پانچواں راستہ یمن اور حجاز کو بحیرۂ احمر کے ذریعہ ایتھوپیا کو جوڑتا ہے۔ اس کے علاوہ عرصۂ دراز سے مشرقی افریقہ کے ساحلوں سے اومان اور بحیرۂ فارس کے علاقوں کے تجارتی روابط باقاعدہ طور پر برقرار تھے۔

یہ تجارتی راستے نہ صرف دونوں جانب کے تاجروں اور انکے سازوسامان کی گذرگاہ تھے بلکہ نظریات کے تبادلہ کے رابطے بھی یہی تھے۔ جلال و جمال کا سنگم اسلام بھی ایسا ہی ایک مذہب تھا جسکا گذران راہوں سے ہوا کرتا تھا۔ افریقہ تو اسلام کے گہوارہ میں ہی تھا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی باعزت صحابۂ کبارؓ میں سے ایک حضرت بلال بن رباحؓ موذنِ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ابی سینا سے حجاز کی نزدیکی نے مکہ کے عربوں اور افریقیوں کے درمیان مسلسل روابط کو ضروری بنا دیا تھا۔ جب اسلام کے پیغام کے خلاف عرب کے کفار کی دشمنی اپنی انتہاء پر پہنچ گئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند ساتھیوں کو ابی سیناء کی جانب ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔

620ء کے آس پاس مسلمانوں نے لہر در لہر ہجرت کی۔ ابی سیناء کے بادشاہ نیگوس نے کھلے دل سے

انکا استقبال کیا۔ جب مسلمانوں اور کفار کے درمیان امن قائم ہوگیا تو یہ مہاجر مکہ لوٹ آئے۔ لیکن رابطہ برابر برقرار رہا اور ایتھوپیا کے کوہساروں نے افریقہ میں سب سے پہلے اسلام کے پیغام کی آواز سنی۔ زبانی روایات کے مطابق حضرت بلال ابن رباحؓ کے کچھ وارثین نے ماءالیل کو ہجرت کی جو کہ مالی کا عربی نام ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہاں کا ایک قبیلہ ''مندنیکا کا کیٹا'' اپنا سلسلہ نسب سے حضرت بلال بن رباحؓ سے جوڑتا ہے۔ مالی کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد کا سہرا اسی قبیلہ کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس قبیلہ کو مندنکا زبان میں ''بلالی بونامہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بھی روایات ہیں کے کچھ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم لیبیاء ہجرت کر گئے اور وہاں سے اور آگے کافی جنوب میں واقع چاڈ کی جھیل تک پہنچ گئے۔ اس طرح کی ہجرتیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتوں کے عین مطابق بھی ہے۔

انہوں نے صحابہ کرام سے یہ کہا تھا کہ دین کی اشاعت کے لئے دنیا کے دور دراز علاقوں میں پھیل جاؤ۔ افریقہ کی ابتدائی تاریخ زیادہ تر زبانی ہی ملتی ہے۔ اس بات میں شک وشبہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ مکہ سے افریقہ ہجرت کرنے والے صحابۂ کرامؓ نے یہاں کے علاقوں سے برابر رابطہ قائم کیا۔ اور مغربی افریقہ کے ترقی یافتہ علاقوں میں بس گئے۔

مسلمانوں نے 642ء میں مصر اور لیبیا کو بازنطینی سلطنت سے چھین لیا۔ اسلام نے مصر میں زوال پذیر بازنطینی تہذیب کی ماہیت کو تبدیل کر کے اس کو ترقی پذیر کر دیا۔ اس کو توحید پرست ماورائی رنگ سے شرابور کر دیا۔ اس طرح نیل کی گودی نوزائیدہ اسلامی تہذیب کا گہوارہ بن گئی۔ مصر کی فتح کے چالیس سالوں کے اندر اموی قیادت کے ماتحت اسلامی افواج بحر اوقیانوس تک پہنچ گئیں۔ مغرب کے فاتح عقبہ بن نافعؓ نے 670ء کے آس پاس خیروان شہر کی بنیاد ڈالی جو کہ جدید تیونیسہ میں واقع ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عقبہ بن نافعؓ نے موریطینیہ پر بھی حملے کی قیادت کی تھی۔ سنے گامبیا کا ''کنٹا'' قبیلہ اپنا سلسلۂ نسب عقبہ بن نافعؓ سے ہی جوڑتا ہے۔ کنٹا قبیلہ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ایک باعزت قبیلہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے سدی محمد الکنتیؒ جیسے دانشوروں کو جنم دیا۔ مغربی افریقہ میں اسلام کی تبلیغ وترویج میں آپ کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں سدی محمدؒ کے بیٹے سدی البقائیؒ نے مغربی

افریقہ میں سلسلۂ قادریہ کو جاری کیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بغدادی نے 1077ء تا 1166ء کے دوران سلسلۂ قادریہ کو قائم کیا۔ یہ سلسلہ افریقہ، پاکستان، ہندوستان، وسطِ ایشیاء اور جنوب مشرقی یوروپ میں اسلام کی اشاعت کا زبردست باعث بنا۔ ایک اور عظیم افریقی شخصیت عثمان دان فدوئیؒ نے سدّی محمدؒ اور قادریہ سلسلہ کے نظریات سے متاثر ہوکر انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں مغربی افریقہ میں اسلام کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کی۔

خیروان ایک اہم تجارتی مرکز کے علاوہ دانشوروں کو اپنی طرف کھینچنے والا مقناطیس بن گیا۔ سوڈان، المغرب اور اسپین کے بڑے بڑے تجارتی قافلے اس شہر سے گذرتے اور مصر سے واپس ہوتے، ایران، خراسان ہندوستان اوران کے آگے کے ممالک سے بھی درآمد شدہ اشیاء سے لدے ہوئے قافلے انہی راہوں سے آتے۔ اس سے بھی اہم ترین بات یہ تھی کہ مکہ اور مدینہ کی جانب حج کے لئے جانے والے قافلے بھی یہیں سے ہوکر گذرتے۔ ہم نے پچھلے ابواب میں بتادیا ہے کہ مدینہ مالکی مسلکِ فقہ کا مرکز تھا۔ یہ فطری بات تھی کہ خیروان اور اسپینی شہروں کی خوشحالی سے متاثر ہوکر مالکی مسلک کے علماء شمالی افریقہ کا رخ کرنے لگے۔ یوں لازمی طور پر مکہ کی نورانی تابانی مغربی افریقہ پہنچی، مالکی مسلک فقہ کو سارے مغربی افریقہ، المغرب اور اسپین کے عوام نے اپنالیا۔ گذشتہ ایک ہزار سالوں سے مالکی مسلک کے اصول قانون نے اور جج وقاضیوں نے مغربی افریقہ اور بقیہ اسلامی دنیا کے درمیان اہم ترین تہذیبی رابطہ کی کڑی کو قائم رکھا ہوا ہے۔

بنوامیہ جن کا المغرب پر تسلط تھا اور سلطنت گھانا کے درمیان تجارتی مصلحتوں کی وجہ سے بیوپاریوں اور تجارتی قافلوں کے آنے جانے میں مدد ملی، یہاں یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ جدید گھانا ملک کے نام سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ پرانی گھانا سلطنت مالی کے اطراف مرکوز تھی۔ جنوب کے سونے کی کانوں پر گھانا کا تسلط تھا۔ جب تجارت میں اضافہ ہوا تو سونے کی مانگ بھی بڑھنے لگی۔ اموی بادشاہ اور ان کے بعد آنے والے بادشاہوں نے تجارتی شاہراہوں کو محفوظ بنائے رکھنے پر خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے کارواں کے گذرگاہوں پر جگہ جگہ تجارتی مراکز اور کارواں سرائے تعمیر کئے تاکہ زیادہ سے زیادہ سازوسامان بحفاظت ان راہوں سے گذر سکے۔ مغربی افریقہ سے برآمد ہونے والے مال میں پہلا نمبر

سونے کا تھا، دوسرے تجارتی اشیاء میں نمک، ہاتھی دانت، گری دار کولا شامل تھے ان اشیاء کے بدلے میں شمالی افریقہ سے مذہبی اموراور انتظامی امور کی خدمات انہیں حاصل ہوتی تھیں۔اسی شمالی افریقہ سے مغربی افریقہ کو بہترین گھوڑے بھی فراہم ہوتے۔ایشیاء سے گرم مصالحہ آتے، خیروان، بخارا اور بغداد سے علم کے اعلیٰ قسم کے کتب آیا کرتے۔کچھ مغربی مصنفین کا یہ الزام بالکل غلط ہے کہ ان تجارتی گذرگاہوں سے ہونے والی عرب افریقی تجارت کا اہم مال غلام تھے یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔سترہویں اوراٹھارویں صدی عیسوی کے دوران اومان کے تاجروں مشرقی افریقہ کے بنٹوعلاقہ سے غلاموں کی تجارت میں یوروپی اقوام سے آگے بڑھنے کی کوششیں کی تھی۔

مغربی افریقہ میں اسلام کی بنیاد کو استحکام عطا کرنے میں فوج کشی یا عربوں کی ہجرت کا ہاتھ نہیں بلکہ تجارت ہی اس کا واحد بنیادی سبب تھا،اس دور کے اہم تجارتی مراکز یہ تھے الجیریا میں طاہرت، مراقش، سجیل ماساہ، مالی میں تاندیری اور نائیجر میں آغادیز۔کاروانوں کی یہ شاہ راہیں سینے گامبیا، اور دریائے نائیجر کے دھانے کے علاوہ چاڈ جھیل کے کناروں پرواقع دولت مند شہروں سے مربوط تھیں۔سنہاجہ قبیلہ صحارا کے علاقوں میں آباد تھا یہ قبیلہ یہاں سے گذرنے والے کاروانوں کو بحفاظت اپنی منزل تک پہنچایا کرتا تھا۔اموی دورِحکومت کے دوران آٹھویں صدی عیسوی میں ہی اس سنہاجہ قبیلے نے سب سے پہلے اسلام قبول کرلیا مقامی تاجر، امراء اور قبائل کے سردار سینے گامبیا اور دریاءِ نائیجر کے دہانے میں اسلام پھیلانے میں پیش پیش رہے۔اس کے کئی اسباب بیان کئے جاسکتے ہیں۔وہاں کے تاجر تو مسلمانوں کی تجارتی ایمانداری اور شریعت کے تجارتی قوانین سے بہت متاثر تھے۔امراء اور قبائلی سرداروں کو تنظیمی اور انتظامی مہارت کے لئے مسلمانوں کی خدمات حاصل کرنی پڑتی تھی لیکن اہم ترین بات تو یہ تھی کہ اسلام نے آفاقی عقائد اور ایک واحد آفاقی قوم کا تصوّر پیش کیا جس کے مطابق تمام مسلمان تمام ایمان والے آپس میں برابر تھے۔نویں صدی کے آتے آتے گاوو، گھانا اور ٹکرور شہروں میں مسلمانوں کے اہم مراکز وجود میں آگئے۔گیارہویں صدی عیسوی تک گھانا سلطنت کے طاقتور بادشاہ بھی بذات خود اسلام قبول کرچکے تھے۔ابتداء میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے میں افریقہ کی باطنی روحانیت پرمبنی روایتی تمدنوں سے

بھی مدد ملی تھی۔ روحانیت پرست افریقہ کے منظر پر جب اسلام آیا تو اس نے دین الفطرۃ کا اعلان کیا، یعنی ساری انسانیت کے لئے فطری مذہب جو تمام اقوامِ عالم کو یاد دلانے آیا ہے، اس روحانی رشتہ کی یاد جو کہ انسان اور علیمِ بسیط، علم کل رکھنے والی واحد قوت کے درمیان ہے۔

جوش وجذبہ سے سرشار مسلم قوم کے موجودگی نے المغرب اور سوڈان کی عمرانی اور سیاسی تحریکوں کا رخ اپنی ہی جانب موڑ لیا۔ وہ تمام تحریکوں کا منبع ومرکز بن گئے۔ گیارہویں صدی عیسوی کے پہلے پچاس سالوں کے دوران مغربی افریقہ کے لق ودق صحراؤں سے مرابطون اٹھے اور سارے مغرب اور اسپین پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ انہوں نے مراقشی، موریطانی علاقوں میں رباط قائم کئے، رباط قلعوں، مدرسوں اور روحانی تربیت کے ملے جلے مراکز ہوا کرتے تھے۔ یہی رباط 1150ء تک ایک مرکزی سیاسی اقتدار کا متحدہ محاذ بن گیا اور ایک عوامی تحریک کا جنم داتا بھی، اسی طاقت ورعوامی تحریک نے اسپین میں معدوم ہوتے ہوئے امویوں اور شمالی افریقہ میں زوال پذیر بنی فاطمہ کو ختم کردیا۔ انیسویں صدی عیسوی میں اسلام نے ہی مغربی افریقہ میں باطنی اصلاح کو ازسرنو جلا بخشی اور اسلام ہی وہ قوت تھی جس نے اسی دوران اس علاقہ سے یوروپی نوآبادیت کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کو قوت نموعطا کی۔ عثمان دان فدویؒ جن کا انتقال 1817ء میں ہوا ان کی جدوجہد سے ''سکوتو خلافت'' قائم ہوئی اور ہر طرف غلاموں کو بغاوت پر آمادہ کیا جس کی بازگشت جمیکا جیسے دور دراز علاقوں میں بھی غلاموں کی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا۔

مشرقی افریقہ میں اسلام کا تعارف مغربی افریقہ کے برخلاف ایک مختلف راہ سے ہوا۔ مشرقی افریقہ ایک وسیع علاقہ پر پھیلا ہوا ہے اس میں صومالیہ، کینیا، یوگینڈا، روانڈا، تانزانیہ، ملاوی اور موزمبیق جیسے جدید ممالک اس کے دائرہ میں شامل ہیں۔ آج اس علاقہ کی سوکروڑ آبادی کا تقریباً چالیس فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

اسلام کی ابتداء سے پہلے ہی یہ علاقہ عربوں کا جانا پہچانا تھا۔ اور''سرزمین زنج'' کہلاتا تھا۔ بحر ہند کے علاقہ میں جاری ایک انتہائی خوشحال اور بڑی تجارت کا ایک حلقہ تھا، ایک ایسی تجارت جو ہندوستان، چین، فارس، عربستان اور افریقہ کے مشرقی ساحلوں تک وسیع تھی۔ خلیج فارس سے سلک اور دوسری

مصنوعات آتی تھیں تو یمن ان ممالک کو بخورات اور گھوڑے درآمد کرتا تھا۔ افریقہ کی برآمدات میں ہاتھی دانت، سونا، جانور کی کھالیں، عنبر اور چاول شامل تھے۔ بحر ہند کی ساحلوں پر ایک قوس کی شکل میں بڑے، چھوٹے تجارتی مراکز افریقہ کے آخری کناروں سے لے کر خلیج ملا کا تک پھیلے ہوئے تھے۔ مشرقی افریقہ کے ممباسا، پیمبا، قلوا، اور شفولہ جیسے شہر بھی انہی تجارتی مراکز کا ایک حصہ تھے۔

مشرقی افریقہ میں اسلام کا تعارف ساتویں صدی عیسوی میں ہی ہوگیا۔ عربستان سے قافلہ در قافلہ لہروں کی شکل میں پہنچنے والے وہ مسلمان مہاجر اس تعارف کا باعث بنے۔ مہاجروں کا پہلا قافلہ 698ء میں یہاں آیا۔ یہ مہاجر عراق کے اموی گورنر حجاج بن یوسف کے مظالم سے پناہ لینے کیلئے یہاں آئے اس کے کچھ عرصہ ہی بعد ایک اور قافلہ آ پہنچا جس کی قیادت سلیمان اور سعید نامی خارجی کر رہے تھے۔ انہوں نے خلیفہ عبدالمالک کے خلاف بغاوت کی تھی اور ناکام رہے تھے۔ جدید کینیا کے ممباسا کے شمال میں لامو کے علاقہ میں سعید نے ایک عبادی ریاست قائم کی۔ امویوں کی جانب سے جیسے جیسے اپنے مخالفین پر ظلم کی انتہاء ہوتی گئی ویسے ویسے زیادہ سے زیادہ مہاجر ان مظالم سے بچنے کے لئے اس علاقے میں آتے گئے۔ 729ء میں جب شیعہ کا زور توڑنے کے لئے ایک زبردست فوجی کارروائی ہوئی تو شیعہ کی کثیر جماعت ممباسا ہجرت کر گئی۔ 750ء میں جب عباسی انقلاب آیا اور امویوں کو چن چن کر قتل کیا جانے لگا تو اب امویوں کی باری تھی کہ وہ ہجرت کرتے، یہ بھی وہاں سے بھاگے اور افریقہ میں پناہ لینے لگے۔ 908ء میں کرامتیوں کی تباہیوں سے بچنے کے لئے ہزاروں عراقی بھاگ کر صومالیہ پہنچے اور اپنے لئے شقہ نامی شہروں کی تعمیر کی۔

گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں کے حملوں کی وجہ سے ایرانی معاشرہ کافی حد تک بکھر گیا۔ جنگوں کی تباہیوں سے بچنے کے لئے کچھ ایرانی مغرب کی جانب اناطولیہ کی طرف ہجرت کر گئے تو کچھ نے مشرقی افریقہ کا رخ کیا عراق اور ایران کی سیاسی شورشوں سے بچ کر بھاگنے والے زیادہ تر مرد ہی تھے۔ مشرقی افریقہ میں انہوں نے دوسری نسل کی مقامی بنٹو عورتوں سے شادیاں کیں۔ ان شادیوں نے عرب، فارسی، بنٹو نسلوں کے اشتراک نے بڑے ہی قیمتی سیماب صفت ارتعاشی سواحلی تمدن کو جنم دیا۔ سواحلی کا

مطلب ہے ساحل کے کنارے، اسی تہذیب کی کوکھ سے تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کے دوران طاقتور سواحلی سلطنتوں کے سلسلہ نے جنم لیا۔

سواحلیوں نے بارہویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی جسکا صدر مقام خلوہ تھا۔اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس سلطنت کی سرحدیں پورے ساحل تک پھیل گئیں جس کا ایک کنارہ زنجبار تھا تو دوسرا کنارہ تھا شفولہ۔اندرونی علاقوں میں اس کی سرحدیں دریائے زامبیزی تک وسیع ہوگئیں جس میں زمبابوے اور منیکا کے سونے کی کانیں بھی شامل تھیں۔سونے کی بہتات اور تجارت کے عروج پر پہنچنے سے سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگیا جس کی وجہ سے یمن سے اور افریقہ کے کوہساروں سے لوگ ہجرت کر کے آنے لگے۔سونے کی تجارت کے لئے ضروری سہولیات بہم پہنچانے کی خاطر ٹی ٹی اور سنّہ جیسے شہر وجود میں آئے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مغربی بحر ہند میں اومان سب سے بڑی بحری طاقت بن کر ابھرا،اومان والوں نے جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی ساحلوں پر قبضہ کرلیا جس میں یمن بھی شامل تھا ان کے اثر کا دائرہ ساحل تک پھیلا ہوا تھا۔1303ء میں اومان کے سلطان سلیمان نے اپنی سلطنت کا پایۂ تخت اومان سے کنیا کے بطاح کو منتقل کردیا۔اگلے پانچ سوسالوں تک ساحل کی تاریخ عام طور پر اومان اور خلیج فارس سے مربوط رہی۔

عربستان اور فارس سے ہجرت کرنے والوں میں علماء کی بھی کافی تعداد تھی۔دانش وروں، تاجروں اور مہاجروں کی کثیر تعداد نے ایک نئی اسلامی قوم کی ابتداء کے بیج بودیئے۔سارا تجارتی لین دین شریعت کے اصولوں کے تحت ہی ہوا کرتا تھا۔جنوبی عربستان میں نشوونما پانے والے شافعی فقہ نے مشرقی افریقہ میں بھی مضبوطی سے اپنا تسلط جمالیا۔بین النسل شادیوں کی وجہ سے تبدیلیٔ مذہب میں بھی اضافہ ہونے لگا۔مسلمانوں کی آبادی بڑھنے لگی۔تیرہویں صدی کے دوران صوفیانہ طرز فکر کے پروں پر سوار ہوکر اسلام عربستان وفارس کے قلب سے اور آگے پھیلنے لگا تو مشرقی افریقہ میں بھی صوفیانہ زاویئے قائم ہوگئے۔ان زاویوں کے عالمی نظام نے جو کہ ایک دوسرے سے مربوط تھے اسلام کے ان نوزائدہ اقوام کو استحکام بخشا جسکی وجہ سے تاجروں اور دانشوروں کے آنے جانے کا تسلسل برقرار رہا اور اسلام کی اشاعت میں بھی

کامیابی حاصل ہوتی رہی۔عرب، فارس اور بنٹو عناصر کے اختلاط نے اور آپسی میل جول نے ایک نئی زبان کو جنم دیا۔ یہ زبان تھی سواحلی، یہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور عربی، فارسی اور بنٹو زبانوں کے مشترکہ الفاظ سے مالا مال تھی۔

1329ء کے دوران مشہور عالمی سیاح ابن بطوطہ نے موگوڈیشو،ممباسا اور خلوہ کا سفر کیا تھا۔اس نے موگوڈیشو کو ایک خوشحال شہر پایا جس کے راستے پختہ تھے۔ جہاں بڑے گنبدوں والی مساجد تھیں۔ وہاں کے لوگ خداترس اور قانون کے پاسدار تھے۔سونے اور چاندی کے زیورات پہنا کرتے تھے اور چینی کے برتنوں میں کھاتے تھے۔آگے جنوب میں خلوہ ایک بڑی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ یہ سلطنت یمن سے آئے مہاجروں نے قائم کی تھی۔جس پر مہدالی شاہی سلسلہ کا راج تھا۔ جب ابن بطوطہ نے اس سلطنت کا سفر کیا تھا اس وقت اسی مہدالی شاہی سلسلہ کا چوتھا فرمانروا وہاں حکومت کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس سے اپنے دربار میں ملاقات کی تھی۔اس نے اس بادشاہ کو بے حد منکسر المزاج اور غرباء کے ساتھ بذاتِ خود بیٹھ کر کھانے والا پایا۔وہ علماء اور شرفاء کی بیحد عزت کرتا تھا۔اسلام کی اشاعت کی کوششیں اس علاقہ سے آگے اور جنوبی افریقی سینگوں کے علاقہ میں اس وقت رک گئیں جب سولہویں صدی کی ابتداء میں یہاں یوروپی گن بردار کشتیاں نمودار ہوئیں۔1505ء میں پرتگالیوں نے خلوہ پر قبضہ کرلیا۔اس کی تمام پانچ سو مساجد کو مسمار کردیا اور وہاں کے باشندوں کو ذبح کردیا۔

1508ء میں انہوں نے موزمبیق پر قبضہ کرلیا۔اس قبضہ کے ساتھ ہی اور زیادہ لوگوں کا قتل بھی کیا۔ پرتگالیوں کے اس چیلنج کے مقابلے کے لئے عثمانیہ ترک میدان میں اتر آئے۔اومان کے سلطان سیف بن سلطان نے سلطنتِ عثمانیہ کے بحری بیڑہ کی مدد سے پرتگالیوں کو مار بھگا دیا اور ساحل کے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔مسلمانوں کی فتح کے ساتھ اس نے اپنا صدر مقام اومان سے خلوہ کو منتقل کیا۔مشرقی افریقہ پر تسلط کے لئے سولہویں اور سترہویں صدیوں کے دوران جدوجہد جاری رہی۔اومانی شاہی سلسلوں کے یاروبی اور سیدی، عثمانیوں کے ساتھ مل کر مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔اس دوران سلطنت کا پایہ تخت بھی مشرقی افریقہ اور خلیج فارس کے درمیان کبھی ادھر کبھی ادھر منتقل ہوتا رہا۔1600ء کے بعد طاقت کا ایک توازن قائم ہوگیا۔مسلمانوں کا

قبضہ شفالہ کے شمالی ساحلی علاقوں پر برقرار رہا اور جنوبی علاقوں پر پرتگالیوں نے اپنی گرفت قائم رکھی۔

سترہویں صدی عیسوی میں بحر ہند میں ڈچ قوم کی بحری طاقت کا بول بولا قائم ہوگیا۔ اس نے یہاں سے پرتگالیوں کا خاتمہ کیا۔ جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن، سری لنکا میں کولمبو اور ملائیشیاء میں ملاکو جیسی اہم پرتگالی نوآبادیات پر قبضہ کیا۔ لیکن دراصل انڈونیشیاء کے جزائر پر ڈچ کا ظلم قہر بن کر برستا رہا۔ آرکیلاگو کے سلاطین سے ان کی مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ ان جنگوں کے دوران ڈچ مسلمانوں کو قیدی بناتے اور جہازوں میں بھر کر جنوبی افریقہ پہنچا دیتے۔ ان قیدیوں میں کچھ دانشور علماء بھی تھے۔ صوفی شیوخ بھی تھے۔ انہی علماء اور صوفیوں کی کوششوں سے پہلی بار آبنائے گڈ ہوپ کے آس پاس کے علاقے اسلام آشنا ہوئے۔ آج جنوبی افریقہ کے چمن زاروں میں ان معزز صوفی شیوخ کے مقابر ستاروں کی مانند چمک رہے ہیں۔ سید عبدالرحمٰنؒ کا مقدس پر جلال مقبرہ اس سچائی کا مظہر ہے۔ سید عبدالرحمٰنؒ کو سماترہ سے 1652ء میں پابہ زنجیر کیپ ٹاؤن لایا گیا تھا۔

1805ء میں اومان کے سلطان، سعید بن سلطان نے اپنا دارالخلافہ مسقط سے زنجبار کو منتقل کیا۔ وہ ایک دانش ور اور دور اندیش فرمانروا تھا۔ اس نے سلطنت اومان کو خوشحال ریاست بنا دیا۔ اس نے زراعت اور تجارت کو فروغ دیا۔ زنجبار میں پہلی مرتبہ لونگ کی کاشتکاری کی۔ مسلمان مہاجروں کو سہولیات فراہم کیں۔ پڑوسی افریقی بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اس کے انتقال کے بعد سلطنت اومان دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک تھا صوبۂ عرب دوسرا تھا مشرقی افریقی صوبہ، سلطان ماجد ابن سعید ساحل کا سلطان بنا۔ اسی نے شہر دارالسلام کی بنیاد رکھی اور اپنی سلطنت کے صدر مقام کو زنجبار سے اس شہر کو منتقل کیا۔

1870ء میں سلطان ماجد کے انتقال کے ساتھ ہی مشرقی افریقہ میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ نوآبادیاتی نظام حکومت اپنے عروج پر تھا، برطانیہ، جرمنی، پرتگال اور اٹلی نے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت مشرقی افریقہ کو آپس میں تقسیم کر لینا تھا۔ 1883ء میں جرمنی نے زنجبار پر قبضہ کر لیا۔ پرتگال آبنائے ڈیلگاڈو کے جنوبی علاقہ کی جانب بڑھے اور اسے موزمبیق میں شامل کر لیا۔ برطانیہ نے کینیا پر اپنا تسلط جمایا۔ 1887ء میں زنجبار کے سلطان بارغاش ابن سعید نے چار ملین مارک کے عوض دارالسلام، خلوہ اور لندی

شہروں کو جرمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ 1889ء میں اس نے پیمبا اور زنجباء پر برطانیہ کی سرپرستی قبول کر لی۔ اس کے دوسرے سال اس نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار ہندوستانی روپیہ میں مگاڈیشو کو اطالویوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ 1894ء میں سالانہ دس ہزار برطانوی پونڈ کے بدلہ میں ممباسہ کو برطانیہ کے پاس رہن رکھ دیا۔ 1907ء میں برطانیہ نے نیاسا جھیل کے اطراف اور اکناف کے علاقہ کی از سر نو تنظیم کی اور اسے نیاسالینڈ کا نام دیا جو آگے چل کر ملاوی جمہوریہ بنا۔ ادھر جرمنوں نے اپنے زیر تسلط کے علاقوں کی از سر نو حد بندی کی اور اسے تانزانیا کا نام دیا۔ 1918ء میں جرمنی نے اپنی شکست کے بعد یہ علاقہ برطانیہ کے سپرد کر دیا۔

نو آبادیات کے اس فروغ کے ساتھ ہی یوروپ سے مشنریوں کا ریلا آیا۔ نجی سرمایہ کاروں نے انہیں بے شمار دولت دی تھی اور انہیں نو آبادیاتی سرکار کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اب تو افریقہ کی روح داؤ پر لگی تھی۔ نو آبادیاتی نظام نے عربی سیکھنے پر پابندی عائد کی، مقامی سواحلی زبان کا استحصال کیا۔ اس کے استعمال پر روک لگائی، مشنیریوں نے بڑے بڑے تعلیمی ادارے قائم کئے جن کا مقصد تھا نو آبادیاتی نظام کو چلانے کے لئے ضروری کارندے تیار کرنا لیکن اس سے بڑا مقصد تھا ان اداروں کے ذریعہ مقامی لوگوں کو عیسائیت کے دائرہ میں کھینچ لینا۔ مسلمانوں نے یہ خوف محسوس کیا کہ اگر ان اداروں میں ان کے بچے تعلیم پانے لگے تو وہ دین سے بیگانہ ہو جائیں گے اسی لئے انہوں نے اپنے بچوں کو مشنیریوں کے ان مدارس میں داخل نہیں کروایا۔ انہوں نے انتہائی بہادری کے ساتھ اپنی بقا کی جنگ لڑی خود اپنے ادارے کھولے جن کی بنیاد مدرسہ اور شیخ کے تعلیمی نظام پر مبنی تھی۔ لیکن ان کے پاس ان اداروں کو چلانے کے لئے ضروری مالیہ نہیں تھا اس لئے ان کا معیار بھی متاثر ہو گیا جو لوگ مشنری اداروں سے پڑھ کر باہر نکلے انہیں نو آبادیاتی نظام میں اچھے عہدے مل گئے جب دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیاتی نظام بکھرنے لگا اور افریقی ممالک آزاد ہونے لگے اس وقت دیوانی انتظامیہ میں عیسائی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ تعلیم کے اس فرق نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی کا عنصر شامل ہو گیا آج بھی مشرقی افریقہ میں اسی وجہ سے حالات کشیدہ ہیں۔

تیسواں باب

مانساموسیٰ کا حج

تقریباً پانچ لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبہ پر محیط مالی کی سلطنت بلا شک وشبہ چودھویں صدی عیسوی میں دنیا کی مالدار ترین سلطنت تھی اس کی سرحدیں مغرب کی طرف دور بحراوقیانوس کے ساحلوں سے ٹکراتی تھیں تو ادھر کافی آگے مشرق میں دریائے نائیجر کے موڑ تک پھیل ہوئی تھیں۔ شمالی صحارا کے جنوبی چٹیل میدانوں سے لے کر خطِّ سرطان کے گہرے جنگلوں پر محیط تھی۔ یہ سلطنت قدرتی وسائل سے مالا مال تھی، سونا، نمک، کولا جوز اور ہاتھی دانت وافر مقدار میں ملتے تھے۔ ان اشیاء کی بحیرۂ روم کے ممالک کے بازاروں میں بہت بڑی مانگ تھی۔ ان تمام کے علاوہ یہ سلطنت مانسا موسیٰ جیسے قابل حکومت کا زبردست ملکہ رکھنے والے اور دور رس نگاہ رکھنے والے بادشاہوں کی سربراہی میں رہی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے مالی کا اہم ترین عنصر جو تھا وہ اسلامی تھا۔ اس حقیقت نے اسے وسیع اسلامی دنیا کا ایک جزو لاینفک بنادیا۔ مالی کی سلطنت کا شمالی افریقہ، اسپین، مصر اور عربستان کے درمیان تجارت اور نظریات کا آزادانہ تبادلہ ہوتا۔ اسپین سے پیتل کی کاریگری کی چیزیں، مصر سے زربفت، ہندوستان سے قیمتی پتھر لئے ہوئے مسلمانوں کے کاروان صحراؤں کو چیرتے ہوئے آتے اور واپسی میں مالی سے سونا، نمک، کولا جوز اور ہاتھی دانت لئے ہوئے واپس ہوتے، اہم ترین بات جو تھی وہ نظریات اور دانش وروں کا بہاؤ تھا۔ افریقی حج کے لئے مکہ جاتے اور واپس ہوتے ہوئے بغداد قاہرہ اور قیروان میں لکھی گئی کتابیں اپنے ساتھ لے آتے۔ سجلماسہ، ٹمبکٹو، مالی اور گھانا میں اسلامی قاضیوں اور علماء کی بہت بڑی مانگ تھی۔ افریقی سپاہی اسپین مصر اور ہندوستان کی مسلم افواج کا ایک لازمی حصہ تھے۔ مالی اسلامی دنیا کو زینت عطا کرنے والا حصہ تھا۔ جو ایشیاء اور یوروپ کو خوشحالی عطا کرنے کے لئے اپنی دولت باقاعدگی سے دے رہا تھا۔

مالی کو عربی میں ماء اللیل کہا جاتا ہے۔ یہ منڈ نیکا قبیلہ کا مسکن ہے۔ یہ قبائل اپنا نسب صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے مؤذن حضرت بلال بن رباع ؓ سے جوڑتے ہیں۔ منڈینکا زبان میں حضرت بلال ؓ کو ''بلالی بنوماؓ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے بعد سے ہی مالی پر اسلامی اثرات پڑنے لگے تھے۔ یہ بات اس دور کی زبانی روایات سے ثابت ہوتی ہے۔ جدید دور کے تحقیق کرنے والوں نے جب ٹمبکٹو اور جینئے میں عظیم لائبریریوں کو دریافت کیا تو اب ان زبانی روایات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ نویں صدی عیسوی میں ابن ہشام اور الیعقوبی، گیارہویں صدی عیسوی میں البقری اور چودھویں صدی عیسوی میں ابن خلدون جیسے اسلامی مؤرخوں نے مالی کے علاقہ میں دور دراز اندرونی علاقوں تک پہنچ کر اسلام کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

''بورے کے مقام پر سونے کی کانوں کے دریافت ہونے کے بعد منڈینکا قبائل میں سیاسی تنظیم کا احساس جاگ اٹھا۔ دولت اور کافی حد تک انسانی وسائل کی توانائی، سیاسی مرکزیت کی بنیادی طاقتیں ہیں۔ صرف ایمان ہی وہ واحد ماورائی عنصر ہے جو انسانوں کو اجتماعی جدوجہد کے لئے آمادہ کرتا ہے اور دولت کی کشش کے دائرہ کو توڑ دیتا ہے۔ سونا لے جانے والے کاروانوں کی حفاظت کے لئے مقامی شکاریوں پر مشتمل محافظین کی جماعتیں تشکیل دی گئیں۔ یہ آزاد فوجی دستے تھے ان سب کا واحد مقصد تھا تجارتی راہوں کی حفاظت کرنا، سندیاتا کے دور حکومت میں ہی منڈینکا قبائل نے ایک متحدہ سیاسی محاذ کی تشکیل دی جس سے مالی کا جنم ہوا۔

سندیاتا جس نے 1230ء تا 1255ء تک حکومت کی وہ مندنیکا زبان میں ماریجا تا کہ نام سے مشہور ہے۔ کچھ روایات کے مطابق سندیاتا نے اسلامی گھرانے میں جنم لیا۔ لیکن ابن خلدون اور کچھ دوسرے مؤرخوں کے مطابق اس نے نوجوانی میں اسلام قبول کیا۔ مندنیکا قبائل پر ایک اور مخالف قبیلہ سوساس کا دباؤ برابر رہا کرتا تھا۔ 1230ء میں سندیاتا نے کئی جنگوں میں یکے بعد دیگرے سوساس کے بادشاہ سومانگرو کو شکستِ فاش دی۔ اس فیصلہ کن فتح کے بعد مندنیکا کے کئی بادشاہوں اور سرداروں نے متحد ہو کر سندیاتا سے وفاداری کا عہد لیا۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس تاریخی معاہدہ کے وقت سندیاتا نے اسلامی لباس

پہنا ہوا تھا اس کے بعد مندنیکا کو اسلام کی طرف سے وہ آفاقی پیوستگی ہم آہنگی عطا ہوئی جس نے ان کی علاقائی اور قبائلی عصبیت کو ختم کر دیا اس طرح مالی سلطنت کا جنم ہوا۔

مانسا اولی سندیانا کا بیٹا تھا۔ باپ کے بعد وہ تخت نشین ہوا۔ مندنیکا زبان میں مانسا یا مانسو کا مطلب ہے بادشاہ یا شہنشاہ اولی مقامی بولی میں علی کا مترادف ہے۔ اولی نے مالی سلطنت کی سرحدوں کو چاروں جانب اور وسیع کر دیا۔ شمال میں اس نے ولاتا اور ٹمبکٹو جیسے اہم ترین تجارتی مراکز کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ مشرق میں اس نے گاوا پر قبضہ کیا، مغرب کی جانب اس کی فوجیں سینگال اور گامبیا پر قبضہ کرتے ہوئے بحر اوقیانوس کی ساحلوں تک پہنچ گئیں۔ اس طرح مالی شمالی جنوبی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ مشرقی ومغربی تجارتی شہراہوں کا مالک بھی بن گیا۔ علاوہ اس کے علم کے اہم مراکز کا امین بھی ہو گیا۔

نقشہ

1285ء میں مانسا اولی کے انتقال کے بعد وراثت کے سوال پر مالی ایک شورش زدہ دور سے گذرا۔

1307ء میں موسیٰ اقتدار کے تخت پر بیٹھا شاید مالی کے تمام بادشاہوں میں سب سے قابل اور مشہور شہنشاہ تھا۔ مانسا موسیٰ نے 1307ء سے 1337ء تک حکومت کی اس نے سلطنت کے انتظامات پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ تجارت کی ترقی پر زور دیا اور کاروانوں کی گزرگاہوں کو محفوظ بنایا۔ 1324ء میں اس نے حج کیا۔ ابن خلدون کے مطابق اس کے ہمراہ بارہ ہزار 12000 مصاحب تھے کچھ مصنف یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ بہتر ہزار 72000 افراد تھے مالی کے لوگ انتہائی دولت مند تھے سب اپنے ساتھ سونے کے انبار لیتے گئے۔ انہوں نے حج کے دوران اس قدر سونا خیرات کیا کے سارے شمالی افریقہ اور مصر میں سونے کی قیمتیں گر گئیں۔ ضروری اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں اور وہاں کی حکومتوں کو افراطِ زر کا سامنا کرنا پڑا۔

حج سے واپس ہوتے ہوئے مانسا موسیٰ نے قاہرہ اور خیروان میں قیام کیا۔ یہاں اس نے کتابوں کا ایک ذخیرہ خریدا اپنے ساتھ مالکی مسلک کے قاضی، منتظم، عالم دین اور حفاظ کو بھی ساتھ لیتے ہوئے واپس آیا، اس نے ولاتا، ٹمبکٹو، اور گاوا کی افریقی یونیورسٹیوں کو شان وشوکت کے ساتھ آراستہ کیا۔ بے شمار مساجد تعمیر کروائیں۔ طلباء کو وظائف جاری کئے۔ عوام میں تعلیمی بیداری کی لہر پیدا کر دی اور شمالی افریقہ کی مسلم طاقتوں اور مصر کے مملوک سلطان نصیرالدین محمد جس کی حکومت 1309ء سے لے کر 1340ء تک رہی کے ساتھ قریبی روابط قائم کئے۔

مانسا موسیٰ ایک متقی، پرہیزگار، عالم، مخیّر سرپرست اور دوراندیش بادشاہ تھا۔ اگر تاریخ وار واقعات کے سلسلے سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کی حکومت 1258ء میں بغداد کی شکست اور منگولوں کے ہاتھوں وسط ایشیاء اور فارس کی مکمل تباہی کے ایک سو سال کے بعد تک قائم رہی۔ چودھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں صرف تین حکومتیں ہی ایسی تھیں جن کا کچھ سیاسی اور اقتصادی اثر باقی رہ گیا تھا۔ یہ حکومتیں تھیں مصر کی مملوک، افریقہ میں مالی سلطنت، اور دہلی میں سلاطین، فارس، غزانِ اعظم کے زیر ماتحت دوبارہ سنبھلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ عثمانیہ ترک دنیا میں عظمت کی جانب آگے بڑھنے سے پہلے، ابھی نوزائیدہ حالت میں تھے۔

دنیا کے عظیم سیاح ابن بطوطہ جو 1304ء سے 1377ء تک بقید حیات رہا۔ اس کی تحریروں سے ہمیں مالی میں اسلام کی حالت کے بارے میں تفصیل سے معلوم ہوتا ہے۔ اس نے 1354ء میں اس علاقہ کا دورہ کیا تھا۔ ابن بطوطہ نے وہاں کے بادشاہ سے ملاقات کی وہاں کے قاضیوں اور عوام دونوں کے ساتھ زندگی گذاری

اپنی تیز نگاہوں سے وہاں کے معاشرہ اور تمدن کا تجزیہ کیا۔ ابن بطوطہ کے مطابق وہاں کے لوگ نماز کے سخت پابند تھے۔ پاکی صفائی میں انتہائی باذوق اور نازک طبع تھے- زکوٰۃ ادا کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے بلکہ اس سلسلے میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتے۔ قرآن کا حفظ کرنا، اس کے علوم حاصل کرنا، اس کا سیکھنا انتہائی وقار اور عزت کا باعث جانا جاتا- شاعری اور تہذیب وتمدن ارتقاء پذیر تھے۔ عورتوں کو ایک ایسی آزادی حاصل تھی جس کی مثال اس دور میں اور کہیں نہیں ملتی-

''ایوان ویان سرتما'' جیسے کچھ مصنفین نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے نہیں بلکہ سب سے پہلے افریقہ والوں نے دریافت کیا۔ فاضل مصنف نے اپنی کتاب ''وہ کولمبس سے پہلے'' میں اس بات کی پرزور دلالت کی ہے۔ جدید تحقیقات اور تاریخی دستاویزات سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ مشہور مؤرخ شہاب الدین ابوالعباس احمد نے ایک کتاب لکھی ہے ''مسالک الابصار فی ممالک الامصار'' یعنی سلطنت کے صوبہ جات میں بلند نگاہی اور ڈھونڈنے والوں کے لئے نئی گذرگاہیں، اس کتاب میں وہ مالیوں کی بحر اوقیانوس میں مہمات کے متعلق تفصیل سے لکھتا ہے۔ کولمبس سے بہت پہلے افریقہ اور امریکہ کے درمیان روابط کو ثابت کرنے والی بے شمار تاریخی شہادتیں ملتی ہیں۔ ویسٹ انڈیز میں پائی جانے والی سنگ تراشی اور افریقی سنگ تراشی میں مکمل مماثلت ملتی ہے، سنے گامبیا کے ساحلوں سے اٹھنے والے سمندری لہروں کا بہاؤ ویسٹ انڈیز اور برازیل کی جانب جہاز رانی کے لئے سازگار ہے۔ کسی براعظم کی دریافت جیسے تاریخ ساز کارنامہ کے لئے صرف سمندری لہروں کے بہاؤ کا سازگار ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ ایسے کارنامہ کے لئے دور اندیشی نقشہ سازی اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے بڑھ کر کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مالی کے پاس یہ سارے وسائل مہیا تھے درحقیقت مالی اس قدر دولت مند تھا کہ وہ بحیرۂ روم کے علاقہ کے مالیات واقتصادیات کو درہم برہم کرسکتا تھا۔ سنے گامبیا کے جنگلات سے بہترین لکڑی وافر مقدار میں دستیاب تھی جس سے کہ بڑے بڑے جہاز تعمیر کرسکتے تھے۔ ایک انتہائی وسیع سلطنت ہونے کے ناطے انسانی توانائی اور وسائل بھی کافی سے زیادہ مل جاتے تھے۔ اس کے حکمراں بھی دور اندیش اور عالمی تصور رکھنے والے تھے۔ اگر افریقیوں نے امریکہ کا سفر کیا ہوگا تو یہ یقینی طور پر مانسا موسیٰ کے دور میں ہی کیا ہوگا۔

اکتیسواں باب

المغیلیؒ اور عسقیہ محمدؒ

المغیلیؒ اور عسقیہ محمدؒ

المغیلیؒ الجیریا کے مشہور دانش ور مفکر تھے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں اپنی زندگی کے دوران انہوں نے مغربی افریقہ کی تاریخ کو جس قدر متاثر کیا شاید ہی کسی اور مفکر نے اس قدر کیا ہو۔ جس طرح ڈھولوں کی آواز پہاڑوں کے سلسلوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اسی طرح عظیم تصورات بھی تاریخ کے ادوار میں اپنی بازگشت پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی ایک ایک گونج کی ہر ایک صدا ایک نئی تحریک کو جنم دیتی ہے۔ جب عظیم عورتوں اور مردوں کے ذریعہ ان نظریات کا نفاذ ہوتا ہے تو تاریخ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور انسانی معاملات کی ازسرنو تشکیل ہوتی ہے عسقیہ محمدؒ جنہیں عسقیہ اعظمؒ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ نے المغیلی کے نظریات کو عملی جامہ پہنایا۔ اس کی وجہ سے بنیادی طور پر مغربی افریقہ کی تاریخ کا دھارا بدل گیا۔ اور جدید دور میں نائیجیریا، مالی، سنے گمبیا سے اٹھنے والی اصلاحی تحریکوں میں انہیں نظریات نے روح پھونکی۔

پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں مالی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور مغربی افریقہ کے مما لک میں سانگھے سب سے بڑی اور طاقت ور ریاست بن کر ابھری۔ یہ ایک قدیم بادشاہیت تھی اور مالی کے عروج کے دور میں بھی اس نے اپنی آزادانہ شناخت برقرار رکھی تھی۔ الیعقوبی نے لکھا ہے کہ نویں صدی کے دوران سانگھے ایک آزاد ریاست تھی اور اس پر ایک مسلمان فرمانروا کی حکومت تھی۔ البقری لکھتا ہے کہ

1068ء میں جب سانگھے کے حکمران کی تخت نشینی ہوئی تو بغداد کے عباسی خلافت کی جانب سے اس کی خدمت میں ایک قرآن کا نسخہ اور ڈھال پیش کی گئی۔ یہ اسکے حاکم اعلیٰ ہونے کی نشانی تھی۔

سانگھے کا پایہ تخت ''کوکیا'' شہر تھا۔ یہ گاؤ اور دریائے نائیجر کے تجارتی مراکز سے صرف ساٹھ میل کی دوری پر واقع تھا۔ 1497ء میں عسقیہ محمدؒ نے صدر مقام کو گاؤ میں منتقل کر دیا۔ 1352ء میں ابن بطوطہ نے گاؤ شہر کا سفر کیا تھا اور اسے سوڈان کا اہم ترین شہر قرار دیا تھا۔

نقشہ

وہاں دو اہم مساجد تھیں۔ایک شاہی دربار کے لئے وقف تھی۔دوسری جامع مسجد تھی۔ اس کی تمام آبادی پابندی سے نماز ادا کرتی۔مقامی آبادی بازاروں میں مراقشی،مصری اوران سے بھی دور دراز علاقوں سے آنے والے تاجروں کے ساتھ گھل مل جاتی۔ادھر جنوب میں ''جین'' کا اہم تجارتی مرکز بھی مسلم علاقہ میں واقع تھا۔ جین کوافریقی تاجروں نے اپنا مرکز بنایا۔یہاں سے ان افریقی تاجروں کوخط استواء کے اس پار دور دراز کے گھنے جنگلاتی علاقوں کے سرحدوں تک اسلام کی اشاعت کرنے کا موقع مل گیا۔

حالانکہ سانگھے حکومت 1000ء کے پہلے ہی سے موجود تھی۔لیکن سنی علی کے دور حکومت میں ہی اس کی سرحدوں کو وسعت حاصل ہوئی۔سنی علی نے ٹمبکٹو اور جین پر تسلط حاصل کر کے انہیں سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس طرح اپنی حکومت پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس کی سرحدیں صحارہ کے کناروں سے لے کر جنوب کے استوائی جنگلات تک وسیع کر دیں۔اپنے عروج کے دور میں سانگھے سلطنت مالی کی شہنشاہیت کی طرح ہی طاقتور تھی۔یہ پانچ لاکھ میل سے زیادہ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی اور مغربی افریقہ کے شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق ومغرب کی جانب سے گذرنے والی تمام تجارتی گذرگاہوں پر اس کا قبضہ تھا۔

سنی علی ایک دور اندیش بادشاہ تھا۔اس نے سلطنت کی تعمیر کے لئے موقع شناسی اور مصالحت سے کام لیا۔وہ ایک بہادر فرمانروا زیرک سیاست داں اور قابل منتظم تھا۔تجارتی روابط بڑھانے کے لئے اس نے مذہب کا استعمال کیا۔لیکن مذہب کو اپنے سیاسی عزائم پر روک لگانے نہیں دیا۔ٹمبکٹو پر ہمیشہ ٹوریگو کا قبضہ رہا تھا۔اس پر تسلط جمالینے کی کیوجہ سے سنی علی کو طاقتور ٹوریگو فرمانروا کے ساتھ محاذ آرائی مول لینی پڑی۔اس کی اپنی سلطنت کے کئی علماء بھی ٹوریگو کے ہی باشندے تھے۔اس وجہ سے سنی علی اور علماء کے درمیان ہمیشہ ایک تناؤ برقرار رہا ہے یہی وجہ تھی کہ سنی علی اپنے علماء کوٹوریگی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ یہ ٹوریگو کے ہمدرد ہیں۔اسی بات پر کئی مصنفین نے اسے مسلم مخالف لکھا ہے لیکن تاریخی حقائق اس بات کی تائید نہیں کرتے۔

سنی علی کے بعد سونگھے زوال کا شکار ہوگئی۔اسکے بیٹے سنی براؤ نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان

کرنے سے انکار کیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ 1493ء میں ایک فوجی عہدیدار محمد طوری نے اسے معزول کر دیا۔طوری نے 1493ء تا 1528ء تک حکومت کی۔اس نے عسقیہ محمدؒ اول کا خطاب اختیار کیا۔عسقیہ محمدؒ اول ایک پرہیزگار انسان، ایماندار سپاہی قابل منظّم اور تعلیم یافتہ شخص تھے۔انہوں نے مصر، شمالی افریقہ اور دوسرے دور دراز کے عالم فاضل اشخاص کو سونگھے منتقل ہونے کے لئے ان کی ہمت افزائی کی۔اس کے دور حکومت میں گاؤ، ٹمبکٹو اور جین جیسے شہر علم کے اہم مراکز بن گئے۔ان کی تمام عالم اسلام میں شہرت تھی-عسقیہ اعظمؒ نے محکمہ انصاف اور محکمۂ انتظامیہ میں کئی اسلامی فضلاء کو اہم سرکاری عہدوں پر تعینات کیا۔وہ ان کی بات غور سے سنتے تھے اور ملکی امور انہی کے مشوروں کے مطابق سنبھالتے جاتے تھے۔عسقیہ محمد پر بے حد اثر ورسوخ رکھنے والی ایک دانش ور ہستی تھی۔المغیلیؒ جو الجیریا کے باشندہ تھے۔

المغیلیؒ ایمانِ خالص کے داعی تھے۔وہ کاروباری مفاد کے لئے مذہب کے استعمال کے سخت مخالف تھے۔انہوں نے واجبی علم رکھنے والے، بذات خود اپنے آپ کو دانش ور اور قاضی کہلانے والے افراد کی سرکاری عہدوں پر تعیناتی کی مخالفت کی وہ اس بات کے قائل تھے کہ اسلام کو کسی بھی شئے کی طرح خوبصورت ڈبوں میں بند کر کے بازار میں بیچا نہیں جاسکتا اور نہ ہی اسلام کے اصولوں کو بادشاہ وقت کی مرضی اور سہولت کے مطابق موڑا جاسکتا ہے۔وہ تو ایک آفاقی ازلی وابدی پیغام ہے جسے انسانیت کی روحانی اور مادی تربیت کے لئے پیغمبر خدا آقائے نامدار تاجدار مدینہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلایا تھا۔

المغیلی ان سے پہلے گذرنے والے فضلاء کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ ہر صدی میں مجدد پیدا ہوتے ہیں۔یہ مجدد اٹھتے ہیں اور دنیا میں ایک بار پھر صرف اسی خالص اسلام کو از سر نو استوار کرتے ہیں جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ عسقیہ محمدؒ نے اپنے آپ کو ایسا ہی ایک مصلح سمجھا۔انہوں نے المغیلیؒ کے صلاح ومشورہ کے مطابق ہی حکومت کی۔انہوں نے مشہور زمانہ منصف وقاضی مقرر کئے۔اس بات کا خیال رکھا کہ فراخدلانہ امدادی عطیہ جات کے ذریعہ ان کی آزادی برقرار رہے۔انہوں نے تعلیم کی حوصلہ افزائی کی۔علم حاصل کرنے والوں کو باعزت وظائف جاری کئے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام صرف دوسرے ممالک سے تجارتی روابط قائم رکھنے تجارتی مفادات حاصل کرنے کا

ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک آفاقی طریقہ کار ہے، علم اور اعلیٰ تمدن حاصل کرنے کا، قانون اور انصاف کی بالاتری قائم کرنے کا۔ ان کے دور حکومت میں اسلام افریقہ کے دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔ مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحلوں سے لے کر مغرب میں شمالی نائیجریا کے چراگاہوں تک لوگ اسلام میں جوق در جوق شامل ہونے لگے۔

ایمان وہ واحد مرکزی دھارا ہے جو اسلامی تاریخ کو آپس میں مربوط کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ دھارا آلودگی زدہ ہوجاتا ہے جیسے کہ کوئی ندی جب بھی آبادیوں سے گذرتی ہے تو گندگی سے ہمکنار ہوجاتی ہے۔ مجدد اور مصلح اس دھارے کو پاک وصاف کرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ آخر کار اسے شفاف بنا کر نیچے وادیوں اور میدانوں میں سیراب ہونے والوں تک پاک وصاف پانی پہنچاتے ہیں۔ المغیلیؒ کے نظریات نے آگے چل کر افریقہ میں اٹھنے والی تحریکوں کو بے حد متاثر کیا- مغربی افریقہ کے عظیم مصلح عثمان دان فدوئیؒ جن کا انتقال 1817ء میں ہوا نے المغیلیؒ کے نظریات سے ہی استفادہ کیا اور اپنی جدوجہد عسقیہ محمدؒ کے انداز سے ہی آگے بڑھائی۔

1528ء میں عسقیہ محمدؒ کو تخت سے معزول کردیا گیا۔ اس لئے کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مختصر سے عرصہ کے لئے انتشار سے گذرنے کے بعد 1539ء تا 1591ء تک سنگھے میں ایک بار پھر امن اور خوشحالی کا دور رہا۔ لیکن 1580ء کے دوران جانشینی کے سوال پر اختلافات کی وجہ سے حکومت کمزور ہوگئی اور بیرونی حملہ آوروں کا شکار ہوگئی۔ اس صدی کے آخر میں غلاموں کی تجارت کرنے والے پرتگالی تاجروں نے سنگھے کے علاقوں پر حملے شروع کردیئے۔ 1591ء میں نمک کی کانوں کی وجہ سے ہونے والی سرحدی جھڑپوں کے باعث مراقش کے جوداد پاشاہ نے سنگھے پر حملہ کر کے گاؤ پر قبضہ کرلیا، دریائے نائیجر کے موڑ تک کے علاقوں کو مراقش کی حکومت میں شامل کرلیا۔ ان مراقشی حملوں کے باعث مقامی مسلمانوں کے اقتدار کا زوال اور زیادہ تیزی سے ہونے لگا۔ اس علاقہ میں انتشار پھیل گیا تو یوروپی حملہ آوروں کو غلاموں کی تلاش میں مغربی افریقہ کے اندرونی علاقوں میں گھس آنے کا موقع مل گیا۔ اب بحر اوقیانوس کے ذریعہ ہونے والی غلاموں کی زبردست تجارت کی ابتداء ہوچکی تھی۔

مردوں کی دُنیا میں عورتیں

مردوں کی دنیا میں عورتیں

خلاصہ:

اسلام نے عورتوں کے لئے تجارتی، قانونی، معاشرتی اور سیاسی میدان کے دروازے وا کئے۔ قرآن نے جائیداد کا حق عطا کر کے ان کو قانونی درجہ عطا کیا۔ رحمت العالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی مثال نے عورت کو آزادانہ طور پر لین دین اور بین الاقوامی تجارت کی منظوری دی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود مسلمانوں کے سربراہ کی حیثیت سے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے سیاسی امور پر مشورہ کے لئے اور سماجی امور پر نصیحت کے لئے ہمیشہ دستیاب رہتے تھے۔ یہ کھلی کشادہ دلی وقت کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے مصلحت کا شکار ہوگئی۔ اموی دور میں خارجیوں کی طرف سے قتل کے اندیشہ نے خلفاء کو عوام سے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے دوران یونانی اثرات بغداد کے ایوانوں پر پڑنے لگے۔ امراء نے اپنے محلوں میں ناچنے گانے والیوں کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ علماء نے جب یہ رنگ دیکھا کہ معاشرہ کے اخلاقی معیار پر نفسانی خواہشات، عیش پرستی کا غلبہ ہونے جا رہا ہے تو فکرمند ہو کر انہوں نے عورتوں پر پابندیوں کے پیچ اور زیادہ کس دیئے۔

عورتوں پر لین دین، بین الاقوامی تجارت، معاشرتی اور سیاسی امور کے جو میدان کھلے ہوئے تھے دھیرے دھیرے وہ سارے دروازے عورتوں پر بند کر دیئے گئے۔ عورتوں کی اس عزلت نشینی اور گوشہ نشینی کو نویں صدی عیسوی کے دوران اسلام کے دامن آغوش میں داخل ہونے والے ترکوں اور افریقیوں کے رسم و رواج نے چیلنج کیا۔

انہی نو واردانِ ایمان کے دامن سے اسلام کی ایسی ملکاؤں نے جنم لیا۔ جنہوں نے آزادی کے

ساتھ حکومت کی اور تمام مسلمانوں کے لئے عزت فخر وغرور کی میراث چھوڑ گئیں۔آ گے چل کر سولھویں صدی عیسوی میں عورتوں کی خودمختار حکمرانوں کی اس فہرست میں برصغیر ہندوپاکستان اور انڈونیشیہ کی کئی مسلمان عورتوں نے بھی باعزت مقام حاصل کرلیا۔

بتیسواں باب

حجاب اور مطلق العنان فرماں روا عورتیں

تاریخ روز اول کی طرح کسی بڑے دھماکہ سے وجود میں نہیں آئی۔ وہ تو انتہائی نرم روی کے ساتھ غیر محسوس، نا قابل فہم ادراک انداز سے قدم رکھتی ہوئی دھیرے دھیرے چلتی ہے۔ جس میں سبھی مرد اور عورتیں باہم ہم آہنگ ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ یہ ایک عالیشان عمارت ہے اس پر ہر ایک انسان نے چاہے وہ کسی قدر بھی حقیر کیوں نہ ہو اپنا اپنا نشان ضرور چھوڑا ہے۔ عظیم واقعات ضرور رونما ہوتے ہیں۔ لیکن وہ تو دراصل مسلسل منکشف ہوتی ہوئی تاریخ میں سنگ راہ کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ کے نازک عہد ساز لمحات کی از سر نو تخلیق میں صرف ہونے والی انسانی جدوجہد کی وہ شان رفعت جنہوں نے حال کو ڈھال کر اسے ایک روپ دے کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے، ان لمحات کو جب تاریخ کا ایک طالب علم دیکھتا ہے تو حیرت سے دنگ رہ جاتا ہے۔ جس طرح زلزلہ کے رخنہ انگیز پرتوں کے پاس مختلف عناصر کا دباؤ مجتمع ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح عام مردوں اور عورتوں کی جدوجہد اور ان کے عمل تاریخ کے بہاؤ میں ایک پر جوش دباؤ پیدا کر دیتے ہیں۔ جب مسلسل جدوجہد اور عمل کے دباؤ آخر کار ایک ساتھ مل جاتے ہیں تو تاریخ ساز لمحات میں مشکّل ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہیئت بھی بالکل ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ جیسی کہ طبقات الارض کی چادریں زلزلے کے آنے سے پہلے کسمسا کر کروٹیں بدلتی ہیں۔

وہ عظیم شخصیات جو تصادم کے حالات میں پیدا ہوتے ہیں اور ان جنگوں میں کامیابی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ان کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہوئے، عام مرد ار عورتوں کی دنیاوی جدوجہد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جی ہاں اصل حقیقت تو یہ ہے کہ انہی عام انسانوں کی جہدِ مسلسل سے ہی

تاریخ ساز واقعات جنم لیتے ہیں۔تاریخ کے ناٹک میں ایک معمولی کاشتکار بھی ویسا ہی ایک کردار ہوتا ہے جیسا کہ کسی طاقتور شہنشاہ کا ہوتا ہے اسی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عورت نے اسلامی تاریخ کو اپنی جانب سے کیا کچھ عطا کیا ہے۔

ایسی بے شمار عظمت والی اور ماضی کے ان شاندار روایات کی حامل عورتیں ہیں جنہوں نے تاریخ کی اس عالیشان عمارت کی بلندیاں طے کی ہیں۔اس کے باوجود کہ ان کی راہ مین بے شمار روڑے اٹکائے گئے۔ ان کے کارناموں کو اس پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے کہ وقت کے ساتھ اسلامی معاشرہ سے انہیں دھیرے دھیرے بالکل الگ الگ کر دیا گیا۔اس طرح ان مشکل حالات میں ان کے کارہائے نمایاں اور زیادہ غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔عوامی زندگی سے عورتوں کو بالکل الگ کر دیئے جانے کے عمل کے لئے کئی صدیاں لگیں-اس عمل کو اس تناظر میں دیکھا جانا چاہیئے کہ وقت کے ساتھ خلافت کی اکائی بکھر گئی اور فرمانروا عوام سے بالکل الگ تھلگ اور کٹ کر رہ گئے۔انتہائی نامساعد حالات کے اس پس منظر میں بھی ہندوستان کی رضیہ اور مصر کی شجرت الدر جیسی عظیم عورتوں کے کارنامے اور زیادہ قابل ستائش بن جاتے ہیں۔

اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں عورتوں پر انتہائی سخت پابندیاں عائد تھیں۔اس قید نما معاشرہ سے اسلام نے عورت کو نجات دلائی۔ اسلام نے عورتوں کے لئے روحانی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی دروازے وا کر دیئے۔انہیں منفرد شخصیت سے نوازا گیا۔انہیں مردوں کے برابر اصول معدلت، انصاف اور ایک آفاقی قوم کی تخلیق میں برابر کا حصہ دار بنایا۔اعلیٰ اقدار کا حامل بنایا، گناہوں سے بچنے کی تلقین کی اور خدائے واحد کی ذات پر مکمل ایمان لانے کی ہدایت کی۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ایسی ہی صفات والی قوم کی تشکیل کی۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس قوم کا مرکز تھی۔ یہ مسجد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے ہی لگی ہوئی تھی۔یہیں سے آپ مذہبی اور معاشرتی احکامات کی تشریح فرمایا کرتے اور قانونی فیصلے صادر کرتے تھے اور یہیں جنگ اور امن کے معاملات پر بھی بحث فرماتے تھے۔

یہاں تین اہم امور کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ پہلا امر تو ہے کہ قوم کے سردار حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اور قوم کے عام افراد کے درمیان کوئی دوری نہ تھی۔نوجوان اور بوڑھے،غریب اور امیر، مہاجر اور انصار،

مدینہ والے اور دوسرے ممالک کے افراد سب کے لئے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے یکسان مواقع فراہم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذہبی ومعاشرتی دونوں حیثیت سے مقتدرِ اعلیٰ تھے۔ امام اعلیٰ کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نماز باجماعت بھی پڑھایا کرتے تھے۔ شریعت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ تھی۔ تیسرے مسجد کا معاشرتی، مذہبی اور سیاسی نظام عورتوں کے لئے کھلا تھا۔ حالانکہ نماز باجماعت عورتوں کے لئے لازمی نہیں تھی۔ لیکن عورتوں کو مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکا نہیں جاتا تھا۔ عورتیں مساجد میں مردوں کے پیچھے صف بندی کر کے نماز ادا کیا کرتی تھیں۔ انہیں معاشرتی، مذہبی اور سیاسی امور پر ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات کے یکساں مواقع حاصل تھے۔

جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہو گیا تو صحابۂ کرامؓ نے اسلام کے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کا حلف اٹھایا اور خلفائے راشدین کا نظام قائم کیا۔ ابن خلدون نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔ ''امت کو شریعت کے مطابق زندگی گذارنے کا موقع دینا ہی خلافت کی ذمہ داری تھی''۔ (مقدمہ صفحہ 476)۔ دوسرے الفاظ میں انسانوں کو احکام الٰہیہ کے سانچہ میں ڈھالنا ہی انکا مقصود تھا۔ خلافت قانون اعلیٰ کی حکومت تھی۔ بادشاہوں کی اپنی اپنی میلان طبیعت کی حکومت کے برخلاف اس خلافت کا طریقۂ کار اور حکومتی نظام بالکل الگ تھا۔ بادشاہت میں بادشاہ کے بول ہی قانون ہوتے ہیں۔ اس قانون کو جب چاہے وہ بنا سکتا ہے یا توڑ سکتا ہے۔ خلافت میں قانون الٰہیہ ہی حکومت کا طریقۂ کار ہوتا ہے۔ خلیفہ بھی قانون کے سامنے اسی قدر جوابدہ ہوتا ہے جس قدر کہ ایک راہ چلتا فقیر۔ قوم کے اجماع سے ہی فرمانروائی کا جواز حاصل ہوتا ہے۔ خلیفہ کا انتخاب آپسی صلاح ومشورہ کے طریقۂ کار سے ہوا کرتا۔ سیاسی، عدالتی، اقتصادی، مذہبی اور معاشرتی امور میں فرمانروا اور رعایا دونوں کی حصہ داری تھی۔ ایک معمولی شخص بھی چاہے وہ مرد ہو یا عورت، خلیفہ کے فیصلہ پر انگلی اٹھا سکتا تھا اور قانون کے مطابق انصاف کرنے کی مانگ کر سکتا تھا۔ اس طرح خلافت اپنے آئین کی درجہ بندی اس کے اداراتی نظام، اور طریقۂ عمل کی وجہ سے بادشاہت سے بالکل ہی الگ تھلگ حیثیت رکھتی ہے۔

مذہبی، عدالتی فوجی اور اقتصادی چہار جہتی نظام میں خلیفہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس نظام میں عوام کا ہر ایک فرد چاہے عورت ہو کہ مرد برابر کا حصہ دار تھا۔ صلاح ومشورہ کے طریقۂ کار سے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام کے خلیفۂ اول بنے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کے مطابق خلیفہ کی چار ذمہ داریاں تھیں۔ اول تو وہ قوم کے مذہبی قائد تھے۔ اس طرح نماز باجماعت کی امامت وہی کرتے تھے۔ دوسرے وہ احکام الٰہیہ کے نفاذ کے ذمہ دار تھے۔ اس لئے انہیں شریعت سے آگاہ ہونا بھی ضروری تھا اور اس کے حکم یا فرمان کو عملی جامہ پہنانے والے بھی وہی تھے۔ اعلیٰ ترین منصف بھی وہی تھے۔ تیسرے ملک کا دفاع کرنا انہی کی ذمہ داری تھی۔ جنگ کے مواقع پر وہی سالار اعلیٰ بن کر فوجوں کی کمان کرتے۔ چوتھے قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارنا بھی انہی کے سر تھا۔ منصفانہ محصول عائد کرنا، رفاہِ عامہ کے کام کرنا معاہدوں کو مکمل دستاویزی شکل دینا اور ملکی کاروبار سبھی انہی کے دائرہ کار میں آتے تھے۔

وقت کے ساتھ خلیفہ کی ذمہ داریوں کے بھی یکے بعد دیگرے حصہ بخرے ہونے لگے۔ کچھ تو تاریخی عوامل کی وجہ سے کچھ خلیفۂ وقت کی سہولت کی خاطر۔ اس راہ میں سب سے پہلے جو چیز کھوئی گئی وہ مذہبی فرضِ منصبی تھی۔ 656ء میں خلیفہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ ان کی وجہ سے انتہا پسند قوتوں کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ 661ء کے آس پاس خلیفہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ، حضرت امیر معاویہ ابن ابوسفیانؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ پر خارجیوں کے قاتلانہ حملوں نے یہ بات ثابت کردی کہ خلیفہ کی شخصیت بھی تیار ہونے والے قاتلوں کی زد میں ہے۔ خارجی ہر اس شخص کے دشمن تھے جو ان سے اختلاف رکھتا تھا۔ انتہاء پسندی ہی انتہاء پسندی کو جنم دیتی ہے۔ حضرت معاویہ بن ابوسفیانؓ جن کا انتقال 680ء میں ہوا جو جنگ وجدال کے ذریعہ 661ء میں اقتدار تک پہنچے۔ انہوں نے اس سمت پہلا قدم اٹھایا۔ قاتلوں سے بچنے کے لئے احتیاط کے طور پر اپنے اطراف محافظوں کو تعینات کیا۔ جب وہ مسجد میں جاتے تو محافظ امیر اور عوام کے درمیان ایک حدّ فاصل قائم کردیتے۔ تمام اموی خلفاء نے سوائے عمر بن عبدالعزیز کے محافظت کے اس حصار کو قائم رکھا۔ فرمانروا اور رعایا کے درمیان سیاسی دوری قائم کرنے کی جانب یہ پہلا قدم تھا۔

خود اپنی حفاظت کی فکر کے علاوہ، تین براعظموں پر پھیلی ہوئی وسیع حکومت کا نظام چلانے کے لئے ایک اعلیٰ خوبیوں والی شخصیت کی ضرورت تھی۔حکام اور عاملوں کو منظّم کرنے، ان پر قابو رکھنے اور انہیں دور اندیشی بخشنے والے بصیرت آمیز فرد کا ہونا ضروری تھا۔ایسے شخص کو وزیر کہا جاتا تھا۔وزیر لفظ ''موازہ'' سے ماخوذ ہے جسکا مطلب ہے سہولت، آسانی، اس طرح مطلق العنان بادشاہ کی آرزوؤں کو نظامت کے ذریعہ آسانیاں فراہم کرنے والا مرکزی کردار وزیر ہوتا تھا۔ اس کے اہم فرائضِ منصبی، دفاع، نظام سلطنت، مالیات اور خارجی امور تھے۔دمشق میں اموی دور حکومت کے دوران جو کہ 661ء تا 750ء رہی سلطنت کی سرحدیں ایشیاء، شمالی افریقہ اور یوروپ تک وسیع ہوگئیں۔تو وزارت کا یہ عہدہ انتہائی اہمیت اختیار کرگیا۔وزیر نہ صرف سلطنت کے امور سرانجام دینے والا دست و بازو بلکہ اسکے غور وفکر کا مرکزی خزینہ اور احکامات کو نافذ کرنے والا افسر اعلیٰ بن گیا۔وہ خلیفہ کی سوچوں کا راز داں اور دربار کے اندرونی حلقہ کا امین تھا۔ جب عباسیوں نے 750ء میں نے اقتدار پر قبضہ جمایا اور دار الخلافہ بغداد منتقل کیا تو وزارت کا عہدہ برقرار رکھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وزارت کی ذمہ داریوں میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ادھر دمشق میں بے روح حکومت کی ناپسندیدہ کارروائیوں سے اپنے آپ کو الگ کرنے کے لئے وزارت کی اہمیت کو کم کرتے ہوئے اسے کئی محکموں میں تقسیم کردیا۔شہنشاہ کی خدمت کرنے والے طاقتور واحد وزیر کی جگہ اب کئی وزیروں نے لے لی۔وزارت کے اس ٹکڑے ہوجانے کی وجہ سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا۔مختلف وزیروں میں آپسی تال میل رکھنے، شہنشاہ اور وزارتوں کے درمیان ترسیل اور خبررسانی کے لئے ایک نئے عہدہ دار کی ضرورت تھی۔اس عہدہ دار کو ''حاجب'' نام دیا گیا۔

لفظ حاجب عربی کے ''حجب'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے چھپانا، پوشیدہ رکھنا، حاجب کا اولین فرض تھا، شہنشاہ کو عوام کی شکاری نگاہوں سے چھپانا، اسے خلوت فراہم کرنا اور اس کی ہدایتوں کے مطابق وزیروں سے رابطہ قائم رکھنا۔ چونکہ ''حاجب'' حکمران کا خبررساں اور رازدان ہوا کرتا تھا اسی لئے اسے محل کے قریب ہی چہاردیواری کے اندر رہائش کے لئے بڑی عمارت دی جاتی۔ کبھی کبھار وزیراعظم

کے سپرد ''حجاب'' اور دوسری وزارتوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داریاں بھی شامل ہو جاتیں۔

''حاجب'' کا دور شروع ہوتے ہی حکمران اور رعایا کے درمیان فاصلہ یا دوری ایک دستوری ادارہ یا رواج کی شکل اختیار کر گیا۔ نماز باجماعت کی امامت کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ کئی خلفاء نے اپنی امامت کا یہ طریقہ ترک کر دیا۔ خلیفہ ہارون الرشید، جس کا انتقال 809ء میں ہوا، اس نے سب سے پہلے پیشہ ور خطیبوں کا تقرر کیا۔ نماز باجماعت کی امامت کی ذمہ داری ان پیشہ ور خطیبوں پر عائد کی گئی۔ سوائے ایک دو نادر مثالوں کے اس کے بعد ہمیشہ مساجد میں مسلمانوں کے سامنے خطبات خطیبوں نے ہی دیئے۔ خلفاء نے نہیں۔ وقت کے ساتھ خطیب کا اعلیٰ درجہ تبدیل ہو کر ایک پیشہ ور ملا کی صورت اختیار کر گیا جو منبر کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھنے لگے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک حکمران تخت کو اپنی ذاتی جائیداد گردانتا ہے۔ خطیب جسے یہ ملازمت بادشاہ کی مہربانی سے ملنے لگی اس فرمانروا کی صحت و عافیت کے لئے منبر پر دعائیں مانگنے لگے۔ جب کبھی شاہی خاندان کا تختہ الٹتا یا کوئی طاقت ور حاکم تخت نشین ہوتا تو پھر پرانے بادشاہ کا نام نکال کر اسی کا نام خطبہ میں لیا جاتا۔ اسی طرح انصاف کے نظام کو چلانے اور فتویٰ دینے کی عزت افزائی بھی کرایہ کے قاضی کے ذمہ دے دی گئی۔

شاہی خاندان جب شہری زندگی کے عادی بن کر سہل پسند و آرام پسند ہو گئے تو اس کے ساتھ ہی عوام اور حکمرانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے بڑھتے چلے گئے۔ شاہی سلسلے جس قدر سہل پسند ہوتے دوری بھی اسی قدر زیادہ ہوتی۔ مثال کے طور پر اسپین میں امویوں نے ''حاجب'' کی خدمات حاصل کیں جبکہ ان کے بعد حکومت کرنے والے مرابطون اور المحدث نے ایسا نہیں کیا۔ بعد میں آنے والے شاہی سلسلے یا خاندانوں نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ یہ شاہی سلسلے قبائلی اور نسلی اتحاد کی وجہ سے متحد تھے۔ انہوں نے حفاظت اور نظم و نسق چلانے کی ذمہ داری کو اپنے ہی رشتہ داروں کے سپرد کیا ہوا تھا۔

دسویں صدی عیسوی میں جب ترکوں نے ترقی کرتے کرتے اقتدار کی کرسی سنبھالی تو انہوں نے خلافت کے ساتھ سلاطین کا نظم بھی جاری کیا۔ اب فرمانروائے وقت اور مذہبی حاکمیت کے درمیان تقسیم مکمل ہو گئی۔ سلطان سیاسی اور فوجی فرمانروا بن گیا۔ خلیفہ قوم کا ایک ایسا نام نہاد اور رسمی فرمانروا رہ گیا جو

مذہبی فتاویٰ بھی جاری نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ ذمہ داری پہلے ہی پیشہ ور قاضی کے حوالے کردی گئی تھی۔ احکامِ الٰہیہ کے خلاف، سیاسی وفوجی حکمرانی کو مذہبی ذمہ داری سے بری الذمہ کرتو دیا گیا۔لیکن اس کا نتیجہ مطلق العنان اور جابر حکمرانوں کے عروج کی شکل میں نکلا۔حکمران رعایا سے جس قدر دور ہوتا۔اسی قدر حقارت کی نظروں سے وہ عوام کو دیکھتا۔ جب کہ خلفاء ایسے منتخب نمائندہ ہوتے جن کا مقصد احکام الٰہیہ کو عوام پر نافذ کرنا ہوتا تھا لیکن اب ابھرنے والے یہ حقیر حکمران بزعم خود سیاسی وفوجی اقتدار کے حامل بن گئے۔ایسے میں یہ حکمران اپنا ہی ذاتی قانون رعایا پر نافذ کرنے لگے۔

سلجوقی ترکوں نے وزیروں اور حاجب کی خدمات حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔عثمانیہ دور حکومت میں ''حاجب'' کو قبائین کے نام سے موسوم کیا گیا۔قرون وسطیٰ کی دنیا میں کسی وزیر کے ہاتھوں اس قدر اقتدار کا آجانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔اس کے ذریعہ اقتدار کے آرزومند اشخاص کو خود آپ ہی بادشاہی مراعات حاصل کرنے کی دعوت دینے کے مترادف تھا۔اسی لئے نااہل حکمران کو خود اسکے وزیر کی جانب سے معزول کئے واقعات صدیوں سے پیش آرہے ہیں۔

دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے دوران ''قاتل تحریک'' کے زور پکڑنے کی وجہ سے سلاطین کی سلامتی ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ یہ تحریک سنی سلاطین کے لئے ایک سزا بن کے رہ گئی۔ جیسے جیسے ترک سلطنت وسیع ہوتی گئی۔''حاجب'' کے عہدوں پر فائز رہنے والوں کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی گئیں۔محل کے میدانوں کی حفاظت کے علاوہ سفیروں کا استقبال محل کے باورچی خانہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی انہیں کے حوالے کی گئی۔اسی طرح دسویں صدی اور گیارہویں صدی کی یہ ''قاتل تحریک'' بھی ساتویں صدی عیسوی کی خارجی تحریک جیسی ہی تھی جن کا مقصد ایک ہی تھا،حکمرانوں کو امت سے دور کرنا۔خلیفہ کو ہی سیاست، مذہب اور عدالتی نظام اور حکومت کے انتظامی امور کا واحد سربراہ ہونا ہے۔یہ تصور اب چکنا چور ہوگیا۔ ان کی جگہ سلطان اور اس کے تنخواہ بردار پیشہ ور لوگ ابھر آئے۔ سوائے چند ایک حکمرانوں کے جو کہ اس سے مستثنیٰ رہے جیسے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جن کی وفات 719ء میں ہوئی اور سلیمان اعظمؒ جن کی وفات 1565ء میں ہوئی وغیرہ یہ ایسے حکمران تھے جنہوں نے خلافت کے صحیح میعار اور اس کے صحیح

اصولوں کے مطابق ایک بار پھر حکومت کے کاروبار کو چلانے کی فکر کی۔ اس سلسلے میں اپنی استطاعت بھر کوششیں بھی کیں۔ خلفائے راشدین اور دوسرے چند ایک خلفاء کو چھوڑ کر ساری اسلامی تاریخ میں خلافت تو بس انا پرستی، خود پرستی کا ایک قدیم ڈھانچہ ہی بنی رہی۔

قتل کا خطرہ، پتھر میں ڈھلی انانیت و مجسم شدہ خود پرست خلافت، سلاطین کا عروج، وزیروں کا ابھرنا، پیشہ ورانہ خطیبوں کو مستعار لینا، حاجب کا تقرر ان سبھی عوامل نے مل کر حکمرانوں کو عوام سے دور بہت دور یکا و تنہا کر دیا۔ سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے الگ تھلگ عوام کے درمیان عورتیں اور زیادہ تنہائی کا شکار تھیں۔ یہ عمل بے انتہاء آہستہ و سبک رفتار تھا۔ یہ انتہائی ضروری تھا کہ خلیفہ نماز باجماعت کی امامت خود کرتے۔ 657 سے 950ء کے دوران ارتقاء پانے والے فقہ کے تمام اہم مسالک میں اس فرضِ منصبی کی ادائیگی کے بارے میں واضح احکامات موجود ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب کہ اسلامی سیاسی طاقت کا دائرہ عالمی سطح پر وسیع ہو رہا تھا۔ اس وسعت کے ساتھ ہی یونان، ہندوستان، چین اور آفریقہ سے نئے تصورات کا ایک سیلاب سا بہا چلا آ رہا تھا۔ اسلام کے سامنے ایک زبردست چیلنج درپیش تھا اس کو دوسری تہذیبوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی وجہ سے پیدا ہونے پیچیدہ صورتِ حال کے خدوخال واضح کرنے تھے۔ باطل تصورات کے مدمقابل اپنے توحید پرست تصورات کی عمارت کی بنیاد کو مضبوط بنانا تھا۔ ان پرانی تہذیبوں کی جانب سے درپیش آنے والے اس چیلنج کے جواب میں اسلامی عقائد کو فقہ کی شکل میں واضح کیا گیا۔

عورت آیا نماز باجماعت کی امامت کر سکتی ہے یا نہیں اس کے متعلق پانچوں اہم فقہ کے مسالک، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور جعفریہ الگ الگ جوابات کے ساتھ سامنے آئے۔ حنفی، شافعی اور جعفریہ مسالک کے مطابق ایک عورت، دوسری عورتوں اور بچوں کی نماز باجماعت کی امامت کر سکتی ہے۔ لیکن مردوں کی نہیں۔ لیکن مالکی اور حنبلی مسالک اور زیادہ سخت گیر تھے۔ چونکہ عورت جمعہ کی نماز کی امامت نہیں کر سکتی اس لئے خود بخود اسکو خلیفہ یا امام بننے سے منع کر دیا گیا۔ لیکن اولین دور کی خلافت کے دوران عورت کے لئے مذہبی و روحانی مقام کھلا رہا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کے دوران عورتیں مسجد میں مردوں کے پیچھے نماز باجماعت ادا کرتی تھیں۔ مسجد میں ہونے والے مباحث میں حصہ لیتی تھیں اور اکثر اوقات

ملکی امور کے متعلق خلیفہ کو ٹوک دیا کرتی تھیں۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے دوران تعمیر ہونے والی عظیم مساجد میں عورتوں کے لئے ایک علیٰحدہ حصہ مخصوص کیا جاتا تھا۔

نویں صدی عیسوی کے دوران کثیر تعداد میں ترک اسلام کے دامن آغوش میں داخل ہونے لگے۔اور جب سلطان کی شخصیت دنیاوی اقتدار کا مرکز بن گئی تو دشمنوں کے خلاف امت کا دفاع بھی وہی کرنے لگا۔ خلیفہ نہیں۔حکومت کے نظام چلانے والے عہدہ داروں کا سلطان ہی تقرر کرتا۔وہی قوانین کو نافذ کیا کرتا۔ اپنی تمدنی روایات کے مطابق ترک،عورتوں کے سیاسی،عدالتی،اور فوجی نظام میں داخلے کے بارے میں زیادہ روشن خیال تھے۔ترکی عورتیں میدان جنگ میں گھڑسواروں کی شکل میں لڑتیں۔ملکی امور میں حصہ لیتی لیتیں۔سلاطین اور منصفوں کے برابر بیٹھا کرتیں۔اور مقدمات کے فیصلوں کے بارے میں اپنی رائے دیا کرتی تھیں۔عوامی امور میں عورتوں کی یہ حصہ داری اگلی صدیوں کے دوران بھی جاری تھی،ترک سلاطین عظیم مغلوں،مغربی سوڈان کے افریقی اور انڈونیشیائی درباروں میں عورتوں کو باقاعدہ حصہ لینے کی آزادی رہی۔

چونکہ اب سلطان لازمی طور پر نماز باجماعت کی امامت نہیں کیا کرتا تھا۔یہ ذمہ داری پیشہ ور خطیبوں کو دے دی گئی تھی اس لئے اب عورت کو سلطان بننے سے باز نہیں رکھا جا سکتا تھا۔لیکن آگے چل کر پیش آنے والے تاریخی حالات نے عورت کو سیاسی و معاشرتی مقام حاصل کرنے سے روکنے کے لئے اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔نویں صدی عیسوی کے دوران عقلیت پسند یونانی تصورات اور یونانی تہذیب کا ایک ریلا سا چلا آیا اور بغداد کے دربار میں داخل ہو گیا۔معتزلی عقلیت پسند خیالات کے میر کارواں بن کے ابھرے اور خلفاء نے کھلے بازوؤں کے ساتھ انہیں گلے لگا لیا۔ لیکن اس کے بعد معتزلی اپنے حدود کو پھلانگ کر عقلیت پسندی سے وحی کو ناپنے کی کوشش شروع کر دی۔انہوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن وقت کے ساتھ ساتھ تخلیق کے عمل سے گذرتا رہا۔ان کے اس موقف کا علماء کی جانب سے زبردست ردعمل ہوا انہوں نے اس نظریہ کی سخت اور مسلسل مخالفت شروع کر دی۔آخرکار معتزلی ہار گئے۔نظریات کی اس بھٹی سے، عقائد سے متعلق ایک ایسا اسلام ابھرا جو تہذیبی اور معاشرتی امور کے سلسلے میں اور زیادہ قدامت پرست تھا۔یہی وہ زمانہ تھا جبکہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے حنبلی مسلکی فقہ کی تدوین کی۔سنی قانونِ فقہ کے چار

بڑے مسالک میں یہی سب سے زیادہ قدامت پرست ہے۔

یونانی تہذیب کے زیرِ اثر بغداد اور مسلم منصفوں کے محلوں میں ناچنے والیوں نے جگہ پالی۔ اس کی وجہ سے معاشرہ کے نظم اور استحکام پر حملے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے، عورتوں اور مردوں کے باہمی میل جول پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ ایسا شاید یہ سوچ کر کیا گیا کہ اس سے عورتیں محفوظ رہیں گی۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ موقف اور سخت ہوتا گیا اور عورتیں معاشرتی اور سیاسی زندگی سے مکمل طور پر الگ کر دی گئیں۔ ایسی قانونی رائے اور تاویلیں بھی پیش کی گئیں جس کے ذریعہ عورتوں کے مساجد میں داخلے کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔

جو آفاقی بھائی چارگی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تخلیق کی تھی وہ چکنا چور ہو گیا۔ اس جگہ حکمران ور عایا کے درمیان طبقہ بندی، عورتوں اور مردوں کے درمیان جنسی امتیاز جیسے گرہ بندیوں نے لے لی۔ سیاسی زندگی سے عام جنتا الگ کر دی گئی اور عوام سے بھی عورتوں کو اور زیادہ الگ تھلگ کر دیا گیا۔

یہ تو بنی نوع انسان کی دبائی نہ جانے والی بلند حوصلگی ہے کہ عوام نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ جنہیں یکا و تنہا کر دیا گیا تھا وہ مسلسل ایسے ماحول کو چیلنج کرتے رہے، یہی وہ کشمکش اور جہد مسلسل ہے جو انسان کو ارتقاء کی منزل کی جانب رواں رکھتا ہے۔ اسلام میں ترک اور افریقی خون کے شامل ہونے سے اور آگے چل کر منگول، ہندوستانی اور انڈونیشیائی عناصر کے آنے کی وجہ سے، عورتوں کو سیاست وتمدن سے بالکل ہی الگ تھلگ کر دینے والے اس موقف کو چیلنج کیا جاتا رہا۔ اور انہیں نئے آنے والوں سے ہی اسلام کی عظیم ملکائیں ابھریں۔ دہلی کی رضیہ سلطانہ، شجرۃ الدر قاہرہ کی، اور عظیم مغلوں کی نور جہاں جیسی عورتوں نے عروج حاصل کیا۔ سیاسی مقام میں اپنا لوہا منوایا اور اسلامی تاریخ پر ایسے نقوش چھوڑے جو کبھی مٹ نہیں سکیں گے۔

تینتیسواں باب

دہلی کی رضیہ سلطانہ

اسلام نے مردوں اور عورتوں کو غلامی کے شکنجہ سے آزاد کیا اور انہیں دنیا کا آقا بنایا۔ مملوکوں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ نویں اور دسویں صدی عیسوی کے دوران بحیرۂ کیپسین اور دریائے اولگا کے ذریعہ غلاموں کی تجارت انتہائی زوروں پر تھی۔ اس دور میں وائکنگ باشندے بڑی ہی وحشت خیزی کے ساتھ یوروپ پر مسلسل حملے کرتے رہے۔ انہیں مال غنیمت اور غلاموں کی تلاش رہا کرتی تھی۔ مشرقی یوروپ جو جاگیرداروں کی چکی میں پس رہا تھا خصوصیت کے ساتھ ان حملوں کا نشانہ بنا رہا۔ شمالی اور مشرقی یوروپ میں مرد، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا جاتا۔ دریائے اولگا کے ذریعہ نیچے لایا جاتا اور مسلمان اور یہودی تاجروں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا۔ ابن فدلون نے ان غلاموں کو لانے لے جانے والے وائننگ جہازوں کی حالت کا انتہائی دردناک نقشہ کھینچا ہے۔

مملوک کا عربی ماخذ ہے ملک، ملک کا مطلب ہے مالک بننا، مسلمانوں کے درباروں میں یوروپی غلاموں کو بڑی مانگ تھی اس لئے کہ وہ بہترین سپاہی ثابت ہوتے تھے۔ اور یوروپی عورتوں کی مانگ ان کی گوری چمڑی کی وجہ سے تھی۔ مملوکوں کو خصوصی چھاونیوں میں سب سے پہلے ذاتی محافظ بننے اور اسلام پر چلنے کی تعلیم دی جاتی پھر انہیں فوج میں شامل کیا جاتا۔ اسپین میں قرطبہ کے درباروں میں اور قاہرہ میں فاطمی درباروں میں انہیں ذاتی محافظ کی حیثیت سے ملازم رکھا جاتا رہا۔ لیکن ترکوں کے عروج کے بعد ہی مملوک اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ ترکوں نے نویں اور دسویں صدی عیسوی کے دوران ایشیاء

میں طاقت کے مراکز سے عربوں اور ایرانیوں کو بے دخل کیا اور خود بادشاہ گر بن بیٹھے۔افواج میں سپاہیوں کی حیثیت سے مملوکوں کا تقرر ہونے لگا اور ترکوں کا تسلط ان افواج پر ہو گیا تو ان غلاموں کو مملوک ترک کے نام سے پکارا جانے لگا۔ان کے اسلام قبول کرنے سے پہلے کچھ غلام جولائے گئے تھے، وہ ترک قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔اس طرح انہیں ترکوں سے خون کی نسبت سے بھی انسیت تھی اور پیشہ کی حیثیت سے بھی شریعت کے مطابق ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو غلام نہیں بنا سکتا۔ اس طرح جب مملوکوں نے اسلام قبول کر لیا تو وہ دوسرے ایمان والوں کی طرح خود بھی آزاد بن گئے اور انہیں وہ حقوق مکمل طور سے حاصل ہو گئے جو کہ ایک مسلمان کا خاصہ ہیں۔ایک ایسے دور میں جب کہ بادشاہیت کا راستہ فوج سے ہو کر گذرتا تھا اس دور میں مملوک نہ صرف یہ کہ انتہائی قابل سپاہی تھے بلکہ طاقت کے ایوانوں سے بھی بہت ہی قریب تھے۔ اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ وہ درباروں کی ملازمت سے اوراوپر اٹھے۔سلاطین کی بیٹیوں سے شادیاں کیں اور خود بادشاہ وسلاطین بن بیٹھے۔اسلام نے انہیں وائیکنگ کے غلامانہ جہازوں سے اٹھا کر افریقہ اور ایشیاء کے عیش سے بھرپور تاج اور تخت کا مالک بنا دیا۔انہیں مملوکوں کی صفوں سے تیرہویں صدی عیسوی میں مصر و ہندوستان میں بادشاہیت کے سلسلے ابھرے۔

رضیہ دہلی کے ترک سلطان قطب الدین ایبک کے مملوک غلام التمش کی بیٹی تھی۔ التمش نے سپاہی کی حیثیت سے ایسی اعلیٰ قابلیتوں کا مظاہرہ کیا کہ اسے تیزی کے ساتھ ترقی دے کر فوج کے ایک حصہ کا سالار بنا دیا گیا۔قطب الدین نے خود اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی اپنے خسر کے انتقال کے بعد التمش 1211ء میں دہلی کے تخت کا مالک بنا۔اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف ایک بہترین سپاہی ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کا مدبر بھی ہے۔جب چنگیز خان نے وسط ایشیاء پر 1219ء میں یورش کی تو التمش نے کچھ تو سفارتی حکمت عملی کے ذریعہ اور کچھ فیصلہ کن فوجی طاقت کے مظاہرہ کے ذریعہ اسے ہندوستان سے دور ہی رکھا۔لاہور اور دہلی منگولوں کی بربریت سے بچا لئے گئے۔التمش کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے ناکارہ اور نا اہل تھے انہیں سلطنت کے کاروبار سے زیادہ شراب اور موسیقی سے دلچسپی تھی۔اس لئے التمش نے اپنی بیٹی کو اپنا جانشین نامزد کیا حالانکہ چند درباریوں اور قاضیوں نے اس کے خلاف صلاح دی۔اپنے باپ کی مرضی

کے مطابق رضیہ 1236ء میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھی۔

التمش ایک غیر معمولی بادشاہ تھا- وہ نہ صرف ایک غلام کی حیثیت سے ترقی کر کے اس دور کے انتہائی طاقتور شاہی سلسلوں میں سے ایک کا سلطان بنا، بلکہ اس نے اپنی بیٹی کی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر اسے جانشین نامزد کیا۔ اس طرح اس نے زمانے کے دستور کو توڑا اور اپنے بیٹوں کے نااہل ہونے کی وجہ بیٹی کی اہلیت کو ترجیح دی۔ رضیہ کو فوری طور پر اس کے بھائی رکن الدین کی جانب سے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ رضیہ کو خوفزدہ کرنے اور اسے تخت چھوڑنے پر مجبور کرنے کے لئے رکن الدین نے خود اپنے بھائی کا قتل کیا۔ رضیہ ایک ماہر سیاست دان تھی۔ اس نے عوام کے سامنے جانے کا فیصلہ کیا اور دہلی کی جامع مسجد میں عام رعایا سے انصاف کی دہائی دی۔ عوام نے حق کا ساتھ دیا۔ رکن الدین اپنے بھائی کے قتل کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ شریعت کورٹ میں مقدمہ چلا جہاں اسکو سزائے موت دے دی گئی۔

رضیہ نے ہندوستان کی ایک مطلق العنان سلطان کی حیثیت سے اپنی حیثیت منوانے میں دیر نہیں کی۔ اس نے اپنے نام کے سکے ڈھالنے کا حکم دیا جس پر عورتوں کی مینارہ، وقت کی ملکہ، شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کندہ کرایا۔ جامع مسجد میں خطبہ اس کے نام کا پڑھا گیا۔ لیکن اس کی بادشاہت اس وقت تک قانونی نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ بغداد کے خلیفہ کی جانب سے جواز کا پروانہ نہ مل جائے۔ حالانکہ بغداد کے خلیفہ نے اپنی ساری سلطنت منگولوں کے ہاتھوں گنوادی تھی۔ اس کے باوجود بغداد کا خلیفہ سنی اسلام کا روحانی اور رسمی سربراہ تھا اور امیر المؤمنین کا خطاب لئے ہوئے تھا۔ صرف وہی کسی بھی سلطان کو قانونی جواز دے سکتا تھا۔ رضیہ جو کہ ایک ترک تھی اور سنی المسلک تھی، اس نے اپنی وفاداریاں بغداد سے وابستہ کیں اور یہ فرمان جاری کیا۔ امیر المومنین امام المستنصر کے نام سے ملکہ التمش سلطان التمش کی بیٹی وہ جو کہ امیر المؤمنین کی شان دوبالا کرتی ہے۔ خلیفہ نے اسے دلی کی ملکہ کی حیثیت سے 1237ء جزوی طور پر تسلیم کرلیا۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ منگول ایک وسیع علاقہ پر قابض ہو چکے تھے اور دھیرے دھیرے بغداد کے اطراف اپنا شکنجہ کس رہے تھے۔ خلیفہ کو مشرق میں ایک سنی پشت پناہ کی اشد ضرورت تھی۔

رضیہ سلطانہ کے متعلق ہمیں زیادہ تر معلومات ابن بطوطہ کی تحریروں کے ذریعہ ہی ملتی ہیں۔ یہ دنیا کا ایک عظیم سیاح تھا۔ رضیہ سلطانہ کے انتقال کے ایک سو سال بعد یہ ہندوستان آیا تھا اور 1335ء تا 1340ء تک یہاں اس کی رہائش تھی۔ اس کے مطابق رضیہ سلطانہ سپاہیانہ لباس میں ملبوس گھوڑے پر سوار ہوکر خود میدانِ جنگ میں شامل ہوتی۔ عدالتی فیصلے دیتی۔ اس نے کئی نئی فتوحات حاصل کیں وہ بذات خود ملکی امور کے متعلق وزارتی مجلس کی صدارت کرتی تھی۔ مگر مردوں کے حسد کی کوئی انتہا نہیں۔ ایک عورت کی حکمرانی ترکی فوجی سالاروں اور امراء کے لئے ایک ایسی کڑوی گولی تھی جسے حلق سے اتارنا مشکل تھا۔ رضیہ کم عمر، خوبصورت اور غیر شادی شدہ تھی۔ کئی امراء نے اسے شادی کا پیام دیا۔ رضیہ نے انہیں ٹھکرادیا اس کے بجائے دربار کے ایک حبشی غلام شاہی اصطبل خانے کے دربان جلال الدین یاقوت کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ دہلی میں افواہوں کا بازار گرم ہوگیا۔ حاسد اور ٹھکرائے ہوئے سالاروں نے اس کو اور ہوادی۔ دعویٰ دہلی کے قاضیوں کے سامنے لایا گیا۔ یہ الزامات عائد کئے گئے کہ وہ اس مرد سے بہت زیادہ قریب ہوچکی ہے۔ قاضیوں نے یہ فیصلہ دیا کہ رضیہ سلطانہ کو تخت سے اتار دیا جائے اور وہ شادی کرکے پردہ نشین ہوجائے۔ انہوں نے ایک ترکی سالار التونیہ کو اس کا جانشین مقرر کیا۔ اس فیصلہ کا کوئی بھی اثر لئے بغیر رضیہ نے دہلی کے قلعہ سے باہر کوچ کیا اور سالار کا مقابلہ کیا۔ لیکن قسمت نے اسکا ساتھ نہیں دیا۔ اسے شکست ہوگئی اور وہ قیدی بنالی گئی۔ رضیہ نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کی حکمران تھی بلکہ انتہائی خوبصورت کم سن عورت بھی تھی۔ فاتح التونیہ اپنی قیدی کی محبت میں گرفتار ہوگیا اور اس سے شادی کرلی۔ دونوں نے مل کر دہلی پر چڑھائی کی جو کہ باپ کی جانب سے عطا کردہ اس کی اپنی میراث تھی۔ بدقسمتی سے التونیہ اور رضیہ دونوں کی متحدہ افواج کو شکست فاش ہوئی۔ رضیہ سلطان جنگ سے بھاگی تھکی ماندی اور بھوک سے نڈھال ہوکر اس نے ایک کسان کے گھر پناہ لی۔ جب وہ گہری نیند سورہی تھی تو میزبان نے دیکھا کہ مردانہ سپاہیانہ لباس پہنے والے کے جسم پر ایک ایسا لباس ہے جو سونے سے بنا ہوا ہے۔

نقشہ

اس نے رضیہ کو نیند میں ہی قتل کر دیا۔لیکن سونے کے لباس فروخت کرتے ہوئے شہر والوں کی طرف سے پکڑا گیا۔

پرانی دلی کے ایک گمنام گوشے میں یہ بہادر عورت قبر کی تنہائی میں سوئی ہوئی ہے۔ اس کے مقبرہ تک پہنچنے کے لئے کسی بھی سیاح کو کچرا پٹیوں،ٹوٹی ہوئی گندی بستیوں اور اور کئی ایک گندے پانیوں کے نالوں کو عبور کر کے جانا ہوتا ہے۔

گلی کی نکڑ پر ڈھکے ہوئے رخ پر کندہ سادے الفاظ سے اس کے مقبرہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ناجائز قبضوں نے اس جگہ کو تقریباً مکمل طور سے گھیر کر ختم کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ سورج کی کرنیں بھی اب اس حسرت بھری قبر تک پہنچ نہیں پاتیں۔ انطونیہ کی قبر اس کے پہلو میں بنی ہوئی ہے۔ دونوں کے پائنتی نامعلوم دو بچوں کی قبریں ہیں۔ ایک تاریخ ساز عورت کو جسکو دنیا نے جانا ہے تاریخ نے ایسی قسمت سے ایسے انعام سے نوازا ہے۔

ابن بطوطہ نے تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح عوام رضیہ کو احترام کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ 1335ء میں جب ابن بطوطہ نے یہاں کا سفر کیا تھا تو رضیہ کا یہ مقبرہ عوام کے لئے باعثِ احترام بن گیا تھا۔لوگ یہاں آیا کرتے تھے۔ اس کی قبر پر ایک خوبصورت مقبرہ تھا، جس پر گنبد آویزاں بنا ہوا تھا۔ اب ہندوستان صوفیوں کی دھرتی بن چکا تھا۔اور رضیہ کو بھی ایک صوفی بنالیا گیا تھا۔اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔

رضیہ نے اپنے المیہ میں ہی فتح پائی تھی۔اس نے تاریخ کو بدل ڈالا۔عام عورتوں اور مردوں نے اسکو اس نگاہ سے دیکھا کہ انہی میں سے ایک عورت، ایک غلام کی بیٹی کس طرح ترقی کے منازل طے کرتے کرتے دنیا کی طاقتور حکومتوں میں سے ایک کے تخت پر جلوہ افروز ہوگئی۔ وہ ایک ستارے کی طرح ابھری اور حجرِ شہابی کی طرح آسمان سے گری، اس نے اپنے عروج سے بھی دنیا کو روشن کیا اور زوال سے بھی۔ اس نے اپنی اعلیٰ قابلیتوں سے یہ ثابت کیا کہ کس طرح رسم ورواج کے بندھنوں میں مقید کر دینے کے باوجود انہیں توڑ کر عورت ایک اسلامی ریاست کی سربراہ بن سکتی ہے۔زمان ومکان کی تمام عورتیں اپنے حقوق کی علمبرداری کے لئے اسکا نام بطور مثال لے سکتی ہیں۔ہندوستان اور پاکستان کی عوامی شاعری میں اس کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقش رہے گا۔اور دور دراز ممالک کی زبانوں میں اس کے لئے احترام کے الفاظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں گے۔

چوتیسواں باب

مصر کی ملکہ......شجرۃ الدر

236 میں جب رضیہ دلی کے تخت پر بیٹھی تو اس کے چودہ سال بعد 1250ء میں ایک اور غیر معمولی عورت شجرۃ الدر مصر کی ملکہ بنی۔ رضیہ کی طرح شجرۃ الدر بھی ایک مملوک اور ترک تھی۔ خصوصیت کے ساتھ شجرۃ بحری مملوک خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو کہ ایک ترک قبیلہ تھا اور نیل کے دامن میں پھیلے جزائر میں آباد ہو گیا تھا۔

وہ دور عالم اسلام کے لئے ایک پر آشوب دور تھا۔ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لئے منگولوں اور صلیبوں کے درمیان ایک خاموش معاہدہ طے پا چکا تھا۔ چنگیز خان نے ایشیاء کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کے وارث بغداد کے دہلیز پر دستک دے رہے تھے۔ مصر کے علاوہ صرف ہندوستان ہی منگولوں کی دست برد سے بچا تھا۔ رضیہ کے والد التمش کی سفارت اور ایک کڑے رخ کے اپنائے جانے کی وجہ سے ایسا ہو سکا۔ اور منگول ہند کی سرحدوں سے واپس چلے گئے۔ سمرقند، بخارا، کابل، حیرات نیشاپور، ملتان اور تبریز منگولوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ مسلمانوں نے 1219ء لے کر 1242ء کے دوران یہ شکستیں کھائیں۔ فارس، خراسان، افغانستان اور عراق ملبہ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ فلسطین سے نکال دیئے جانے کے بعد صلیبیوں نے اپنی ساری قوت اسپین پر لگا دی تھی۔

اندلس میں ہونے والے آپسی اندرونی خلفشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے جزیرہ نما اسپین کے کافی حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اسپین میں اموی خلافت کا صدر مقام قرطبہ 1236ء میں صلیبوں کے ہاتھوں چلا گیا۔ غرناطہ کے اطراف ایک چھوٹی سی پٹی کو چھوڑ کر اسپین کا سارا حصہ صلیبوں کے قبضہ میں آ گیا تو اب

انہوں نے اپنی توجہ مصر اور شمالی افریقہ پر مرکوز کرنی شروع کی۔

وہ مملوک ترک ہی تھے جو صلیبیوں اور منگولوں کی متحدہ یورشوں کے سامنے ثابت قدم رہے۔ جبکہ عرب، ایرانی اور اندلسی سب کے سب اپنے دشمنوں کے قدموں پر پڑے ہوئے تھے۔ ان حالات میں مملوکوں کی ڈھال نے صلیبیوں اور منگولوں کی متحدہ افواج کو ادھر یروشلم کے دروازوں پر اور ادھر دریائے سندھ کے کناروں پر روک دیا۔ 261 میں عین جلوت کی جنگ میں سلطان بیبرس کی فتح نے مکہ اور مدینہ کو اس انجام سے بچالیا جیسا کہ 1095 میں یروشلم کا ہوا تھا۔

مملوک کی حیثیت سے شجرۃ الدر غلام ہی پیدا ہوئی تھی۔ ہندوستان کی رضیہ کی طرح اس نے اقتدار کے ایوانوں تک عروج حاصل کیا۔ غلامی سے سلطان تک عروج کے دو پہلوؤں کی جانب ایک بار پھر توجہ مبذول کرنا ضروری ہے۔ توحید کی وہ ماورائی روح ہی تو ہے جو آقا، نوکر، کالے اور گورے، مالک اور غلام کے بندھنوں کو توڑ دیتی ہے۔ ایمان کی پاسداراس امت کی عظیم گودی میں تمام انسانوں کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، امیر ہوں یا غریب سبھوں کو اپنی مکمل قابلیتوں کے مطابق ترقی کے یکساں مواقع دیئے گئے ہیں۔ اس دائرہ کے اندر کوئی آقا نہیں اور کوئی غلام نہیں۔ انسانوں کے ادنیٰ تفرقے جن کی بنیاد دولت اقتدار، نسل اور قبیلہ پر ہے یہ سب احکامِ الٰہیہ کے سامنے بیکار ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اللہ کی نظروں میں اور قانونِ الٰہیہ کے مطابق تمام انسان ایک ہیں۔ لیکن ایمان کی وہ سچی روح وقت کے ساتھ ساتھ گم ہوئی گئی اور جب حکمرانوں نے حاجب کے پیچھے چھپنا شروع کیا تو نااہل اور ناکارہ اقتدار پرستوں کا قانون، قوانین الٰہیہ کی جگہ لینے لگا۔ دوسرے منگولوں اور صلیبیوں نے جو تباہی مچائی اس کی وجہ سے مسلم دنیا میں اعلیٰ ترین افراد کی روایات کا خاتمہ ہوگیا۔ 1236ء میں قرطبہ کے ہاتھ سے جانے کے ساتھ ہی اسپین میں بنوامیہ کی امارت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ادھر 1258ء میں بغداد سے بنوعباس مٹادیئے گئے۔ پُرانے سیاسی وسماجی طریقۂ کار کی تباہی میں سابق غلاموں یعنی مملوکوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی اہمیت اور اقتدار جتائیں جس کے ذریعہ ایک نئے سیاسی وسماجی نظام کو فروغ پانے کا موقع ملا۔ یہ طریقہ نظام پرانے اشراف کے طریقۂ کار کی ضد تھا ترک روایات کے مطابق اس نظام میں عورتوں اور مردوں کو یکساں مواقع حاصل تھے۔

شجرۃ نے اپنے دور سے دو خاندانوں کے درمیان کی خلیج کو پاٹ دیا۔مصر کے آخری ایوبی حکمران ملک الصالح سے اس کی شادی ہوئی ۔ 1250ء میں الصالح کا انتقال اس وقت ہوا جبکہ مصر،فرانس اور جرمنی کے صلیبیوں کی متحدہ افواج کا سامنا کرر ہا تھا۔ان افواج کی کمان شاہ لوئس نوم کی ہاتھوں تھی۔ فوج کو مایوس وبددل ہونے سے بچانے کے لئے شجرۃ نے سالاروں سے مشورہ کیااور سلطان کے موت کی خبر پوشیدہ رکھی۔اس وقت صلیبیوں کے افواج کی کمان شاہ لوئس آپ خود کرر ہا تھا۔شجرۃ کے زیر قیادت مصری افواج نے شاہ لوئس کو عبرت ناک شکست دی اور وہ گرفتار ہوگیا۔ بے شمار جرمن اور فرانسیسی صلیبی قیدی بنالئے گئے۔ان نازک لمحات کے دوران صالح کا بیٹا طوران شاہ قاہرہ سے غائب رہا۔شجرۃ نے کہلا بھیجا کہ وہ فوراً پائے تخت کو واپس آ جائے۔اس کے واپس آتے ہی اس نے طوران شاہ کو اقتدار کی باگ ڈور سونپ دی۔لیکن وہ نااہل ثابت ہوا۔اس نے طاقتور مملوک سپہ سالاروں کو اپنا دشمن بنالیا جنہوں نے اس کو 1250ء میں قتل کرڈالا اور شجرۃ سے درخواست کی کہ وہ مصر کی ملکہ بن جائے۔

سنی اسلام میں حکومت کا جواز بغداد کے خلفاء سے ملتا تھا شجرۃ جو کہ ایک ترک تھی،سنی العقیدۃ اور حنفی فقہ کی پیروکار تھی۔اس وقت بغداد میں بنوعباس کے چھیالیسویں خلیفہ کی حیثیت سے المنتصر حکومت کرر ہا تھا۔ شجرۃ نے المنتصر سے اجازت طلب کی اور جبکہ بغداد اس کی درخواست پر غور کرر ہا تھا۔وہ ایک آزاد حکمران کی حیثیت سے مصر پر حکومت کرتی رہی۔اس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ الازہر کے خطیبوں نے جمعہ کے خطبات اس کے نام دینے شروع کر دیئے۔

لیکن شجرۃ بغداد سے ملکہ کا خطاب پانے میں ناکام رہی۔سیاسی طور پر دہلی کی بہ نسبت بغداد پر ایک عورت کو مصر کی ملکہ تسلیم کر لینے کے لئے کوئی خاص دباؤ نہیں تھا۔منگول ایشیاء کے تمام علاقوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرنے کے بعد بغداد کی سرحدوں پر دستک دے رہے تھے۔ایسے وقت دور مشرق کی جانب ہندوستان میں ایک وفادار رضیہ سلطانہ کا برسر اقتدار رہنا منگولوں کے خلاف تحفظ کا ایک ذریعہ تھا۔اس کے برعکس قاہرہ منگولوں کے جنگی سرحدوں سے کافی پرے تھا اور ابھی تک عباسیوں کے روحانی دائرہ اثر میں تھا۔ادھر قاہرہ میں مالکی مسلک کے قدامت پرست علماء بھی اس کی مخالفت کرر ہے تھے۔اسی لئے المنتصر

نے شجرۃ کو مصر کی سلطانہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قاہرہ میں اپنے ابھرتے ہوئے عروج کو برقرار رکھنے کے لئے مملوک محافظوں نے اپنے ہی ایک سالار عزالدین ایبک کو سلطان نامزد کر دیا۔ بغداد نے اس کی نامزدگی کو قبول کرلیا اور مصر میں مملوک دور حکومت کی ابتداء ہوگئی۔ یہ حکومت 1517ء میں عثمانیہ ترکوں کے قاہرہ پر قبضہ کر لینے تک برقرار رہی۔

شجرۃ کو ہٹانا ویسے آسان نہ تھا۔ وہ وسائل رکھنے والی بلند حوصلہ سیاسی جنگجو تھی۔ قاہرہ کے مرکز اقتدار پر بنے رہنے کے لئے اس نے عزالدین ایبک سے شادی کر لی۔ دونوں سات سالوں تک ہنسی خوشی زندگی گذارتے رہے۔ نئے سلطان کے ساتھ ملکہ کا نام بھی سکہ پر کندہ کیا گیا اور جمعہ کے خطبات میں بھی دونوں کا نام لیا جاتا رہا۔

شجرۃ ایک تعلیم یافتہ عورت تھی اور علم کی سرپرستی کرتی رہی۔ اس نے اپنے نام سے کئی کالج قائم کئے، وہ ایک خوبصورت، ذہین، باصلاحیت مصنفہ، دلنشین مقرر، اور سیاسی زندگی کی زیرک کھلاڑی تھی۔ لیکن قسمت کو ایک اور مرتبہ اس کے خلاف مداخلت کرنی تھی۔ سیاسی اقتدار میں حصہ داری کا مطلب ہے ملکہ اور بادشاہ صرف اور صرف ایک دوسرے کے ہی وفادار رہیں۔ لیکن اس دور کی جغرافیائی سیاست کی وجہ سے بادشاہ وقت کو اور شادیاں کرنی ہوتی تھیں۔ جب عزالدین نے موصل کے ترک عطاء بیگ بدرالدین کی لڑکی سے نکاح کا فیصلہ کیا تو شجرۃ الدر یہ برداشت نہ کر سکی کہ وہ اپنی محبت اور اپنے اقتدار میں کسی دوسرے کو بھی حصہ دار بنتے ہوئے دیکھے۔ اپنے شوہر کو دوسرے نکاح سے باز رکھنے میں ناکامی کے بعد اس نے اسکو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ حسد نے فریب سے کام لیا۔ ایک مکمل سازش رچی گئی اور عزالدین کو اس وقت قتل کر دیا گیا جبکہ وہ شاہی محل میں حمام خانے کی طرف جا رہا تھا۔ شجرۃ کے لئے بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ مملوک سپہ سالاروں کو اس سازش میں اس کا ہاتھ ہونے کا پتہ لگ گیا۔ اسے قتل کر دیا گیا اور اس کے جسم کو قلعہ کے پشتہ سے پھینک دیا گیا۔ اسی کے بنائے ہوئے ایک کالج میں اسکو دفن کر دیا گیا۔

ہندوپاک کی رضیہ اور قاہرہ کی شجرۃ ان دونوں کی غیر معمولی زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ اسلامی تاریخ میں ایک عورت کو سیاسی یا معاشرتی درجہ حاصل کرنا کس قدر مشکل ہے۔ پہلے تو خلفاء عوام سے دور ہو کر یکا

وتنہا ہو گئے ۔حضرت امیر معاویہؓ نے ذاتی محافظوں کو رواج دیا۔ ہارون الرشید نے جمعہ کے خطبات کی ذمہ داری ایک پیشہ ورانہ قاضی کے ذمہ کر دی۔ بعد میں آنے والے خلفاء نے سوائے چند ایک کے، عوام اور اپنے درمیان رابطہ کے لئے حاجب کا تقرر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پہلے چاروں خلفائے راشدین کے بعد میں آنے والے حکمرانوں کے لئے مالِ غنیمت بن کے رہ گئی۔ حکمران اپنے محلوں اور حرم سراؤں میں بند ہو گئے ۔ نوکر شاہیوں کا وسیع نظام فروغ پا گیا جس نے تخت اور کسان کے پسینے کے درمیان اس دوری کو مروجہ دستور کی شکل دے دی۔ اس سیاسی تنہائی کا بہت زیادہ دباؤ اور اثر عورتوں کو دو طریقوں سے سہنا پڑا۔ پہلے تو یہ کہ عباسی دورِ حکومت میں پروان چڑھنے والے بڑے مسالک کے فقہ کے مطابق عورتوں کو جمعہ کی نمازوں سے الگ کر دیا گیا۔ اس بات کو طے کر دیا گیا کہ عورت خلیفہ نہیں بن سکتی۔ دوسرے عورت کو عوامی اور معاشرتی نظام سے الگ کیا جانا تھا۔ اس طریقۂ کار کو بنو فاطمہ بنو امیہ اور بنو عباس کے سبھی درباروں کی سیاسی اجارہ داریوں کی جانب سے پشت پناہی حاصل ہوتی رہی۔ جیسے جیسے تاریخ آگے بڑھتی رہی دو قسم کے حجابوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ پہلے مرحلہ میں مسلمان مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر نظر انداز کر دیئے گئے اور حکمران طبقہ نے ایک طرح سب سے حجاب یا پردہ کر لیا۔ دوسرے مرحلہ میں عورتوں کو حجاب در حجاب کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں عوامی زندگی سے بھی پردہ پوش کر دیا گیا۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی سے عورت کی علاحدگی مکمل اور پورے طور سے تھی۔ آخر کار جب مسلمان اپنی فوجی اور سیاسی طاقت سے ہاتھ دھو بیٹھے، ان کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا تو وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہوئے تھے جہاں سے وہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں ناکام تھے۔ جدید تہذیب کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ ایک ایسی تہذیب جس نے انفرادی آزادی، عورت کے لئے مساوات، آزادی اور ذمہ داری کے نعرے بلند کئے اور انہی نعروں سے دنیا کے اسٹیج پر مرکز نگاہ بن گئی، اس تہذیب کا مقابلہ اور اسکا سامنا اب انہیں کرنا تھا۔

منگولوں کا سیلاب

خلاصہ:

خراساں کے سلطان شاہ محمد کے غرور وتکبر نے اسلامی دنیا کو منگولوں کے سیلاب میں ڈبو دیا۔ 1219 میں منگولیا کے سطح مرتفع سے چنگیز خان اتر آیا اور وسط ایشیا اور ایران کے سارے علاقوں کو تباہ برباد کر کے رکھ دیا۔ اس علاقہ کی نوے فیصد آبادی قتل کر دی گئی۔ ایک زمانے کے مشہور و عظمت والے شہر کھنڈر بنا دئے گئے۔ علوم کے مراکز صفحۂ ہستی سے مٹا دئے گئے۔ چنگیز خان کی موت کے بعد بھی منگولوں کی پیش قدمی مشرقی یوروپ اور مشرقی وسطیٰ میں جاری رہی۔ 1258ء خلافت کا صدر مقام بغداد منگولوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ خلیفہ پاؤں تلے روند کر ہلاک کر دیا گیا۔ کلاسیکل اسلامی تہذیب پر ہمیشہ کے لئے گمنامی کا پردہ گر گیا۔ یہ احساس کرتے ہوئے کہ اسلام کو ختم کر دینے کا سنہری موقع آ پہنچا ہے۔ صلیبیوں نے منگولوں سے معاہدہ کر لیا۔ صرف مملوک سلطان بیبرس کی فیصلہ کن مزاحمت نے صلیبیوں اور منگولوں کے اس سیلاب کو روکنے میں کامیابی حاصل کی۔ سلطان بیبرس نے بیت المقدس کے دروازوں کے سامنے نازرتھ کے پاس عین جلوت کے مقام پر انہیں فیصلہ کن شکست دی۔ اب یہاں سے روحوں کی جنگ کا آغاز ہوا۔ اسلام اور عیسائیت دونوں منگولوں کی روحوں کو فتح کرنے کی کوششوں میں جٹ گئے۔ جب عظیم فارس کے غزان نے اسلام قبول کر لیا تو اسلام نے یہ جنگ جیت لی۔ ایشیا اسلام کی آغوش میں رہا اور عیسائیت یوروپ کی سرحدوں کی جانب ہٹ گئی۔ صلیبیوں منگولوں کے درمیان اندرونی طور پر ہونے دوستانہ تعلقات در تعلقات پر مورخین کی نظر بہت ہی کم گئی ہے۔ اس باب میں اسلام کے خلاف ہونے والی انہی اندرونی سازشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پینتیسواں باب

چنگیز خان کی تباہیاں وتاراجیاں

یہ وہ صدی تھی جبکہ تین انتہائی طاقتور تہذیبی روایات اسلام،قرون وسطیٰ کی عیسائیت اور منگول، ایک دوسرے سے متصادم ہوئے۔اس تصادم کے بعد کے نتائج نے تینوں روایات کی اس طرح کایا پلٹ دی کہ یہ تبدیلی بنیادی اور بہت ہی گہری ثابت ہوئی۔منگولوں کا طوفانی انقلاب عالمی تھا جس نے انسانی تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے،اس نے پرانے شاہی خاندانوں کے سلسلے تباہ کردئے،انسانی نسلوں کی ہیئت بدل دی اور بنیادی طور پر مذہب اور تہذیب تک انسان کی رسائی کو بدل ڈالا۔منگولوں کے اس اثر کو آج بھی دنیا کے اس سیاسی جغرافیائی تناظر پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے واقعات کو مسلمانوں کے نقطہ ءنظر سے دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ۱۲۰۰ء کے ایشیائی یوروپی سیاسی وجغرافیائی حالات پر غور کیا جائے،اس صدی کے آخر میں رہنے والے کسی بھی مسلمان کے لئے یہ سوچنا ٹھیک ہی ہوگا کہ اسلام کے لئے اس سے بہتر وسیع المنظر حالات نہیں ہوسکتے۔صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کا جوا کاندھے سے اتار پھینکا اور ۱۱۸۷ء میں یروشلم کو آزاد کروالیا۔۱۱۹۱ء میں محمد غوری نے دہلی فتح کرلیا اور دہلی میں اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔المحد ثین نے ۱۱۹۶ء میں الارکوس کی جنگ میں عیسائی صلیبیوں کو شکست دے دی اور اسپین پر مسلمان کی فرمانروائی برقرار رکھی۔مصر پر سے فاطمیت کا دور ختم ہوگیا۔فاطمیت اور فلسفی اگناسٹک کے گمراہ کن نظریات سے بنیادی سنی اسلام کو جس چیلنج کا سامنا تھا امام غزالی نے اپنے پرزور دلائل کے ذریعہ ان نظریات کو شکست دے دی۔

اسلام ہندوستان میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا تو انڈونیشیا میں بھی قدم جمانے کا موقع حاصل ہو گیا تھا۔

ان تمام کامیابیوں کے درمیان دور افق پر کالے بادل گھرتے جا رہے تھے۔ سچ تو یہ کہ ۱۲۰۰ء کی ایک نسل بعد ہی اسلام جسمانی طور پر ناپید ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے جس قدر تباہی و بربادی کا سامنا کیا ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور مسلمانوں کی تاریخ میں تیرھویں صدی عیسوی میں ہی اسلام نے انتہائی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی جیسی ظفریابی حاصل کی ایسی عالیشان کامیابی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

۱۲۰۰ء تا ۱۲۲۰ء کے درمیان وسط ایشیاء کے جغرافیائی و سیاسی میدان پر تین الگ الگ قابلیتیں رکھنے والے حکمران حاوی رہے۔ بغداد کا خلیفہ الناصر، خوازم کا سلطان علاء الدین شاہ اور منگولیا کا تیموچین (جسے بعد میں چنگیز خان کے نام سے پکارا جانے لگا)

سلطان علاؤالدین ۱۲۰۰ء میں خوارزم کے تخت پر بیٹھا، وہ ایک بلند خواب دیکھنے والا، انا پرست اور بہت جلد غصہ میں آنے والا شخص تھا۔ اللہ تعالی نے اسے تین قابل بیٹوں سے نوازا تھا۔ اس کے عہد ہی میں اس نے اپنی سلطنت آمودریاء سے لے کر خلیج فارس تک مضبوط کر لی۔ فرغانہ کی ہری بھری زرخیز وادی اور روایتی طور پر مشہور بخارا اور سمرقند شہر اس کی سلطنت کا ایک حصہ تھے۔ اس کی کامیابیوں نے بغداد کے خلیفہ الناصر جو کہ ۱۱۸۰ تا ۱۲۲۵ء تک خلیفہ رہا۔ کے دل میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ دونوں کے درمیان تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ علاؤالدین نے ۱۲۰۵ء میں بغداد پر حملہ کر دیا اسکا ارادہ خلیفہ کو تبدیل کرنے کا تھا۔ جیسا کہ اکثر اوقات تاریخ کے نازک لمحات میں ہوتا آیا ہے۔ خلیفہ الناصر کو فطرت کی نیرنگیوں نے بچا لیا۔ ایک طاقتور سرمائی طوفان اٹھا اور جنوب مغربی ایران کے پہاڑوں پر بھاری برف باری نے برف کے ڈھیر لگا دیئے۔ علاؤالدین کو فتح حاصل کئے بغیر خراسان لوٹنا پڑا۔ الناصر نے اس حملہ کے لئے سلطان کو معاف نہیں کیا۔ اس نے سلطان علاؤالدین کو سبق سکھانے کے لئے دور دراز منگولیا کے چنگیز خان کو دعوت دی ۔ مورخ لکھتے ہیں کہ سفیر کے سر کو مونڈھا گیا پھر اس کے سر پر خلیفہ کا پیغام گودا گیا پھر اس کے بالوں کو بڑھایا گیا۔ اس کے اس سفیر کو سلطان کے علاقوں سے گذار کر چنگیز خان کے پاس بھیجا گیا۔

لیکن چنگیر خان نے اس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ وہ اس وقت مشرقی چین کی مہم میں مصروف تھا۔

تیموجن ۱۱۶۲ء میں ایک منگول قبیلہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زمانے میں اسے اپنے ہی قبیلہ کی سرداری برقرار رکھنے کے لئے کافی جدو جہد کرنی پڑی۔ ۱۲۰۶ء تک وہ تمام منگول قبائل کو متحد کرنے میں کامیاب ہوگیا اور چنگیز خان کا خطاب اختیار کیا اس کے بعد اس نے شمالی چین پر کامیاب حملے کئے اور ۱۲۱۵ء تک شمالی چین کی سلطنت اس کے قبضہ میں آ گئی۔ چنگیز خان نے چینیوں سے اس دور کی جدید جنگی ٹکنالوجی حاصل کی، سرنگ بنانے کی انجینرنگ شب خون مارنے والے انجن، دفاعی ریشمی بکتر بند اور سب سے اہم ترین بارودی سفوف کی تکنالوجی ان سے سیکھی۔

چنگیز خان اور علاؤالدین کے درمیان ابتداء میں تعلقات دوستانہ تھے، حالانکہ دونون سلطنتوں کی افواج کے درمیان مقامی شہزادوں کے مسئلوں کو لیکر چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہوئیں تھیں۔ لیکن ۱۲۱۸ء میں تقدیر کے لکھے واقعات پیش آئے۔ چنگیز خان نے قیوہ کے تین بیوپاریوں سے مال خریدا اور خراسان کا مال خریدنے کے لئے اپنے کچھ نمائندہ روانہ کئے۔ سرحدی صوبہ "اوطراء" کے گورنر ناصرالدین کو ان پر جاسوس ہونے کا شبہ ہوا۔ انہیں گرفتار کرلیا او رعلاؤالدین کو لکھا کہ انہیں قتل کردینے کی اجازت دی جائے۔ اجازت ملنے پر ان بیوپاریوں کو قتل کردیا گیا۔ چنگیز خان غضب ناک ہوا تھا اس نے اپنا ایک سفیر ناصر الدین کے پاس بھیجا اور قصاص طلب کیا دوسری تہذیبوں کے ساتھ باہمی ردعمل کے دوران بے جا غرور و نخوت اور سراب آمیز امیدوں کا اظہار کرنا بسا اوقات مسلمانوں کا ایک کردار بن چکا ہے، اسی فخر اور پر فریب امید کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناصرالدین نے سفیر کو قتل کردیا۔ یہ چنگیز خان کی توہین تھی جو کہ وہ برداشت نہ کرسکا۔ جنگ کے طبل بجنے لگے۔

چنگیز خان نے منگول قبائل کو جمع کیا اور لڑائی کی تیاریاں شروع کردیں۔ عظیم فاتح جنگ کی تیاریوں کو جتنی اہمیت دیتے ہیں اتنی ہی اہمیت جنگی چالوں کو بھی دیتے ہیں۔ فوجی نفری، گھوڑے اور رسد کی فراہمی سارے امور کے متعلق کامل تیاری کی گئی اور ۱۲۱۸ء و ۱۲۱۹ء کے موسم سرما کے دوران وسط ایشیاء کے عظیم کوہ کے سلسلوں کو کامیابی کے ساتھ عبور کیا۔ چنگیز خان ایک بے انتہا زیرک سپہ سالار تھا۔ آمودریا کے

کنارے اطراء کے مقام پر علاؤ الدین اور منگولوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی۔اس میں ہار جیت کا فیصلہ نہ ہوسکا۔لیکن سلطان نے اپنے پُرغرور کردار کی خاصیت کی وجہ سے یہ اعلان کر دیا کہ جنگ میں وہ فاتح رہا ،اس نے اپنی افواج میں تحفے تحائف تقسیم کئے اور سمرقند کی جانب لوٹ گیا۔

یہی وہ تاریخی لمحہ ہے جبکہ علاؤ الدین محمد نے جنگی امور کے تعلق سے بہت بڑی فوجی حماقت کی۔اس نے اپنی افواج کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور وادی فرغانہ میں شہروں کی حفاظت کے لئے مختصر افواج کو تعینات کیا۔اس نے سوچا کہ سرحدی علاقوں میں لوٹ مار کرنے کے بعد منگول واپس لوٹ جائیں گے۔اس لئے اس نے شہروں کی حفاظت کے لئے مدافعانہ جنگی چالیں اختیار کیں۔اس طریقہء کار نے چنگیز خان کو وہ برتری عطا کردی جس کے ذریعہ وہ اپنی مکمل فوجی طاقت کسی بھی ایک جغرافیائی مقام پر مرکوز کرسکتا تھا۔اس کو علاؤ الدین شاہ کو مکمل فوجی طاقت کا بیکوقت سامنا کرنے کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔

چنگیز خان اور علاؤ الدین محمد کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے اہم ترین بات جو ابھر کر آتی ہے یہ ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے، چنگیز خان ایک جنگجو تھا، ظالم، بے رحم، بے درد، دھوکہ باز، لیکن ایک عظیم فاتح کے شایاں صلاحیت رکھنے والا تھا۔اس کے مقابلہ میں علاؤ الدین میں صلاحیت کی کمی تھی وہ لشکر کشی اور افواج کی ترتیب کے فن سے نابلد تھا۔وہ جنگ کئے بغیر ہی اپنی فوجوں کے ساتھ عین موقع پر بھاگ کھڑا ہوا۔چنگیز خان ہمیشہ کسی بھی حملہ سے پہلے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ دشمن کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرلیا کرتا تھا۔دوسری جانب علاؤ الدین اپنے اس مہلک دشمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے دشمن کو جنگ کے لئے بھڑکا دیا۔یہ تہذیبوں کے درمیان تصادم تھا۔جس میں منگول بہتر صورت حال میں تھے، انہیں بہتر ٹکنالوجی، مہارت، حکمت عملی اور قیادت کا فائدہ حاصل تھا۔اس کے برخلاف سلطان ایک مہلک ذاتی مغالطہ میں مبتلا تھا۔وہ اپنے دشمنوں کی ٹکنالوجی، مہارت، حکمت عملی تحریکی جذبات یا استعداد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

چنگیز خان نے ایک شہر کے بعد دوسرے شہر پر مسلسل حملے شروع کر دیئے۔۱۲۱۹ء میں اطراء، جھانڈ، قوقن، بخارا، سمرقند اور سگناگ یکے بعد دیگرے اس کے قبضہ میں آ گئے۔ہر شہر میں اس کا طریقہء کار ایک

ہی تھا، تمام مرد، عورتیں اور بچے قتل کر دیئے جاتے سوائے انکے جو فوجی حملوں کے دوران غلاموں کی طرح کام آسکیں۔ زرعی زمینات منگول گھوڑوں کی چراگاہوں میں تبدیل کر دی گئیں، شہر در شہر زمیں بوس کر دیئے گئے۔

تالاب اور باندھ تباہ کر دیئے گئے، لائبریریاں جلا دی گئیں، مساجد توڑ دی گئیں۔ عالم فاضل لوگوں کو اذیتیں دے دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ شاہ علاؤالدین محمد منگول فوجوں کے آگے بھاگتا رہا، ہر ایک شہر میں اسکا پیچھا کیا جاتا رہا ۱۲۲۰ء تک بلخ، نیشاپور، غزنی کے علاوہ، کشان، اصفہان، اور دمغان کے صوبے بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ آخر کار علاؤالدین شاہ بحیرہ کیسپین کے ایک دور دراز جزیرے کو بھاگ گیا جہاں وہ ایک بھکاری موت مرا۔ لیکن اپنے پیچھے بزدلی، بے ہمتی اور نامردانگی کی ایک ایسی داستان چھوڑ گیا جس کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔

منگول افواج کئی حصوں میں بٹ کر وسط ایشیاء، مغربی ایران افغانستان اور شمالی مغرب ہندوستان میں تباہیاں مچانے لگیں۔ صرف ایک شہزادہ جلال الدین میں اتنی خود اعتمادی تھی کہ اس نے ان قتل و غارت گری پھیلانے والوں کا ڈٹ کر سامنا کیا۔ وہ جلال الدین شاہ کا تیسرا بیٹا تھا۔ اس نے ہر موڑ پر منگولوں کا مقابلہ کیا اور ۱۲۲۰ء کے دوران ایک موقع پر اس نے منگول افواج کے ایک حصہ کو افغانستان میں شکست بھی دی۔ منگولوں کے زبردست دباؤ کے باعث وہ مشرق کی جانب پیچھے ہٹا اور سندھ کے کنارے اٹک کے مقام پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ پیچھے دریا تھا اور بائیں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ تھا اور سامنے دشمن کی افواج جلال الدین منگولوں کے قلب پر شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔ لڑتے لڑتے وہ اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ جہاں چنگیز خان کا ڈیرہ تھا لیکن انسان سوچتا کچھ اور ہے اور اللہ تعالی کی کرنی کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ انسان کی بہترین مہارت اور منصوبہ بندی کے باوجود عظیم جنگوں کا نتیجہ آسمانی اشاروں سے ہی ہوتا ہے۔ اسے اللہ تعالی کی مشیت ہی کہیئے کہ اس وقت چنگیز گھوڑے سے اتر کر دوسرے کام، کاج میں مصروف تھا اور یوں چنگیز خان بچ گیا، تاریخ کے پہیے گھومنے لگے دشمنوں نے جلال الدین کے محافظوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ دلبرداشتہ ہو کر بہادر شہزادے نے پہاڑی کی بلندی سے گھوڑے کے ساتھ دریا میں

چھلانگ لگادی اور جب وہ اس عظیم دریا کو چیر کو تیرتے ہوئے۔

نقشہ

ہندوستان کی جانب بڑھ رہا تھا تو چنگیز خان بے اختیار پکار اٹھا ''قابل فخر ہے وہ ماں جس نے ایسے بیٹے کو جنم دیا''۔

آخر کار جب ۱۲۲۲ء میں چنگیز خان منگولیا کی جانب واپس ہوا تو اس نے وہ علاقہ آج جسے قزاخستان ، ازبکستان، کرخیزیا، ترکمنستان، ایران، افغانستان اور مغربی پاکستان کی ریاستیں کہتے ہیں اس سارے علاقہ کو مکمل طور سے تباہ برباد کر دیا تھا، سمرقند، بخارا، مرو، حیرات، غزنی کابل اور نیشاپور جیسے عظیم شہروں کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا ابن کثیر کے الفاظ کے مطابق ان علاقوں کی آبادیوں کا ایک سوواں حصہ بھی نہیں بچا تھا۔ یہ تو صرف ابتداء تھی، چنگیز خان کی موت کے بعد منگولوں نے مغربی ایشیاء اور وسط یوروپ میں اپنی پیش قدمی جاری رکھی، ان کی راہ میں جو کچھ آیا اسے روندھتے ہوئے برباد کرتے ہوئے اور یوروپ وایشیاء قسمتوں کو بدلتے ہوئے۔

اس طرح تیرھویں صدی کے پہلے دودہوں کے دوران اس عظیم جغرافیائی وسیاسی کھیل میں تہذیبوں کی قسمتیں داؤ پر لگائی گئیں۔ یہ داؤ اسلامی دنیا، وسطی دور کی عیسائیت اور منگولوں کے درمیان کھیلا گیا، اور اس صدی کے اگلے معرکوں کے دوران ہونے والی عالمی جدوجہد کے لئے اسٹیج تیار ہو چکا تھا۔

چھتیسواں باب

بغداد کی شکست

چنگیز خان کی موت ۱۲۲۷ء میں ہوئی۔اس کے مرنے کے بعد اس کی وسیع سلطنت پانچ حصوں میں تقسیم ہوگئی۔(۱) منگولستان، جوکہ منگولوں کے آبائی علاقوں پہ مشتمل تھا (۲) چغتائی۔خراسان اور فرعانہ کی وادیوں پر مشتمل (۳) فارس جس پر ال خان کی حکومت تھی (۴) اوس اور خزاخستان جس پر سنہرے سوار حکمراں تھے اور (۵) چین۔منگولوں نے چنگیز کی موت کے بعد بھی اپنی فتح مندیاں جاری رکھیں۔۱۲۲۹ء میں انہوں نے تین بڑی مہمات کی منصوبہ بندی کی۔پہلی مہم چین کو مکمل طور سے فتح کرنے کے لئے تھی۔ یہ مہم ۱۲۷٦ء تک قبلائی خان کے دور حکومت تک مکمل نہ ہوسکی۔دوسری مہم روس، پولینڈ، ہنگیری اور بلگیر یا کو فتح کرنے کے لئے تھی۔منگول اس مہم میں کامیاب رہے اور اس علاقہ پر انہوں نے دوسو سالوں تک حکومت کی۔سپہ سالار چرماغون کے زیر کمان تیسری مہم خراسان کے شہزادہ جلال الدین کے خلاف تھی۔

۱۲۲۱ء میں جنگ اٹک کے دوران دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد جلال الدین نے دہلی کے قابل مملوک حکمراں التمش سے پناہ طلب کی۔چنگیز خان کے دشمن کو پناہ دینے کے خطرات سے التمش اچھی طرح واقف تھا۔حالانکہ ایک شہزادہ کے شایان شان اس کی آؤ بھگت کی گئی لیکن جلال اچھی طرح جانتا تھا کہ اس استقبال کے لئے بچھائی گئی سرخ قالین کے نیچے کس قدر سرد مہری چھپی ہوئی ہے۔۱۲۲۳ میں وہ سندھ اور مکران کی راہ سے اصفہان واپس پہنچا، راہوں میں ملنے والے ان بے رحم صحراؤں کے ہاتھوں تکالیفات

سہتے ہوئے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ پندرہ سو سال پہلے مشکلات جھیلتے ہوئے انہی راہوں سے سکندر گذرا تھا۔ جلد ہی اپنے بھائی کی مدد سے خراسان، مازاندراں اور عراق میں جو کچھ بچا تھا جلال الدین اسکا مالک بن بیٹھا۔ ۱۲۲۵ء میں اپنے باپ کے دشمن سے بدلہ لینے کے لئے اس نے خلیفہ الناصر کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ خلیفہ کی افواج کو شکست ہوئی اور بغداد پر اسکا قبضہ ہو گیا۔ جلال الدین نے اور آگے جارجیا کے اندر پیش قدمی کی اور ۱۲۲۶ء میں طفلس پر قبضہ کر لیا۔ اس حملہ کے باعث جیورجیا کے باشندے غصے سے بپھر اٹھے اور انہوں نے جلال الدین کے خلاف روس کے کپچاک اور منگولوں سے معاہدہ کر لیا۔

اب جلال الدین کو جارجیائی، روس کے کپچاک اور منگولوں کی متحدہ فوجوں کا سامنا کرنا تھا۔ ۱۲۲۷ء میں اصفہان کی جنگ میں اس نے منگولوں کو شکست دے دی۔ اس کی جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ منگولوں کا جنگ کے میدان میں سامنا کیا جائے۔ اس نے اپنے باپ کی طرح قلعہ بند ہو کر جنگ لڑنے کے خطرہ سے گریز کیا۔ تیز رفتار اور گھوم کر لپیٹ لینے والے حملے کرنے کی وہ مہارت جسکے لئے وسط ایشیاء والے مشہور تھے جلال الدین نے اس مہارت کو اپنایا جس کی وجہ سے اسے دشمنوں پر کاری وار کرنے کے مواقع حاصل ہونے لگے۔ ۱۲۲۹ء میں نئے خلیفہ المنتصر نے جس کا دور حکومت ۱۲۲۶ تا ۱۲۴۲ تھا سے جلال الدین نے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ لیکن اب خوش قسمتی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی چرماغون کی منگول فوجوں نے ۱۲۳۰ء میں موغان کے میدانوں میں ایک ایسی حالت میں اسے جا لیا جب کہ وہ ابھی جنگ کی تیاری نہیں کر پایا تھا۔ جلال الدین بمشکل وہاں جان بچا پایا، اس کے کچھ ہی وقت بعد ایک کرد ڈاکو نے اسے ہلاک کر دیا۔

اس طرح مسلمانوں کے بہادر ترین سپاہیوں میں سے ایک کا خاتمہ ہو گیا۔ بادشاہوں شہزادوں کی قطاروں میں چاہے وہ مسلمان ہوں کہ عیسائی وہ ایک اکیلا شہزادہ تھا جس نے منگول قبائلی گروہ کا کھلے میدانوں میں بہادری و شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا اور کئی مرتبہ انہیں شکست بھی دی جلال الدین میدان جنگ کا بہترین شہسوار تھا لیکن اس میں تنظیمی صلاحیت کی کمی تھی۔ جو کہ ایک مدبر کی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ کبھی آرام نہیں کرتا تھا، اس کی شجاعت اور نظام الملک (۱۰۹۱ء) کے ذکاء و فہم کی یکجائی ہی منگولوں کے اس سیلابی حملوں کا جواب ہو سکتی تھی۔

اس دوران خوارزم کی غارت گری کا سلسلہ جاری رہا منگولوں نے ایک بار پھر ان شہروں کا دورہ کیا جن پر وہ قابض ہو چکے تھے۔اولیں بربادیوں کے بعد جو کچھ بھی باقی بچ رہا تھا اب انہیں بھی تباہ کر دیا۔ ۱۲۱۵ء میں مانگو، منگولوں کا سربراہ خان چنا گیا اس نے سب سے پہلے دو مہمات سر انجانے دینے کا فیصلہ کیا۔ایک طرف اپنے بھائی قبیلائی خان کی سرکردگی میں فوج کو جنوبی چین کی فتح کے لئے روانہ کیا دوسری جانب بغداد میں خلافت کے خاتمہ کے لئے ہلاکو خان کی سربراہی میں ایک مہم بھیجی۔ دونوں ہی جانب منگول افواج فاتح رہیں۔

ہلاکو خان نے اصفہان میں اپنی حالت مستحکم کی اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھا۔ راستے میں ہونے والی مزاحمتوں پر یکے بعد دیگرے قابو پانے لگا، اس کا سب سے پہلا نشانہ وہ قاتل تھے جو اس کی پچھلی صفوں کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ ہلاکو اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ یہ قاتل بنو فاطمہ کے پروردہ ہیں۔ گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران انہوں نے بے شمار سپہ سالاروں وزیروں اور سلاطین سب کو یکے بعد دیگر قتل کیا ان قاتلوں نے پورے دوسو سالوں تک مسلمان شاہی سلسلوں کو دہشت زدہ کئے رکھا۔ وہ قاتل کا ایک خنجر ہی تھا جس نے انتہائی زیرک ودانا وزیر نظام الملک کی زندگی کا خاتمہ ۱۰۹۱ء میں کیا۔ ۱۲۵۶ء میں ہلاکو خان نے ان قاتلوں کی کمین گاہوں پر حملہ کیا اور ایک کے بعد ایک سب کا صفایا کر دیا۔

۱۲۵۷ء میں سردیوں کے دوران ہلاکو خان بغداد کی جانب بڑھا۔ اسلام کو مٹانے کے لئے منگولوں اور عیسائی طاقتوں کے درمیان ایک حقیقی معاہدہ طے پا چکا تھا۔صلیبوں اور آرمینیائی افواج نے شمال کی جانب سے شام پر حملہ کیا جس کی وجہ سے ترکی افواج کا ایک حصہ ادھر برسر پیکار ہو گیا۔ یہ افواج بغداد کے دفاع کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ المعتصم فوجی حیثیت سے ہلاکو خان کے مدمقابل ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا، چنگیز خان کے مقابلے میں خوارزم کا شاہ محمد جس ہلاکت آمیز خود پرستی میں مبتلا تھا، المعتصم بھی ایسی ہی انا پرستی کا شکار تھا۔ خلیفہ المعتصم صدر مقام کے دفاع کا ضروری انتظام نہ کر سکا۔ خلیفہ کا وہ زبردست خزانہ جس کے ذریعہ بڑی فوج کھڑی کی جا سکتی تھی، بند ہی رہا۔ ہلاکو نے خلیفہ المعتصم کو خود سپردگی کا پروانہ بھیجا۔ جب خلیفہ نے انکار کر دیا تو ہلاکو نے عباسی صدر مقام کا محاصرہ کر لیا اور منصوبہ بند انداز سے آگے بڑھنے لگا۔

جون ۱۲۵۸ء کو شہر بغداد نے ہتھیار ڈال دیئے۔اس کے بعد بربریت کا جو ننگا ناچ ہوا اسے کسی بھی قسم کے الفاظ میں بیان نہیں جا سکتا۔ بغداد کو لوٹنے تباہ تاراج کرنے کا عمل ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ المعتصم کو ایک قالین میں لپیٹ کر پیٹا گیا اور منگول گھوڑوں سے روندا گیا۔مساجد مسمار کردی گئیں۔کتب خانے جلا دیئے گئے۔علم کے مینار علماء وفضلاء کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا گیا۔کاریگروں، دستکاروں کو غلام بنالیا گیا۔عورتوں کو راستوں میں کھینچا گیا،ان کے بے حرمتی کی گئی اور دور دراز راہوں میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ پانچ سو سالہ حکومت کے دوران عباسیوں نے فرات اور دجلہ کی دریاؤں پر جو تالاب تعمیر کئے تھے انہیں توڑ دیا۔ وسط ایشاء میں ان تالابوں کے توڑ پھوڑ دیئے جانے کی وجہ سے زرعی پیداوار میں کمی آ گئی اور صدیوں تک آبادی اور اقتصادی حالت میں سدھار نہ آ سکا۔ بغداد جو دنیا کا سب سے بارونق اور سب سے بڑا شہر تھا اب شیطانوں کا مسکن بن گیا۔

بغداد کی شکست تاریخ عالم کا انتہائی اہم واقعہ ہے اس کے ساتھ ہی کلاسیکی اسلامی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ عباسیوں نے مدینہ اور دمشق کے بعد سنی اسلام کے صدر مقام کی حیثیت سے بغداد کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ خلافت کا پایہ تخت تھا اور اسلامی سیاسی زندگی کا ایک محور وہ بغداد ہی تھا جہاں سلطان اور بادشاہ سب آتے اپنی دنیاوی اقتدار کے لئے قانونی جواز حاصل کرنے کے لئے اور روحانی امور میں رہبری کے لئے بغداد میں خلافت کے ٹوٹ جانے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو ایک بار پھر ایک نئے مرکزی ادارہ کی تعمیر کرنی پڑی تا کہ اسلام کی دنیاوی اور روحانی مرکزیت باقی رہے۔

ہلاکو نے حمدان میں قدم جما لئے اور وہاں سے اس نے نئی یورشیں شروع کیں۔سارے عراق پر قبضہ جما لیا۔۱۲۶۰ء میں منگولوں، آرمینائی اور صلیبیوں کی متحدہ افواج نے شمالی شام کے الپو پر قبضہ جما لیا۔ اب صرف فلسطین باقی رہ گیا تھا جو کہ مصر مکہ اور مدینہ کی کنجی ہے۔ ہندوستان میں التمش اور اس کی بیٹی رضیہ سلطانہ کی دانشمندی سے صرف دریائے گنگا کے میدان منگولوں کی فتح سے بچ گئے۔ وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ اسلام کی وہ شمع جو چھ سو سال پہلے منور ہوئی،شاید جسمانی طور پر بجھ جائے گی۔ وہ اسلامی تہذیب کی روشنی ہی تھی جس نے علم، فنکارانہ تخلیقات اور تمدن کو چھ سو سالوں سے زندہ رکھا

ہوا تھا جب کہ اس وقت یوروپ تاریکی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ تہذیب اپنے زوال کے برسوں میں بھی روحانیت پرست بھی تھی اور تجرباتیت پرست بھی، وہ قدیم یونانی، ہندوستانی ایرانی اور مصری تہذیبوں کی خوبیوں کو اپنے میں جذب کر کے ایک بہترین تمدن کو دنیا کے لئے منتقل کر رہی تھی۔ بغداد کی شکست کے بعد اسلام خود اپنی ہی ذات کی تجدید کے دور سے گذرنے لگا۔ اب اس کی توجہ زیادہ تر باطن کی جانب تصوف کی جانب اور روحانی علوم کی جانب مبذول ہونے لگی۔ یہی وہ صوفی اسلام ہے جسے فاتحین منگولوں کو فتح کرنا تھا، ہندوستان، افریقہ اور انڈونیشیا میں لاکھوں کے دل جیتنے تھے اور اگلے چار سو سالوں تک تینوں براعظموں کی قسمت کو سنوارنا تھا۔

اس طرح ۱۲۵۸ء میں ایک تہذیب مرگئی لیکن وہی تہذیب اپنی ہی دوسری شاخ دوسری ٹہنی، دوسرے روپ سے تجدید پا کر اپنا لوہا منوانے لگی اور ایک بار پھر دنیا میں روشنی بکھیرنے لگی۔

سینتیسواں باب

عین جلوت کی جنگ

جنگ بدر کے بعد پہلی بار ایک بار پھر ایسا ہوا کہ مسلم دنیا نیست و نابود ہونے کے دہانے پر کھڑی تھی۔ جنگ بدر کے بعد جنگ عین جلوت میں ایک بار ویسی ہی صورت حال تھی۔ چھ سو سال پہلے جس طرح کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے میدان میں فتح حاصل کی تھی بالکل اسی طرح منگولوں، صلیبیوں اور آرمینیائی افواج کی متحدہ طاقت کو عین جالوت کے مقام پر مملوکوں نے شکست دی۔ مسلم دنیا بال بال بچی۔ تاریخ بسا اوقات تہذیبوں کو کچھ ہی وقفہ کے لئے دم لینے کی مہلت دیتی ہے وہ کچھ وقفہ کے لئے السائی سی رہتی ہیں لیکن جب کروٹ لے کر اٹھتی ہیں تو ایک بار پھر دنیا کو انقلاب سے دوچار کر دیتی ہیں بلکل اسی انداز سے مسلم دنیا بھی بچ گئی۔ وہ گہری نیند سے اٹھی اور ایک بار پھر دنیا پر اپنا جھنڈا لہرانے لگی۔

ہنگیری اور پولینڈ کو شکست دینے کے بعد منگول جب وسط یوروپ سے واپس ہونے لگے تو عیسائی طاقتوں پر یہ بات صاف واضح ہوگئی کہ مغربی یوروپ اب محفوظ ہے۔ 1245ء میں کونسل آف لائنس میں یہ قرارداد پاس کی گئی کہ منگولوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جائے۔ 1246ء میں جان دی پلانو کارپنی کے ماتحت ایک وفد منگول صدر مقام قراقرم پہنچا اور عظیم خان قیون کے سامنے عرض واگذاشت کی۔ قیوق نے اپنے دربار میں دو عیسائی وزیروں کو بھی تعینات کیا ہوا تھا۔ جان کا پرتپاک استقبال ہوا۔ 1247ء میں ایک ڈومنی پادری (Anselm) انسلم کی سرگردگی میں دوسرا وفد بھیجا گیا۔ 1253ء میں فرانس کے بادشاہ لوئس نے (Rubruquis) روبروکیس کے ولیم کے زیر اہتمام ایک تیسرا

وفد بھیجا۔1254ء میں آرمینیا کا بادشاہ ہیٹن خود سفر کر کے قراقرم پہنچا۔

عیسائیوں کی باضابطہ صلح کی ان پیش کشوں کا انعام انہیں فوجی امداد کے وعدے کی شکل میں مل گیا۔ بڑے بڑے شہروں میں عیسائی آبادی محفوظ رہی جبکہ منگول مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے۔مثال کے طور پر جب بغداد کو مسمار کر کے زمیں بوس کیا گیا تو وہیں بغداد کی عیسائی آبادی ایک مقامی بشپ کے کلیسا میں جمع ہوگئی اور انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا بغداد کے غارت گر ہلاکو خان کی کئی بیویاں تھیں۔ان میں ایک نیسٹوری (Nestorian) عیسائی دوکوز خاتون تھی جو کہ اس کی بیویوں کی سربراہ تھی۔اپنی ابتدائی کامیابیوں سے عیسائی بہت خوش تھے اس قدر خوش کہ پوپ الیگزنڈر چہارم نے 1260ء ہلاکو کو الگ خط لکھا اس سے درخواست کی کہ عیسائیت قبول کر لے اور ہمارا مددگار بن جائے۔

1258ء میں بغداد کی شکست کی خبر کا عیسائی دنیا میں بڑی ہی مسرت کے ساتھ استقبال ہوا انہوں نے اس کو یروشلم کے نقصان کی بھرپائی کا ایک اچھا موقع جانا۔یہی وہ زمانہ تھا جب فاطمی قاتلوں نے انگلینڈ کے بادشاہ ہنری سوم کے پاس ایک وفد بھیجا اور منگولوں کے حملوں سے ان کی حفاظت کرنے کی درخواست کی۔ ونچسٹر کے بشپ کی جانب بہت کڑا جواب ملا ''ان کتوں کو آپس میں ہی ایک دوسرے کو کھا جانے اور صفحہ ہستی سے مٹ جانے دو۔تب ہم ان کی تباہیوں کے ملبہ پر ایک نئے کیتھولک کلیسا کو تعمیر ہوتے ہوئے دیکھیں گے''۔

اس منگول،عیسائی اتحاد نے مسلمانوں کے علاقوں کے خلاف اپنی جارحانہ سرگرمیوں کو برقرار رکھا۔ جہاں منگولوں نے ایشیاء کو تباہ کیا وہیں مشرقی بحیرۂ روم اور شمالی آفریقہ پر صلیبی حملے جاری رہے۔1218ء میں ایک جرمن فوج نے مصر پر حملہ کیا اس نے دامیطہ پر قبضہ کیا اور آگے قاہرہ کی جانب بڑھنے لگی۔مصریوں نے اس فوج کو دریا کے دہانے تک آنے دیا جب وہ قریب گئی تو انہوں نے دریائے نیل کے پشتوں کو کھول دیا جس کی وجہ سے جرمن فوج اس علاقہ میں پھنس کر غرق ہوگئی۔1261ء میں فرانس نے شمالی آفریقہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔اسی دوران اسپین اور پرتگال مراقش کے ساحلوں پر فوجی طور پر سرگرم تھے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ہلاکو نے بغداد پر فتح حاصل کر لی اس کے بعد آگے بڑھ کر عراق و رشام پر بھی

قبضہ کرلیا۔ اپنے نجومیوں سے صلاح ومشورہ کے بعداس نے مراغا کو اپنا مستقر بنایا۔ شیراز کے قریب عطاء بیگ سلجوق شاہ کو پکڑ کر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ 1260ء میں الپو پر طوفانی حملہ کیا وہاں کی ساری آبادی موت کے گھاٹ کے اتاردی گئی۔ دمشق نے لڑے بھڑے بغیر ہی خود کو سپرد کر دیا۔ منگول سپہ سالار کتبوغا، آرمینیا کے بادشاہ ہیٹن (Haytan) اور صلیبی بادشاہ انٹیوک کے بوہمنڈ نے پرانے اموی صدر مقام کی راہوں میں مارچ کیا اور شہر کے مسلمانوں کو صلیب کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ مصر کے مملوک سلطان قطوز کو حکم نامہ بھیجا گیا کہ سرنگوں ہو جائے یا نیست ونابود ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔

مملوکوں کے سامنے بڑا ہی سخت انتخاب تھا۔ وہ جانتے تھے سرنگوں ہونا یا جنگ میں ہار جانا دونوں کا ہی مطلب ہے نیست ونابود اور اسلامی تہذیب کے اس آخری قلعہ کا تباہ و برباد ہو جانا۔ حالانکہ دہلی ابھی تک منگولوں کے دست برد سے بچا ہوا تھا۔ 1260ء میں اسلام ہندوستان کے میدانوں میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ مملوک یہ بھی جانتے تھے کہ انکے ہار جانے کا مطلب ہے یروشلم، مکہ ومدینہ پر بھی دشمنوں کا قبضہ ہو جانا سلطان قطوز نے فوراً سپہ سالار بیبرس کے زیر کمان ''جہاد'' کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ اس کا جواب حد سے زیادہ پر جوش تھا۔ جذبہءشہادت سے سرشار مسلمانوں کی فوج سینائی سے گذرتی ہوئی فلسطین کی جانب بڑھنے لگی تا کہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے۔

مملوک ترک قبیلہ تھا جس نے دریائے نیل کے جزائر کو ہی گھر بنالیا تھا۔ اس لئے انہیں اکثر بحری مملوک کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے مملوک لفظ ملاکہ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے مالک ہونا۔ نویں اور دسویں صدی کے دوران دریائے اولگا کے ذریعہ جو آج کے روس میں بہتا ہے بحیرۂ کیسپئن کے اطراف غلاموں کی تجارت زوروں پر جاری تھی سویڈن کے باشندے وائکنگ اس تجارت کا اولین ذریعہ تھے۔ نویں اور دسویں صدی کے دوران وائکنگ باشندوں کی بحیرۂ بالٹک کے اطراف کے علاقوں میں بڑی ہی جابرانہ طاقت تھی۔ وہ جدید روس، جرمنی بلقان کے سلاوک علاقوں کے اندرونی حصوں میں دور تک حملے کرتے، غلاموں کو پکڑتے اور انہیں یہودیوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے۔ ان غلاموں کو ترک سلاطین نے اپنالیا یہ غلام مسلمان ہو گئے اسلام میں رچ بس گئے، غلامی سے اٹھے اکثر نے شاہی شہزادیوں سے بیاہ

کیا اور ترقی کرتے کرتے حکمران بن بیٹھے۔اس طرح اسلام کی ماورائی اوراعلی طاقت نے غلاموں کو بادشاہ بنادیا۔تیرھویں صدی عیسوی کے دوران مصراور ہندوستان پر مملوک یعنی غلام خاندانوں کی حکومت تھی ۔

بیبرس کی افواج کا، منگولوں ،صلیبیوں اور آرمینائیوں کی متحدہ طاقت سے ناز رتھ کے قریب عین جلوت کے مقام پر مقابلہ ہواستمبر 1261ء کو گھماسان جنگ چھڑ گئی۔مملوکوں کے بائیں بازو نے حملہ آوروں پر زبردست حملہ کیااورانہیں پیچھے دھکیل دیا۔لیکن منگولوں نے دائیں بازو پر پلٹ کرحملہ کیا،مملوک شش و پنج میں پڑ گئے ۔ جنرل بیبرس نے فوراً میدان سنبھالا اسلام کے دفاع کے لئے جنگی نعرے بلند ہونے لگے مسلمانوں نے مجاہدانہ حملے کئے دشمنوں کوشکست فاش ہوئی کتبوغا قتل ہوگیا۔۔آرمینیاء کا بادشاہ ہیٹون اورآنٹیوک کا بادشاہ بوہیمونڈ دونوں میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ۔منگولوں کا الپوتک پیچھا کر کے انہیں تباہ کردیا گیا۔مصر کے ساتھ ساتھ حجاز اور فلسطین دونوں بھی بچ گئے ۔منگولوں نے ایشیاء اور یوروپ کو جوتاریکیوں میں ڈبو رکھا تھا تباہیوں کے ان اندھیروں کا سلسلہ اب ٹوٹ گیا۔

عین جلوت یقیناً انسانی تاریخ کی ایک فیصلہ کن جنگ ہے۔اس کی اہمیت کا موازنہ 765ء کی جنگ طورس اور 1757ء کی جنگ پلاسی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ جنگ یوروشیا میں منگولوں کی آخری پہنچ کا ایک نشان ہے۔عین جلوت میں شکست کے ساتھ عیسائیت نے یروشلم کو پھر سے حاصل کرنے کی امید چھوڑ دی شام کی سرحد پران کی کچھ گرفت کی کوئی اہمیت باقی نہ رہ گئی۔آرمینائی کیا کسی پہاڑی سلسلوں میں اپنے ٹھکانوں کوواپس لوٹ گئے ۔اگرمملوکوں کوشکست ہوجاتی تو انکا انجام بھی بغداد جیسا ہی ہوتا، ہلال احمر کی جگہ صلیب لے لیتا،قاتل اور لیٹرے منگول شاید مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات پرحکومت کرر ہے ہوتے ۔

عین جلوت سے واپسی کے بعد بیبرس نے سلطان قطوز کومعزول کردیااور مقتول خلیفہ المعتصم کے ایک رشتہ دار کو قاہرہ آنے کی دعوت دی اور مصر میں پھر سے عباسی خلافت کو قائم کردیااس طرح سنی اسلام کا دنیاوی آستانہ برقرار رہا جسے 1517ء میں عثمانیہ ترکوں نے ختم کیا۔یہاں سے خلافت کے مستقر کو استنبول لے گئے۔

اڑتیسواں باب

غزان اعظم کا قبول اسلام

عین جلوت کی جنگ میں مملوکوں کی فتح نے منگولوں کی پیش قدمی پر روک لگا دی اس کے ساتھ ہی عیسائیت اور اسلام کے درمیان ایک نئی جدو جہد شروع ہوگئی۔ تیرھویں صدی عیسوی کے آخری تین دہے ایک ایسی جدو جہد سے عبارت ہیں جب کہ منگولوں کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کرنے کے لئے تگ ودو شروع ہوگئی یورو یشیاء کی جغرافیائی وسیاسی جدو جہد میں یہی عنصر غالب رہا۔

اس کھیل میں عیسائیت نے سب سے پہلے اپنا پانسہ پھینکا منگول حکمرانوں کو تبدیلیء مذہب پر آمادہ کرنے کے لئے انہوں نے کئی سفارتیں بھیجیں۔ 1245ء تا 1270ء عیسائی دنیا نے صلاح الدین کے ہاتھوں فلسطین کو کھودیا (1187ء) اور وہ اسے واپس حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شکست کے جذبہ نے انہیں اس جوش سے بھر دیا کہ منگولوں کو عیسائی بنایا جائے۔ منگول جو کہ اہل کتاب نہیں تھے ان کی خدمت میں عیسائی بیویاں پیش کی گئیں، صرف ان کی ایک نگاہ التفات حاصل کی خاطر۔ منگول سردار ہلاکو کی سب سے اہم ترین بیوی دوکوز خاتون عیسائی تھی، شہنشاہ پولیوگوس (paleologus) نے اپنی بیٹی میری کو دلہن کی شکل میں ہلاکو خان کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن میری کے منگول دربار پہنچتے پہنچتے تک 1265ء میں ہلاکو مرگیا۔ اس لئے اس کے بیٹے اباغا نے اس سے شادی کرلی جسکی حکومت 1265ء تا 1281ء تک رہی۔

خود منگولوں کے درمیان بھی اندرونی طور پر رسہ کشی چل رہی تھی۔ روس کے خانوں یعنی سرداروں نے

اسلام قبول کرلیا تھا اور اس طرح روس کے مسلم خان اور فارس کے بے شمار خداؤں کے پرستار خان کے درمیان ایک رسہ کشی شروع ہوگئی۔ جورجیہ میں کرکی جنگ میں روسیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔لیکن اباغا کو اصل چیلنج مصر سے تھا۔مصر کے سلطان بیبرس نے عین جلوت کی جنگ میں اپنی فتح کے بعد حملہ آور آرمینیوں اور صلیبیوں کے خلاف ایک زبردست مہم چھیڑ دی۔شام صلیبیوں سے پاک ہوگیا اور شمالی عراق میں آرمینیا کو کئی شہروں سے ہاتھ دھونا پڑا۔بیبرس دشمن کا پیچھا کرتا ہی گیا اور آخر کار 1277ء میں ''ابولستن'' کے مقام پر منگولوں سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔ایک خوفناک جنگ کی ابتداء ہوگئی۔بیبرس کی فوج جذبہء ایمانی سے سرشار تھی وہ مسلمانوں کے ان کھوئے ہوئے اہم علاقوں کو ایک بار پھر واپس لینے کے لئے بے قرار تھے۔منگولوں کو شکست ہوئی اور ان کی آدھی فوج قتل ہوگئی۔اس کے دوسرے سال دمشق میں بیبرس کا انتقال ہوگیا اس کے انتقال کے بعد مصر میں وارث کے مسئلہ پر کچھ عرصہ کے لئے رسہ کشی رہی۔اباغا نے اس صورت حال کو ایک سنہری موقع جان کر مصر پر حملہ کردیا۔لیکن 1281ء میں حمس کی جنگ میں اسے شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اباغا بذات خود اس کے اپنے اعتراف کے مطابق مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔اس نے مصر پر حملہ کرنے کیلئے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی بات چیت آگے بڑھائی 1284ء میں اباغا مر گیا۔اس کا بیٹا تغادور الخان تخت پر بیٹھا۔حالانکہ عیسائیوں نے نکولس کے نام سے اسکا بپتسمہ (Baptesma) کردیا تھا۔لیکن تغادور نے عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا اپنا نام احمد رکھا۔شہزادہ احمد نے مصر کے مملوکوں سے دوستانہ تعلقات کا ہاتھ بڑھایا جسے انہوں نے قبول کرلیا۔اسکے باوجود، عیسائیوں، منگولوں اور مسلمانوں کے درمیان اس تکونی کشمکش کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا یہ رسہ کشی ابھی جاری تھی احمد کی اپنی فوج میں ہی کئی ایسے افراد تھے جو اسکے مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے خوش نہیں تھے۔ان ناراض افراد نے اسے تخت سے معزول کردیا اسکی جگہ اباغا کے ایک اور بیٹے ارغون کو تخت پر بٹھادیا۔

اپنے باپ اباغا کی طرح ارغون بھی مسلمانوں کا کٹر دشمن تھا۔اس نے مسلمانوں کے خلاف متحدہ حملہ کے لئے عیسائیوں بادشاہوں کے سامنے کئی تجاویز رکھیں۔لیکن ان تجاویز پر عمل درآمد ہونے سے پہلے ہی فلسطین میں عیسائیوں کے آخری مضبوط گڈھ عکرہ پر بھی مملوکوں نے قبضہ جمالیا۔اس شکست کے ساتھ ہی

مغربی ایشیاء میں صلیبیوں کی قسمت پر مہر لگ گئی۔1291ء میں ارغون مر گیا اور جانشین کے سوال پر رسہ کشی شروع ہوگئی۔

1295ء میں غزان خان الخانوں کے تخت پر بیٹھا اور اپنی مسلم شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔اس کے اسلام لانے کے ساتھ مسلمانوں نے وہ جنگ جیت لی جو کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان جاری تھی۔اسلام نے اس جنگ میں منگولوں کی روح پر فتح حاصل کرلی۔یہ فیصلہ کن فتح تھی ایک ایسی فتح جسکے بعد عیسائیت کو صرف اپنے مقام کی طرف ہی پیچھے ہٹنا تھا۔

غزانِ خان کی تخت نشینی کے باوجود مملوکوں اور الخانوں کے درمیان دشمنی میں کوئی کمی نہیں آئی۔شامی پہاڑی سلسلوں پر قبضہ کے لئے دونوں کے درمیان رسہ کشی شروع ہوگئی۔غزان نے کچھ عرصہ کے لئے دمشق پر قبضہ کرلیا،لیکن اب کی بار اسکا یہ قبضہ قرآن کے نام سے تھا۔لیکن آخرکار 1301ء مرجوع السفر کی جنگ میں مملوکوں کو فتح حاصل ہوئی۔شام کا ایران کی بجائے مصر کے ساتھ قریبی رشتہ برقرار رہا۔غزان کی فوجیں دریائے فرات کے مشرق میں پیچھے ہٹ گئیں۔

غزان تاریخ میں پہلے عظیم منگول خان کی حیثیت سے مشہور ہے یہ شہرت اسلئے ہے کہ اس نے گذشتہ صدی میں ہونے والی بربادیوں اور تباہیوں کے بعد ایران،عراق اور وسط ایشیاء میں تنظیمی اصلاحات نافذ کیں ان علاقوں کی ازسرنو تعمیر کی کوششیں کی۔وہ ایک خداترس اور ایک اچھے احساسات رکھنے والا حکمراں تھا عوام کے لگان میں کمی کی۔محصولات کے طریقہ کار میں اصلاحات کیں ڈاک کی بنیاد ڈالی،محکمہ انصاف کی ازسرنو تنظیم کی ان منگول ڈاکوؤں کو سخت سزائیں دیں جو کہ چنگیز خان کے زمانے سے نواحی بستیوں میں لوٹ مار مچا رہے تھے۔الخانی دور جو کہ چودہ مارچ 1302ء سے شروع ہوا ایرانی اور وسط ایشائی جمہورتیوں میں رفاہ عامہ کے نظم ونسق کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

غزان نے تبریز کو اپنا صدر مقام بنایا۔اس شہر کو اس دور کی بہترین عمارتوں سے سجایا۔چنگیز خان سے پہلے کے معماروں کی تعمیری وراثت کو استعمال کرتے ہوئے اس نے عالیشان جامع مسجد تعمیر کی کئی یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی۔یہاں تعلیم دینے کے لئے اس دور کے چوٹی کے علماء وفضلاء کو دعوت دی۔اس

نے راستے وشفا خانے بنوائے ایک رصدگاہ بھی تعمیر کی جو کہ دنیا کی بہترین رصدگاہوں میں سے ایک تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو خصوصیت کے ساتھ، عربی اور فارسی تعلیم حاصل کرنے والوں کو وظائف جاری کئے، علم ہندسہ فنکاری، فن تعمیر اور فارسی ادب پھلنے پھولنے لگے۔ فارس کے پہاڑی سلسلے ایک بار پھر اسلامی علوم کے مرکز بن گئے۔

غزان کا قبول اسلام مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سنگ راہ ہے۔ جہاں سے اسلام نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ ایک بار پھر مسلمان تاریخ ساز کردار ادا کرنے کی جانب گامزن ہو گئے۔ غزان کے قبول اسلام اور فارس میں اس کے اقتدار کی مضبوطی کے ساتھ ہی وسط ایشیاء اور بحیرۂ روم کی دنیا کے درمیان ایک جغرافیائی خط فاصل قائم ہو گیا۔ دریائے فرات کے کنارے اس کے حدود ٹھہرے جو دونوں کو دوسرے سے جدا کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسا کہ امین اور مامون خلفاء کے دور میں تھا۔ منگولوں کے حملوں سے پہلے پانچ سو سالوں تک عربی زبان اسلامی علوم حاصل کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی مغزن بنی رہی۔ اس دور کے عالم و فاضل چاہے وہ غزنی اور اندلس جیسے دور مقامات کے ہی کیوں نہ ہوں عربی زبان میں ہی لکھا کرتے تھے۔ چنگیز خان اور غزان اعظم کے درمیان پچھتر 75 سال کا فاصلہ تھا۔ 1218ء سے لے کر 1295ء تک کا یہ زمانہ انتہائی آزمائشی دور تھا جب کہ مسلمانوں کی قسمت معلق رہی۔ 1258ء میں بغداد کی شکست اس آزمائشی دور کا انتہائی نقطہ عروج تھا۔ غزان کے قبول اسلام سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ایک نئے زمانہ کی ابتداء ہوئی۔ اب عمل کا دائرہ عربی بولنے والوں سے منتقل ہو کر فارسی بولنے والے لوگوں کے ہاتھ آ گیا۔ منگول حملوں نے شہری آبادیوں کا مکمل صفایا کر دیا ان شہری آبادیوں کے ساتھ ہی عربی بولنے والوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ دیہی شیوخ جو اس قتل عام سے بچ رہے وہ فارسی زبان کے دلدادہ تھے۔

چودھویں صدی کے بعد فارسی مسلمانوں کی عوامی زبان بن گئی حالانکہ عربی کا استعمال عبادتوں میں ہوتا رہا۔ صوفیانہ درس کے استاذ رومیؒ، سعدیؒ، حافظؒ، جامیؒ جیسے شعراء اور محمد اقبالؒ جیسے جدید مصنف سبھوں نے فارسی میں لکھا۔ عثمانیہ ترکوں، صفویوں، مغلوں اور ہندوستان کے جنوب کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں، سبھوں کی درباری زبان فارسی تھی۔ صوفیانہ تصورات نے فارسی زبان کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

علاوہ اس کے جدید زبانیں جیسے کہ ترکی، اردو، پشتو، اور مالے زبانیں وغیرہ انہیں صوفیانہ اثرات کے زیر اثر پروان چڑھیں۔ یہ غیر عرب ایشیاء'' عجمی ایشیاء کے درمیان ہونے والے یہ تاریخی تجربات تھے الگ الگ طور سے ہونے والے یہ تجربات ایک بڑے اور واضح فرق کو نمایاں کرتے ہیں۔ جب کہ ایشیائی اثرات زیادہ تر روحانی ہیں تو مرکز عرب فقہ وشریعت پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ عربوں اور غیر عربوں کے یہ اپنے اپنے الگ الگ تاریخی تجربات ہیں۔ یہ الگ الگ تجربات شاید ان اختلافات یا کم فہمی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یا اس فرق کو واضح کرتے ہیں جو کہ آج کل امریکہ جیسے ملک میں نظر آرہے ہیں جہاں دنیا بھر کے مسلمان ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، اس جیسے ملک کے تصورات کی بھٹی میں اس وقت پک کر یہ نظریات دہک رہے ہیں۔

اسلام نے فاتحین کو فتح کیا ہے، منگول اپنے چچیرے بھائیوں ترکوں اور تاتاریوں کے ساتھ اسلامی پرچم کے علم بردار بنے اور آنے والی صدیوں میں اسلام کے پرچم کو ہندوستان، انڈونیشیا، ملائشیا اور افریقہ جیسے دور مقامات میں اسے لہرا دیا۔ لیکن یہ اسلام اس قادر مطلق اس بلند و برتر و ماورائی قوت سے اپنے تقرب ورسائی کے اعتبار سے کلاسیکی اسلامی دور کے اسلام سے الگ شناخت رکھتا ہے۔ یہ مذہبی رسومات سے زیادہ روحانیت پسند ہے۔ یہ زیادہ تر وجدانی ہے۔ مشاہداتی عنصر اس میں کم ہے اور یہ نئی سرزمینوں میں نئے ممالک میں اپنے دور کے اعلیٰ تر صوفیوں اور شیوخ کے ساتھ بڑے جوش سے در آیا۔

تلوار پر روح کی فتح

خلاصہ:

منگولوں کی بربادیوں نے اسلامی تہذیب کو بدل کے رکھ دیا -اموی اور عباسی دور کا وہ علمی، تجربی اور ظاہری شان وشوکت کا اسلام دور چلا گیا۔ اس کی جگہ ایک عوامی اسلام ابھرا جو کہ تصوف سے بہت ہی زیادہ متاثر تھا۔ روحانی سائنس نے جسمانی سائنس پر غلبہ پالیا،عظیم صوفی شیوخ ابھرے اور انہوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ وہ صوفی اسلام ہی تھا جسے عارفوں نے ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیاء، مشرقی یوروپ اور افریقہ میں صحارا کے نچلے علاقوں کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ لاکھوں لوگوں نے اس روحانی اسلام کو قبول کیا اور اسلامی دنیا کی مرکزی کشش اب قاہرہ اور دمشق سے لاہور، کلکتہ اور کولالمپور کی جانب منتقل ہوگئی۔

انچالیسواں باب

اولیائے کرام کی شاندار کامیابی

صوفی لفظ کا مطلب ہے تصوف پر چلنے والا، یہ لفظ عربی کے ''صوف'' سے ماخوذ ہے جسکا مطلب ہے خالص۔اس کا ایک دوسرا مطلب ''صوف''یعنی اون سے لیا گیا ہے۔آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات اون کی کمبل اوڑھتے تھے اس لئے صوف حضرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات مبارکہ سے قربت یا نسبت کو بھی کہا جاتا ہے اگر اور گہرائی سے تحقیق کی جائے تو یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس کے ضمنی یا پوشیدہ معنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چہتی بیٹی فاطمۃ الزہرہؓ سے بھی منسوب ہیں جنہوں نے اون سے کمبل بُنی تھی۔جس طرح ایک بننے والا اون کے دھاگے لیتا ہے اور ان سے عبادہ بنتا ہے اس طرح تصوف دنیاوی زندگی کے بکھرے ہوئے اجزاء سے ایک تقدس مآب عالمی نقطہءنظر کو ترتیب دیتا ہے۔صوفی اصطلاح میں ''حضرت فاطمہؓ کے اون بننے'' کے مخفی معنی ہیں روح کو خالص بنانا اسے پاکیزگی میں ڈھالنا،تصوف کا تیسرا مطلب ہے اہل الصّف،یعنی اعلیٰ درجہ کے انسان، وہ جنہوں نے اپنے آپ کو سب سے الگ برتر ثابت کیا اپنے کو خالص بنانے،عشق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوب جانے اور انسانیت کی بےلوث خدمت کے ذریعہ۔

تصوف اسلام کی ہی دین ہے اسی کے گود میں وہ پروان چڑھا، یہ بودھ یا یونانیوں سے مستعار نہیں لیا گیا جیسا کہ کچھ جدید مصنف دعویٰ کرتے ہیں۔صوفیوں کی اکثریت اپنی روحانیت کا سلسلہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے واسطے سے آقائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملاتے ہیں اور کچھ صوفیاءکرام اپنا سلسلہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جوڑتے ہیں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابو ذر الغفاریؓ جن کا انتقال 652ء میں ہوا ایک مشہور صوفی تھے۔ روزمرہ کی زبان میں تصوف کا مطلب ہے خدائے تعالیٰ کی محبت کا وجدانی و روحانی دونوں کا فوری اور ضروری علم رکھنا۔ صوفیائے کرام اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مسلسل ذکر سے بے لوث خدمت سے، جلال و جمال سے بھرپور بہترین شاعری کے ذریعہ سے الفت الٰہیہ کی شدت سے لبریز نغموں سے، وجد آفریں گیتوں سے، اللہ تعالیٰ کی لطف وعنایات کو حاصل کرنے، اس کی لو میں اس کی یاد میں گم ہو جانے کی شدید چاہت سے بھرے اشعار اور دنیا کے لذائذ سے اجتناب کے ذریعہ چاہے۔ یہ لفظ کہیں سے اخذ کیا گیا ہو سچ تو یہ ہے کہ تصوف اسلامی تاریخ میں ایک عظیم دریا کے مانند بہتا آیا ہے آس پاس کے وسیع علاقوں کو روحانیت کے مرغزاروں کی شادابی بخشتے ہوئے۔ سچائی و صداقت بھرے باغات میں تبدیل کرتے ہوئے مختلف قسم کی رکاوٹوں سے بھرپور اکثر اوقات اختلافات، بغض، جنگ وجدال اور خانہ جنگیوں سے معمور مسلمانوں کی تاریخ میں ''تصوف'' وہ واحد چشمہ ہے جس کے سوتے مسلمانوں کے تمام مسالک سے پھوٹ کر بہتے ہیں چاہے سنی ہو کہ شیعہ فاطمی ہو کہ زیدی یا کوئی اور ہو۔ شریعت اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تصوف ہی وہ واحد سیمابی آمیزش ہے جو کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو آپس میں پگھلا کر ایک ہی سانچہ میں ڈھالتی ہے۔

روحانیت اسلام سے پیدائشی اور جبلی طور پر وابستہ ہے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود روحانیت کے منبع و مرکز ہیں، ان کی یہ روحانی وراثت صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کو منتقل ہوئی۔ آنے والی نسلوں نے امانت کے اس سلسلے کو زندہ رکھا اسلام کی اولین صدیوں کے دوران جبکہ حکمران طبقہ میں دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی ہونے لگی تو علماء کے ایک طبقہ نے درباروں کی دنیا پرستی کے خلاف سخت برگشتگی کا اظہار کیا۔ حضرت حسن البصریؒ جن کا انتقال 728ء میں ہوا۔ حضرت رابعہ الاداویہؒ جن کا انتقال 802ء میں ہوا اور منصور الحاجؒ جن کا انتقال 922ء میں ہوا ابتدائی دور کے مشہور صوفیائے کرام ہیں۔ ویسے تصوف، ضبط نفس کی تعلیم کے ایک شعبہ کی حیثیت سے معاشرہ کے اندرون سے ایک ذیلی چشمہ بن کر بہتا تو رہا ہے لیکن گیارھویں صدی عیسوی تک آتے آتے ہی یہ اپنے آپ کو مکمل طور سے منوا نہ سکا تھا۔ اس کے برخلاف

آٹھویں اور نویں صدی عیسوی تک فقہ کے سائینس کو قانونی شکل میں مدون کر کے دستوری اساس دے دی گئی تھی اور حدیث کا سائینس بھی دسویں صدی عیسوی تک اپنی بنیادوں پر استوار ہو چکا تھا۔

گیارھویں بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران تاریخی دھارے سنگدلانہ حد تک صوفیوں کی موافقت میں بہتے رہے۔ الغزالیؒ جن کا انتقال 1111ء میں ہوا نے اپنی پر جوش تحریروں سے تصوف کو با عزت مقام بخشا اور اسے مکمل طور سے اسلام کے اصلی دھارے کے بہاؤ میں لے آئے۔ انہوں نے علمائے دین، فلسفہ دانوں اور فاطمیوں سے اس بارے میں بحث مباحثہ کیا اور ثابت کیا کہ تصوف ہی وہ واحد طریقہء کار ہے جس کے ذریعہ علم کی حقیقت کو پایا جاسکتا ہے۔ اپنی معرکتہ الاعلی تصنیف ''تحفظ الفلاسفہ'' میں انہوں نے علم کے حصول کے لئے فلسفیانہ رسائی کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کہا کہ یہ سچائی یا حقیقت کو پانے کا نامکمل طریقہ کار ہے، احیاء علوم الدین'' میں انہوں نے فاطمیوں کے مخفی یا باطنی رسائی کے خلاف دلائل پیش کئے تمام عیبوں سے پاک ایک ان دیکھے واحد امام کی تلاش کے خلاف بھی بحث کی اس رنگین دھنک کے دوسرے سرے پر علماء آیات کی بے لطف تشریح کے پیچھے پڑے رہے، اس کے روحانی اور مخفی مطالب کو سمجھے بغیر الغزالیؒ نے دلالت کی کہ روح کے پاک وصاف ہوکر روشن ومنور ہوجانے کے بعد ہی سچا علم حاصل ہوتا ہے جب منگولوں کی تباہیاں و بربادیاں عالم اسلام پر چھا گئیں تو اسی زمانے میں اسلامی دنیا میں تصوف کی جڑیں پھیل کر مضبوط ہوگئیں۔ چنگیز خان اور اس کے وارثین نے ایک تہذیب کو نیست و نابود کر دیا۔ بخارا، سمرقند، نیشاپور، حیرات اور بغداد جیسے علم کے مرکز ملبے کے ڈھیر بنا دیئے گئے۔ بخارا سے لیکر بغداد تک پھیلے اسلام کے تمام مرکزی علاقوں سے آبادیوں کو ختم کر دیا گیا۔ ابن کثیر کے مطابق صرف بغداد اور اس کے اطراف واکناف کے علاقوں میں دس لاکھ سے زیادہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ سارا علاقہ آبادیوں سے خالی ہوگیا۔ بڑے بڑے باندھ اور تالاب توڑ دیئے گئے۔ زراعت کا خاتمہ ہوگیا۔ شہر چراگاہیں بن گئے۔ کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک دی گئیں۔ لائبریریاں جلا کر خاک کر دی گئیں۔ مساجد کو مسمار کر دیا گیا، علماء فضلاء اور صاحب علم افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ کلاسیکی اسلامی تہذیب پر گہرا پردہ پڑ گیا۔

جب مسلمانوں کی سیاسی طاقت برباد کردی گئی اور تہذیب کا خاتمہ کردیا گیا تو اسلام نے اپنی توجہ اپنے باطنی وروحانی بنیادوں کی جانب مبذول کردی۔ وہ صوفیائے کرام ہی تھے جنھوں نے تیرہویں صدی عیسوی کے گھپ اندھیارے دور میں ایمان کی شمع روشن رکھی۔منگولوں نے مسلم حکمرانوں کوقتل کردیا، کتب خانوں کو برباد کیا۔علماء کوغلام بنایا لیکن ان کی تلوار صوفیوں کے دلوں کو چھو نہ سکی۔صوفیائے کرام ثابت قدم رہے انہوں نے عیسائیوں کے خلاف ایک زبردست روحانی جنگ لڑی اور ایران کے غزان اعظم کے 1295ء میں اسلام لانے کے ساتھ ہی اس جنگ کو جیت لیا۔چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں دور دراز کے مقامات میں ایمان کی یہ آگ مسلسل جلتی ہی رہی، ظلم، جبر وبربریت کے اندھیروں میں یہ مدھم روشنی سلگتی رہی جب تاریکی دور ہوگئی تو یہی چھوٹی سی آگ روشنی کے عظیم مینارے بن گئی۔توحید کے پیغام کو پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیاء اور مشرقی یوروپ تک پہنچا دیا۔یوروشیاء کے معاشرتی افق کو تغیر پذیر کیا، تبدیلی سے آشنا کیا۔دنیا کے اہم واقعات کو مکمل طور سے متاثر کیا۔اسلامی دنیا کے دور دراز مقامات کے کونے کونے میں ایک ہزار سالوں سے زیادہ عرصہ تک تصوف انسانی اصلاح کے لئے، معاشرتی اصلاح کے لئے ایک رہنما قوت بنا رہا۔علاوہ اس کے سیاسی تحریکوں کے لئے بھی کاٹ دار دھار کا کام دیتا رہا۔ ایک مہمیز کا کام سرانجام دیتا رہا۔آج اگر اسلامی دنیا کا کشش ثقل قاہرہ کی بہ نسبت سنگا پور سے قریب ہے تو اس کی وجہ سلاطین کی طاقت یا ملاؤں کے خطبات یا پند ونصائح نہیں بلکہ صوفی شیوخ کی روحانی رسائی قرب اور تقرب کی وجہ سے ہے۔

منگول سیلاب کا سامنا کرنے والی نسل میں نہ صرف اپنے وجود کو برقرار رکھنے کا استقلال باقی تھا۔ بلکہ ایمان کی خدمت کرنے اور اس کی اور زیادہ اشاعت کرنے کا عزم مصمم بھی تھا اس دور کے غیر معمولی ذہانت والے افراد نے روحانیت کو اپنے آپ کے اور اسلام کے اعلیٰ اقداروں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ہر طرف صوفی طریقہ جڑ پکڑنے لگا اور اس تاریک ترین وقت میں گھنے اندھیروں میں مسلمانوں کو اپنی زندگی بچانے کا ذریعہ بنا۔تاریخ پر ابدی نقوش چھوڑنے والے طریقوں میں اہم ترین طریقہ ان صوفیائے کرام کے ہیں۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جن کا انتقال بغداد میں 1166ء میں ہوا۔حضرت شیخ معین الدین

چشتیؒ جو اجمیر، ہند میں 1236ء میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ حضرت ضیاء الدین حاجب سہروردیؒ جن کا مصر میں 1258ء میں انتقال ہوا۔

جلال الدین رومیؒ جن کا ترکی میں 1273ء میں وصال ہوا اور خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ جنہوں نے بخارا میں 1386ء میں وفات پائی جیسے جید صوفیائے کرام اپنے طریقہ سے صدیوں تک نسلوں کی رہبری کرتے رہے۔ ابن العربی جن کا وصال 1240ء میں ہوا انہوں نے تقریباً اسی دور میں اسپین کو صوفی نظریات سے آشنا کرایا۔ قادریہ سلسلہ تو سارے اسلامی ممالک میں پھیل گیا اور مذہبی معاشرتی اور سیاسی تحریکوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ برصغیر ہند و پاک میں اسلام کی ترویج میں چشتی سلسلہ کا سب سے زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ابن العربیؒ کی تحریروں نے دنیا بھر میں تصوف کی نشو ونما پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔ مصر، شام، ملیشیاء، مشرقی افریقہ اور شمالی افریقہ میں شادھولیہ مسلک کو سرپرستی مل گئی۔

جلال الدین رومیؒ کے ماولاویہ طریقہ نے ترکی اور یوروپ کو متاثر کیا۔ اسلام کی قوتِ مدافعت نے منگول حملوں کے زبردست جھٹکوں کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ آخرکار خود منگولوں کو ہی اسلام قبول کرنے کی جانب راغب کرنے میں کامیاب رہا۔

ایک طرف تو تصوف شریعت اور سنت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اٹل اور ثابت قدم رہا۔ دوسری جانب یہی تصوف اسلامی روحانیت اور مقامی تہذیبوں کو آپس میں پگھلاتا رہا۔ باطنی بھٹی میں تپا تا رہا اس سے ایک عوامی اسلام ابھرا جو برصغیر ہند و پاک، انڈونیشیاء اور افریقہ کے اندرونی علاقوں میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گیا۔ اسلام کے روحانی طول وعرض اور گہرائی یعنی مکمل حجم کو جب تک سامنے رکھا نہیں جاتا اس وقت تک اس علاقہ کی تاریخ کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔

خاص وعام مسلمانوں کے صوفیت کی جانب حد درجہ جھکاؤ پر روک لگانے اور ان کی اصلاح کرنے کے لئے بھی جو بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کا خمیر بھی صوفیانہ افکار سے ہی بنا تھا۔ شام کے ابن تیمیہؒ جن کا انتقال 1326ء میں ہوا۔ ہندوستان کے احمد سرہندیؒ جن کی وفات 1615ء میں ہوئی۔ لیبیا کے محمد السانسوئی 1859ء میں جنہوں نے آخری سانس لی۔ اور سوڈان کے المہدیؒ جنہوں نے 1885ء میں

وفات پائی۔ ان تمام مصلحین کی اصلاحی تحریکیں آخرکار اور بنیادی طور پر صوفیانہ طرزِ فکر سے ہی اٹھی تھیں اسی سے ان کا خمیر بنا تھا۔

اولیائے کرام کی کامیابی کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے۔ وسطِ ایشیاء پر چنگیز خان کے حملے کے صرف پچیس سال پہلے یعنی 1292ء میں افغانیوں نے ہندوستان کو فتح کیا تھا۔ جب ہلاکو نے 1258ء میں بغداد تباہ و برباد کیا تو اس وقت اسلام نے انڈونیشیاء میں بس اپنا پہلا قدم ہی رکھا تھا۔ ہندوستان اور مشرق بعید میں جو اسلام داخل ہوا وہ علماء کے پند ونصائح آموز اسلام سے زیادہ صوفیوں کا روحانی اسلام تھا۔ صوفی تحریکوں نے خصوصیت کے ساتھ اسلام کے مشرقی حصہ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ وہ مشرق جسے آج ہم ایران، پاکستان، ترکی، وسط ایشیاء، ہندوستان، بنگلہ دیش، ملیشیاء، انڈونیشیاء کہتے ہیں۔ علاوہ اس کے مغربی افریقی کے وہ ممالک جو صحارا کے جنوب میں واقع ہیں۔ انہیں بھی ان تحریکوں نے بے حد متاثر کیا۔ 1261ء میں عین جلوت کی جنگ میں فتح کی وجہ سے عرب کے وہ مرکزی علاقے جو منگولوں کی تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رہے۔ ان علاقوں پر صوفیوں کا اثر کم رہا اور یہاں کے لوگ اس کلاسیکی اسلام کے زیادہ وفادار رہے جس میں شریعت اور سیاسی وراثت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چودہویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں عثمانیوں کے غازیانہ جوش وولولے میں (Bektashi) بیقتشیہ، نقشبندیہ اور قادریہ اثر نے نئی روح پھونک دی۔ عثمان دان فدویؒ جن کا انتقال 1817ء میں ہوا جنہوں نے مغربی افریقہ میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی وہ قادریہ صوفی مسلک کے ماننے والے تھے۔ عبدالقادر الجزائریؒ ایک قادریہ شیخ تھے۔ انہوں نے الجزائر پر فرانس کے قبضہ کے خلاف جدوجہد کی۔ 1840ء کے دوران شمالی کوچک پر رومیوں کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف شمائل داغستانیؒ نے جدوجہد کی۔ سینگال اور مالی میں فرانس کے قبضہ کے خلاف شیخ الحج تالؒ نے 1860ء میں جہد مسلسل کی۔ ابھی حال ہی میں یعنی 1911ء میں شمالی افریقہ پر اٹلی کے نوآبادیاتی حملوں کا سانسوئی تحریک نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

جدید دور میں بھی کئی غیر عرب اسلامی ممالک میں صوفی نظم وضبط نے قومی آزادی کی تحریکوں کے لئے

قائدفراہم کئے۔اس کی سب سے بڑی مثال ایشیائے کوچک کی ہے جہاں پورے ایک سوسالوں تک روسی تسلط کے خلاف نقشبندیہ نظم وضبط کے حلقہ والوں نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس کے برخلاف اٹھارویں صدی عیسوی کے دوران عرب میں وہابی تحریک کا نعرہ جنگ جویانہ تھا یہاں شریعت کی انتہائی سخت پابندی تھی۔مصراورالجیریاء کی جدیداسلامی تحریکیں شریعت اورسیاسی وراثت کے جذبہ سے بھری ہوئی ہیں۔

صوفیوں نے ہندوستان افریقہ اورانڈونیشیاء کوفتح کیااورمشرق کے مسلمانوں کی سیاست، زبان، فنکاری،موسیقی اورتہذیب وتمدن پراپنی گہری چھاپ چھوڑی۔صوفیوں کی روحانیت قدیم ایشیائی دماغ سے مکمل مطابقت رکھتی تھی۔ ہندواور بودھ دونوں ہی گروہ درگروہ اسلام کے دامنِ آغوش میں داخل ہوئے۔اس طرح محمودغزنوی یا علاؤالدین خلجی کے برخلاف اجمیر کے خواجہ معین الدینؒ پنجاب کے حضرت بابا فریدالدینؒ، دکن کے حضرت خواجہ قطب الدینؒ اوردہلی کے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے برصغیر ہند پر پائیدار اور گہرا اثر چھوڑا۔انڈونیشیائی بدھ ازم کے ریاضت وزہد نے صوفیانہ اسلام کو ملاؤں کے کتابی علم کے خطبات سے زیادہ قابل قبول پایا۔افریقہ کی مظاہر پرست روح نے تصوف کے ڈھول کی دھن پررقص شروع کیااورلاکھوں کی تعداد میں اسلام کی آغوش میں شامل ہوگئے۔

سیاست،موسیقی،تہذیب وتمدن کے میدان میں آگے چل کرپیش آنے والی صورت حال پرتصوف نے کم گہرااثرنہیں چھوڑا۔صفوی شاہی سلسلہ کی ابتداءصوفی تحریک سے ہی ہوئی۔مغل شہنشاہ بابرصوفیت کا دلدادہ تھا اور یہ بات اس کے بابرنامہ سے صاف ظاہر ہوجاتی ہے۔عثمانیہ خاندان کے اولین سلاطین ''غازیٔ روم'' کہلاتے تھے۔ یہ نقشبندیہ سلسلے کے پیرو تھے۔مغل شہنشاہ اکبراور جہانگیر حضرت خواجہ سلیم چشتیؒ کے انتہائی عقیدتمند پیروکار تھے۔چشتیوں اورنقشبندیوں نے ہندوستانی موسیقی پر بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ انہوں نے حمدیہ نغموں کلاسیکی راگوں کے ملن سے موسیقی کونئی سمتیں عطا کیں جوکہ قوالی،نعت،حمداورغزل گوئی کے طرز سے صاف ظاہر ہے۔حضرت شیخ جلال الدین رومیؒ کی آفاقی صلاحیتوں کا شاید سب سے بڑااعتراف یہ ہے کہ آج شمالی امریکہ میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مصنف وہی ہیں۔

اس کی تاریخی کامیابیوں کے باوجود،علم کے فقدان کی وجہ سے صوفیانہ طرزفکر کے غلط استعمال کی

راہیں کھل گئیں۔اٹھارویں صدی عیسوی کے دوران مسلم معاشرہ میں عام سیاسی وتمدنی انحطاط کی وجہ سے روحانیت اوراخلاقیات زوال پذیر ہوگئے۔جس طرح مذہب روحانیت کے بغیر زوال پذیر ہوکر صرف ظاہری رسومات کا ایک پلندہ بن کر رہ جاتا ہے اسی طرح روحانیت شریعت کے بغیر انحطاط کا شکار ہوکر صرف انانیت اور وحدالوجود کا چربہ بن کر رہ جاتی ہے۔روحانی طریقہ سے وابستہ اس کمزوری کی وجہ سے اس کو کئی تحریکوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔مثلاً عرب کی وہابی تحریک اور اٹھارویں صدی عیسوی میں ہی دہلی ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ کی تحریک فرانس کے لوگوں نے اسی کمزوری کا فائدہ ٹھاتے ہوئے بیسویں صدی عیسوی کے دوران شمالی افریقہ میں کئی غلط از کار صوفی طریقوں کو رواج دیا تاکہ فرانسیسی نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑنے والے مسلمانوں میں انتشار پیدا کیا جاسکے۔لیکن یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ تصوف کے غلط استعمال کی اصل وجہ مسلمانوں کا سیاسی ومعاشرتی تنزلی اور بگاڑ تھا۔ تصوف کے ناجائز اور غلط استعمال کے باوجود اسلامی تعلیمات کی رنگارنگ دھنک میں رنگ بھرنے والے تصوف کو انحراف یا کجروی کہہ کر ردنہیں کیا جاسکتا۔ اگر اسلامی تاریخ کے مختلف جہتوں کو سمجھنا ہوتو صوفیانہ طرزفکر کو اسلامی سرگرمیوں کا مرکزی دھارا ماننا ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ آٹھ سو سالوں سے یہ اسلامی تحریک کا اہم ترین طریقۂ کار اور طرزفکر رہا ہے۔

تصوف وہ اثر آفرین قوت ہے جس نے انتہائی نازک وقت میں اسلام کو کنارے لگایا۔منگولوں کی روح کو فتح کیا، اسلام کے ازلی وابدی پیغام کو ایشیاء، افریقہ اور یوروپ کے اندرونی حصوں میں دور دور تک انتہائی شدت سے پہنچایا۔آج لااوریت زدہ تہذیب دنیا کے سامنے جو چیلنج پیش کررہی ہے، اس کا جواب مسلمانوں کو اسلام کی روحانیت میں تلاش کرنا ضروری ہے۔

چالیسواں باب

ہندوستان اور پاکستان کے صوفیائے کرام

برصغیر ہندو پاک کے فلسفی شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کے الفاظ میں

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

اسلام ایک غبارہ کی طرح ہے۔ایک طرف اسے دبائیے وہ دوسری جانب ابھر آتا ہے۔چنگیز خان کے بعد ایک سوسالوں کے اندر ہی اسلام نے فاتحین کو فتح کرلیا۔وہ منگول جنہوں نے بخارا سے بغداد تک سب کچھ تباہ و برباد کرڈالا تھا خود اس نئے مذہب کا ہراول دستہ بن گئے۔مغرب کی جانب اسلام کی پیش قدمی اسے یوروپ تک لے گئی۔مشرق میں ہندوستان اور انڈونیشیاء میں اسلام نے نئی جڑوں کی آبیاری کی۔اسلام کا کششِ ثقل قاہرہ اور دمشق سے اب لاہور اور کوالالمپور کو منتقل ہوگیا۔

711ء میں محمد بن قاسم نے جب سندھ فتح کیا تھا تو اسوقت سے لے کر آگے آنے والے پانچ سو سالوں تک ہندوستان اور بغداد کی خلافت کی سرحدوں کے درمیان عموماً خموشی سی چھائی رہی۔برصغیر میں اسلام نے مالبار کے ساحل اور جنوبی پاکستان میں صرف محدود دراندازی کی تھی۔اس دور تک اسلام ایک متوازن سطح کی بلندی پر پہنچ چکا تھا لیکن اب اپنے اندرونی مناظرے اور بیرونی خطرات سے گھرا ہوا تھا۔تقریباً دوسوسالوں تک فاطمی بادشاہوں نے سندھ اور ملتان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔عالمگیر سطح پر اسلام ایک

طرف فاطمی سنی رسہ کشی میں الجھا ہوا تھا تو دوسری جانب مسلم صلیبی معرکہ آرائی میں یہی وجہ تھی کہ اسلام کی اشاعت دوسرے مقام پر ہی رہی۔اس کی جانب ضروری توجہ نہیں دی جاسکی۔

بارہویں صدی عیسوی کے دوران 1171ء میں قاہرہ میں فاطمی خلافت کے خاتمہ 1186ء میں جنگ حطین میں صلیبیوں کی شکست اور 1186ء میں ہی محمد غوری کی دہلی کی فتح کے ساتھ ہی یہ صورت بدل گئی اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران برصغیر میں اسلام کی پیش رفت میں تیزی آ گئی۔اس کے کئی اسباب بیان کئے جاسکتے ہیں۔اولین تو یہ کہ دہلی میں سلطنت کے قائم ہو جانے سے علماء اور سوداگروں کو سیاسی اقتدار کے زیر سایہ ملک بھر میں آزادانہ گھومنے پھرنے کا موقع مل گیا۔دوسرے منگولوں کے ان حملوں کی وجہ سے جنہوں نے وسطِ ایشیاء اور ایران کو تباہ و برباد کر دیا۔کئی مشہور علماء وفضلاء بھاگ کر ہندوستان کی محفوظ پناہ میں آنے لگے۔تیسرے اور شاید سب سے اہم ترین وجہ برصغیر میں صوفی سلسلوں کا جاری ہونا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اسلام ہندوستان اور پاکستان میں نہ تو فاتحین کی طاقت سے پھیلا اور نہ ہی ملاؤں اور قاضیوں کے طویل مباحثوں سے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صوفی شیوخ کی ان تھک جدوجہد سے ہی یہاں اسلام کی روشنی پھیلی۔ اس لحاظ سے مسلم ہندوستان ان عرب ممالک سے الگ ہے جہاں اسلام کی بنیاد کلاسیکی اسلام پر رہی اور 665ء سے لے کر 1258ء تک ان عرب ممالک میں محدثین اور مجاہدین کی کوششوں سے اسلام پھیلا۔

مذہب جس طریقۂ کار سے ایمان لانے والوں کے دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے اس کی گہری چھاپ ان کے قلوب پر جس طرح پڑتی ہے یہی اثر آفرینی یہی چھاپ ان کی طرز زندگی سے صاف ظاہر ہوتی ہے جس طرح وہ مذہب کی محبت کو محسوس کرتے ہیں اسکے اصولوں کے مطابق زندگی گذارتے ہیں جس سے انکی زندگی عبارت ہوتی ہے۔تبدیلی مذہب کا اصل مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔عربوں کے تجربہ کے مطابق اسلامی طرز زندگی بغداد کی خلافت کے شاہی دور کے دوران استوار ہوئی اس کا جھکاؤ حد سے زیادہ مذہب کے خارجی یا ظاہری پہلو کی جانب تھا۔اس کے برخلاف برصغیر ہندوپاک، انڈونیشیاء اور افریقہ کے باشندے باطنی اور روحانی اسلام سے زیادہ روشناس ہوئے۔

تیرہویں صدی عیسوی کے صوفی شیوخ عیسائی مبلغوں کی طرح نہ تھے۔ وہ ایمان کے سوداگر نہ تھے کہ گلی گلی مذہب کو بیچا کرتے۔ وہ تو اللہ کے عشق میں مخمور تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ دنیاوی فائدے کے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ انسانیت کی خدمت کرتے۔ اس خدمت کے دوران قوم وملت میں امتیاز نہ کرتے جو کوئی بھی ان کے قریب آ جاتا اس کے ساتھ اپنے روحانی خزانے کو آپس میں تقسیم کرتے۔ ان کی منزل یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کرتے۔ بلکہ قلوب کی تبدیلی تو اس خدمت کا ایک ذیلی حصہ تھا اصل مدعا نہیں۔ صوفیانہ فکر انسانی طرز عمل میں تبدیلی لانے کی طرف اپنی اپنی کوششوں کو مرکوز کرنا ہے۔ وہ انسانی تنگ نظری کو وسعت دے کر اسے ابدی امن کی جانب لے جاتا ہے وہ ابدی وسرمدی امن جو کہ صرف اور صرف خدائے تعالیٰ کی قربت سے ہی ملتا ہے۔ انسانوں کے قلوب کی یہ تبدیلی ہی ان کی اصلی کرامتیں تھیں۔ مسلمانوں کو بھی اسی روحانیت کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کہ ہندوؤں اور بودھوں کو۔ جب کوئی مسلمانوں کے کسی صوفی کے ذریعہ اپنے روحانی مقام کو پالیتا ہے تو اسے ''بصیرت آ گاہی'' کہا جاتا ہے۔ جب ایک غیر مسلم اس مقام کو حاصل کر لیتا تو اسے تبدیلی قلب کہا جاتا ہے۔

ہندوستان جسکا معاشرتی ڈھانچہ ذات پات کی تقسیم کا مضبوط گڑھ تھا، اسلام جیسے آفاقی مذہب کو اپنانے کے لئے تیار تھا۔ بنیادی طور پر ہندو معاشرہ میں انسان کا مقام اسکی پیدائش سے طے ہو جاتا ہے جس ذات میں وہ پیدا ہوتا ہے وہی اسکا مقدر ہوتی ہے اس کے مطابق وہ اعلیٰ یا ادنیٰ بنتا ہے۔ برہمنوں نے منتروں کے جاپ اور بھگوان کی رضا جوئی صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ جنگجو راجپوت طبقہ کے لئے شاہانہ مراعات مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ اس صورت حال کو برقرار رکھنے میں راجپوت برہمنوں کا برابر ساتھ دے رہے تھے۔ ویشاء زمین میں ہل چلاتے اور لگان ادا کرتے۔ معاشرہ کی اس سیڑھی میں سب سے نیچے شودر تھے جو کہ اچھوت تھے۔ ہندوستان کے ایک مشہور مصنف وی.ٹی راج شیکھر نے لکھا ہے ''ان اچھوتوں کو عوامی کنوؤں سے پانی لینا ممنوع تھا۔ وہ دوسری جگہوں پر ملنے والے کسی بھی قسم کے گندے پانی کو پینے پر مجبور تھے۔ جن مدارس میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے بچے بڑھتے تھے ان مدارس میں

اچھوتوں کے بچے کو داخلہ نہیں ملتا تھا حالانکہ وہ ہندوٗ خداوٗں کی ہی پوجا کرتے تھے لیکن مندروں کے تمام دروازے ان پر بند تھے۔ حجام اور دھوبی تک انکا کام نہیں کرتے تھے۔ ذاتیلے ہندو جو کہ چونٹیوں کے لئے شکر ڈالتے، کتے اور جانور پالتے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنے گھروں میں خوشامد کہتے وہی ہندو اچھوتوں کو ایک قطرہ پانی کا پلانے سے انکار کرتے اور ان سے رتی برابر بھی ہمدردی نہیں جتاتے۔ یہی اعلیٰ درجہ کے ہندو ان اچھوت ہندوٗں کے ساتھ غیر انسانی اور انسانیت سے گرا ہوا، جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے تھے۔ ایسے معاشرتی ڈھانچے یا پیمانے میں اسلام کا پیغام آیا آپسی بھائی چارگی پر زور دیتے ہوئے مساوات کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اعلیٰ وارفع ہونے کے پیغام کو اپنے جلو میں لئے ہوئے اور اس پیغام کا کھلے دل سے استقبال ہوا۔

صوفیوں کی کامیابی کا سب سے اہم ترین سبب ہے، ہندوستانی دماغ کا روحانیت کی جانب جھکاؤ، ہر ایک تمدن اپنا ہی ایک معیار تراش لیتا ہے جو کہ اس تمدن کی روایات واخلاقیات کو مجسّم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج کے امریکہ میں ایک تاجر وہاں کے روایات واخلاقیات کا معیار ہے۔ یوروپ کا معیار اپنے صنعتی انقلاب کے دور میں مشاہدہ کرنے والا اور موجد تھا اسی یوروپ کے تاریک دور میں وہی معیار راہب تھا تو قرون وسطیٰ کے جاپان میں ''سمورائی'' تھا ادھر مسلم مشرق وسطیٰ میں روایت پسند اور ہندوستان میں سادھو اور رشی تھا۔ گوتم بدھ نے اس معیار کو بلند کیا۔ شنکر آچاریہ اور تلسی داس نے بھی یہی کیا۔ مختلف مذاہب کے ان لوگوں نے وہ عزت پائی وہ شرف حاصل کیا جو کہ بادشاہوں کے لئے بھی باعث رشک ہے۔ برصغیر میں جب اسلام داخل ہوا تو اس نے بھی وہی طریقۂ کار اختیار کیا جو اس روحانی گردان پر صادق آسکے۔ ہندوستان کی نبض کو ٹھیک ٹھیک پہچان کر وجدانی اور فوری طور سے صوفیائے کرام نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیا جو کہ اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ صاحب قانون دان بھی نہ کرسکتے تھے۔ اس طرح ان عظیم صوفیوں نے لاکھوں ہندوستانیوں کو اسلام سے آشنا کرایا۔ انہوں نے الگ ہی ایک انوکھی پہچان والے ہندوستانی تمدن، زبان، شاعری اور موسیقی کو پروان چڑھایا جو کہ قدیم ہندوستانی تہذیبی سرمایہ اور اسلام کی مرتعش وسرشار موجوں کا ایک سیمابی مرکب تھا۔

برصغیر ہندو پاک کے عظیم صوفی شیوخ میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ہے۔ سچ تو ہے کہ انہیں ہندو پاک میں اسلامی روحانی تحریک کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1139ء میں وسط ایشیاء کے ایک مقام سجستان میں خواجہؒ کا جنم ہوا۔ آپ بارہ سال کی عمر میں ہی یتیم ہو گئے۔ یہاں سے آپ نے سمرقند کا سفر کیا اور اس دور کے اعلیٰ ترین تعلیمی مراکز میں تعلیم حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں حافظ قرآن بنے، عربی، فارسی و ترکی زبانوں پر مکمل عبور حاصل کیا۔ پھر آپ نے نیشاپور کا سفر کیا اور حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ہاتھ بیعت کی۔ پورے سات سالوں تک چشتیہ سلسلے کے طریقہ کار کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خواجہ معین الدینؒ کو اس سلسلہ کے حلقہ میں داخل کر لیا گیا۔ نیشاپور سے آپ بغداد کی جانب روانہ ہوئے۔ یہاں اس دور کی انتہائی قدر آور شخصیتوں سے انکی ملاقات ہوئی جن میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ، حضرت خواجہ اوحاذ الدین کرمانیؒ اور حضرت خواجہ ابوسعید تبریزیؒ شامل ہیں۔ اصفہان میں آپ کی ملاقات حضرت شیخ قطب الدینؒ سے ہوئی۔ جنہوں نے آپکے ہاتھ بیعت کی آگے چل کر دہلی کی ولایت ان کو عطا کی گئی۔ اصفہان سے حضرت خواجہ معین الدینؒ نے غزنی، لاہور اور ملتان تک کا سفر کیا یہاں انہوں نے سنسکرت اور ہندی زبان میں مہارت حاصل کی تاکہ مقامی لوگوں سے بات چیت میں آسانی ہو سکے۔

یہی وہ وقت تھا جبکہ محمد غوری نے 1192ء میں جنگ ترائن میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دی اور دہلی و اجمیر کو سلطنت غوریہ میں شامل کر لیا۔ حضرت خواجہ معینؒ نے ملتان سے دلی کا سفر کیا وہاں سے اجمیر جا بسے جو کہ چوہان شہنشاہیت کا صدر مقام تھا۔ ریگستان کے صحراؤں میں آباد یہ شہر صوفی تحریک کا مرکز بن گیا جو ہندو پاک کے کونے کونے تک پہنچ گئی۔ آپ کی کوششوں سے ہزاروں نے اسلام قبول کیا۔ آپ کے مریدوں کی جدوجہد سے لاکھوں نے اسلام کے پیغام پر لبیک کہا۔ ان کے تین مرید تو خود عظمت کے مینار بنے اور عظیم صوفیوں کے سلسلے کو جاری رکھنے والی شخصیتوں میں آپ کا نام انتہائی قدر آور ہے۔

یہ تین مریدین ہیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی کا قطب مینار جن کے نام سے رکھا گیا ہے۔ حضرت شیخ حمید الدین ناگوریؒ اور لاہور کے بابا فرید گنجؒ، خواجہ اجمیری پھر ایک ہی مرتبہ دہلی واپس

گئے ،سلطان شمس الدین التمش دہلی کا سلطان تھا۔ جب خواجہ دہلی پہنچے تو سلطان خود انکے حضور آیا اور سونے چاندی اور زیورات کے انبار آپ کی خدمت پیش کئے ۔خواجہؒ نے ان تحائف کو نرمی سے واپس کر دیا۔ اسلامی تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے جبکہ شہنشاہوں نے دولت کے انبار بصد اصرار پیش کئے تو عظیم صوفیائے کرام نے انہیں حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔صوفیائے کرام کا تصور اس دنیاوی سونے چاندی جواہرات سے پرے کچھ اور اعلیٰ تر منزل سے معمور تھا۔ انہوں نے دنیا کو ٹھکرا دیا اس لئے دنیا نے انکا پیچھا کیا۔ان کی نظر تو جنت کی حکمرانی پر تھی ۔ ابدی ، ماورائی شاہی خاندانوں کے عروج وزوال کے سائے سے پرے۔ یہی وہ بےلوث بے غرض نقطۂ نظر تھا جس نے انہیں عوام کا چہیتا بنا دیا۔ایک ایسی چیز جسے حکمران حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن حاصل کر نہیں پاتے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ ایک مشہور شاعر بھی تھے، دس ہزار سے زیادہ فارسی اشعار آپکے نام گرامی سے منسوب ہیں۔وہ ایک ایسے مصنف تھے جنہوں نے کثرت سے لکھا۔لیکن افسوس کہ ان کی اکثر تحریریں ضائع ہوگئیں۔ان کا انتقال 1236ء میں ہوا وہ ایک باعث احترام مقدس، قابل صد تحسین موت تھی۔ ہندوستان و پاک میں اسلام کا تعارف کروانے کے علاوہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی قوم کی تعمیر کرنے کا سہرا اگر کسی کے سر جاتا ہے تو وہ اجمیر کے خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شخصیت ہے۔

صوفیائے کرام صرف اس لئے کامیاب نہیں ہوئے کہ وہ ذکر کرتے تھے۔حمدیہ نغمے الاپتے تھے۔ رحم دل ومخیرّ تھے، بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اسلام کی اشاعت کے مقصد کے لئے اس کے تسلسل کے لئے ضروری ادارہ سازی کی تکمیل کر لی تھی۔ تا کہ ان کے انتقال کے بعد بھی یہ کام جاری رہے۔صوفی طریقۂ کار کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ ایک خداترس استاذ ہی ایک سچے شاگرد کو علم منتقل کر سکتا ہے اور اس کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔صوفی ترتیب کا ڈھانچہ ایک اہرام کی طرح ہے۔اس صوفی اہرام کا مرکز ''قطب''، ''ولی'' یا ان کے سجادہ نشین اور خلیفہ ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر قادریہ سلسلے کے قطب ہیں۔بغداد کے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ۔

صوفی مسلک کے طریقہ کار یا تقرب کو طریقت کہتے ہیں۔صوفیانہ مسلک میں تصوف کا درس

رضا کارانہ طور سے دیا جاتا ہے۔ اپنی خوشی سے کوئی بھی مرید بن سکتا ہے۔ لفظ مرید عربی لفظ ارادۃ سے اخذ شدہ ہے جس کا مطلب ہے خواہش یا مرضی، مرید وہ ہوتا ہے جو خدائے تعالیٰ کی قربت کا آرزومند اور طلب گار ہوتا ہے اور اس کا جھکاؤ عشق حقیقی کی جانب ہوتا ہے۔ راہ طریقت میں مرید کے درجات دھیرے دھیرے بلند ہوتے رہتے ہیں۔ ابتداء طالب یا مبتدی سے ہوتی ہے پھر متدرّج یعنی عمل کرنے والا بنتا ہے اسکے بعد شیخ یا استاد کا درجہ پاتا ہے اور آخر کار قطب کے آخری مقام پر فائز ہوتا ہے۔ قطب کا مطلب ہے مینار، رہبری کرنے والا، راہ دکھلانے والا- الگ الگ طریقوں کے الگ الگ اندرونی مطالب ہوتے ہیں۔ مرید سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے استاد کی حد درجہ فرمانبرداری کرے اور نظم وضبط کا بے انتہاء پابند ہو۔ ایک شخص بیک وقت مختلف سلسلوں سے ربط وضبط رکھ سکتا ہے لیکن کسی ایک سلسلے کی پاسداری کو احسن مانا جاتا ہے۔

مرید کی پیش رفت درجات یا مقامات سے ہوتی ہے اور یہ درجات ہیں توبہ، زہد، فقر، صبر، توکل علی اللہ اور رضائے الٰہی۔ اس طرح صوفی مسالک ایک باقاعدہ تنظیمی ڈھانچے کو ترتیب دیتے ہیں جہاں باقاعدہ طریقۂ کار اور نظم وضبط سے تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے والوں کی پیش رفت کو ناپنے کے علاوہ انہیں قدم بہ قدم، درجہ بدرجہ علم الیقین کی جانب لے جایا جاتا ہے۔

صوفیانہ طرز پر چلنے والے جس جگہ پر آپس میں ملتے ہیں اسے زاویہ کہا جاتا ہے۔ ذکر اور مطالعہ کی جگہ کو حلقہ کہا جاتا ہے۔ اسی دور میں سارے عالم اسلام میں ایسے زاویہ اور حلقے قائم ہوگئے۔ صوفی مسالک اور ان کی تنظیموں نے سلسلوں کے ذریعہ اپنے تسلسل کو برقرار رکھا اسی سلسلے کے ذریعہ صوفیائے کرام اپنے اساتذہ یا ولی کے ذریعہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی فیوض وبرکات حاصل کرتے ہیں۔ صوفیانہ تنظیم کا اعلیٰ منصب ہے قطب کے درجہ پر فائز ہونا۔ اپنی زندگی کے آخری وقت میں یہ اپنا جانشین مقرر کردیتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا سلسلۂ مبارک حضرت سید محمد غوث سندھیؒ (1482ء) نے پندرہویں صدی میں ہندو پاک میں جاری کیا۔ حالانکہ چشتیہ سلسلہ کی بہ نسبت یہاں قادریہ سلسلہ کا اثر کم ہی ہے لیکن سارے برصغیر میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام نامی انتہائی عزت واحترام سے لیا

جاتا ہے۔انہیں عموماً پیرانِ پیر دستگیر یا غوث الاعظمؒ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔قادریہ سلسلے کے مشہور شیخ حضرت میاں پیرؒ ہیں جن کا انتقال 1635ء میں لاہور میں ہوا۔آپ مغل شہنشاہ شاہجہاں کے سب سے بڑے بیٹے دارالشکوہ کے استاد تھے۔دارالشکوہ بذاتِ خود ایک بلند پایہ عالم تھا۔اس نے حضرت میاں پیرؒ کی سوانح عمری لکھی ہے۔پنجاب اور کشمیر کے دیہی علاقوں میں اسلام پھیلانے کا سہرا حضرت میاں پیرؒ کے سر باندھا جاتا ہے۔

چشتیہ سلسلہ اجمیر سے دہلی، پنجاب، بنگال اور دکن کے علاقوں میں پھیل گیا۔حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے لوگوں کی تربیت کی انہیں برصغیر کے دور دراز علاقوں میں روانہ کیا۔یہ لوگ ان علاقوں میں روحانیت کی عظیم شخصیتیں قرار پائیں۔خواجہ بختیار کاکیؒ جن کا دہلی میں انتقال 1236ء میں ہوا پنجاب کے بابا فریدؒ جن کا پاک پٹن میں انتقال 1265ء میں ہوا حضرت نظام الدین اولیاءؒ جنہوں نے دہلی میں 1325ء میں وفات پائی۔یہ بابا فریدؒ کے مرید تھے۔حضرت نظام الدین محمودؒ جنہیں عام طور سے چراغ دہلوی کہا جاتا ہے جن کا دہلی میں 1356ء میں انتقال ہوا۔یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔حضرت گیسودرازؒ یہ چراغِ دہلوی کے مرید تھے ان کا انتقال 1422ء میں ہوا۔ان جیسی بہت ساری ہستیاں خواجہ معین چشتیؒ کی بدولت پروان پانے والوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ان تمام شخصیتوں نے اپنی کوششوں سے براعظم کی کایا پلٹ دی اسے اسلام کے ایک فولادی سانچے میں ڈھال دیا۔لاکھوں افراد کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کردی۔دنیا کی ان مالدارترین اور طاقتورترین حکومتوں میں سے ایک جنہیں دنیا نے دیکھا ہے ایسی عظیم الشان شاہی خاندان کی روحانی بنیاد اسی سلسلے نے رکھی جسے ہندوستان کے عظیم مغل کہا جاتا ہے۔

چشتیہ سلسلے کی تاریخ دہلی کے درباروں کی سیاست سے بڑی گہرائی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اس قدر کہ ہندوستان کی تاریخ کا کوئی بھی جائزہ اس وقت تک نامکمل ہوگا جب تک کہ چشتیہ سلسلے کے گہرے اثر کا تذکرہ نہ کیا جائے۔مغلیہ خاندان کا پہلا شہنشاہ بابر بذاتِ خود ایک صوفی عارف تھا۔ شہنشاہ اکبر شیخ سلیم چشتیؒ 1572ء میں جن کا فتح پور سیکری میں انتقال ہوا کا مرید تھا۔اکبر ہر سال شیخ سلیم چشتیؒ اور خواجہ معین الدین چشتی

ؒ اجمیری کے درباروں میں ننگے پاؤں چل کر زیارت کے لئے حاضری دیتا۔ شہنشاہ جہانگیر، شاہجہاں اور اس کا بیٹا داراشکوہ ان شیوخ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ گذشتہ ایک ہزار سالوں سے صوفیوں کے طریقۂ کار میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اسی لئے چشتیہ سلسلہ اور اس کے ہم عصر قادریہ وسہروردیہ سلسلے جدید اسلام اور قرونِ وسطیٰ کے درمیان ایک تہذیبی کڑی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ ان صوفیائے عظام کی تاریخ پڑھنے سے آج دنیا میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو خواجہ معین الدینؒ نے دلی کی ولایت عنایت کی تھی۔ ان کی پیدائش ترکستان میں ہوئی۔ بغداد میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کی ملاقات خواجہ معین الدینؒ سے ہوئی اور وہ انکے مرید ہوگئے جب خواجہ معین الدینؒ اجمیر میں قیام پذیر ہوگئے تو بختیار کاکیؒ نے بھی اجمیر کی راہ اختیار کی وہاں سے انہیں چشتیہ سلسلے کے سفیر کی حیثیت سے دہلی بھیجا گیا۔ دہلی شہر سیاسی اقتدار کا مرکز تھا اور سیاسی رسہ کشی کی ایک دہکتی بھٹی بنا ہوا تھا۔ سلطان التمش نے انہیں دہلی کے قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ لیکن بختیار کاکیؒ نے اسے ٹھکرا دیا انہوں نے حکومتی اقتدار کے بندھنوں میں جکڑے جانے کی بجائے روحانی مدارج کو آزادی کے ساتھ طے کرنے کو ترجیح دی۔ سلطان تصوف کا دیوانہ تھا۔ صوفی طریقوں کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور عام طور سے اسے قبول کیا جاتا تھا۔ حضرت شیخ بختیارؒ بذات خود ایک مشہور و معروف اور عشقِ حقیقی میں ڈوب جانے والے قوال تھے۔ اکثر محفلِ سماع سجایا کرتے اس عظیم عارف شیخ کی کاوشوں سے ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا۔ حضرت شیخ بختیارؒ نے 1236ء میں رحلت فرمائی۔ ان کے بعد چشتیہ سلسلے کی ولادت حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کو ملی۔

ہندوستان کے افق پر تصوف جب ایک طاقت و رقوت بن کر ابھرنے لگا تو اسے بھی کئی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چودھویں صدی عیسوی کے دوران دلی کے درباروں نے صوفیوں، مصلحوں، قاضیوں، فلاسفروں اور حکمرانوں کے درمیان رسہ کشی دیکھی۔ اس دور کی جغرافیائی سیاست نے دلی کے درباروں میں افکار کی جنگ کے لئے ایک رنگین پس منظر تیار کیا تھا۔

چودھویں صدی کے درمیان تک افریقہ، یوروپ، مشرق وسطیٰ وسطِ ایشیاء اور چین کے لئے تمام

تجارتی شاہراہیں پھر سے کھول دی گئیں۔ یہ راستے منگول حملوں کی وجہ سے بند ہو گئے تھے۔غزانِ اعظم کے 1295ء اسلام لانے کی وجہ سے ایران ایک بار پھر اسلام کی آغوش میں آ گیا۔اس کی وجہ سے ہندوستان سے مشرق وسطیٰ اور وہاں سے آنے اورافریقہ واسپین کی جانب جانے والی راہوں میں جو رکاوٹیں تھیں وہ دور ہوگئیں ازسرنوقوتِ نمو پانے والے اسلام نے دنیا کے نظام کوایک دوسرے سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا جہاں لوگوں کے علاوہ مختلف علاقوں کے نظریات بھی نہایت آزادی کے ساتھ ایک بر اعظم سے دوسرے براعظم کا سفر کرتے تھے۔

اس دوران مسلم دنیا میں سیاسی اقتدار کے تین مراکز ابھرے، پہلا مرکز افریقہ میں دولت مند مالی حکومت کا تھا جو موسیٰ مانسا کے زیرحکومت اپنے عروج کے بام پر پہنچی۔دوسرا مرکز وہ سلطنت تھی جو مصر اور شام پر محیط تھی،تیسرا اورسب سے طاقتور مرکز تھا دہلی کے سلاطین کی حکومت اس زمانے میں یون چین ایک عالمی طاقت تھی لیکن ہم بیجنگ اور دہلی کے سفارتی تعلقات کی حد تک ہی اس کا تذکرہ کریں گے۔خلجیوں نے 1296ء سے لے کر 1316ء تک سارے ہندوستان کو فتح کرلیا۔ان کی حکومت کی سرحدیں پشاور سے لے کر ملابار تک پھیلی ہوئی تھیں جو کہ پندرہ لاکھ مربع میل سے زیادہ پر محیط تھی۔تغلق جو خلجیوں کے جانشین بنے وہ اس وسیع حکومت کے وارث بھی تھے۔ یہاں ہم محمد بن تغلق کے دربار پر زیادہ توجہ مرکوز کریں گے۔اس لئے کہ ابن بطوطہ کی تحریروں سے اس کی شخصیت پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ابن بطوطہ جو کہ 1335ء سے 1341ء تک دہلی کا قاضی رہا وہ لکھتا ہے'' دہلی کی سلطنت اس قدر مالدار تھی کہ جب بھی شہنشاہ دہلی کی راہوں سے گذرتا تو اس کے پیچھے پیچھے آنے والے درباری ان راہوں میں سونے چاندی کے سکے لٹاتے رہتے تاکہ عوام انہیں چن لیں۔دہلی کے اسی شان وشوکت بھرے دربار میں صوفیوں اوران کے مخالفین حکماء، وکلاء اور حکومت کے امراء کے درمیان رسہ کشی کے آخری مناظرے ہوئے۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔اس لئے کہ چودھویں صدی عیسوی میں جو واقعات گذرے انہوں نے آگے آنے والے تاریخی واقعات پر سیدھے اثر ڈالا، اس کے اثرات آج تک ہمارے اس موجودہ دور کی تبدیلیوں میں بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

منگولوں کی بربادیوں نے وسط ایشیاء اور ایران سے بے شمار صاحب علم اصحاب کو ہندوستان ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ایک سیلاب کی طرح ان صاحب علم صوفیوں کی آمد نے ہندوستان اور پاکستان میں روحانی تحریک کو قوت عطا کی جس کی وجہ سے یہاں اسلام کی اشاعت میں تیزی آئی۔لیکن یہ ہجرت صرف صوفیوں اور درویشوں تک محدود نہ تھی۔ علماء اور قاضیوں کی ایک بڑی تعداد بھی بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہوئی۔ یہ لوگ ہندوستان میں مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ کچھ اور علماء اور قاضیوں نے انڈونیشیا کے جزائر کی جانب ہجرت کی۔

دہلی کے سلاطین کی بڑی تمنا تھی کہ اپنے آپ کو اسلام کا محافظ ثابت کریں۔انہوں نے ان ہجرت کر کے آنے والے علماء کو فراخدلی کے ساتھ ملازمت فراہم کی۔علاوہ اس کے ان سلاطین نے عالم اسلام کے دور دراز علاقوں میں اپنے سفیر بھیجے تا کہ مزید مشہور علماء، قاضیوں اور حکماء کو تلاش کر کے ہندوستان لے آئیں۔اور ہندوستان کی سلطنت سرکاری طور پر ان سے استفادہ حاصل کر سکے۔ایک طرف صوفیوں کی موجودگی جو اسلام کی باطنی اور روحانی پہنچ میں سرگرداں تھے، تو دوسری طرف قاضیوں کی موجودگی جو فقہ کو انتہائی سختی سے نافذ کرنے پر مصر تھے۔اس وجہ سے دلی کے درباروں میں کافی کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔قانون کے ماہرین سلطنت پر اپنے طریقے سے اثر انداز ہونے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے تا کہ حکومت میں شریعت کی پابندی سختی کے ساتھ نافذ ہو۔انہیں صوفیوں کے چند طریقوں پر سخت اعتراض تھا۔مثلاً سماع پر وہ معترض تھے انہوں نے دہلی کے درباروں پر دباؤ ڈالا کہ ان محفلوں پر پابندی عائد کر دی جائے۔

اس دور کی ایک اصلاحی تحریک نے کشیدگی میں ایک دوسرے عنصر کا اضافہ کیا۔موجودہ دور کی طرح تیرہویں صدی عیسوی میں بھی اصلاح کے ایسے ہی علمبردار تھے جنہوں نے سوچا کہ ممکن ہے کہ تصوف معاشرہ کو جمود کی جانب لے جائے۔

اس دور کے ایک مشہور مصلح دمشق کے ابن تیمیہؒ تھے جن کا انتقال 1326ء میں ہوا۔ابن تیمیہؒ اسلامی کلاسیکی دور کے ان علماء کی آخری کڑی میں سے ایک تھے جنہوں نے آخرت کی دنیا کی فکر سے بھرپور تصوف میں معاشرہ کے زوال کے بیج بوئے جاتے دیکھا۔انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ایک شکست

خوردہ قوم میں از سرِ نو توانائی بھرنے کی کوشش کی۔ وہ قوم جو منگولوں کے حملوں کے تحت کراہ رہی تھی۔ اس قوم میں انہوں نے بیداری کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ ان کا نمونہ اسلام اولین صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ تھا۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے انہوں نے مملوکوں کو ابھارا کہ وہ منگولوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ابن تیمیہؒ کے نظریات پھیلتے پھیلتے دہلی تک بھی آن پہنچے جہاں انہیں طاقتور چشتیہ مسلک کی تحریک کا سامنا تھا۔

کشیدگی کا تیسرا عنصر تھا معتزلہ فلسفہ کی موجودگی آٹھویں صدی عیسوی کے دوران اسلام پر یونانی نظریات کے اثرات کی وجہ سے معتزلیوں کو عروج حاصل ہوا۔ انہوں نے عباسیوں کی سرپرستی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں ان کے عقائد دربار کا عقیدہ بن گئے۔ سرکاری سرپرستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معتزلی اپنی حدود سے آگے نکل گئے۔ انہوں نے فلسفیانہ عقائد کو قرآن پر ثبت کیا۔ اسی وجہ سے انہی قدامت پرست علماء کے غیض وغضب کا شکار ہونا پڑا۔ آخرکار نویں صدی عیسوی کی ابتداء میں انہیں اقتدار سے بے دخل کر دیا گیا۔ لیکن ان کے فلسفہ کا اثر مسلمانوں سے ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسلامی دنیا فلاسفر سائنسدانوں کی ایک چمکدار کہکشاں کو تخلیق کرتی رہی ہے۔ یہ عمل منگولوں کے حملوں تک جاری رہا۔ ان میں سے مشہور ترین یہ ہیں۔ الخوارزمی (انتقال 863ء)، الفارابی (انتقال 950ء)، ابو علی سینا (انتقال 1037ء)، عمر خیام (انتقال 1132ء)، اور الطّوسی (انتقال 1274ء)۔ بارہویں صدی عیسوی کے دوران مغرب کے عظیم فلسفی ابن رشد نے ارسطو پر اپنا تبصرہ لکھا۔ تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کے دوران چند فلسفی عالم فاضل شخصیتوں نے ہندوستان کی جانب ہجرت کی۔ دہلی کے درباروں میں انہوں نے استقبالیہ ماحول پایا۔ شیخ الماد الدینؒ انہیں قابل قدر فلسفیوں میں ایک تھے۔ جو ہندوستان آئے اس دور کے فلسفی بھی چشتیہ مسلک کی صوفی تحریک کے خلاف میدان میں اتر آئے۔

وہ تغلق شہنشاہوں کا دور تھا۔ جبکہ صوفی تحریک نے علماء، فلسفیوں اور مطلق العنان بادشاہوں کی متحدہ طاقت سے سیدھی سیدھی ٹکر لی۔ علماء اور قاضیوں نے سماع کو قانون شریعت کے خلاف ٹھہرایا۔ اس پر پابندی عائد کرنے کی مانگ کی۔ دہلی کے سلطان غیاث الدین تغلق نے اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لئے ایک کانفرس بلائی۔ 1320ء میں بادشاہ کے دربار میں مشہور علماء، قاضی اور فلسفہ دان جمع ہوئے۔ حضرت

نظام الدین اولیاءؒ کو بھی دعوت دی گئی۔ جو بات ایک کانفرنس سے شروع ہوئی وہ چشتیہ صوفیوں کے کورٹ مارشل تک جا پہنچی۔ دہلی کے چیف قاضی، قاضی جلال الدین اور شیخ زادہ جام نے سماع کے خلاف تاویلات پیش کیں۔

نظام الدین اولیاءؒ نے حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اس رسم کا دفاع کیا۔ بحث میں گرما گرمی آ گئی۔ اس لئے سلطان نے شیخ الماد الدین کی طرف رخ کیا۔ وہ معتزلی تھے۔ انہوں نے ایران، عراق، شام اور مصر میں دور دور تک سفر کیا تھا۔ شیخ الماد الدین نے جواب دیا سماع ان کے لئے حلال ہے جو دل سے سنتے ہیں اور ان کے لئے حرام ہے جو نفس سے سنتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے بھی قاضی جلال الدین کا ہی ساتھ دیا اور شہنشاہ سے مانگ کی کہ سماع پر پابندی عائد کر دی جائے۔ شہنشاہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ وہ ایک مذہبی مسئلہ میں اپنے آپ کو پھنسانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک اختلافی فیصلہ سنایا۔ چشتیہ مسلک کے لئے سماع جائز قرار دیا۔ قلندریہ اور حیدری سلسلے کے لئے ناجائز اس زمانے تک قلندریہ اور حیدریہ سلسلوں نے ابھی ہندوستان میں پوری طرح جگہ نہیں بنائی تھی۔ اس طرح انکے خلاف فیصلہ دینے سے شہنشاہ کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔

1325ء میں غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوا۔ صوفیوں اور قاضیوں وفلاسفروں کے درمیان محمد بن تغلق (انتقال 1351ء) کے دربار میں بھی رسہ کشی ہوتی رہی۔ محمد بن تغلق اپنے دور کا انتہائی باصلاحیت حکمران تھا۔ وہ تاریخ کے طلباء کے لئے ایک معمہ تھا وہ عالم، حافظ قرآن، فقہ کو اچھی طرح جاننے والا، پنجگانہ نمازی، روزہ دار اور باقاعدگی سے زکوٰۃ ادا کرنے والا بادشاہ تھا۔ خلفائے راشدین کی طرح اس نے بھی غیر مسلمین سے عزت و شرف کا سلوک روا رکھا، تمام رعایا پر صرف منصفانہ ٹیکس عاید کیا لیکن وہ بڑا تند رو تھا بہت جلد غصہ میں آ جاتا۔ اپنے مخالفین کو برداشت نہیں کر پاتا، جو اس کی راہ کا روڑا بنتے انہیں وہ انتہائی سختی سے سزا دیتا۔ محمد بن تغلق پہلا بادشاہ تھا جس نے یہ محسوس کیا کہ دور دراز فاصلہ پر واقع دہلی سے برصغیر پر حکومت کرنا مشکل ہے۔ اس نے صدر مقام کو ہندوستان کے مرکزی کشش ثقل پر واقع دولت آباد منتقل کیا۔ یہ دکن کے کنارے واقع دولت آباد جدید ممبئی شہر سے ایک سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اپنے شاندار آرام دہ حویلیوں میں رہنے والے امراء نے جب آنا کانی کی تو اس نے انہیں نئے مقام کو منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ہندوستان میں پورے پانچ سالوں تک برسات نہ ہونے کی وجہ سے قحط شروع ہوگیا۔ تغلق آباد میں پانی نہ رہا۔ محمد بن تغلق کو ایک بار پھر واپس اپنے دربار اور لاؤ لشکر کے ساتھ دہلی واپس لوٹنا پڑا۔

تغلق دور ہی میں دکن سب سے پہلے اسلام سے آشنا ہوا اس کے بعد خلجی دور میں اس نے رفتار پکڑ لی اسی دور میں دکنی زبان کی ابتدا ہوئی جس سے جدید اردو زبان نے جنم لیا۔ چین کے قبلائی خان (1294ء میں انتقال) کے نظریہ کو مستعار لیتے ہوئے۔ محمد بن تغلق نے چمڑے کے سکے جاری کئے۔ یہ ایک دور رس نظریہ تھا۔ اس کا مقصد تجارت کو فروغ دینا تھا۔ یہ تجارت سونے اور چاندی کی کمی کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھی۔ لیکن چالباز ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں نے جعلی سکے ڈھال لئے اس طرح اس تدبیر کو ناکام کر دیا۔ تغلق کو یہ سکے واپس لینے پڑے۔ اس کی وجہ سے سرکاری خزانے پر بھاری بوجھ پڑا۔ ویسے ہمیں اس دور میں محمد بن تغلق کے علماء، قاضیوں اور صوفیوں کے ساتھ باہم دیگر عمل اور کشمکش آرائی سے مطلب ہے اس لئے کہ یہی وہ آپسی عمل ورد عمل ہے جس نے آنے والی صدیوں میں اسلام کی صورت متعین کی۔

ہم طاقتور چشتیہ تحریک کی جانب واپس آتے ہیں۔ 1235ء میں شیخ بابا فرید گنج خواجہ قطب الدینؒ کے جانشین بنے۔ منگولوں کی تباہیوں کے دوران ان کے آباء واجداد نے کابل کو ہجرت کی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ہدایت کے مطابق حضرت بابا فریدؒ نے مغربی پنجاب کی جانب ہجرت کی۔ پنجاب یعنی آج کے پاکستان میں اسلام کے تعارف کا اولین سہرا اگر کسی کے سر جاتا ہے تو وہ بابا فریدؒ ہیں۔ انکی پارسائی، خلوص، سچائی اور لگن کو دیکھ کر ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کیا ان اسلام قبول کرنے والوں میں راجپوت قبائل بھی شامل تھے۔ بابا فریدؒ فقہ کے ماہر تھے۔ عربی اور فارسی کے مشہور شاعر بھی تھے۔ اس برصغیر میں پھلنے پھولنے والے صابریہ اور نظامیہ طریقے کی کڑیاں چشتیہ سلسلہ سے ہی جاملتی ہیں۔ ان کی ابتداء بابا فریدؒ سے ہوئی۔ انہوں نے کئی اساتذہ کی تربیت کی اور انہیں ہندوستان و پاکستان کے مختلف مقامات پر روانہ کیا۔ ان میں مشہور ترین یہ ہیں۔ شیخ جمالؒ ہانسوی، امام الحقؒ سیالکوٹی معصوم علاء الدین صابرؒ سہارنپور، شیخ منتقدین دکن اور سب سے اہم ترین حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی۔ بابا فریدؒ نے ''اسرار الاولیاء'' لکھی۔ یہ صوفیانہ نظریات اور دستور کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

1257ء میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو چشتیہ سلسلے کی قیادت کی ولایت ملی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ہندوستانی عوام اور دہلی کے سلاطین کے دل جیت لئے۔ ایسا کام کسی اور صوفی سے نہ ہوسکا۔ سچ تو یہ ہے کہ انکا وہ دور ہندوستان میں صوفی تحریک کے بامِ عروج کا دور تھا۔ وہ حدیث کے ماہر تھے، روحانیت کا سرچشمہ تھے، بہترین انداز سے بحث کرنے کا فن جانتے تھے۔ انہوں نے درس وتدریس کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا تھا۔ روایت ہے کہ کسی بھی وقت دہلی کے باہر موجود ان کے زاویہ میں بیک وقت تین ہزار طلباء اور دوسو قوال شامل ہوا کرتے تھے۔ شیخ حسن الدین ملتانیؒ دکن کے شیخ برہان الدین غریبؒ، گجرات کے شیخ یعقوب پٹنیؒ، سراج الدین عثمانیؒ اور پانی پت کے بوعلی قلندرؒ ان کے مشہور طلباء میں سے تھے۔ عظیم شاعر حضرت امیر خسروؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے۔

اس وقت تک چشتیہ سلسلے اور سلاطین دہلی کے درمیان اچھے تعلقات برقرار تھے۔ سلاطین اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ صوفیائے کرام کی عوام پر گرفت مضبوط ہے۔ اسی لئے وہ ان صوفیاء کرام کی ایک نظرِ کرم کے طالب رہا کرتے تھے۔ خلجی خاندان کے برسراقتدار آتے ہی (1296ء سے لے کر 1316ء تک) دہلی کے سلاطین نے پورے برصغیر پر مکمل فتح حاصل کرلی۔ ان کی حکومت جنوبی جزیرہ نما کے آخری کونے تک قائم ہوگئی۔ علاؤالدین اس فتح کا معمار تھا۔ اس کا مزاج سیکولر تھا۔ لیکن وہ صوفیائے کرام کی طاقت سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے اس نے ان سے اچھے تعلقات کو مضبوط کیا۔ علاؤالدین نے بذاتِ خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ایک پیغام روانہ کیا۔ ان سے ملاقات کی تمنا کی۔ علاؤالدین کا جواب حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سنا تو تاریخ کا وہ مشہور جملہ کہا۔ ''میری جھونپڑی میں دو دروازے ہیں ایک سے آؤ گے تو میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤنگا''۔ علاؤالدین کے بعد دہلی میں کچھ عرصہ کے لئے بدامنی چھائی رہی۔ اس کا خاتمہ تغلق خاندان کے برسراقتدار آنے پر ختم ہوا جنکا دور حکومت 1316ء تا 1351ء تک رہا۔

1325ء میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا انتقال ہوا۔ انہوں نے حضرت مخدوم ناصر الدین محمودؒ کو اپنی ولایت عطا کی تھی- وہ ان کے جانشین بنے۔ آپ کو چراغِ دہلی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اسی سال سلطان محمد بن تغلق دہلی کے تخت پر بیٹھا۔اس نے صوفیوں کی گرفت کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ انہیں بیکار محض کاموں میں الجھانے کے لئے ان کو سرکاری ملازمتیں اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چراغ دہلی کو یہ حکم دیا کہ وہ بادشاہ کو شاہی لباس پہنانے میں مدد کیا کریں۔اس کا مطلب تھا بادشاہ کے حکم کی بجاآوری اوراس کی بے دام غلامی۔ جب ولی کے روحانی آقا نے اس سے انکار کیا تو انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا۔دوسروں کو دہلی سے باہر جانے پر مجبور کردیا۔مثال کے طور پر شیخ شمس الدین یحییٰؒ کو کشمیر کی جانب جانا پڑا۔شیخ شہاب الدینؒ کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بادشاہ کی غلامی اختیار کریں۔جب باعمل شیخ نے انکار کیا توان کی ڈاڑھی نوچ لی گئی۔دہلی کے قاضی کمال الدین کی جانب سے ان کے خلاف فتویٰ جاری کروایا اور آخرکار انہیں شہید کردیا۔دہلی صوفی آقاؤں سے خالی ہوگئی سوائے چند ایک کہ جو یا تو عمر رسیدہ تھے یا سرکاری پابندیوں سے گھرے تھے۔

محمد بن تغلق نے اپنی جوانی فلسفیوں کے درمیان گذاری تھی اور ایک معتزلی کی حیثیت سے اس کی تربیت ہوئی تھی۔خصوصیت کے ساتھ شیخ المادالدین سے وہ بہت متاثر تھا جو کہ اس دور کا مشہور فلسفی تھا۔ اس کا ٹھکانہ دلی بنی ہوئی تھی۔اس نے شام کا سفر کیا،دمشق کے ابن تیمیہؒ(انتقال 1326ء) سے ملاقات کی۔ان کی اصلاحی تحریک اور صوفی مخالف نظریات کو اپنے میں جذب کرلیا۔محمد بن تغلق اپنے معتزلہ نظریات کی حد تک بغداد کے ہارون رشید سے ملتا جلتا تھا لیکن ہارون الرشید جیسی دانائی اور فراست اس میں نہیں تھی۔جس طرح ہارون کے جانشینوں نے معتزلہ مخالفین کو سزائیں دی تھیں،محمد بن تغلق نے بھی بالکل ویسا ہی کیا۔ ویسی ہی سزائیں انہیں دیں۔

اسلامی تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ وہ فلسفی جنہیں اپنے مخالفین کے حق سب سے زیادہ روادار ہونا چاہئے تھا۔وہی فلسفی دان سب سے زیادہ ''بےصبرو برداشت نہ کرنے والے'' ثابت ہوئے۔انہیں تاریخ پراثر انداز ہونے کے دو مواقع حاصل ہوئے تھے۔پہلی مرتبہ عباسیہ دور کے اولین برسوں میں 800ء کے آس پاس دوسری مرتبہ ہندوستان میں طاقتور تغلق شاہی سلسلے کے دوران 1330ء کے آس پاس دونوں ہی مرتبہ وہ بہت بری طرح ناکام ہوئے اور اپنے مخالفین کے ساتھ انتہائی بربریت کا برتاؤ کیا اور ان کی آواز کو

دبایا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ نے انہیں مسترد کر دیا۔ان کا رول گھٹ کر اسلامی سیاسی ڈھانچے کا ایک گھیرا بن کر رہ گیا۔ان کے افکار فلسفہ اور امت مسلمہ دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئے۔

محمد بن تغلق نے 1335ء میں وفات پائی۔تاریخ نے اس کو بے وقوف سلطان قرار دیا۔صوفیوں کا وجود باقی رہا۔ پھلا اور پھولا کیونکہ ان کی حکومت تو اللہ تعالیٰ کی حکومت تھی جسے زمانے کے اونچ نیچ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کے ترانے الاپتے تھے اور لوگ ان کی دھن پر رقص کرتے تھے، انہوں نے اپنے آپ کو انسانیت کے لئے وقف کر دیا،حق وانصاف کے لئے جدوجہد کرتے رہے،اسی راہ میں اکثر انہوں نے اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔علماء اور قاضیوں کو شکست ہوئی کیونکہ وہ بادشاہ کے نوکر تھے اور انہیں اس ملازمت سے جب چاہے نکالا جا سکتا تھا۔آزادی کے باوجود انہیں سرکاری طبقہ کا دست راست سمجھا جاتا تھا۔فلسفہ دانوں نے جو ظلم اور بربریت بھرے طریقۂ کار کو اپنایا اسی کی وجہ سے وہ مات کھا گئے۔ وہ ختم نہ ہونے والے بحث ومباحثہ کے بھنور میں پھنس کر رہ گئے۔قرآن کی قربت حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی حدود سے آگے بڑھ گئے، یہ موضوع ان کے طریقۂ کار کی رسائی سے پرے تھا۔ اسلام جو زندہ رہا وہ صوفیانہ اسلام تھا، باطن کی طرف رجوع کرتے ہوئے روحانیت سے بھرپور، جہاں جہاں اس نے قدم رکھا وہاں کی تہذیب وتمدن کو اپنے ہی ایک الگ رنگ میں ڈبو لیا۔وہ کلاسیکل اسلام سے رنگ اور طریقہ میں الگ تھا وہ کلاسیکل اسلام 1258ء میں بغداد کے تباہ ہونے تک برقرار رہا تھا جبکہ صوفیانہ طرز اسلام مشاہداتی تھا۔زندگی کی حرارت سے بھرپور تھا، باطن کے ساتھ خارج پر بھی بھرپور نظر رکھنے والا تھا۔اسے اندرون کی بھی خبر تھی اور باہر کی بھی۔ تیرہویں صدی عیسوی کے بعد صوفی اسلام کی قسمت میں ہی مسلمانوں کی تاریخ کو نئی شکل عطا کرنا لکھا تھا۔

اکتالیسواں باب

ابن بطوطہ کی رحلہ

انسانیت کی وہ آفاقی روح جو بے قرار رہتی ہے، تلاش کرنے، سیکھنے اپنے تجربات کو دستاویزی شکل دینے اور دوسروں کو سکھلانے کے لئے، انسانیت کی وہی روح ابن بطوطہ میں مجسم ہوگئی تھی۔اس کی پیدائش 1304ء میں مراقش کے شہر تیانجیر میں ہوئی۔ اکیس سال کی کم عمری میں ہی وہ حج کے لئے نکل پڑا پھر مکہ سے وہ دنیا کی سیر کے چل نکلا۔اس دوران پورے پچیس سال تک وہ سفر کرتا رہا۔اس دور کے تہذیب وتمدن کے تمام بڑے مراکز سے اس کا گذر رہوا اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن بطوطہ ان گنے چنے عظیم ترین مہم جواور تلاش پسند افراد میں سے ایک ہے جنہیں دنیا جانتی ہے۔ جیسے کہ چھٹی صدی عیسوی کے چین کا قان پان بارہویں صدی عیسوی کے اسپین کا ابن جبیر تیرہویں صدی عیسوی میں وینیس کا مارکو پولو۔

ابن بطوطہ کی اہمیت اسکے سفر نامہ ''رحلہ'' میں پوشیدہ ہے اس کے ذریعہ ہمیں چودھویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا کا ایک بہترین جائزہ مل جاتا ہے۔اس دور کی دنیا میں طاقت کے دوسرے مراکز اور علاقائی طاقتوں کے ساتھ ان کے روابط کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ابن بطوطہ نے اس دور کی مشہور شخصیتوں سے ذاتی طور پر ملاقات کی وہ شخصیتیں جنہوں نے تاریخ پر گہرا اثر چھوڑا ہے،ان سے اس کی گفتگو رہی مغرب کے ابن خلدون ،شام کے ابن تیمیہؒ،عراق ،فارس کے سلطان ابوسعید،مشرقی افریقہ کے

سلطان نورالدین علی، عثمانیہ سلطنت کے سلطان اورخان، ہندوستان کے سلطان محمد بن تغلق، انڈونیشیاء کے سلطان علی ظاہر، چین کے شہنشاہ توغون تیمور، مالی کے مانسا سلیمان اور علاوہ ان کے اس دور کے مشہور صوفی شیوخ سے بھی ابن بطوطہ نے ملاقاتیں کیں۔ ان شخصیتوں کے بارے میں اس کے تاثرات سے اس دور کے انقلاب آفریں شخصیتوں اور دہشت وخوف بپا کرنے والوں کے متعلق انمول معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس زمانے کے رسم ورواج سماجی اقدار، معاشروں کے دستور وغیرہ کے بارے میں وہ لکھتا گیا جس جگہ کا بھی اس نے سفر کیا وہاں کے متعلق اپنے تاثرات کو وہ قلمبند کرتا گیا۔ اس طرح اس زمانے کے حالات وغیرہ کے بارے میں اس کی تحریریں اولین اور بہترین معلومات کرتی ہیں۔ اس وقت کی مسلم دنیا میں موجود معاشرتی وتہذیبی اکائی اور مختلف رنگارنگی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔

چودھویں عیسوی کے پہلے آدھے حصے کے دوران دنیا میں تقریباً امن تھا۔ صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ منگولوں کا قتل عام ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ مغرب میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار تھا۔ المحد ث شاہی خاندان ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ اس کی جگہ مغرب میں چار مختلف قوتوں نے لے لی تھی۔ مراقش میں مرینی، الجیریا میں ودیدی، تیونیسیہ میں حفصی اور غرناطہ میں ناصری عروج پر تھے۔ ان سلاطین اور کیسٹلے وآراگاں کی عیسائی حکومتوں کے درمیان کافی حد تک امن برقرار تھا۔ طاقت کے اس توازن کی وجہ سے آبنائے جبل الطارق جہاز رانی کے لئے کھلا ہوا تھا۔ وینیس اور جنیوا کے جہاز اس آبنائے سے گذر کر فرانس اور برطانیہ کے مغربی ساحلوں سے تجارت کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں اٹلی کے دولت مند شہروں نے نشاۃ ثانیہ کے پہلے دور کی اولین لہر کو محسوس کیا، مصر شام وحجاز مصر کے مملوکوں کے زیر اقتدار تھے۔ جنہوں نے منگولوں کو شکست دے کر اسلامی دنیا میں ایک باوقار مقام حاصل کیا تھا۔ اس سے بڑھ کر بغداد کی تباہی کے بعد قاہرہ خلافت کا مرکز بن گیا۔ یمن کے ذریعہ ہندوستان اور چین کے ساتھ تجارت کی وجہ سے قاہرہ اور دمشق عالمی درجہ کے شہر بن گئے فارس ایک بار پھر اسلام کی آغوش میں آ گیا۔ اور فارس، عراق اور خراسان میں از سر نو تعمیرات کا عظیم سلسلہ شروع ہو گیا۔ چین کو جانے والی سلک شاہراہ ایک بار پھر کھل گئی۔ عثمانیہ ترک یوروپ میں لگاتار یورش کر رہے تھے۔ مسلسل آگے بڑھ رہے تھے،

بازنطینی شہنشاہیت انہیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی، معاہدوں کے ذریعہ شادیوں کے بندھنوں کے ذریعہ ہندوستان اور پاکستان میں طاقت ور اور دولتمند تغلق شاہی سلسلے حکومت کر رہے تھے۔ یہ ان خلجیوں کے وارث بنے جنہوں نے سارے برصغیر کو دہلی کے فوجی وسیاسی اقتدار کے جھنڈے تلے متحد کر دیا تھا۔ اسلام ملیشیاء اور انڈونیشیاء میں داخل ہو چکا تھا۔ اور ''اچے'' سلطانی ریاست بڑی بے صبری کے ساتھ ان علماء، فقہ کے ماہرین اور قاضیوں کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ جو گذشتہ صدی میں منگولوں کی تباہیوں اور بربادیوں سے بچ کر راہِ فرار تلاش کر رہے تھے۔ چین پر ابھی تک منگولوں کے یون شاہی سلسلے کی ہی حکومت تھی۔ انہوں نے شمالی اور جنوبی حصوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا۔ مغربی افریقہ مالی شہنشاہیت کو عروج کے بام پر پہنچے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اس وسیع وعریض اسلامی دنیا کو آپس میں جوڑنے والا اتحاد تھا شریعت، ابن بطوطہ نے شریعت اور اسکے مالکی فقہ کے نفاذ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس طرح اسے ایک قاضی کا درجہ مل گیا۔ اس وقت دنیا میں کافی حد تک امن وامان تھا اور اسلامی دنیا میں سنی نظریات کی چھاپ پھیلی ہوئی تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر ابن بطوطہ کو اس دور میں کافی سہولیات مل گئیں۔ قانون شریعت کے بعد آپس میں متحد کرنے والی دوسری آفاقی طاقت تھی عربی زبان۔ قرآن اور حدیث کی زبان کی حیثیت سے عربی زبان کو خصوصی درجہ حاصل تھا۔ قانون کے ترسیل کا ذریعہ بھی یہی زبان تھا۔ قانونِ شریعت اور زبان وہ آفاقی قوتیں تھیں جنہوں نے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا۔ اس وقت بھی جبکہ اقتدار اور طاقت کے لئے آپس میں برسرِ پیکار رہے۔ اور اس وقت بھی جبکہ یہ غیر مسلمین سے برسر جنگ رہے۔ مسلمانوں کے ہاتھ سیاسی اقتدار تھا۔ زمین کے وسیع حصے پر ان کی حکومت تھی۔ مورتانیہ سے لے کر بنگال تک اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جس کے باعث تجارتی راہیں ان کی عمل داری میں تھیں۔ یہ راہیں اس دور کے اہم ترین تہذیب وتمدن کے مراکز کو آپس میں جوڑتی تھیں۔ یہ تہذیبیں چین، ہندوستان، فارس، مصر، اٹلی اور مغربی افریقہ کی تھیں ان سبھی کی راہیں اسلامی دنیا سے ہی گذرتی تھیں۔ شاہراہوں کے اس وسیع جال کی حفاظت مقامی بادشاہ انتہائی خوبی سے کیا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی اپنی خوشحالی بھی بین الاقوامی تجارت

سے وابستہ ہے۔کوئی بھی مسافر مالی سے لے کر ہندوستان کا سفر بحفاظت سانی کے ساتھ کرسکتا تھا۔ سفر کے دوران اپنے مسلمان ہونے یا لسانی شناخت کو چھپائے رکھنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں تی تھی۔

تجارت کے علاوہ حکمرانوں کے درمیان وقار کے لئے بھی مسابقت جاری تھی۔اسی وجہ سے علماء، فضلاء معمار ڈاکٹر، انجینئر، شعراء اور باکمال ہنرمند افراد کی بہت مانگ تھی۔ وہ مختلف درباروں کی طرف سفر کرتے رہے جہاں انہیں اچھی تنخواہوں پر عہدے ملتے رہے۔باکمال افراد کی مختلف درباروں کو ہجرت نے علم اور ایمان کے پھیلاؤ کے لئے ایک طاقتور انجن فراہم کیا۔ان افراد کی اسی ہجرت نے خصوصیت کے ساتھ ان علاقوں کو زیادہ فائدہ پہنچایا جو کہ تازہ بہ تازہ اسلام غوش میں ئے تھے۔ ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیاء، ملیشیاء، ترکی اور مغربی افریقہ ان سے استفادہ کرنے والے نوواردان ممالک میں سے تھے۔اسی زمانے میں ''بارود'' کی ٹکنالوجی چین سے ہندوستان پہنچی۔ یہاں سے مشرق وسطیٰ اور مصر ہوتی ہوئی یوروپ پہنچی۔ چودھویں صدی عیسوی کے دوران اسلامی دنیا کے مناظر کی منظر کشی تبدیل ہوگئی۔ اسلامی دنیا کا مرکزی کششِ ثقل روایتی فارس، عرب سے نکل کر ان علاقوں کی جانب منتقل ہو گیا جہاں ج سب سے زیادہ مسلم بادی ہے، یعنی انڈونیشیاء، پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور نائیجیریا قانون الٰہی عربی زبان اور تجارتی راہوں کے ذریعہ حاصل ہونے والے بیرونی روابط کی اہمیت صاف ظاہر تھی۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا روحانی اتحاد بھی اسی قدر ضروری تھا۔اس زمانے میں جب کہ منگولوں کی بلائے ناگہانی اپنی انتہاء پر پہنچی ہوئی تھی اسی روحانی اتحاد نے اپنا لوہا منوایا تھا۔یہی اب مذہب کے اظہار بیان کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ پاک وشفاف پانی سے لبریز جھیل کی طرح جو چھوٹے چھوٹے جزائر کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔اس روحانیت نے افریقی، عرب، ایرانی، ترک، ہندوستانی اور ملائی باشندوں بادخطوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔جغرافیائی اور تہذیبی حدود کو بلند و برتر ماورائے ادراک ڈور سے باندھ دیا یہی جذبۂ وحدت صوفی شیوخ کو ہندوستان کے اندرونی علاقوں اور دور بکھرے ہوئے مشرقی جزائر لے گیا۔اسی صوفیانہ مسلک کا کوئی نہ کوئی سلسلہ ترکیوں میں روحانیت اور غازیانہ جذبات پیدا کرتا رہا جس کی وجہ سے ترک جنوبی یوروپ میں فاتحانہ پیش قدمی کرتے رہے۔

ادھر چشتیہ سلسلہ کے صوفی ہندوستان کے اندرون دور دراز جنگلوں تک چلتے چلے گئے ادھر مُلّام یعنی مذہبی استاذ افریقہ کے دور دراز چراگاہوں میں چلتے رہے، اپنی جسمانی پیاس بجھانے کے لئے وہ پانی کے چھاگل نہیں لے گئے وہ تو اسلام کی آفاقی روحانیت کا ایک سمندر ہی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ سارے انسانوں کی روحانی پیاس بجھانے کے لئے انہیں سیراب کرنے کے لئے، چودھویں صدی عیسوی کے آدھے حصہ تک پہنچتے پہنچتے یہ روحانیت آگے بڑھ چکی تھی۔ اس نے اب مراقبہ اور ذکر سے بھی آگے اور بڑھ کر معاشرتی سرگرمی کو اپنا لیا تھا۔ اس عمل کو جاری رکھنے کے لئے مستحکم اداروں کو قائم کیا گیا۔ کوئی بھی مسافر مختلف مقامات پر موجود امن وسکون کے ان مراکز میں گوشۂ عافیت پا سکتا تھا۔ راستوں میں تعمیر کئے گئے، کارواں سرائے میں جگہ جگہ موجود خانقاہوں میں جنہیں صوفیوں نے تعمیر کیا تھا۔ اس دور کے جن جن مشہور شیوخ کی مہمان نوازی سے آشنا ہونے کا شرف ابن بطوطہ نے حاصل کیا وہ یہ ہیں اسکندریا کے شیخ برہان الدینؒ، یروشلم کے شیخ عبدالرحمٰن ابن مصطفیٰؒ، اصفہان کے شیخ قطب الدینؒ ہند کے چراغ دہلیؒ اور سلہٹ کے شیخ جلالؒ۔

ابن بطوطہ نے اپنی ابتدائی تعلیم مالکی مسلک کے مدرسہ میں حاصل کی۔ دور دراز کے علاقوں میں موجود مختلف صاحبِ علم شخصیات سے اس کی ملاقات رہی۔ ان سے تبادلہ خیالات رہا۔ ان کے بارے میں عمل رد عمل ہوتا رہا۔ اس نے جو ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اس کی وجہ سے اسے اپنے سفر میں ہونے والے اس باہمی عمل کے دوران بہت فائدہ پہنچا۔ اس نے شہری آداب کے بارے میں بھی ضروری تربیت حاصل کی تھی۔ ایسی تربیت اس دور کے کسی بھی شریف آدمی کے لئے انتہائی ضروری تھی۔ تصوف اسلامی معاشرہ میں گہرائی تک اتر چکا تھا۔ ابن بطوطہ بڑے بڑے صوفی شیوخ کی صحبت میں یوں محسوس کرتا تھا، جیسے کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ابن بطوطہ نے اس نئی مسلم شخصیت کو نکھار عطا کیا وہ شخصیت جو صوفیانہ روحانیت سے معمور تھی اور قانون شریعت سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھی۔ ابن بطوطہ مراقش کا باشندہ تھا۔ اس لئے اہلِ زبان میں سے تھا۔ اس عربی زبان دانی کی وجہ سے اسے ان قاضیوں، علماء اور صوفیوں کی صحبت آسانی کے ساتھ میسر ہو جاتی تھی جو کہ اسلامی دنیا کی روحانیت اور ادب کے روشن ستارے تھے۔

1325ء میں وہ نائیجیریا سے یضۂ حج ادا کرنے کے لئے نکلا۔اس دور میں حج کا مطلب صرف مکہ کا سفر نہ تھا۔اس کے لئے تو ایک مہم طے کرنی ہوتی ،مختلف شہروں سے گذرتے ہوئے جو کہ راہ میں ملتے تھے،عظیم مساجد و مدارس دیکھنے کا موقع ملتا۔و کے ماہر اساتذہ سے علم سیکھنے کے مواقع ملتے۔علاوہ اسکے اس دور کا حج انسان کے آپسی بھائی بہن چارگی کے آفاقی رشتہ کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ابن بطوطہ جس کارواں کا مسافر تھا اس میں مشہور عالم ابوعبداللہ الزبیدی اور تیونس کے قاضی ابوعبداللہ نفضا بھی مل تھے۔اس کارواں کا گذر مغرب کے چند اہم ترین شہروں سے ہوا۔جیسے طلیم چین جو کہ ودید باہیت کا صدر مقام تھا۔ الجیرز اور تیونس تیونس تجارت اور تہذیب وتمدن کا بڑا مرکز تھا۔یہاں یقہ سے،سونا، ہاتھی دانت مختلف قسم کے مغز آمیز جوز آتے ،مصر سے کشیدہ کاری اور لکڑی کا منقش سامان آتا۔ علاوہ اس کے دوسرے مما لک سے مصر آنے والا سامان بھی یہاں آتا۔جیسے کہ ہندوستان سے جڑی بوٹیاں ،دوائیاں،گرم مصالحے اور چین سے چینی کے برتن، یہ سامان جنوبی یوروپ کی شہری سلطنتوں کے علاوہ اور مغرب کے دوسرے شہروں کو روانہ کیا جاتا تھا۔یہ المحدث سلطنت کا مشرقی صدر مقام تھا۔انہوں نے اس شہر کو خوبصورت مساجد سے یین کیا اور بڑی بڑی درسگاہیں تعمیر کیں۔المحدث حکو کے ٹوٹ جانے کے بعد ہی عیسائیوں نے اندلس کے بڑے حصہ کو روند ڈالا۔اور مسلمانوں کو وہاں نکال دیا۔علماء،فضلاء، دستکاروں، فنکاروں عروں،ادیبوں،موسیقاروں، باغبانی کے ماہروں کی ایک بڑی تعداد وہاں سے آئی۔اس سے شمالی یقہ اور خصوصیت کے ساتھ تیونیسیہ کو بہت بڑا فائدہ پہنچا۔المحدث کے بعد حفصیوں نے اقتدار سنبھالا۔انہوں نے علم کے وغ کی روایت کو جاری رکھا جسے المحدث نے روا رکھا تھا۔تیونس جس کی آبادی ایک لاکھ تھی، یہاں قاہرہ، دمشق سے فیض حاصل کرنے کے لئے لوگ آتے دور دراز مقامات سے علماء بھی کھنچے چلے آتے تھے۔

ابن بطوطہ نے تیونس میں دو ماہ قیام کیا۔یہاں اندلسی شائستگی اور درباری آداب سیکھے۔یہ آداب اس دور کے بہترین طور طریقے مانے جاتے تھے۔یہاں اس نے جو کچھ پاکیزگی ونفاست بھرے آداب سیکھے آگے چل کر دورانِ سفر وہ آداب اس کے بہت کام آئے۔

تیونس سے یہ کاروان روانہ ہوا۔ لیبیا کے انتہائی سخت ریگستان کو پار کرتا ہوا۔اسکندریہ پہنچا۔ یہ شہر دریائے نیل کے دہانے پر واقع ہے۔اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وینیس، جنیوا، تیونس، تانجیر، ویالنسیا، سسلی اور شام کے ساحلوں سے اس کی تجارت زوروں پر تھی یہی وہ مقام ہے جہاں ہندوستان کے کاروانوں کے راستے اور مشرقی افریقہ کے سمندری راہیں آپس میں ملتی تھیں۔ افریقہ اور ایشیاء کے تمام ساز وسامان اسکندریہ سے ہوکر ہی گذرتے تھے۔اسکندریہ میں ابن بطوطہ نے صوفی شیخ برہان الدینؒ سے ملاقات کی اور کچھ وقت ان کے زاویہ میں گذارا۔ بزرگ شیخ نے ابن بطوطہ کو صوفی سلسلے میں شامل کرتے ہوئے اسے اپنا عباء عنایت فرمایا۔اس پر اپنی روحانی انوار کی بارش کردی۔ یہ قافلہ اسکندریہ سے عظیم شہر قاہرہ پہنچا اس زمانے کے قاہرہ کی آبادی اس وقت پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ جو کہ لندن کی آبادی سے پندرہ گنا، تبریز شہر سے تین گنا زیادہ تو دہلی سے دگنی تھی۔ یہ مملوکوں کا پائے تخت تھا۔مملوک ہندوستان کے ہم خاندان غلامان کی طرح یوروپی اور وسطِ ایشیائی غلاموں کی نسل سے تھے جنہیں ترکوں نے خریدا اور اپنا لیا۔انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔امراء وشرفاء کے خاندانوں میں شادیاں کیں۔اپنی دانائی اور عقلمندی سے ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن بیٹھے۔مصری مملوکوں کو بحری مملوک کہا جاتا تھا۔اس لئے کہ ان میں سے بہت سارے دریائے نیل کے جزائر میں بسیرا کرتے تھے۔1250ء میں انہوں نے کمزور اور دنیاوی طور پر بیمار ایوبی خاندان کو اقتدار سے اتارا۔مصر، شام، بحر احمر کے ساحلی عرب علاقوں اور سوڈان کو فتح کیا اور اپنے ماتحت لے آئے۔مملوکوں نے اپنے بہترین انتظامی قابلیتوں کا ثبوت دیا۔اور یہ بھی جتلا دیا کہ وہ بھی علم کے اعلیٰ سرپرست ہیں۔ابن بطوطہ جب قاہرہ پہنچا تو وہاں سلطان الناصر محمد بن قلاوان کی حکومت تھی جس نے 1293ء سے لے کر 1341ء تک حکومت کی۔ وہ رفیع الشان تعمیرات کا شائق تھا۔الناصر نے تیس سے زیادہ مساجد، بے شمار مدارس، اور ہسپتال تعمیر کروائے۔ابن قلاوان کی تعمیر کردہ عالیشان مسجد آج بھی قاہرہ کے پرانے شہر میں کھڑی ہوئی ہے۔ فارس، عراق اور وسطِ ایشیاء میں منگولوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لئے علم وفضل کے بے شمار ماہرین، صوفیائے کرام، شعراء، ماہرین لسانیات، معمار، فقہاء، ریاضی دان، فلاسفر اور ڈاکٹر قاہرہ چلے آئے۔

قاہرہ اسلامی فنون، تہذیب وتمدن کا مشہور مرکز بن چکا تھا۔

1258 میں بغ⑩ کی تباہی کے بعد عباسیہ خاندان کے بچ نکلنے والے ایک⑩ کو خلیفہ کی حیثیت سے قاہرہ کے تخت پر بٹھایا گیا-اس طرح یہ شہر خلافت کا مرکز اور اسلامی☎ سی زندگی کا مرکز بن گیا- قلاوان کا ہسپتال اپ⑩ ور کا ایک عجوبہ تھا- ہسپتال کو اس زمانے میں ''مارستان' کہا جاتا تھا-اس میں بیماروں کے لئے تین سو سے زی⑩ ہ وارڈ 🕒-یہ اس زمانے کے بہترین آلات سرجری سے مزین تھا- اسپتال میں ڈاکٹروں سرجن اور صاف صفائی کرنے والوں کی کمی نہ☆-اس عمارت سے ملحق لکچر ہال 🕒، باتھ روم 🕒، لائبریاں تھیں- اور ڈسپنسریاں تھیں-قرآن کی قرأت ے⑩ ل⑩ ماغ اور روح کو پرسکون راحت ملتی بیماری سے⌗ ء پانے کے لئے موسیقی کی لہروں کا بھی استعمال کیا جاتا یہاں مفت علاج ہوتا- امیر اور غریب سب کے لئے یکساں طور پر علاج کی سہولتیں مہیا تھیں-

مدارس یعنی اسکولوں کو مساجد سے ملحق کیا گیا تھا- مسجد مدرسہ کے تصور کی ابتداء مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی -۹۶۹ھ تا 1100 ے⑩ وران بنو عباس اور بنو فاطمہ ے⑩ رمیان جورسہ کشی جاری☆ اس⑩ ور میں⑩ ونوں مساجد و مدارس کے سرپرستی میں ایک⑩ وسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے- قاہرہ اور بغ⑩ ⑩ ونوں علم وفنون کے بڑے مراکز بن گئے- قاہرہ میں ''الازہر ترقی کرتا رہا تو بغ⑩ کا جامعہ نظامیہ ترقیوں کی بلندی سر کرتا رہا- مرو، نیشاپور، بخارا، سمرقند⑩ مشق، فیض، ٹمبکٹو، اور قرطبہ جیسے صوبوں نے علم وفن کی شمع روشن کرنے میں بغ⑩ وقاہرہ کو ایک مثال بنایا- علاوہ اس کے آنے والی صدیوں میں اسلامی اثر قبول کرنے وا⑩ ہلی، تبریز، استنبول اور لاہور نے بھی علم کی ترقی کی اسی راہ کو اپنایا- ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ قاہرہ میں بے شمار مدارس 🕒-ان کا شمار کرنا ناممکن تھا-

ہر مسجد اپنی جگہ ایک مدرسہ بھی ہوا کرتی اور اس سے ملحق ایک⑩ یوان خانہ بھی ہوا کرتا جہاں صاحبِ کمال اساتذ⑩ رس⑩ یا کرتے اور علم کے شوقین طلباء قرآن، فقہ، عربی قواعد، ریاضی، طب اور فلسفہ سیکھا کرتے۔ فلسفہ جیسے زی⑩ ہ سیکولر سائنس سبھی مدارس میں پڑھائے نہیں جاتے 🕒۔

حج کا وہ کاروان جس کے ساتھ ابن بطوطہ سفر کر رہا تھا اس کے یہاں سے نکلنے میں تاخیر ہوگئی۔ ابن

بطوطہ حج کے لئے جلد از جلد پہنچنا چاہتا تھا۔اس نے دریائے نیل کے بہاؤ کے رخ پر جنوب کا راستہ اختیار کیا،صحرا سے ہوتے ہوئے سوڈانی بندرگاہ عیدھب پہنچا۔اس نیل کی وادی کے متعلق بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ ایک انتہائی خوبصورت باغ ہے جس میں زندگی اور قوت حیات سے بھرپور وہ مملوک حکومت کے لئے اجناس وخوراک فراہم کرنے والی حسین وادی تھی۔عیدھب جبس سے بھرپور بندرگاہی شہر تھا۔ڈھول آلودہ ہم پانی کے بغیر،درآمد شدہ مال سے بھرا ہوا۔بے رحم موسم کی وجہ سے مجبور ہوکر ابن بطوطہ قاہرہ پھر سے لوٹ آیا۔یہاں سے اس نے سینائی صحراء سے ہوتے ہوئے فلسطین اور شام کا سفر کیا۔الخلیل یعنی ہیبرون میں مسجد ابراہیم میں نماز پڑھی اور یروشلم کی مسجد اقصیٰ میں کئی دن گذارے۔1326ء کے آتے آتے یروشلم مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان متنازعہ فیہ شہر نہیں رہ گیا تھا۔فلسطین میں صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہوچکا تھا اب اس شہر کو مسلمان عیسائی اور یہودی زائرین آنے لگے۔ابن بطوطہ نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخر (Dome of Rock) میں کئی راتیں عبادتوں میں گذاری ان عبادتوں کے دوران وہ اسراء اور معراج کے واقعات کو یاد کرتا رہا۔اس زمانے میں وہاں رفاعی سلسلہ کے مشہور صوفی شیخ عبدالرحمٰن بن مصطفیؒ موجود تھے۔ ابن بطوطہ نے ان کے زاویہ میں کئی دن گذارے۔

شیخ ابن مصطفیؒ سے اجازت حاصل کر کے ابن بطوطہ دمشق کو روانہ ہوا یہاں اس نے مشہور مصلح ابن تیمیہؒ سے 1328ء میں ملاقات کی۔دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل الگ تھا۔ابن بطوطہ اس نئے صوفی دور کا انسان تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتا وہاں کے مشہور صوفیاء کرام کی صحبت تلاش کرتا۔ابن تیمیہؒ نے صوفیانہ طریقِ کار میں آگے چل کر آنے والے خطرات کا احساس کرلیا۔ ان خطرات کا اظہار کیا ملا کرتے تھے کہ یہ طریقۂ کار کوئی آزمایا ہوا تجربہ بھی نہیں تھا۔ نام نہاد لوگوں کے ذریعہ اس کے غلط استعمال ہونے کا بھی احتمال تھا۔صوفیاء کرام نے اس الزام کا جواب یوں دیا ہے کہ صوفیانہ طریقۂ کار سے انسان کے کردار میں فوری طور پر جو بہتری آجاتی ہے۔ یہی تجربہ اس طریقۂ کار کا کتاب سے بہترین ثبوت ہے۔ صوفی مسلک کے کچھ اصحاب قرآن کے مجازی معنی بیان کرتے تھے۔ابن تیمیہؒ اس کے سخت مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن کو صرف اس کے ادبی معنوی حیثیت سے سمجھا جائے۔امام شافعیؒ نے اس پر زور دیا

تھا۔ابن تیمیہؒ سمجھتے تھے کہ صوفی طرزفکر میں کئی خطرات چھپے ہوئے ہیں۔ اس دور کی نسل کو ان خطرات سے آ گاہ کرنے کے لئے وہ ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔انہوں نے مسلمانوں کو اس اسلام کی جانب واپس لوٹنے کے لئے آواز دی جو کہ بنوامیہ اور بنوعباس کے دور میں جاری وساری تھا۔ ان کے خیال کے مطابق وہی اسلام جوش سے بھرپور،ظاہری جہت رکھنے والا اور تجربی ہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں کی نہیں بنتی تھی۔

لیکن تاریخ کے سامنے کہ اسلامی دنیا نے صوفیانہ طرزفکر کو اپنالیا۔ابن تیمیہؒ کو بس ایک عالم کا درجہ دیا اور بھلا دیا۔اب جبکہ گذشتہ دوسوسالوں سے جب یوروپی اقوام نے نوآبادیات قائم کیں تو اسکی وجہ سے اسلامی دنیا کو نئے نئے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مغربی افکار کے ان چیلنجوں کا جواب دینے کے لئے اسلامی دنیا نے پھر سے امام ابن تیمیہؒ کے افکار سے رجوع کرنا شروع کیا ہے۔

دمشق مملوکوں کا دوسرا صدر مقام تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی جگہ وہ ایک رفیع الشان شہر تھا۔ 1258ء سے لے کر 1315ء تک مملوکوں اور عراق وایران کے اِلخان کے درمیان ہونے والی رسہ کشی کی وجہ سے دمشق کو نقصان پہنچا تھا۔جب دونوں شاہی خاندانوں کے درمیان امن بحال ہوگیا تو ایک بار پھر اس شہر کی پہلی سی رونق لوٹ آئی۔مصر، شمالی افریقہ سے لے کر بحراسود تک اور چین، فارس وہندوستان کی تجارتی شاہراہوں کے سنگم کی حیثیت سے ایک بار پھر اسکو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس کی آبادی ڈھائی لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔وہاں تیار ہونے والا مشہور فولاد ''دمشق فولاد'' کہلاتا تھا اور ساری دنیا میں اس کی مانگ تھی۔

اسلام نے پرانی دنیا کو کس طرح واحد تجارتی اکائی میں تبدیل کردیا تھا اس کی بہترین مثال لوہے کی تجارت اور اس کے تیار کرنے کا عمل ہے۔مشرقی افریقہ سے خام لوہا گجرات کو برآمد کیا جاتا وہاں اس کو پگھلا کر لوہے کے ڈلّوں میں تبدیل کیا جاتا اور یہاں سے ایک بار پھر شام کو برآمد کیا جاتا۔دمشق میں اسے پھر سے پگھلایا جاتا۔دوسری دھاتوں کے اجزاء اس میں شامل کئے جاتے اور اسے بہترین فولاد کی شکل میں تیار کرکے باہر نکال لیا جاتا۔فولاد تیار کرنے کا یہ عمل ابھی اس موجودہ دور تک دنیا میں کسی کو نہیں تھا۔ 1960ء کے دہے میں اس کیمیائی عمل کو پھر سے ڈھونڈ نکالا گیا۔اسے اعلیٰ ترین ملائمت کا نام دیا گیا یعنی

Plasticity ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ دمشق کے بازار برآمد شدہ اشیاء سے بھرے ہوئے تھے۔ ہندوستان سے گرم مسالے، ہیرے جواہرات، کشیدہ کاری کے کپڑے، عطریات اور ادویاتی جڑی بوٹیاں، چین سے چینی سامان، بحر اسود کے علاقے سے فر، ترکی اور وسطِ ایشیاء کے گھوڑے یہاں کے بازاروں میں قدم قدم پر بکھرے ہوئے تھے۔ دمشق کے امراء نے قاہرہ کے سلاطین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بے شمار مساجد، مدارس، ہسپتال مسافروں کے لئے سرائے نہریں اور عوامی حمام خانے تعمیر کروائے، ابن بطوطہ نے اپنا کافی وقت دمشق میں بنوامیہ کی تعمیر کردہ عظیم الشان مسجد میں گذارا یہاں اس نے دوسرے نصاب کے علاوہ امام بخاری کی حدیث بھی پڑھی۔

آخر کار 1326ء میں ابن بطوطہ حج کرنے کے لئے چل پڑا۔ آج کے دور میں حاجیوں کو بے شمار سہولتیں حاصل ہیں۔ حجاج کرام ان سہولیات کو اپنا حق سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اس دور میں ایسی کسی بھی قسم کے آرام کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا اور دمشق سے مکّہ تک آٹھ سو میل کی مسافت انتہائی دشوار گذار راستوں سے طے ہوتی تھی۔ زائرین حرم عموماً کارواں کی شکل میں حج کے لئے نکلتے تھے۔ بسا اوقات ایک ایک قافلہ میں تیس ہزار تک حجاج کرام شامل ہوتے۔ قافلہ میں سفر کے لئے ضروری اجناس ہوتا اس کا ایک امیر ہوا کرتا۔ ساتھ میں ائمہ کرام منصف، ڈاکٹر ہوا کرتے ان کی حفاظت کے لئے سپاہیوں کا جتھا بھی ساتھ ساتھ چلتا اس کے باوجود راستوں میں کئی لوگ انتقال کر جاتے۔ بسا اوقات صحراؤں میں اچانک آنے والی بھیانک ریت کی آندھیوں میں پھنس جاتے۔ ڈاکوؤں کے حملوں کا شکار ہوتے۔ افریقہ کے کچھ علاقوں سے حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے ایک ایک سال کا عرصہ لگ جاتا۔ مالی جیسے ممالک سے حج کرنے کے لئے دو دو سال بھی لگ جاتے۔ اس کے باوجود وہ آتے تھے۔ آدم کے بیٹے اور بیٹیاں دھرتی کے ایک ایک کونے سے مکہ مکرمہ کی مقدس ومکرم عبادت کی پناہ میں، خالق کائنات کی بزرگی و برتری کے گن گانے کے لئے انسانوں کے قدیم ترین پاکیزہ ترین بھائی چارگی کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لئے۔

چودہ سو سال پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے طریقۂ کار کی تکمیل کی تھی۔ آج چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود ان میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ابن بطوطہ نے 1326ء میں حج

کے دوران جن جذبات کا احساس کیا تھا آج اس دور کے حجاجِ کرام بھی بالکل انہی پر کیف روح پرور احساسات میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں۔ شمال کی جانب آتے ہوئے یہ کارواں سب سے پہلے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنچا۔ وہاں مسجد نبوی کے گھیرے میں گم ہوکر ابن بطوطہ عبادت کرتا رہا۔ آقائے نامدار تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرتا رہا، ان پر صلی اللہ علیہ وسلم درود وسلام بھیجتا رہا۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر اس نے اپنا لباس ترک کیا، احرام باندھا اور ساتھیوں کے ساتھ بآواز بلند تلبیہ پڑھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ میں حاضر ہوں میرے مالک، میں حاضر ہوں۔ بے شک تمام تعریفیں صرف تیرے ہی لئے ہیں۔ تو ہی تمام نعمتوں کا مالک ہے۔ ساری کائنات کا مالک ایک اکیلا تو ہی ہے، اے میرے مالک میں حاضر ہوں تیرے حکم پر مختلف زبانوں میں اللہ کی بزرگی بیان کرتے ہوئے ہزاروں افراد کا کاروان چلتا رہا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہوا اٹھا۔ یادرہے کہ لفظ حرم صرف اور صرف مکہ میں کعبہ کے اطراف کے علاقہ، مسجد نبوی اور یروشلم میں الاقصیٰ مسجد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ انسانوں کے ہجوم میں اس نے گم ہوکر طواف مکمل کیا۔

اس کے بعد صفا، مروہ کے درمیان سعی کی۔ اس وقت کو یاد کیا جب اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ اپنے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کو چھوڑ گئے تھے۔ اس لق ودق صحراء میں بی بی ہاجرہؓ پانی کی تلاش کے لئے جدوجہد کررہی تھیں۔ اس نے یاد کیا اس وقت کو جب رحمتِ الٰہی جوش میں آئی ایک ماں کی دعاؤں کے نتیجے میں پتھر سے پانی پھوٹ نکلا۔ ماں ہاجرہ بے اختیار پکار اٹھیں۔ زمی یا مبارکہ، او مبارک پانی رک جاؤ، صفا ومروہ کے درمیان سات پھیرے لگانے کے بعد ابن بطوطہ نے زم زم کے کنویں سے جی بھر کے اپنی پیاس بجھائی لفظ زم زم زمی سے بنا ہے جو کہ چٹان سے ابلتے چشمے کو دیکھ کر حضرۃ ہاجرہؓ کے منہ سے بے اختیار نکلا ہے۔

مکہ مکرمہ سے وہ منیٰ پہنچا یہاں سے عرفات کے عظیم باسعادت مجموعہ میں شامل ہوگیا۔ یہاں اس میدان میں آدم کی اولاد کھڑی ہوئی تھی، کالے اور گورے، امیر اور غریب، عرب وترک، ایرانی وہسپانوی۔ اللہ کے حضور کھڑے ہوئے تھے اس مجموعہ میں کوئی بادشاہ نہ تھا کوئی فقیر نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے سب برابر تھے۔ خالق کائنات کے حضور جھکے انسانوں کی نظروں میں بھی صرف اسی کی بندگی کرتے ہوئے اس سے رحم کی بھیک مانگتے ہوئے نظر عنایت کے لئے دامن پھیلائے ہوئے عرفات سے ابن بطوطہ مزدلفہ واپس ہوا

پھر وہاں سے منیٰ ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ۔ یوں اس نے حج کے تمام ارکان ادا کیے اس کے بعد اپنے ساتھی حجاج کرام سے آن ملا۔ اس مبارک گھڑی پر خوشیاں منانے کے لئے، تانجیر سے جس منزل کو پانے کے لئے وہ نکلا تھا، اب اس نے اس منزل کو پالیا تھا لیکن نئے افق اُسے اپنی جانب لبھا رہے تھے۔

1326ء میں ابن بطوطہ ایک ایسے قافلہ کے ساتھ ہوگیا جو حج کے فرائض سے فارغ ہوکر وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ اس قافلہ نے شمالی راہ اختیار کی جو کہ مکہ، مدینہ سے وسطِ عرب اور کوفہ سے ہوکر گذرتی ہے۔ اس راہ میں اس نے بے شمار کنویں اس کے ساتھ اینٹوں پتھروں سے بنی نہریں اور کارواں سرائے دیکھے جنہیں ہارون رشید کی بیوی ملکہ زبیدہ نے تعمیر کیا تھا۔ اس نے 799ء میں حج کیا تھا اور یہ ساری تعمیرات اسی حج کے دوران ہوئی تھیں۔ اسی وجہ سے اس کا یہ حج بڑا ہی مشہور ہے۔ نجف اور کربلا زیارت گاہ تھے۔ نجف سے اس نوجوان مسافر نے بصرہ کی طرف جنوبی راہ اختیار کی، راہ میں رفاعی صوفیانہ سلسلے کی ابتداء کرنے والے حضرت شیخ احمد بن رفاعیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ وہ زاویہ میں رکا رہا۔ اس سلسلے کے صوفیانہ طریقوں میں حصہ لیا، جس میں نماز، سماع اور درویشانہ ضرب بھی شامل ہے۔ کچھ اور جنوب کی جانب، عابد جان شہر میں ابن بطوطہ صوفیوں کی صحبت میں شامل رہا۔ ایرانی سطح مرتفع پر چڑھتے ہوئے اس نے زیروس پہاڑوں کے سلسلے کو پار کیا اور خوبصورت شہر اصفہان میں داخل ہوا۔ اصفہان منگولوں کی بربادیوں سے محفوظ رہا تھا۔ اس کی کچھ تو وجہ یہ تھی کہ یہ حملہ آور منگول فوجوں کی راہ سے دور واقع تھا۔ دوسرے یہاں کی حکومت نے ان کا سامنا کرنے کی بجائے ان کی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔ ابن بطوطہ سہروردی سلسلے کے شیخ قطب الدینؒ کے ساتھ رہا۔ یہاں سے وہ رفیع الشان شیراز کی جانب چلا۔ اصفہان کی طرح اس نے بھی منگولوں کی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا تھا اسی لئے یہ بھی ان کی بربادیوں سے بچا رہا۔ یہ ایران میں صوفیانہ کارروائیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ شیراز کو برجِ اولیاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں مشہور فارسی شاعر شیخ سعدیؒ اور محترم صوفی شیخ ابن خفیفؒ مدفون ہیں۔ ابن بطوطہ نے فارس کے لوگوں کو بڑا ہی فیاض، مہذب، اچھے اور نیک کاموں کا دلدادہ اور خداترس پایا۔

وہاں سے واپس ہوتے ہوئے ابن بطوطہ بغداد پہنچا اس برباد شدہ شہر کو پھر سے تعمیری جدوجہد میں

مصروف پایا۔ اس دور میں فارس پر منگول شہزادہ ابوسعید (1316ء تا 1335ء) کی حکومت تھی وہ ایک بہترین عالم خداترس انسان خوبصورت عمارتیں تعمیر کرنے کا شوقین اور اعلی درجہ کا منتظم تھا۔ اس کے زیر حکومت فارس ترقی کی راہ پر چل نکلا اور منگلوں کی تباہ کن حملوں کی راکھ سے از سر نو تعمیر و ترقی کی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ منگولوں نے اپنا صدر مقام تبریز کو بنایا- ابن بطوطہ نے اس شہر کا سفر کیا اس نے اس کو تجارتی طور پر خوشحال پایا۔ اس کا موازنہ دمشق کی خوشحالی سے کیا جاسکتا تھا اس نے شہر کو ہرے بھرے باغات عالیشان مساجد اور خوبصورت محلوں سے مزین دیکھا۔

بغداد کو واپس ہوتے ہوئے اس عالمی سیّاح نے شمال کی جانب موصل کا راستہ اختیار کیا یہاں اس نے ایک عظیم خاتون صوفی جن کا نام حضرت ستہ زاہدہؒ تھا سے ملاقات کی آپ نے کئی مشہور صوفیاء کرام کی تربیت کی تھی کئی خداترس لوگوں نے آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں تصوف پر صرف مردوں کی ہی اجارہ داری نہ تھی۔ کئی خواتین روشنی کا منارہ بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس روشنی کے ذریعہ بے شمار مرد و خواتین انسانوں کے اندر پائی جانے والی روحانیت کے سرچشمے سے فیضیاب ہوئی ہیں۔ حضرت رابعہ الادویہؒ جن کا انتقال 802ء میں ہوا اسلام کی اولین خواتین صوفیاء کرام میں سے ایک تھیں آپ نے اللہ تعالیٰ سے عشق یعنی عشقِ حقیقی کو عربی شاعری میں انتہائی جذباتیت اور خوبصورت پیرائے میں ادا کیا ہے۔ وہ تو دوسری بات ہے کہ تاریخ میں آگے چل کر عورتوں کو پس پردہ دھکیل دیا گیا۔ اور اکثر انہیں علم سیکھنے اور سکھانے سے باز رکھ دیا گیا۔

مکہ سے واپسی کے بعد ابن بطوطہ نے 1327ء سے لے کر 1329ء دو سالوں تک علم حاصل کرتا رہا۔ یہاں سے وہ ایک بار پھر سیاحت پر نکل پڑا۔ اب کی بار وہ بحر ہند کے مغربی ساحلوں پر واقع شہروں کا سفر کرتا رہا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے ہی مسلمانوں نے اپنی خوشحالی کے لئے تجارت کو ایک ذریعہ بنایا۔ مشرق وسطیٰ، ایشیاء یوروپ اور افریقہ کے تجارتی شاہراہوں کے مرکز پر واقع ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگ خصوصی جغرافیائی حیثیت کا حامل رہے ہیں۔ افریقہ کے مشرقی ساحل بذریعہ سمندر، ہندوستان، انڈونیشیاء اور چین سے جڑے ہوئے ہیں۔ خلیج فارس میں ابادان اور مسقط، جزیرہ نمائے عرب

کے جنوبی کنارے پر واقع عدن اور یمن اس دور کی اہم بندرگاہیں تھیں اسی تجارت میں موگودیشو، ممباسا، قلوہ، اور شوفالا بھی انتہائی اہم درجہ رکھتی تھیں۔ یہ افریقی ساحلوں پر پھیلی تھیں- ان پر مقامی مسلم امیروں کی حکومت تھی ان کے زیرنگران یہ تمام شہر خوشحال اور دولتمند بن گئے۔

آگے والے جنوبی علاقوں کو زنج کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ لوگوں اور سامان تجارت کی آمد و برآمد دونوں جانب سے ہوا کرتی تھی۔ بہت پہلے آٹھویں صدی کی ابتداء میں عراق کے جنوب میں زنج نو آبادی قائم تھی۔ ابن بطوطہ نے سیاحت کا جو دستور العمل تیار کیا اس کے تحت وہ مکہ سے مراقش کے ساؤ کن آیا، یہاں سے یمن کے عدن اریٹیریا کے زئیلا، صومالیہ کے موگوڈیشو، کینیا کے ممباسا سے ہوتے ہوئے دور جنوب کی جانب زامبیا اور قلوہ کا سفر طے کیا۔ مشرقی افریقہ سونا، ہاتھی دانت، جانوروں کے چمڑے اور سخت قسم کی عمارتی لکڑی درآمد کرتا تھا۔ اس کے بدلہ میں ہندوستان سے گرم مصالحہ مہین روئی سے بنے ملبوسات اور دوائیاں درآمد ہوتے تھے۔ چین سے سلک اور اعلیٰ درجہ کا چینی کا سامان، دمشق سے فولاد، پارچہ جات، پیتل کے ظروف قاہرہ کی راہ سے ہوتے ہوئے یہاں آتے۔ افریقی سمندروں کے ساحل صوفی تحریک کی وجہ سے بقیہ اسلامی دنیا سے ایک زنجیر میں بندھ گئے تھے۔ سمرقند جیسے دور دراز علاقوں سے علماء اور تاجروں نے ہجرت کی۔ افریقی عورتوں سے شادیاں کیں اور ساحل کے ایک انتہائی شاندار مشترکہ تہذیب وتمدن کو جنم دیا۔ ابن بطوطہ نے یہاں کے شہروں کے لوگوں کو کافی مالدار پایا۔ وہ بہترین نفیس روئی سے بنے کپڑے زیبِ تن کرتے، خوبصورت زیورات پہنتے، عالیشان گنبدوں والی خوبصورت مساجد میں عبادت کرتے، چین سے برآمد شدہ اعلیٰ درجہ کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے۔ شہر پرامن تھے۔ قلعوں میں بند نہ تھے۔ دور دراز سے آنے والے تاجروں کا گرمجوشی اور کھلے دل سے استقبال کیا جاتا۔ ان کا امن پسند ہونا اور قلعوں کی دیواروں سے اپنی حفاظت نہ کرنا۔ یہی چیز ان کے خلاف گئی، ان کی امن پسندی انکی دشمن بن گئی۔ جب سولہویں صدی عیسوی میں پرتگالی لٹیروں نے سمندری جہازوں کے ذریعہ بے رحمی کے ساتھ حملے شروع کردیئے اور یکے بعد دیگرے شہر در شہر انہیں مفتوح کرلیا۔

1332ء میں ابن بطوطہ نے اناطولیہ کے سطح مرتفع اور بحر اسود کے اطراف کے علاقوں کی مہم سر کی۔

اناطولیہ کے متعلق اس کے مشاہدے قابل توجہ ہیں۔ اولین بات تو یہ کہ تمام ترک غازیانہ جذبہ سے سرشار تھے۔ 1332ء تک ترکوں نے اناطولیہ کے تقریباً تمام علاقہ کو فتح کرلیا تھا۔سلطنت عثمانیہ ابتدائی منزل میں تھی۔لیکن بہت جلد ایک عالمی شہنشائیت کا روپ دھارنے کے لئے پورے طور سے تیار تھی۔ نویں صدی عیسوی سے ہی اپنے مادروطن منگولیا کے سرحدی علاقوں کے ترک قبائل طوفان کی طرح اٹھے، پہلے خراسان پر چھا گئے۔یہاں سے وہ ایران کی جانب بڑھے پھر اناطولیہ اور وہاں سے آگے فتح یاب ہوتے چلے گئے پھر وہ وقت آیا جب ان کی یہی ہجرت اسلام کی حفاظت کے لئے غازیانہ جذبہ میں تبدیل ہوگئی۔

ترک قبائل ابتداء سے ہی ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک ہجرت کرتے رہے اسلام نے ان ترک قبائل کو ایک ایسے جوش اور جذبہ سے بھردیا جوان کے لئے آگے بڑھنے کا بہترین زینہ ثابت ہوا۔ چونکہ ان کی طبیعت ہی ہجرت پسند تھی۔اگر یہ تمام ترک قبائل اسلام کی آغوش میں نہ بھی آتے تو بھی ان کا جذبہ ہجرت کم نہ ہوتا۔ابن بطوطہ نے دوسری اہم بات جوان میں دیکھی وہ تھی عورتوں کا عوامی زندگی میں کھل کر حصہ لینا۔ترک عورتیں گھوڑے کی سواری کرتیں۔سپاہیانہ حیثیت سے جنگ لڑتیں،عوامی اجلاس مین حصہ لیتیں،تجارت کرتیں اور مردوں کے شانہ بہ شانہ زندگی کے ہر شعبہ میں شامل ہوا کرتی تھیں۔ مالکی مسلک پر انتہائی سختی سے عمل کرنے والے مغرب سے آنے والے ابن بطوطہ کے لئے یہ صورت حال بالکل نئی تھی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اسلامی تاریخ میں آزاد حکمرانوں کی حیثیت سے ابھرنے والی ملکائیں ترک قبائل سے ہی نسبت رکھتی تھیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں انڈونیشیاء میں یکے بعد دیگرے چھ مسلم ملکاؤں نے آزادانہ حکومت کی۔ابن بطوطہ نے اپنے مشاہدات میں جو تیسری اہم بات دیکھی وہ یہ تھی۔اس نے اناطولیہ میں نوجوانوں کی طاقتور تحریکوں کو دیکھا۔یہ تحریکیں صوفیانہ مسلکوں سے برادرانہ طریقے سے جڑی ہوئی تھیں۔نوجوان کی ''اخی تحریک'' نے برادرانہ اخوت کو مضبوط بنایا۔نوجوانوں کو اتحاد احسان، بہادری اور نیک کرداری کے فوائد سے آگاہ کیا۔ یہ ''اخی برادرانہ تحریکیں علماء وفضلاء کی مہمان نوازی کرتیں۔ ان کے اخراجات بھی برداشت کرتی تھیں۔ غازیانہ تحریک نے عوام کو جس جوش اور ولولہ سے بھردیا تھا۔''اخی'' تحریک نے بھی نوجوانوں میں بالکل ویسے جذبے ابھار دیئے تھے۔

ابن بطوطہ کا تصور اب مشرق میں دہلی کی جانب مڑ گیا۔اس دور میں صوفی ،علماء ہر شعبہ کے عالم اور تاجر دہلی کی جانب بے اختیار کھینچے چلے آ رہے تھے۔ 1332ء میں اس نے یہ سفر شروع کیا۔ اولگا قطعہ سے گذرتے ہوئے اس نے مشاہدہ کیا کہ غلاموں کی تجارت اس وقت بھی زوروں پر تھی اس کے بعد خراسان اور چغتائیوں کے قناط سے گذرتے ہوئے ابن بطوطہ نے بخارا، سمرقند، بلخ اور حیرات کے کھنڈر بھی دیکھے۔ یہ وہ شہر تھے جو ابھی حال تک اسلامی تہذیب وتمدن کے تاج میں جڑے خیرہ کن ہیرے تھے۔لیکن اب منگولوں نے انہیں کھنڈروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ابن بطوطہ نے کابل، غزنی، اور ملتان کا سفر کیا۔ یہاں وہ سہروردی سلسلہ کے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کی صحبت میں رہا۔1334ء میں وہ دہلی آیا۔ دہلی پر اس وقت محمد بن تغلق کی حکومت تھی۔ یہ ذہانت، ادبی ذوق اور من موجی طبیعت کے لئے مشہور تھا۔اس نے ابن بطوطہ کو چیف قاضی مقرر کیا۔ دہلی جو کہ راجپوتوں کی فوجی چھاؤنی کی حیثیت سے ایک چھوٹا سے قصبہ تھا۔اب مسلمانوں کے دور حکومت میں یہ ترقی یافتہ بین المذاہب اور بین الاقوامی شہر بن چکا تھا۔ یہ اب ایک بہت ہی طاقتور سلطنت کا مرکز تھا۔ دہلی کی مرکزیت کے تحت سارا براعظم متحد ہوگیا۔ ان وجوہات کی بنا پر ہندوستان ایک ایسا طاقت وراور دولتمند ملک بن گیا جس کی مثال نہیں ملتی۔قطب مینار کو بنے ہوئے سو سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔قوت الاسلام کی عظیم مسجد شہریوں کے لئے جامع مسجد بنی ہوئی تھی۔

ابن بطوطہ نے دہلی کے دربار کی شان وشوکت اور دولت مندی کا ایک نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے۔ سچ تو ہے کہ اسی وجہ سے جب ابن بطوطہ مراقش واپس ہوا تو اس کے ہم عصروں نے اسے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ابن خلدون جیسی شخصیت نے بھی خیال کیا کہ تانجیئر کے شیخ ابن بطوطہ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔اس کی کہانیاں بے بنیاد سی لگتی ہیں۔ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ 1340ء میں چین کے فرمانروا، شہنشاہ توغان تیمور نے اپنی سفارت دہلی کے دربار میں روانہ کی تھی۔اس نے دہلی میں بدھ مت کا ایک عبادت خانہ بنانے کی درخواست کی تھی۔ محمد بن تغلق نے اس درخواست کو رد کر ڈالا۔اس طرح ایک تاریخ غلطی اس سے سرزد ہوگئی۔ ہندوستان کے صوفیوں اور ایوان شہنشائیت کے بودھ راہیوں کے درمیان باہمی عمل ردعمل کا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔جس کی وجہ سے چین کی اندرونی سرزمین میں اسلام کی اشاعت کا موقع بھی چلا گیا۔

سلطان نے سفیروں کو خالی ہاتھ لوٹانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے سونے، ہیرے، جواہرات کے تحائف کے ساتھ ابن بطوطہ کو ان کے ساتھ بیجنگ بھیجا۔ 1340ء میں ابن بطوطہ نے گوالیار گجرات اور دولت آباد کا دورہ کرتے ہوئے سورت پہنچا جو کہ ہندوستان کے مغرب میں واقع ہے۔ یہاں سے اسے چین کے لئے جہاز کی سواری پکڑنی تھی۔ لیکن دورانِ سفر اسکا جہاز طوفان میں پھنس کر تباہ ہو گیا۔ ابن بطوطہ نے اپنے آپ کو مالابار کے ساحلوں پر پایا وہ ساحلوں پر شہر در شہر گھومتا رہا۔ مزید سیاحت کے دوران جزائر مالدیپ، سری لنکا اور بنگال کا سفر طے کیا۔ یہاں اس نے سلہٹ کے مشہور صوفی حضرت شیخ جلالؒ سے ملاقات کی۔ یہاں سے اس نے انڈونیشیاء کا سفر اختیار کیا۔ وہاں سماٹرا کے سلطان احمد المالک الظاہر نے اس کا استقبال کیا۔ آخر کار کینٹون کی راہ سے گذرتے ہوئے وہ بیجنگ جا پہنچا۔ یہاں اس نے تجارت میں کامیاب و کامران ترقی کرتے اور پھلتے پھولتے مسلمانوں کو دیکھا۔

ابن بطوطہ بغیر آرام کے سفر کرتا رہا۔ 1349ء میں اس نے مراقش کی جانب واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس نے جنوب کا سفر کرتے ہوئے مالی کی عظیم سلطنت کا مشاہدہ کیا۔ 1351ء سے 1355ء کے درمیان دورانِ سفر دریائے نائجر کے کنارے کنارے وہ سجلما سا، ولاطا، ٹمبکٹو، اور گوا جیسے شہروں سے ہو کر گذرا۔ اس زمانے میں مالی پر عظیم مانسا موسیٰ کے جانشین مانسا سلیماں کی حکومت تھی۔

ابن بطوطہ نے مالی کے عوام کی زندگی کے بارے میں جو لکھا ہے وہ انتہائی اہم ہے اس کو افریقی اور عرب معاشرہ میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک میں باہمی اختلاف صاف نظر آیا اسی وجہ سے اس کا تذکرہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ شمالی افریقہ میں عورتیں مردوں سے بالکل الگ رکھی جاتی تھیں۔ شمالی افریقہ پر عربوں کا اثر نمایاں تھا۔ ابن بطوطہ نے مالی میں اس کے بالکل برخلاف دیکھا یہاں عورتیں مردوں سے بالکل الگ پردے میں نہیں رہا کرتی تھیں۔ اناطولیہ کی ترک عورتوں کی طرح اس علاقہ میں عورتوں کو آزادی حاصل تھی وہ کھلے عام بازار جایا کرتیں بادشاہ کی درباری زندگی میں حصہ لیتیں۔ قاضیوں اور علماء سے کسی بھی مسئلہ پر بحث کے لئے یا مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے جب وہ ان کے پاس جاتیں تو چہرے پر نقاب نہیں اوڑھتی تھیں۔ ابن بطوطہ مالکی مسلک کا ایک قاضی تھا اسی لئے اس

نے یہاں عورتوں کی آزادی کو قابلِ اعتراض جانا۔ابن بطوطہ نے دیکھا کہ دریائے نائیجریا کے کنارے آباد تمام شہر خوشحال ومتمول تھے۔لوگ خداترس اور نماز کے پابند تھے۔علماء قرآن اور سنت کو اچھی طرح سمجھتے تھے وہاں کی یونیورسٹیوں میں دوسرے ممالک جیسے کہ فیض اور قاہرہ سے علماء اور فضلاء آتے اور جاتے تھے یہاں وہ درس بھی دیتے تھے۔تمام مساجد عبادت کرنے والوں سے بھری رہتی تھیں۔ابن بطوطہ 1335ء میں اپنے گھر واپس ہوا اس نے اپنی بقیہ زندگی میرینی کے بادشاہ سلطان ابوعنان کی خدمت میں گذاردی۔اسی سلطان کے حکم پر ''رحلہ'' کی تدوین ہوئی۔ ابن جوزیہ ابن بطوطہ سے بذات خود اس کے سفر کے حالات سنتا جاتا تھا اور انہیں قلمبند کرتا رہتا۔اس طرح ''رحلہ'' لکھی گئی۔

ابن بطوطہ جس دنیا کو جانتا تھا اسے جلد ہی ختم ہونا تھا۔1346ء میں پلیگ کی مہلک بیماری نے سب کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ایک زہریلی کالی مکڑی کی طرح وہ سارے کرۂ ارض پر چلتی رہی۔ تمام شہروں کی آبادیوں کو نیست ونابود کرتے ہوئے۔اس نے لوگوں کو یوں ڈس لیا کہ افریقہ، ایشیاء اور یوروپ پوری ایک نسل تک پھر ترقی کی منزل طے نہ کرسکے۔یہی وہ کمزور اقوام تھے جنہیں سمرقند کے امیر تیمور لنگ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

بیالیسواں باب

اصفہان پر ہلال

مسلم ایشیاء کے سیاسی ارتقاء میں ایران کا مرکزی کردار رہا ہے۔اس کی دین ہے اسلام کی روحانی وراثت کا تحفظ اس میں از سرنو روح پھونکنا، اور اس کی اشاعت کرنا۔ایران نے یہ کام اپنی زبان، فنون لطیفہ اور تعمیرات کے ذریعہ کیا۔ جہاں عربوں نے اسلام کی عظیم الشان عمارت کو مقصد العین کی بنیاد عطا کی۔ لیکن وہیں وہ ایرانی تھے جنہوں نے اسے حسن کی زینت بخشی اور روحانیت کی خوبصورتی سے سجایا۔ اس کامیابی کا بنیادی ذریعہ تھا فارسی زبان۔ یہ زبان مشرق کی عوامی زبان اور ایران، ترکی، وسط ایشیاء، افغانستان اور برصغیر ہندو پاک کے شاہی خاندانوں کی درباری زبان رہی۔ایران تصوف کا سرچشمہ رہا۔ منگولوں اور تاتاریوں کی تباہیوں و بربادیوں کے بعد اسی چشمہ نے اسلامی سرحدوں کو دور دور تک پھیلا دیا۔سچ تو ہے کہ ایران کی ہی سرزمین پر اسلام کی روح کو از سرنو دریافت کیا گیا۔

ایرانی سرزمین کو جغرافیائی حیثیت سے ایشیائی سرزمین کے شطرنج میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ایرانی سطح مرتفع بحر کیسپیئن سے شروع ہوتا ہے۔بحیرۂ روم سے چین و ہندوستان کے لئے گذرنے والے تمام زمینی راستوں پر اسی کی بالادستی ہے۔قرونِ وسطیٰ کے دوران مصر میں اسکندریا اور شام میں الپو کی تجارتی راہگذاریں ایران سے ہی گذرتی تھیں۔

شمالی راستے ایران کے شمال مغرب میں واقع تبریز کو وسط ایشیاء کے بخارا اور سمرقند سے جوڑتے تھے۔اس طرح یہ راہیں سلک شاہراہ سے جڑ کر براہِ سنکیانگ چین تک چلی جاتی تھیں۔جنوبی تجارتی راہگذار اصفہان کے ذریعہ کابل پہنچتے ہیں تو وہاں سے ہندوکش کے دروں سے ہوتے ہوئے گنگا کے وسیع وعریض میدانی علاقوں میں پھیل جاتے تھے۔ان تجارتی شاہراہوں سے بڑے بڑے کارواں گذرتے اپنے ساتھ قرون وسطیٰ کے ممالک کی تیار کردہ اشیاء بھی لے جاتے تھے۔ عالم، فاضل مہم جو اشخاص ان کاروانوں میں شامل ہوتے تھے۔اس طرح ایران نظریات کی ایک بھٹّی بن گیا۔ یہاں اس کے اپنے نظریات کے ساتھ چین، ہندوستان اور بحیرۂ روم کی دانشوری بھی ایک ساتھ پگھلتی تھی۔کسی بھی بڑے فاتح کے لئے ایرانی بالائی علاقوں پر تسلط حاصل کرنا انتہائی اہم تھا۔یہاں سے اسکو مشرق یا مغرب میں کہیں بھی حملہ کرنے کی استطاعت حاصل ہوجاتی۔منگولوں کے ہلاکو خان اور تاتاریوں کے تیمور لنگ نے اپنے حملوں سے اس بات کی سچائی کو ثابت کردیا۔

جنگ القادسیہ جو کہ 636ء تا 637ء میں ہوئی اس جنگ نے ایران کے مرکز کو مسلمانوں کی پیش قدمی کے لئے کھول دیا۔نہاوند کی جنگ (642ء) نے فتح کو اور زیادہ مضبوطی سے جوڑ دیا۔ 751ء تک مسلم افواج نے جنگ طلاس میں چین کی مزاحمت کو ختم کردیا۔اس وقت اسلامی سلطنت کی سرحدیں مشرق میں دریائے سندھ سے پرے اور شمال میں دریائے اوکسس تک پھیل ہوئی تھیں۔آتش پرست ژورستانی دنیا جو ایک زمانے میں بہت طاقتور تھی۔اس قدر کہ ایتھنس (Athens) سے لے کر کابل تک اس کا سامنا کرنے والا کوئی نہ تھا۔یہ سلطنت اب طویل اسلامی دنیا کا ایک حصہ تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اولین صحابہ کرامؓ فارس سے تھے۔ان کا نام ساری کے مسلمان انتہائی ادب واحترام سے لیتے ہیں۔حضرت سلمان فارسیؓ ایسے ہی ایک صحابی ہیں۔اموی حکومت کے پہلے پچاس سالوں کے دوران، فارس کی سرزمین پر اسلام کا پھیلاؤ کچھ دھیما رہا۔عربوں نے انہیں اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جب تک کہ وہ جزیہ ادا کرتے رہے۔اور حکومت کے قوانین پر چلتے رہے۔دمشق کے خلفاء کی اولین فکر محصول کی وصولی تھی۔ اشاعت اسلام کی انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔فاتح

عربوں نے اپنی قبائلی معاشرتی سرحدوں کی حفاظت انتہائی شدت سے کی۔ کچھ ایرانیوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔عرب ان کے ساتھ موالیوں یعنی جن کی حفاظت کی جاتی ہے کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک ایسی اصطلاح تھی جس کے ذریعہ نومسلموں کوقوم میں اوروں سے کم تر معاشرتی مقام دیا جاتا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (انتقال 619ء) کے خلیفہ بننے کے بعد یہ صورتِ حال بدل گئی۔ اموی خلفاء میں وہی ایک واحد شخصیت تھے جنہوں نے عوام تک پہنچنے کی کوشش کی۔انہوں نے امتیاز برتنے والا ٹیکس ختم کر دیا۔انہوں نے ایرانیوں کو وہی عزتمندانہ مراعات عطا کیں جو کہ عرب امراء کو حاصل تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ تیزی کے ساتھ اسلام قبول کرنے لگے۔ 750ء میں جب عباسی انقلاب اٹھا تو ایرانی عنصر نے طاقت کا توازن عباسیوں کے حق میں کر دیا۔اس انقلاب کے اولین رہنماؤں میں سے ایک ابومسلم تھا۔ یہ ایک ایرانی فوجی جنرل تھا اپنے فن کا یکتا اور ثابت قدم۔

ایرانی ایک قدیم تہذیب کے امین تھے۔ایک ایسی تہذیب جو چینی اور ہندوستانی تہذیب وتمدن سے گہرائی کے ساتھ آپسی عمل اور ردعمل میں مبتلا رہی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ترقی یافتہ ٹکنالوجی لائے۔ زراعت کے بہتر طریقے،آفاقی فلاسفی،حساب،فلکیات اور حکومتی نظام میں انتہائی پراثر نظم لے آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران ہی مسلم قوم میں ان کی موجودگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ حضرت سلمانؓ ہی تھے جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجھاؤ دیا کہ مکہ والوں کے حملہ کو روکنے کے لئے مدینہ کے اطراف دفاعی خندق کھودی جائے۔اس کی وجہ سے جنگ میں نمایاں فرق آ گیا۔اس کو جنگ خندق کہا جاتا ہے۔ایرانیوں کی قالین بُننے کی مہارت نے ابتدائی دور میں حضرت عمر بن الخطابؓ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ جنگِ مدائن کے بعد ایک انتہائی خوبصورت قالین ایران کے صدر مقام سے مدینہ لایا گیا جسے فرش نو بہار کہا جاتا تھا۔آگے آنے والی صدیوں کے دوران بغداد کے خلفاء اور اطراف کے صوبہ جات کے ایرانی شاہی خاندانوں نے قالین سازی کی حوصلہ افزائی کی۔خلفاء نے نظم ونسق، کے ایرانی طریقوں کو اپنایا۔ یروشلم میں قبۃ الصخر Dome of Rock کی تعمیر میں بازنطینی اور ایرانی طرز تعمیر کو استعمال کیا گیا۔بنوامیہ کے دور میں زمین دوز پانی کی Aqueducts نالیوں کی تعمیر میں بھی اس کا بہت

زیادہ استعمال کیا گیا۔ ایران کے زرتشت بھی آسماں کی وحدت کا تصور رکھتے تھے۔ عربوں نے انہیں "اہل کتاب" کا درجہ دے رکھا تھا۔ یہ عیسائیوں اور یہودیوں کو دیئے گئے درجہ کے مساوی ہے۔

ایرانیوں نے بہت ہی جلد انتہائی دانش مند لوگوں کی حیثیت سے دنیا میں اپنے وجود کا احساس کروا دیا۔ عربوں نے اپنی فوجی چھاؤنیاں بنا رکھی تھیں۔ وقت کے ساتھ یہ صاحب علم وفراست رکھنے والی شخصیات کے مراکز بن گئے۔ اسلام قبول کرنے والے ایرانیوں کی اکثریت ان چھاؤنیوں کو ہجرت کر گئی۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں بسنے والے عربوں کے ساتھ مذہبی اور تمدنی ربط پیدا ہو سکے۔ جیسے جیسے یہ شہری چھاونیاں پھیلتی گئیں ویسے ہی اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ مذہب میں نئے نئے داخل ہونے والوں کے لئے معاشرتی اور قانونی دائرۂ کار کی تشریح کی جائے۔ دوسری اقوام کے ساتھ ان کے ربط کی وجہ ہونے والے باہمی اثر اندازی کے حدود بھی معین کئے جائیں۔ اس ضرورت نے فقہ کے سائنس کو جنم دیا۔ کوفہ جو کہ عربی زبان بولنے والی اور فارسی زبان بولنے والی دنیا کی سرحدوں پر واقع تھا۔ علمی درس کے مرکز کے علاوہ دانش ور لوگوں کا مرکز بن چکا تھا۔ ایسے ہی ایک دانش ور تھے امام ابوحنیفہؒ جن کے نام نامی سے حنفی مسلکِ فقہ منسوب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ افغان ایرانی نسل سے تھے اس لئے وہ قوم کے غیر عرب حلقہ کے تفکرات یا جذبات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہوں نے اور ان کے شاگردوں نے جس فقہ کے مسلک کی تدوین کی وہ انہی اجتہادی کاوشوں کا آئینہ ہے۔

وہ عباسی خلیفہ مامون (انتقال 833ء) کا دور تھا جب ایرانی عباسی سلطنت میں ایک فیصلہ کن سیاسی طاقت بن گئے۔ مامون نے اپنے بھائی امین (810ء تا 813ء) پر خلافت کی جانشینی کے لئے جو فتح حاصل کی۔ اس فتح میں ایرانیوں کا زیادہ عمل دخل تھا۔ مامون کی افواج میں بے شمار ایرانی شامل تھے۔ طاہر نامی اثر آفریں سالار ان کی قیادت کر رہا تھا۔ فاتح خلیفہ نے طاہر کی اس وفاداری کے لئے نوازتے ہوئے اسے جنوبی عراق کا گورنر مقرر کیا۔ بنوطاہر جلد ہی آزاد حکمران بن گئے۔ انہوں نے بغداد سے اپنی وفاداری برقرار رکھتے ہوئے بنوطاہر کے شاہی سلسلے ہی بنیاد رکھی۔ انہوں نے فارس کے درباری آداب کو رواج دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی فارسی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے فروغ دیا۔

دسویں صدی عیسوی تک دریائے دجلہ کے مشرق میں ایرانیوں کی تعداد عربوں سے زیادہ ہوگئی۔ مسلم قوم کے سیاسی، لسانی اور دانش وارانہ تناظر پر ایرانیوں کی دوراندیشی کا بہت زیادہ اثر رہا ہے۔ بنوطاہر نے ایرانی شاہی سلسلے (820ء تا 822) کی بنیاد ڈالی۔ اس حکومت کا صدر مقام نیشاپور تھا، الخوارزمی (انتقال 862ء) جیسے حساب دانوں اور الطبری جیسے مؤرخوں کی سرپرستی فارس کے درباروں نے ہی کی۔

فقہ اور حدیث کے سائنس عرب کی طرح فارس میں بھی پھلتے پھولتے رہے۔ عظیم ترین محدثین میں سے ایک امام البخاری (انتقال 869ء) اسی دور میں خراسان میں رہا کرتے تھے۔ امام البخاریؒ نے عالم اسلام کا دورہ کیا۔ تین لاکھ سے زیادہ احادیث کو جمع کیا۔ مکمل تحقیقات اور چھان بین کے بعد تقریباً سات ہزار احادیث کو صحیح قرار دیا۔ ان کی جمع کردہ احادیث اسلامی سائنس کا ایک مستندترین مجموعہ ہیں.اس کو وہی درجہ حاصل ہے۔ جیسا کہ امام جعفر الصادقؒ امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ، امام مالک بن انسؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی جمع کردہ احادیث کو حاصل ہے۔

ایرانی سیاسی اثر بنی بویہ کے دور میں اپنی انتہاء کو پہنچا۔ بنی بویہ نے جنوبی عراق میں عروج حاصل کیا۔ 932ء کے دوران دور دراز کے علاقوں کے لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کے ساتھ ہی سلطنت کے کششِ ثقل کا مرکز بغداد سے دور ہوتا گیا۔ یہ مشرق میں فارس اور مغرب کے صوبوں کو منتقل ہوتا گیا۔ درباری سازشوں نے خلافت کی طاقت کو کمزور کردیا تھا۔ مصر کے بنو فاطمہ کی جانب سے فوجی طاقت کا دباؤ بڑھتا گیا۔ عباسی خلیفہ مستکفی کسی بھی جانب سے مدد حاصل کرنے کے لئے مجبور تھا۔ اس نے بویہ شہزادے احمد کو فاطمی خطرہ کے خلاف بغداد کے دفاع کرنے کی دعوت دی۔ بنی بویہ جو کہ اثنا عشری فقہ کو مانتے تھے۔ انہیں بغداد کے سنی خلفاء کی سرپرستی حاصل ہوجانے سے حد سے زیادہ خوشی حاصل ہوئی۔ احمد کو شاہی دربار سے معزالدولہ کا خطاب عطا ہوا اور سلطنت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ دے دی گئی۔ کئی برسوں تک ایران کے بنوبویہ بغداد پر عملاً حکمرانی کرتے رہے، آخرکار سلجوقیوں نے بنوعباس کو بویہ کے ہاتھوں سے نجات دلائی۔

خراسان کے بنوسمنی (910ء) کے دور حکومت میں فارسی زبان، فنون لطیفہ اور عمارت سازی کا فن اپنی انتہا کو پہنچا۔ سمرقند، بخارا، نیشاپور، مشہد اور ہیرات جیسے شہروں نے ایسی ترقی کی کہ یہ علم وفنون حاصل

کرنے کے میعاری بین الاقوامی مرکز بن گئے۔ سمنویوں کی سرپرستی نے سائنس اور علم کے میدان میں مشہور شخصیات کو جنم دیا۔ابونصر الفارابی (انتقال 950ء) اور ابوعلی ابن سیناء (انتقال 1037ء)اس کی زندہ مثال ہے۔غزنویوں نے جب سمینوں کو اقتدار سے ہٹایا۔(962ء تا 1026ء) تو انہوں نے بھی فنون کی سرپرستی جاری رکھی۔محمود غزنوی نے اپنے صدر مقام کو فنون اور تہذیب وتمدن کا روشن منارہ بنا دیا۔ مشہور مؤرخ اور واقعات کو تاریخ وار لکھنے والا البرونی (انتقال 1048ء) محمود کے دربار سے وابستہ تھا، فارسی کا مشہور شاعر " شاہ نامہ " کا مصنف فردوسی غزنی میں رہا کرتا تھا۔فردوسی نے شاہ نامہ لکھا یہ ایک شہکار نظم ہے اس میں اسلام کے آنے سے پہلے ایران کی مشہور شخصیات کے کارناموں کو اجاگر کیا اور محمود کی تعریف کرتے ہوئے اس کو ان دوسری تمام شخصیات کے بہترین کارناموں سے بھی برتر کارنامے انجام دینے والا ثابت کیا۔

یہ عظیم شاعر سلطان کے جانب سے بہت ہی کم انعام ملنے پر مایوس ہوگیا اس نے ایک ہجو لکھی اور اسے بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔سلطان محمود اس وقت ہندوستان کی مہم سر کر رہا تھا اس ہجو کو پڑھتے ہی وہ شرمندہ ہوا اور فردوسی کو انعام واکرام سے نواز دیا۔لیکن فردوسی ان انعامات کو حاصل کرنے کے لئے زندہ نہ رہا۔انعامات سے لدے اونٹ جب غزنی شہر کے ایک دروازے سے داخل ہورہے تھے تو دوسرے دروازے سے فردوسی کی میت دفنانے کے لئے لے جائی رہی تھی۔

لیکن وہ مغل سیلاب تھا جس نے اسلامی تاریخ کے تناظر کی کایا پلٹ دی۔ایرانی عنصر کو اسلام کے دانش ورانہ عمل کی اولین صف میں لا کھڑا کیا۔جب چنگیز خان 1219ء میں ایشیاء کے پہاڑی علاقوں سے فرغانہ کی وادی میں آیا اس وقت اسلامی تہذیب بنیادی طور پر شہروں سے ہی وابستہ تھی۔فارس اور وسط ایشیاء میں جیسے جیسے اسلام قبول کرنے کا عمل تیز ہوتا گیا ویسے ہی دیہی آبادی شہروں کی جانب تیزی سے ہجرت کرنے لگی۔اس عمل کی اولین وجہ اقتصادی صورت حال تھی۔ سرکاری سرپرستی بھی چند بڑے شہروں تک مرکوز تھی۔اسی لئے ان شہروں کی جانب دانشور اور کسان سبھی کھنچے چلے آنے لگے۔شہروں میں اس معاشرتی باہمی عمل درعمل نے ایک نئی صورتِ حال پیدا کردی۔یہاں شرعی حدود کی حکومت اور مسالکِ فقہ

کے قانونی پہلوؤں پر زیادہ زور دینے کی ضرورت آن پڑی۔عربی قرآن کی زبان تھی ۔فقہ کے مختلف مسالک اور تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان بھی یہی تھی۔

چنگیز خان نے علم وعرفان کے شہری مراکز کو تباہ و برباد کر دیا۔کچھ شہروں کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی قتل کر دی گئی۔ بارونق شہر ویرانوں اور منگولوں کے گھوڑوں کے چراگاہوں میں تبدیل ہو گئے۔ مساجد اور مدارس سب کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔عربی زبان بولنے والے شرفاء وعلماء وغیرہ یا تو مقتول ہو گئے یا انہوں نے بھاگ کر ہندوستان مصر اور اناطولیہ میں پناہ لے لی۔جب عربی تہذیب وتمدن کے شہری مراکز مٹ گئے تو برباد شدہ قوم کی قیادت کا سہرا دیہی عوام کے سر آ گیا-ان کی بول چال کی زبان فارسی تھی ۔اور ایرانی تناظر کے علاقوں سے،انہیں کی جھونپڑیوں اور ٹوٹے پھوٹے گھروں سے ایک بار پھر اسلام ابھرا، فاتحین کو فتح کرنے کے لئے اس کے پیغام کو ایشیاء،افریقہ، یوروپ کے دور دراز واقع کونوں تک پہنچانے کے لئے۔

تاریخی بہاؤ نے اسلامی دنیا کو ایسے ہی حوادث سے نپٹنے کے لئے تیار کیا تھا۔صحرائے گوبی سے منگولوں کے اتر آنے سے ایک سو سال پہلے اسلام کا دل دوسری دھن پر رقص کر رہا تھا۔وہ قاضیوں اور علماء کی دھن تھی جو فقہ کے مہین ترین چھوٹے سے چھوٹے مسئلے پر بھی حد سے زیادہ زور دے رہے تھے۔

امام الغزالیؒ (انتقال 1111ء) شاید اسلام کے پہلے ہزار سالہ دور کی سب سے اہم اور واحد شخصیت تھی جس نے اسلامی علوم کی تکمیل کی۔انہوں نے تصوف کو اسلامی علوم کے سرچشمے میں مدغم کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ خود اپنی ذاتی مثال سے انہوں نے تصوف کو اسلامی طرز حیات کا مرکز ومنبع بنا دیا۔ان کی کوششوں سے اسلام کا روحانی حجم تیزی سے ترقی پذیر ہونے لگا۔اس روحانیت کے علمبردار تھے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (انتقال1186ء) جو اپنے عہد کی انتہائی قدآور شخصیت تھی۔

حضرت شیخ ابومحمد محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی پیدائش 1077ء میں جیلان میں ہوئی۔ یہ شہر ایران کے شمال میں واقع ہے۔ یہ دور بے حد دانشورانہ ہل چل کا دور تھا۔حضرت شیخ نے اپنی ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے ہی حاصل کی۔ 1095ء میں جبکہ آپ ابھی اٹھارہ سال کے نوجوان ہی تھے۔ بغداد کی

جانب چل پڑے آپ کو علم کی پیاس اور تربیت کی تڑپ اس منزل کی طرف لے گئی آپ نے اپنے دور کے یکتائے روزگار علماء اور شیوخ سے اکتسابِ علم حاصل کیا۔ ان جید علماء میں حضرت شیخ ابووفا ابن عقیلؒ، حضرت شیخ محمد البقلانیؒ اور حضرت شیخ ابوزکریا تبریزیؒ شامل تھے۔ پچاس سال کی عمر میں آپ کو حضرت شیخ قاضی ابی سعید المکرّمیؒ نے درس کی اجازت دی اور آپ نے بغداد میں شیخ قاضی ابی سعیدؒ کے مدرسہ میں مہتمم اعلیٰ کی حیثیت سے درس شروع کیا۔

بہت جلد حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ مدرسہ کا صحن آنے والے مجموعہ کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ اسی لئے آپ جامع مسجد میں درس دینے لگے۔ جلد ہی جامع مسجد کا صحن بھی ناکافی ثابت ہونے لگا تو آپ نے درس وتدریس کے مقام کو شہر کے باہر ایک کھلے میدان میں منتقل کر دیا کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخؒ کو سننے کے لئے اکثر اوقات شہر سے ستر ہزار سے زیادہ لوگ آیا کرتے تھے۔ محرّر آپ کے خطبات لکھ لیتے اور آئندہ نسل کے لئے محفوظ کر دیا کرتے۔

حضرت شیخؒ کے خطبات میں اسلامی طرز زندگی کے ہر ایک رخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کلام، حدیث، فقہ، تفہیم القرآن، اخلاقیات، سیرت النبیؐ اور تصوف پر انہوں نے سیر حاصل خطبات دیئے ہیں۔ وہ شریعت پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کے قائل تھے۔ جو شرعی احکامات پر مکمل طور سے عمل نہیں کرتے تھے انہیں برمحل ٹوک دیا کرتے۔ وہ زمانہ روحانیت کے گہرے ماحول میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ نام نہاد علماء نے یہ اعلان کیا کہ مذہب پر ان کی خصوصی توجہ دیئے جانے کی وجہ سے انہیں نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسے فرائض کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ان لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور خبردار کیا کہ ہر وہ موقف جس کی بنیاد شریعت نہ ہو کفر ہے۔ ''الفتوح الربانی'' میں حضرت شیخؒ نے تصوف کی جو تشریح کی ہے وہ روحانیت کا لافانی سرچشمہ ہے۔ اس کتاب نے آٹھ سو سالوں سے مسلمان اور غیر مسلمین دونوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کیا ہے۔ حضرت شیخؒ کی نرم طبیعت نے انہیں غریبوں کا دلدادہ بنا دیا۔ ان کی راست گوئی اور دیانت داری کی وجہ سے اعلیٰ اور طاقت ور سبھی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سلاطین اور شہنشاہ ان سے ملاقات کرنے اور فیضان پانے کے لئے ان کے در پر کھڑے رہتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے فیض پانے والے صوفی عارفوں کی ایک دھنک بارویں تیرہویں اور چودھویں عیسوی میں قائم ہوگئی۔ 1186ء میں حضرت شیخؒ کے انتقال کے بعد شاگردوں نے آپکا پیغام اسلامی دنیا کے دور دراز کونوں تک پہنچایا۔ ان کے روحانی اور معاشرتی نظریات کو ٹھوس شکل دینے کے لئے قادریہ صوفی طریقہ قائم کیا۔ مختلف طریقوں میں یہ اولین طریقہ ہے جسے تیرہویں صدی عیسوی کے بعد اسلامی تناظر پر حاوی ہونا تھا۔ قادریہ طریقہ کی تابکاری پرانی دنیا کے ہر ایک براعظم پر اثر انداز رہی یہ لاکھوں لوگوں کو اسلام کے آغوش میں لانے کا باعث بنا۔ ابھی حال ہی میں انیسویں صدی کے دوران عثمان دان فدوئیؒ اس عظیم شیخؒ کے نظریات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مغربی افریقہ میں منصفانہ معاشرتی نظام قائم کرنے کے لئے طویل اور مسلسل جدوجہد کی۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس عظیم شخصیت کو غوث الاعظم دستگیرؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے انہیں یہاں آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اولین صحابہ کرامؓ کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا جاتا ہے۔

عالم اسلام پر منگولوں کی غارت گریوں، تباہیوں، بربادیوں کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور ان کے فوراً بعد آنے والے صوفیوں کی محنت نے عالم اسلام کو پھر سے سنبھالا، اس کے زخموں پر مرحم رکھا۔ انہی کی کوششوں نے اسلام کو از سر نو زندگی بخشی۔ 1219ء سے 1250ء تک یعنی ایک پوری نسل تک منگولیا کے گھڑسوار یوروپ وایشیاء کے براعظموں میں آزادانہ گھومتے رہے۔ ہر طرف پرانے شہروں کو غارت کرتے ہوئے تمام معاشروں کو نئی شکل، نیا روپ دیتے ہوئے اور از سر نو تبدیلی کی جانب مائل کرتے ہوئے ادھر مغرب کی طرف متوازی طور پر صلیبیوں کی جانب سے درپیش خطرہ بھی کچھ کم خطرناک نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ صلیبیوں نے منگولوں کو عیسائی بنانے کی بھرپور کوشش کی یا کم از کم انکے ساتھ ایک ایسا معاہدہ طے کرنے کی کوشش کی جسکا واحد مقصد اسلام کو مکمل طور سے ختم کرنا تھا۔ 1261ء عینِ حلوت کی جنگ کے بعد عالم اسلام پر فوجی خطرہ تو کم ہوگیا لیکن غیر اسلامی نظریات کے ہاتھوں میں اسلامی ایشیاء کے چلے جانے کا خطرہ باقاعدہ بنا رہا۔

ایسے اندھیرے دور میں وہ تصوف ہی تھا جس نے آگے بڑھ کر اس چیلنج کا مردانہ وار سامنا کیا اور

دنیائے اسلام کو پیش آنے والے سب سے سنگین لمحات میں اسلام کو بچایا۔ تصوف کی انتہائی ذہانت اسکی وجد آفریں باطنی کردار میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ دلوں کا اسلام ہے دماغوں کا نہیں۔منگولوں کے ساتھ ہی اس شہری تمدن کا خاتمہ ہوگیا جو فقہ اور فتویٰ کی شاندار اسلامی عمارت کو سہارا دیئے ہوئے تھا۔ اب قیادت کا جو ادیہی عوام کے کندھوں پر آن پڑا جہاں اسلام کی بنیاد جذباتیت اور پرجوش محبت سے عبارت تھی۔ قادریہ اور دوسرے سلسلوں کی جانب سے قائم کردہ خانقاہیں اسلامی زندگی کا مرکز بن گئیں۔ کسی بھی خانقاہ کے پانچ اہم نمایاں مقاصد ہوتے۔اول تو وہ ایک مسجد ہوتی تھی جہاں اہل ایمان نماز کا فرض ادا کرتے۔دوسرے وہ ایک مدرسہ تھی جہاں قرآن اور فقہ کا سائنس پڑھایا جاتا۔ تیسرے وہ ایک پرسکون گوشہ تھا یہاں لوگ تنہائی میں باطن کی جانب اپنے احساسات کو مرکوز کرتے یا ذکر کے لئے جمع ہوتے۔ چوتھے یہ ایک ایسی جگہ ہوا کرتی تھی جہاں پر افراد کے کردار کو از سرنو ڈھالا جاتا۔ شیخ کی نگراں نگاہوں کے سامنے، بےلوث خدمت، اعلیٰ حوصلگی، بلند ہمتی، اللہ تعالیٰ کے حضور مکمل خود سپردگی اور زندگی کو آفاقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی تعلیم یہاں دی جاتی۔ پانچویں یہ ایک مسافر خانہ بھی ہوا کرتا تھا یہاں پر تھکے ماندے مسافر سستایا کرتے۔اکثر یہ وقت کے ستم گر ہاتھوں سے بچ کر بھاگنے والے خاندانوں کے لئے ایک پناہ گاہ ثابت ہوئی تھی۔ایران کے روح پرور اسلام نے اسے درپیش چیلنجوں کا سامنا آسانی سے کرلیا۔جب 1295ء میں منگول ال خان غزان نے اسلام قبول کرلیا تو اس کے قبول اسلام کے ساتھ ہی ایران ایک بار پھر اسلامی زندگی کی صفِ اول میں شامل ہوگیا۔

ایران کی سرزمین سے اسلام ہندو پاک میں پھیلا، ملیشیاء اور انڈونیشیاء کے جزائر کے مجموعہ پر اپنا عکس اور اثر اس نے ڈالا۔ ادھر مغرب کی جانب براعظم افریقہ میں صحراء کے زیریں حصوں میں اسلام غلبہ حاصل کرنے والے مذہب کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا۔منگول تاتار غارتگری کے بعد عثمانیہ ترک جو ابھرے تو وہ بھی تصوف سے سرشار تھے۔صوفیانہ تصورات کی بھٹی میں تپ کر صفویہ شاہی سلسلہ ایران میں ابھر آیا۔

اب جبکہ وہ شہری تعلیمی مراکز تباہ ہوچکے تھے جہاں عربی تعلیمی زبان تھی تو اس کی جگہ فارسی زبان نے لے لی اور وہی تعلیم کا ذریعہ بن کر ابھری۔فارسی زبان وجد آفریں اور کیف آور اسلام کے اظہار کا ذریعہ بنی

رہی۔ فارسی زبان کا اسلام کے ساتھ پانچسو سالوں سے رابطہ رہا ہے۔اس قربت کی وجہ سے زرخیز عربی لغات کا گہرا اثر فارسی پر پڑا۔ اس طرح اب اسلامی دنیا میں مرکزی کردار ادا کرنے کی باری فارسی زبان کی تھی۔نازک احساسات وجذبات سے پرشاعری اور جلال و جمال سے بھری نثر نے اول تو تیموریہ اورصفویہ دورحکومت میں اور پھر مغلوں اور عثمانیہ ترکوں کے زمانے میں ایک جادوسا جگا دیا۔یہ دور فارسی زبان کا تھا۔ اس کی شاعری اور نثر کا تھا، دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی شاعری، جلالی وجمالی عکس کا نچوڑ، نثر نگاری اس دور میں اپنے کمال کو پہنچی، لوگوں کے جذبات، خیالات اور احساسات کے اظہار کا آئینہ بنی۔

مولانا محمد خداوندگار جلال الدین رومیؒ جن کا شمار شاید فارسی کے عظیم ترین شعراء میں سے ہوتا ہے ان کا اثر آج اس جدید دنیا میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔منگولوں سے پہلے کی اسلامی تہذیب شہری اور تجربی تھی منگولوں کے بعد اس تہذیب کی جگہ دیہی جوش وجذبات سے پر تہذیب نے لے لی۔اس اثر آفریں تہذیب کا بہترین آئینہ، اسکا اعلیٰ وارفع نمونہ مولانا رومیؒ نے پیش کیا۔اس ولولہ خیز اور دلوں میں ہیجان پیدا کرنے والے تمدن کو ان سے بہتر انداز سے کسی اور نے پیش نہیں کیا۔انہوں نے اس روحانی قلبی و باطنی تہذیب کو اعلیٰ مقام عطا کر دیا۔ان کا اسلامی نام محمد تھا۔خداوندگار اور جلال الدین ان کے خطابات تھے۔ انہیں رومی اس لئے پکارا جاتا ہے کہ ان کا رہائشی مقام قونیا تھا۔یہ مقام جس صوبہ میں تھا اسے اس دور میں ''رُم'' کہا جاتا تھا۔جس کا مطلب تھا پرانی رومی سلطنت کا ایک صوبہ۔ان کے شاگرد انہیں مولانا کہا کرتے تھے۔مولانا کا مطلب ہے ہدایت یافتہ بزرگ۔ان کی پیدائش 1207ء میں افغانستان کے بلخ شہر میں ہوئی۔ان کے والدین ایرانی وافغانی نسل کے تھے۔ان کے والد بہاؤ الدین ولاد ایک مشہور عالم تھے۔ کبراویہ طریقہ کے صوفی تھے۔مقامی لوگ انہیں عزت واحترام سے دیکھا کرتے۔حساس ذہین کے مالک رومی نے بچپن ہی میں اپنے والدین کے علم وروحانیت کی دولت کو اپنے آپ میں جذب کرلیا۔لیکن منگولیا سے اٹھنے والے آگ کے طوفان نے جلد ہی بلخ کے امن کو ختم کر دیا۔جیسے ہی چنگیز خان خراسان پر نمودار ہوا اور ایران وافغانستان کی جانب پیش قدمی کرنے لگا تو بہاؤ الدین ولاد بھاگ کر نیشا پور پہنچے۔یہاں نوعمر رومی کی ملاقات مشہور زمانہ صوفی وشاعر فرید الدین عطارؒ سے ہوئی۔انہوں نے کلاسکل تصنیف ''منطق

الطائر"، لکھی ہے۔ کمسن لڑکے میں عطار نے دانشوری کی جھلک دیکھی اور اپنی تصنیفات تحفۃً اس کو عطا کیں
بہت جلد ہی منگولوں کے تباہ کن سیلاب نے پورے فارس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہاؤالدین ایک بار پھر اپنے خاندان سمیت بھاگے۔ اب کے انہوں نے بغداد میں پناہ لی۔ شیخ بہاؤالدین کے آنے کی خبر قونیا کے حکمران قیقباد تک پہنچی۔ قیقباد دانشوروں کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے بہاؤالدین کو قونیا میں بس جانے کی دعوت دی۔ رومیؒ کا خاندان اناطولیہ کے لئے چل پڑا۔ انہوں نے مکہ اور مدینہ کا سفر کیا۔ سفر کرتے کرتے حج بھی ادا کیا۔ شیخ بہاؤالدینؒ کا انتقال 1231ء میں ہوا۔ انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ کا نگرانِ اعلیٰ کم عمر جلال الدین کو مقرر کیا۔

1232ء میں رومیؒ نے شیخ برہان الدین محقق ترمذیؒ سے ملاقات کی۔ آپ شیخ بہاؤالدین کے شاگرد تھے اور پھر مرید بھی بن گئے تھے۔ رومیؒ نے علم الکلام، حدیث، فقہ، تفہیم القرآن، عربی وفارسی قواعد اور تصوف پر عبور حاصل کیا۔ لیکن وہ روشنی جس نے مولانا رومیؒ کی وجد آفریں روح پرور شاعری کو جلا بخشی وہ شیخ شمس الدین تبریزؒ کی شخصیت تھی۔ مولاناؒ نے شیخ تبریزیؒ سے 1245ء میں ملاقات کی۔ دونوں کے درمیان ایک روحانی دوستی ہوگئی جس نے انہیں روحانی شاعری کی تخلیق پر اکسایا۔ 1247ء میں جب شیخ تبریزیؒ قونیا سے غائب ہوگئے تو مولاناؒ حد درجہ غمگین ہوئے۔ اناطولیہ اور شام کی جانب ان کے تلاش کے لئے سفیر روانہ کئے۔ یہ تلاش بیکار ثابت ہوئی۔ لیکن شیخؒ نے مولاناؒ کی روحانیت کے سمندر کو بیدار کر دیا تھا۔ جس طرح چودھویں کا چاند سمندروں کی لہروں میں مدّ وجزر پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح مولانا نے اپنے روح پرور جذبات کو اپنی شاعری کے مجموعہ "دیوانِ شامِ تبریزیؒ" میں انڈیل دیا۔ یہ ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جس کی مثال غنائیت موزونیت، دردِ دل اور روحانیت کے لحاظ سے اور کہیں نہیں ملتی۔

مولاناؒ رومی کو جس چیز نے عالمی شہرت کا مالک بنایا وہ ان کی مثنوی ہے جو ستائیس ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ مولانا رومؒ نے عربی اور فارسی زبانوں کے صحیفے اور کلاسکل دیوان کھنگال ڈالے۔ اس بحرِ ذخار میں ڈوب کر آپ نے ایک ایسے قدیم اور ہم آہنگ سروں سے بھرپور تخلیق پیش کی اس میں انسانی روح کی اپنے مالکِ حقیقی کی جانب سفر کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کا ایک ایک شعر اس قد

رخوبصورت ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی اس کی ایک ایک داستان بے مثال دانشوری سے بھرپور ہے۔

صوفیاء کرام کے حلقوں میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے بے پایاں سمندر سے ایک قطرہ محبت کا لیا اور انسانوں کی تمام ارواح کو بخش دیا لیکن اس کی بے پایاں محبت میں کوئی کمی بیشی نہیں آئی۔ اس ایک قطرہ محبت کو اس ذات پاک نے اپنی تخلیق کردہ تمام مردوں اور عورتوں میں یکساں طور پر تقسیم کیا۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ مولانا رومیؒ نے اس قطرۂ عشق حقیقی کے اصلی جوہر کو اپنی گرفت میں کرلیا ہے جس نے بنی نوع انسان کو سنبھالا دیا ہوا ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

مثنوی اسلامی تصوف کا خلاصہ ہے۔ اس نے اسلامی تہذیب وتمدن اور شاعری پر انتہائی گہرا اثر چھوڑا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس قوس پر جو کہ یوروپ، ترکی، ایران، وسط ایشیاء اور ہندو پاک برصغیر سے ہوکر گذرتا ہے۔ انتہائی جدید زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ فارسی زبان میں جس روحانیت کا اظہار ہوا ہے مولانا اسی روحانیت کے منتہائے کمال پر کھڑے ہیں۔ ان کی تحریریں صدیوں سے مسلم مصنفوں کو جوش وجذبات سے لبریز کرتی آئی ہیں۔ شمس الدین محمد حافظؒ جن کا انتقال 1391ء میں ہوا جیسی شخصیت روحانیت کی اس بلندی کے بس قریب ہی پہنچ پائی ہے۔ عبدالرحمٰن جامیؒ (انتقال 1492ء) اور محمد اقبالؒ (انتقال 1938ء) جیسی عظیم شخصیات نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس عارف دانا شخصیت پر اس سے زیادہ اور کیا عقیدت کے پھول نچھاور کئے جاسکتے ہیں کہ آج امریکہ میں سب سے مقبول شاعر شکسپئر یا ملٹن نہیں بلکہ مولانا جلال الدین رومیؒ ہیں۔

ایران کی وراثت روحانیت کا وہ نقشۂ اول ہے جو گذشتہ پانچ سوسالوں سے اسلام پر حاوی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت مولانا رومیؒ، حضرت بہاؤالدین نقشبندیؒ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ جیسے مشہور صوفیاء کرام، انسانوں اور مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ ثابت ہوئے۔ کیا غریب کیا امیر اور کیا شہنشاہ سبھوں نے ان کی تقلید کو اپنا فرض جانا۔ معماروں اور فنکاروں نے ان سے تخلیقی تحریک کا فیضان حاصل کیا۔ مصلح اور اصلاح کے مخالفین دونوں نے اپنی تحریکوں کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرنے کے لئے ان کے نام کو استعمال کیا۔ ایشیاء کا فاتح تیمور لنگ صوفیاء کرام کا

بے حد معتقد تھا استنبول کے فاتح عثمانیہ سلطنت کے شہنشاہ سلطان محمود کی تربیت ایک صوفی شیخ نے کی ایران کے صفویہ شاہی خاندان نے صوفی تحریک سے ہی متاثر ہوکر اقتدار حاصل کیا۔ مغل شہنشاہ اکبر اور جہانگیر حضرت شیخ سلیم چشتی کے اس قدر معتقد تھے کہ ان کی خانقاہ میں حاضری دینے کے لئے پیدل جاتے تھے۔ مغربی افریقہ میں عثمان دان فدوئی کی اصلاحی تحریک کا محرک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا نام گرامی تھا۔

منگولوں کے بعد جو تعمیرات ہوئیں ان پر ایرانی روحانیت کا اثر بالکل کھل کر صاف صاف نظر آتا ہے۔ اسلامی طرز تعمیر نے جنت کے تصور کو زمین پر پیش کرنے کی ایک سعی کی ہے۔ ماورائی جنت کی ایک جھلک کو انسانی یا مادی پیمانے کے انداز سے زمین پر پیش کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔ اس لئے جیومیٹری یعنی اقلیدس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول مقصدی اقلیدس دوم آفاقی اقلیدس، مقصدی اقلیدس حسابی طریقوں کے ظاہر کو پیش کرتا ہے۔ آفاقی اقلیدس ان کے باطنی مطالب کو اجاگر کرتا ہے۔ اس طرح ایک نقطہ خلاء یا جگہ کا خاتمہ نہیں جیسا کہ حساب میں اس کی تشریح کی گئی ہے بلکہ اس جگہ کے خلاء کا آغاز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے نام کو یاد دلاتا ہے۔ یہی تصور عربی اور فارسی زبانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک لکیر گھوم کر دائرہ بن جاتی ہے یہی دائرہ انصاف کی علامت بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی بھی سمت یا رخ کی طرف اشارہ نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

ماوراء کی جانب خلقی یا ابتدائی طور پر مرتکز ہونے نے مسلمان معماروں کو مساجد و میناروں کی تعمیر میں اقلیدس میں پوشیدہ کچھ ماورائی حسن کو اجاگر کرنے کی جانب راغب کیا۔ ایرانی فنِ تعمیر کی غیر معمولی ذہانت کی بہترین مثال یہ ہے کہ انہوں نے اس ماورائی ادارک کو مذہب کے دائرۂ کار سے باہر بھی لاگو کیا۔ خصوصیت کے ساتھ ماورائی اقلیدس کے علامتی مطالب پر زور دے کر اس کے ذریعہ گنبدوں اور مقبروں کی تعمیر کی۔ اس کا نتیجہ بے مثال حسن والے یادگاروں کی تعمیری شکل میں سامنے آیا۔ تیموریوں، صفویوں اور عثمانیہ ترکوں نے بزرگانِ دین اور بادشاہوں کے مقابر میں اسی فن تعمیر کا مظاہرہ کیا گیا۔ کوشش یہ کی گئی کہ اس تعمیر میں جنت کی کوئی ادنیٰ سی جھلک تو نظر آ سکے۔

یہ فنِ تعمیر شہنشاہ شاہ جہاں کے دربار میں اپنی انتہا کو پہنچا جس نے اپنی بیگم ممتاز کی یاد میں تاج محل تعمیر

کیا۔ یہاں ایسی حسین ترین، نازک ولطیف وہم آہنگ کاری گری دیکھنے میں آتی ہے جس کی دنیا بھر میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایسی تعمیر صرف اور صرف وجد آفریں اسلام میں ہی ممکن ہے۔ جس کی بنیاد یہی ہے کہ عالم بالا کی جانب سفر کا پہلا زینہ صرف عشق ہے۔ ظاہری مذہبی رسومات نہیں۔ اس کے برعکس، ایسی تعمیر کلاسیکل اسلام کے دور میں ممکن نہ تھی جو کہ صرف اور صرف اصول پرستی، عقلیت پسندی اور مذہبی رسومات کو ہی زیادہ اہمیت دیتا تھا کلاسیکل اسلام نے قانون کی عالیشان عمارت تعمیر کی۔ منگول دور کے بعد فارسی بولنے والے لوگوں نے اسی قانون کی شاندار عمارت کو ایک ایسے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا۔ جس پر سوار ہو کر انہوں نے عشق کی وہ یادگار حسین اور دلفریب یادگاریں تعمیر کیں جنہیں دیکھ کر انسانی عقل حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو فارسی بولنے والی دنیا کی جانب سے عالم اسلام کے لئے اہم ترین دین تھی ''زاویہ'' اور اسکا رائج کیا جانا۔ اسے ترکی میں ''ٹکے'' کہا جاتا ہے۔ ایرانیوں نے نہ صرف ''زاویہ'' کے اس رواج کو ایجاد کیا بلکہ تصوف کا سائنس بھی انہی کا رائج کردہ ہے+ زاویہ اور تصوف، اناطولیہ اور برصغیر کی عوامی زندگی کا ایک حصہ بن گئے اور قوم کی زندگی کے مرکزی ادارہ کی حیثیت سے ابھر آئے۔ ''زاویہ'' کی بنیاد مسجد مدرسہ کی گردان پر رکھی گئی ہے۔ یہ مسجد و مدرسہ اسلام کی ابتداء سے ہی موجود ہے۔ ایرانیوں، ترکوں، ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے اس کا دائرہ کار اور بڑھایا۔ اللہ تعالیٰ کی یاد کو اس میں شامل کیا۔ ذکر کے ذریعہ وجد آفریں مذہبی جذبہ کو پیدا کیا۔

دھیرے دھیرے زاویہ نوجوان تحریکوں کا مرکزی حصہ بن گیا۔ جہاں نوجوان بہادری، عزت، وفاداری، کمزوروں کی مدد، بلند ہمتی کی تعلیم حاصل کرتے۔ اور ان کے کردار کی تعمیر صوفی شیخ کی نگراں کار آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ ابن بطوطہ اپنی رحلہ میں ان زاویوں کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے۔ اس نے خصوصیت کے ساتھ اناطولیہ، ایران اور ہندوستان کے زاویوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ہر صوفی کا اپنا زاویہ ہوتا۔ اس مین نوجوان مرد وخواتین جمع ہوتے عبادت کرنے کے لئے، قرآن اور فقہ سیکھنے کے لئے، ''ذکر' کرنے کیلئے اور ایمان پر مبنی برادرانہ تعلقات استوار کرنے کیلئے۔ مثال کے طور پر ایک خطاط برسوں

کے تربیتی دور سے گذرتا ہے۔ یہ تربیت ہوتی ہاتھوں کے پٹھوں کو قابو میں کرنے کی، اپنے اوزار کی تیاری اور دیکھ بھال کی، اپنے کام کی جانب مکمل توجہ دینے اور اپنی روح کی طرف دھیان کو مرتکز کرنے کی۔ اس دور کا خطاط کسی نہ کسی طریقہ کا رکن ہوتا۔ اس طریقہ کے ذریعہ دل کو نظم وضبط سکھایا جاتا۔ آخر کار تخلیقی عمل کا سرچشمہ دل ہی تو ہے۔ دیہاتوں کے ان پڑھ، اجڈ کسان ہوں کہ، شہر کے نازک مزاج علماء وفضلاء ،صوفیائے کرام نے عشق کی حقیقی منزل تک سب کی رسائی آسان کردی۔ عالم بالا سے بالواسطہ قربت نے مسلمانوں کے کردار کوڈھال دیا۔ چنگیز خان کے بعد پورے پانچ سوسالوں تک دنیائے اسلام کا یہی عالم رہا۔ ''زاویہ'' ہی وہ مرکزی ادارہ تھا جس کے ذریعہ یہ سب کچھ ممکن ہوسکا۔

وقت کے ساتھ یہ زاویئے ساری اسلامی دنیا میں پھیل گئے اٹھارویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کے معاشروں کو استحکام بخشتے رہے۔ ہندوستان، پاکستان، ایران، ترکی اور شمالی افریقہ کے دیہی پس منظر میں، زاویہ کا تاریخی طور پر مرکزی کردار رہا۔ زاویہ سے نکلنے والے افراد ہی ترکوں کی پیش قدمی کے پشت پناہ رہے۔ عثمانیہ سلطنت کے تیزی سے پھیلنے میں ان کا اہم ترین ہاتھ رہا۔ وہ زاویہ کے تربیت کردہ لوگ ہی تھے جنہوں نے 1578ء میں جنگ ''القصر الکبیر'' میں پرتگالیوں کو شکست دی۔ اورانہوں نے شمالی افریقہ کو اس انجام سے بچالیا۔ وہ انجام جو کہ اسپین کے مسلمانوں کا ہوا تھا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں ''زاویہ'' نے یوروپ کی مشترکہ اسٹاک کمپنیوں کی سردمہر کارگذاریوں کا مقابلہ کیا۔ جب یہ دوبدو مقابلہ ہوا تو اسلامی دنیا کی سیاسی اور معاشرتی زندگی زوال کا شکار تھی۔ لیکن ''زاویہ'' کی روحانی وراثت آج بھی باقی ہے۔ اس روایتی اسلام کی بار بار شدت سے آنے والی یادوں کے درمیان پچھلے دور کی وہ حسین یادیں بھی ابھر آتی ہیں۔ جبکہ ایشیاء، یوروپ اور افریقہ کے براعظموں کو ان زاویوں نے باہم مربوط کردیا تھا۔

ترک اور تاتار

خلاصہ:

تیمور لنگ شاید دنیا کا عظیم ترین فاتح ہے وہ پندرہویں صدی عیسوی کے آخری چوتھائی میں تاریخ کے صفحات پر دراتا ہوا گھس آیا۔ فرغانہ کے تاتاروں کو یکجا کر کے اس نے سمرقند اور وسطِ ایشیاء پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ منگول سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے لے لی تھی۔ تیمور پچیس سالوں تک مسلسل حملے کرتا رہا ان حملوں کے دوران اس نے منگولستان، بحر کیسپئن کے خان، فارس کے اِلخانیہ شاہی سلسلہ، ہندوستان کے خاندانِ تغلق، روس کے سنہرے شہسواروں اور مصر کے مملوکوں کو شکست دی۔ 1402ء میں انقرہ کی جنگ میں عثمانیہ سلطنت کی شکست اس کی عظیم ترین فتح تھی۔ عثمانیہ سلطان بایزید اول، جو کہ بذات خود ایک عظیم فاتح تھا، اس جنگ میں شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ اسے قیدی بنا لیا گیا اور اناطولیہ کو تیموری سلطنت میں شامل کر لیا۔ 1405ء میں تیمور چین کو فتح کرنے کے ارادہ سے نکلا اور راستے ہی میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ تاتاریوں کی فتح مندیوں نے ایشیاء کے پرانے شاہی سلسلوں کا خاتمہ ایسے کر دیا جیسے سیلاب تنکوں کو بہا لے جاتا ہے۔ تیمور لنگ کی فتح مندیوں کی خاک سے ایران کا صفویہ شاہی سلسلہ، ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کی اٹھان ہوئی۔ ادھر یوریشیاء میں عثمانیہ ترکوں نے ایک بار پھر عروج حاصل کیا۔

ترتالیسواں باب

سمرقند کا امیر تیمور

1395ء تک بازنطینی صدر مقام قسطنطنیہ چاروں طرف سے عثمانیہ سلطنت کے علاقوں سے گھر چکا تھا۔ ترکوں کی جارحانہ پیش قدمی نے انہیں جنوب مشرقی یوروپ اوراناطولیہ کا مالک بنادیا۔ عثمانیہ افواج دریائے ڈینوب پار کر کے ہنگیری کے میدانی علاقوں میں پیش قدمی کرنے لگیں۔ بازنطینی شہنشاہ مینوئل نے مایوس ہوکر اپنے تخت کو بچانے کی آخری کوشش کی۔ اس نے پوپ بونی فیس نوم اور یوروپ کے دوسرے بادشاہوں سے مدد کی درخواست کی۔ 1396ء میں یوروپ کے نوابوں اورامراء نے اس کی مدد کا جواب دیا۔ ایک سوسالہ آپسی خانہ جنگیوں سے وقت نکال کر فرانس، جرمنی، برطانیہ، ہالینڈ اور ہنگیری کے صلیبی سپاہیوں نے جنگِ نکوپولس میں ترکوں کا سامنا کیا۔ اس جنگ میں صلیبیوں کو عبرتناک شکست ہوئی اور میدان جنگ سلطان بایزید کے ہاتھ رہا۔ نکوپولس کی شکست کے بعد یوروپ میں اتنی ہمت نہ رہی کہ ایک اور جنگ کرتا۔ اس نے اب جنگ کی بجائے ترقی پذیر عثمانیہ کے ساتھ تجارت کرنے کو ترجیح دی۔ بایزید نے آگے بڑھ کر بازنطینی صدر مقام کا محاصرہ کرلیا۔ شہنشاہ مینوئیل مایوس ہو چکا تھا اور اپنے صدر مقام قسطنطنیہ کو ترکوں کے حوالے کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ایسے وقت اسے ایسی جگہ سے مدد ملی جس کی توقع

بالکل نہیں تھی۔ وہ مدد اسے سمرقند کے امیر تیمور لنگ سے ملی۔

تیرہویں اور چودہویں کے دوران پوپ اور یوروپ کے بادشاہ منگولوں کو خوش کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔ ایشیاء کی قسمت بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پرانی دنیا کی قسمت ترازو کے پلڑے میں برابر برابر لٹکی ہوئی تھی۔ منگول شہزادوں کی اولین ترجیح عیسائیت تھی۔ کبھی وہ اسلام کے بارے میں دوسری ترجیح کے طور پر سوچتے، کبھی کبھار دوسرے اوقات میں بدھ مت کے متعلق بھی انکا جھکاؤ نظر آتا۔ اس طرح منگولوں کی سوچ کی لہر کبھی ادھر جھکتی تو کبھی ادھر، چنگیز خان کی موت کے بعد اس کی وسیع سلطنت چار بڑے حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک تھا چین کا یون (منگول) شاہی سلسلہ جہاں قاقانون کی حکومت تھی۔ خاقان کا مطلب ہے عظیم خان۔ چنگیز کا پوتا قبلائی خان۔ 1268ء تا 1294ء اس خاندان کا عظیم ترین حکمران تھا۔ دوسری چغتائی سلطنت تھی جو کہ چنگیز خان کے بیٹے کے نام سے موسوم تھی۔ اس کا مرکز سمرقند تھا۔ اس میں وسطِ ایشیاء کے وسیع لق ودق صحراء بھی شامل تھے۔ فرغانہ کی زرخیز وادی کے علاوہ جنوبی افغانستان تک اس کی سرحدیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تیسرا تھا فارس جس پر الخان کی حکومت تھی جسکا مطلب ہے عظیم خان کے نائبین۔ چوتھی سلطنت ہنگیری سے لے کر بحر کیسپئن تک وسیع تھی۔ اس میں آج کے روس کے کافی علاقے بھی شامل تھے۔ یہاں تاتاریوں کی حکومت تھی۔ انہیں گولڈن ہورڈ یعنی سنہرے شہسوار بھی کہا جاتا تھا۔ جوچی کے بیٹے باٹو جو کہ چنگیز خان کا پوتا تھا وہ اس علاقہ کا بادشاہ تھا اس کے خیمہ پر ہمیشہ سونے سے بنایا گیا نشان لگا رہتا تھا جو اس کا علامتی نشان تھا۔ اسی لئے یہ سنہرے شہسوار کہلائے۔

1300ء تک بدھ مت اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام نے دلوں کی یہ جنگ جیت لی۔ بدھ مت اور عیسائیت روحوں کی یہ جنگ ہار گئے۔ ایران کے الخان، وسطِ ایشیاء کے چغتائیوں اور اولگا کے تاتاریوں سبھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ صرف منگولیا اور چین اسلام کے دامن رحمت سے دور رہے اور قاقانی چینیوں میں تحلیل ہوگئے۔ منگولوں نے روس اور وسطِ ایشیاء پر اپنے گورنروں اور صوبیداروں کے ذریعہ اقتدار کو برقرار رکھا۔ ایک عام معاہدہ کے تحت یہ صوبیدار تاتاری ہوتے تھے۔ تاتاری ترکمان لوگ تھے۔ منگولوں سے انکی کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ ورنہ یہ ترکمان منگولوں سے بالکل ہی الگ قومیت کے لوگ تھے۔

تاتاریوں کو چنگیز خان نے مفتوح کیا تھا۔ بعد میں یہ لوگ اس کی افواج میں شامل ہو گئے۔ خراسان، روس اور فارس پر حملوں میں یہ پیش پیش رہے۔ منگولوں اور تاتاریوں کے درمیان ایک پرامن خاموش معاہدہ طے تھا۔ معاہدہ یہ تھا کہ منگول بادشاہ بنے رہیں گے اور تاتاری منتظمین اعلیٰ اور امیروں کی حیثیت سے ان کی خدمات انجام دیں گے۔

چودھویں صدی عیسوی کے اولین پچاس سالوں تک یعنی 1350ء تک چاروں منگول بادشاہ آپس میں خانہ جنگی میں مشغول رہے اور ان کے اقتدار کا مرکز ختم ہو گیا۔ شہزادہ ابوسعید کے انتقال کے بعد فارس کی الخانوی حکومت پارہ پارہ ہو گئی۔ چودھویں صدی عیسوی کے دوسرے پچاس سالوں کے دوران فارس پر شہزادوں کی ایک ٹولی کی حکومت رہی جو مظفرین کہلائے۔ اصفہان، شیراز، تبریز، ہیرات ان سبھی علاقوں پر الگ الگ خودمختار بادشاہوں کی حکومت تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں آپس میں ہمیشہ لڑتی رہتی تھیں۔ ان آپسی جنگوں کے اخراجات پورے کرنے بھی ضروری تھے۔ اس لئے یہ سلطنتیں کسانوں پر محصول بڑھاتی گئیں۔ کاشتکاروں کی تکالیفات بڑھتی گئیں۔ یہی حالت چغتائی علاقہ میں بھی تھی جو کہ افغانستان سے لے کر منگولیہ تک پھیلا ہوا تھا، یہاں بھی آپسی فوجی کشمکش جاری تھی۔ اولگا کے تاتاری منگول قبائل کے ایک ڈھیلے ڈھالے سے مجموعے پر مشتمل تھے جب کبھی لوٹ مار اور مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے روس کے اندرونی علاقوں پر حملے کرتے تو یہ آپس میں متحد ہو کر حملے کرتے۔ 1382ء میں تاتاریوں نے ماسکو کو ہی جلا کر خاک کر ڈالا۔ انتشار کی اس صورت حال سے تیمور اٹھا، اسے عام طور پر تیمور لنگ کہا جاتا ہے۔ شاید وہ دنیا کے کسی بھی دور کا عظیم ترین فاتح ہے۔

علاقائی تاریخی کتابوں میں تیمور کو ایک ایسے فاتح کے روپ میں پڑھایا جاتا ہے جس نے 1402ء میں انقرہ کی جنگ میں عثمانیوں کو شکست دے دی یا ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے جس نے دہلی میں 1399ء میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد کا قتل کیا۔ ایسی تنگ نظری اس عظیم فاتح کے لئے بڑی ناانصافی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تیمور کی بے شمار فتوحات کو اس دور کے واقعہ نگاروں کی تحریروں کی کسوٹی سے پرکھا جانا چاہئے۔ 1360ء میں ابن بطوطہ نے لکھا۔ ''دنیا کے سات عظیم شہنشاہ ہیں (ا) مراقش کا مرینوی

سلطان (۲) مصر کا مملوک سلطان (۳) ترکی کا عثمانیہ سلطان (۴) فارس کا الخان (۵) وسط ایشیاء کی چغتائی سلطنت کا خان (٦) ہندوستان کی سلطنتِ تغلق کا شہنشاہ اور (۷) شہنشاہ چین منگ۔ ہوسکتا ہے مراقش کے بادشاہ کے بارے میں ابن بطوطہ کے بیان سے لوگ اتفاق نہ کریں۔ سیاسی طور اپنے آپ کو آزاد ثابت کرنے کے لئے اسے اس بادشاہ کا نام اس فہرست میں شامل کرنا ہی پڑا۔ تیمور نے دوسرے چھ عظیم شہنشاہوں میں سے پانچ کو شکست فاش دے دی۔ دہلی سے لے کر ماسکو تک، آمو دریا سے لے کر مصر کے سینائی صحراء تک تیمور کی فتح مندی کا جھنڈا لہرا دیا۔ اس نے ماسکو فتح کیا اولگا کے تاتاروں کی طاقت کو 1385ء تا 1389ء کے دوران کچل کے رکھ دیا۔ اس نے 1398ء میں اصفہان اور 1399ء دہلی پر قبضہ کیا اور انہیں جلا ڈالا۔

اس نے دمشق کو بھی اپنی علمبرداری میں لے کر اسے آگ لگا دی اور مصر کے مملوکوں کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ 1402ء میں انقرہ کی جنگ میں عثمانیوں کو شکست دے کر بایزید کو قید کرلیا۔ وہ عثمانیہ کا مکمل خاتمہ کرنے کے قریب آ گیا تھا۔ صرف چین ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس کی تلوار کی زد سے محفوظ رہا اس لئے کہ جب تیمور چین فتح کرنے کے لئے نکلا تو راہ میں ہی اسکا انتقال ہوگیا۔ تیمور کی سلطنت ستر لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ جو کہ امریکہ کے موجودہ رقبہ سے دوگنا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید روس کا عروج تیمور کے دور سے ہی شروع ہوا۔ اس لئے کہ دریائے اولگا کے تاتاریوں کی طاقت کو اسی نے تباہ کیا۔ روسی جو دوسو سالوں سے تاتاریوں کے قبضہ کا بوجھ ڈھوتے چلے آرہے تھے۔ ان تاتاریوں کو جب تیمور نے شکست دے دی تو روسی آگے بڑھنے کے لئے پر تولنے لگے۔

تیمور کو کسی بھی کسوٹی پر کستے ہوئے اس کا بھی خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ وہ ایک پکا مسلمان تھا۔ اس کی فوج کے ساتھ ہمیشہ ایک مستقل مسجد رہتی تھی جو خوبصورت تھی اس کی خوبی یہ تھی کہ اسے فوج کے ساتھ ہی منتقل کیا جاسکتا تھا۔ فوج کے ہمراہ اس مسجد کے علاوہ علماء اور قاضیوں کا ایک گروہ بھی رہا کرتا تھا حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت سے اسلامی تاریخ میں ایک کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف اسلام کے اعلیٰ ترین اقدار تھے تو دوسری جانب مادی فوائد کیلئے دنیاوی اقدار کی جانب رغبت تھی، ذاتی انا پرستی

تھی، ان دونوں اقدار کے درمیان ایک کشمکش سی اس دور سے ہوتی چلی آ رہی تھی۔ تیمور کی شخصیت کے اندر دین و دنیا کی یہ رسہ کشی اپنی انتہاء پر تھی جہاں کہیں بھی وہ فتح حاصل کرتا اس بات کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھتا کہ مساجد اور صوفیائے کرام کے مقابر کو کوئی نقصان پہنچنے نہ پائے۔ ان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے یا بھولے سے بھی علماء کا کہیں قتل نہ ہو جائے۔ لیکن وہ ایک پیدائشی جنگجو تھا اس کی بنیادی فطرت نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس دنیا کا آقا بن جائے جسے وہ جانتا ہے۔ اس کی سیکولر سیمابی فطرت نے قرآن کے ان مقدس اصولوں کو پرے ڈال دیا جہاں یہ کہا گیا کہ ''تم اپنے دینی بھائیوں کا خون ناحق ہرگز نہ بہانا،،۔ لیکن اقتدار کی محبت نے اس آسمانی حکم کی پرواہ نہ کی۔ وہ ان کے لئے رحم دل تھا جو اس کے آگے سر جھکاتے تھے۔ حکم عدولی کرنے والوں کے لئے وہ بے انتہاء سنگدل تھا۔ سیکولر اور مقدس اقدار یہ دونوں برقی رو پوری اسلامی تاریخ میں متوازی طور پر بہتے رہے ہیں اور بہتے چلے آ رہے ہیں۔

تیمور ایک تاتاری تھا۔ وہ سمرقند کے قریب خراسان میں 1327ء میں پیدا ہوا۔ ایک ایسے دور میں جبکہ عصائے شاہی تلوار کی نوک پر حاصل کیا جاتا تھا وسطِ ایشیاء نہ صرف فاتحین کا گہوارہ تھا بلکہ آگے چل کر ابھرنے والے فاتحین کا بھی گہوارہ بنا ہوا تھا۔ وسطِ ایشیاء کے شہسوار بار بار حملے کرتے۔ شمالی ہندوستان، ایران اور ان سے بھی آگے کے علاقوں پر اور وہاں پر بسے بسائے لوگوں کو فتح کرتے۔ دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی مقامی لوگوں میں رچ بس جاتے۔ بعد میں انہی لوگوں کو ایشیاء کے سطح مرتفع سے ابھرنے والے خانہ بدوش قبائل کی نئی لہروں کے حملے کا سامنا کرنا پڑتا۔ فاتحین کے اس گہوارے میں ہی تیمور کی پیدائش ہوئی۔ اس کی فطرت میں جنگ لڑنے کی فطرت رچ بس گئی، ایک ایسا شوق جس کی مثال تاریخ عالم میں کوئی اور شاید ہی قائم کر سکا۔

نوجوانی سے ہی تیمور پر صوفی شیخ زین الدینؒ کا بہت اثر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روحانیت سے تعلق رکھنے والی باتوں کو بڑی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا کرتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چغتائی شہنشائیت تقریباً پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ آخری منگول چغتائی فرمانروا دریائے آمو کے پیچھے دور تک ہٹ گئے تھے۔ منگول خان تغلق نے ایک تاتاری قازغان کو سمرقند کا وائسرائے مقرر کیا تھا۔ تیمور نے اسی قازغاں کے دربار میں پہلی

ملازمت حاصل کی۔ جلد ہی اس نوجواں کی بہادری کا چرچا دربار میں ہونے لگا اور وہ خصوصی شاہی دستہ ''بہادر'' کا مرکز نگاہ بن گیا۔ قازغان اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی خوبصورت نواسی علجائی خاتون کے ساتھ شادی کردی۔ جس کے نام سے سمرقند کا بی بی خاتون کا خوبصورت مقبرہ موسوم ہے۔

قازغان کی پوتی الجائی خاتون آغا کے ساتھ تیمور کی شادی بڑی کامیاب رہی۔ تیمور کی طرح الجائی بھی مسلمان تھی۔ اس کے دوسرے تاتاری بہنوں کی طرح وہ بھی بے نقاب ہوکر گھوڑے کی سواری کرتی تھی۔ ملک کے انتظامی امور میں حصہ لیتی۔ اپنے شوہر کے ساتھ میدان جنگ میں جاتی، اپنے اقتدار کے سرحدوں کے اندر عوامی معاملات میں دلچسپی لیتی۔ تیمور کی خدمات کے صلے میں قازغان نے اسکو ''منگ بھاشی'' یعنی ہزار سواروں کا سردار مقرر کیا۔ لیکن اس دور کی غیر یقینی صورت حال نے تیمور کو امن وچین کی سانس لینے نہیں دیا۔ سارا علاقہ بدامنی سے شرابور تھا۔ ہر طرف ایسے ہتھیار بند لوگوں کی بہتات تھی جو کہ قابل تھے اور خوش آئند منصوبوں سے بھرے ہوئے بھی۔ ہر ایک قابل شخص اپنی جگہ شہرت اور دولت حاصل کرنے کے خوش آئند خواب دیکھ رہا تھا۔

اس دوران تاتاریوں کے درمیان آپسی محاذ آرائی میں قازغان مارا گیا اور اسکا علاقہ شورشوں سے بھر گیا۔ حالات پر قابو پانے اور امن قائم کرنے کے لئے شمال سے منگول خان تغلق آیا۔ تیمور نے تغلق کا ساتھ دیا۔ انعام میں اسے ''طومان باشی'' یعنی دس ہزار ''سواروں کا سردار'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ لیکن جب تغلق اپنی فوجی چھاؤنی کو واپس ہوا تو اس کے ظالم سپہ سالار نے تاتاریوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھانا شروع کردیا۔ ان کے علماء اور تعلیم یافتہ لوگوں کو قید میں ڈال دیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو اٹھالے گیا۔ تیمور نے اسکا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ عورتوں اور بچوں کے لئے جو کچھ وہ کرسکتا تھا اس نے کیا۔ لیکن تاتاری بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے اختلافات اس قدر گہرے تھے کہ وہ متحد ہوکر مقابلہ نہ کرسکے۔ جب منگول خان تغلق کو یہ پتہ چلا کہ تیمور نے اس کے مامور کردہ سپہ سالار سے لڑائی کی ہے تو اس نے حکم دیا کہ تیمور کو گرفتار کرکے اسے سزائے موت دی جائے۔ لیکن تیمور ایک چالاک جنگجو تھا۔ اس نے خطرے کا احساس کرلیا اور اپنی بیوی و وفاداروں کے ساتھ جنوب کی جانب فرار ہوگیا۔

عظیم شخصیات کو قسمت ہی بناتی ہے۔اگلے چند سالوں کے دوران تیمور افغانستان کے پہاڑوں اور ترکمان کی سرزمین کے صحراؤں میں بھٹکتا رہا۔اس نے صحراؤں کی تپا دینے والی گرمیوں کو بھی محسوس کیا اور ہندوکش پہاڑوں کی طوفانی ہواؤں کا سامنا کرنے کی بھی عادت ڈالی۔اسی خانہ بدوشی کے دوران قندھار کے امیر کی مدد سے مقامی شورش کو دبانے کے لئے جب وہ امیر کے دوش بدوش لڑ رہا تھا تو لڑائی کے دوران اسکے پاؤں میں ایک تیر لگا اور وہ زندگی بھر کے لئے لنگڑا ہو گیا۔اسی لئے وہ تیمور لنگ کے نام سے مشہور ہوا۔

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ کسی بھی تسلط سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے قومی اتحاد کے لئے اسلام کے نام کا ہی سہارا لیا۔اسی کے نام سے اتحاد کی آواز لگائی۔منگولوں کا ظلم تاتاریوں کی برداشت سے باہر ہو گیا۔بخارا اور سمرقند کے علماء اور صوفیوں نے تاتاری امیروں اور سرداروں کو آواز دی کہ منگولوں کے خلاف متحد ہو کر انکا سامنا کریں۔تاتاریوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔1367ء میں سردریا کے مقام پر منگولوں کے ساتھ ان کی گھمسان جنگ شروع ہوگئی۔تمام تاتاری امراء نے افغانیوں وشمالی فارس کے ایرانیوں اور تیمور نے اس جنگ میں حصہ لیا۔قسمت تاتاریوں کے خلاف تھی۔وہ جنگ ہار گئے لیکن سمرقند شہر اس جنگ میں دشمن کے سامنے مضبوطی کے ساتھ کھڑا رہا۔دشمن کے ہر ایک حملہ کے بعد تیمور کی اعلیٰ حوصلگی کا اعتبار اس کی قوم کے لوگوں میں بڑھتا گیا۔اس کی ثابت قدمی، بہادری اور قائدانہ صلاحیتوں نے انہیں متاثر کیا۔تاتاری ایک بار پھر متحد ہو کر جنگ لڑنے کے لئے تیار تھے۔اب صرف ایک اچھے قائد کی ضرورت تھی۔1368ء میں علماء، صوفیائے کرام، امراء اور سرداروں کا سمرقند میں ایک اجلاس ہوا۔انہوں نے آپسی مشورہ کے بعد متفقہ طور پر تیمور کو اپنا سردار بنانے کا اعلان کیا۔تیمور یہ سلطنت کی ابتداء اسی فیصلہ سے ہوئی۔اسی کے ساتھ دنیا کی تاریخ کا ایک خصوصی باب بھی شروع ہوا۔

سب سے پہلے تیمور نے سمرقند کے اطراف واکناف کے علاقوں میں اپنی بنیاد مضبوط کی۔اس نے کیا دوست کیا دشمن سبھی کو تحفے تحائف، خطابات اور جاگیروں سے نواز کر اپنا وفادار بنا لیا۔اس نے اسکے بعد جو قدم اٹھایا وہ تھا تاتاری علاقوں سے منگولوں کو نکال باہر کرنا۔دریائے آمو کے جنوبی تاتاری علاقوں سے منگولوں کو پاک کیا۔پھر دریا کے اس پار منگولوں کے اندرونی علاقوں پر اس نے حملے شروع کر دیئے۔

1370ء تا1379ء کے دوران منگولوں کے ساتھ کئی جنگیں ہوئیں۔ تیمور فتح یاب رہا۔اب فرغانہ کی وادی پر سے منگولوں کی گرفت ختم ہوگئی۔ سمرقند میں مضبوط تیموری حکومت کے قیام کی وجہ سے پڑوسی ریاستوں کا اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا لازمی بات تھی۔ بحر کیسپئین اورخراسان کے تاتاری فرغانہ پر بار بار حملے کرتے ہرایک حملے میں دولت حاصل کیا کرتے تھے۔اس میں انکا فائدہ تھاان کے سردار یوسف نے تیمور کو چیلنج کیا۔ دونوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہونے سے پہلے ہی یوسف قدرتی موت مرگیا۔ تیمور نے آگے بڑھ کرخراسان، خیوہ، دریائے اولگا کے نشیبی علاقوں پر قبضہ کرلیااورانہیں اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ پھر وہ جنوب میں افغانستان کی جانب مڑا۔ ہرات کے امیر غیاث الدین کوشکست دے کر ہرات شہرکواپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ ہرات بڑے شہروں میں ایک تھا جوسب سے پہلے تیمور کے ہاتھ لگا۔ اس وقت ہرات کی آبادی ڈھائی لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ وہاں کی علمی درسگاہیں فنون اورتہذیب کے مراکز ترقی اورشہرت میں تبریز، دمشق اوردہلی کی یونیورسٹیوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ تیمور یہاں کی دولت، کاریگر، معمارسب اپنے ساتھ لے گیا۔ یہی طریقہ اس نے اصفہان، دہلی، تبریز، دمشق اورانقرہ پرحملوں کے دوران اپنایا۔ ہرایک فتح کے بعد سمرقند کی دولت میں اضافہ ہوتا گیا۔ شہر نیلے گنبدوں کی حسین مساجد اورخوبصورت مقبروں کی جنت بن گیا۔ وسطِ ایشیاء میں اب تیمور کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔اس کی حکومت کا جھنڈا دریائے آمو سے لے کر دریائے سندھ تک لہرارہا تھا۔ ہندوکش پہاڑوں کی سطح مرتفع پر بیٹھ کر یہ عظیم فاتح یوروپ اورایشیاء کے اس طویل خطۂ ارض پرنظر دوڑا سکتا تھا۔ جس پر ابھی اس کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ یہ علاقے 1336ء تا1370ء کے دوران پھیلنے والی کالی پلیگ سے تباہ وبرباد ہوچکے تھے۔ اب امیر تیموراس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیارتھا۔

بحر کیسئن کے اطراف مہم جوئی کے دوران اس کا سامنا اولگا کے تاتاریوں سے ہوا جنہیں سنہرے شہسوار بھی کہا جاتا تھا۔ ان سنہرے شہسواروں نے روس کو دوسو سالوں تک دبائے رکھا تھا۔ انہوں نے مشرقی یوروپ میں دوردورتک گھستے ہوئے ہنگیری پر بھی حملے کئے۔ روس کے امراء تاتاریوں کوخراج دینے پر مجبور تھے۔ جب کبھی وہ محصول ادانہیں کرتے یا کرنہیں پاتے تھے تو ان کو سخت سزا دی جاتی۔ ان کے

علاقوں پر حملے کر کے لوٹ مار مچائی جاتی۔ ان سنہرے شہسواروں کا مقابلہ کرنا روسیوں کے لئے بیکار ثابت ہوتا۔ اس لئے کہ بدلہ بہت تیزی اور انتہائی بے رحمی سے لیا جاتا۔ 1316ء میں ماسکو کے بادشاہ نے ایک لاکھ کسانوں پر مشتمل ایک مسلح فوج تیار کی اور سنہرے سواروں کی ایک فوج کو شکست دے دی۔ یہ جنگ دریائے ڈان کے کنارے ہوئی۔ دوسرے سال سنہرے سوار پھر واپس ہوئے۔ روسیوں پر فتح حاصل کی۔ جس راہ سے روسی پسپا ہوئے اس راہ کی ہر ایک چیز کو تاتاریوں نے پائمال کر دیا اور 1377ء میں ماسکو شہر کو جلا کر خاک کر ڈالا۔

سنہرے سواروں کا سردار طوقطمش مشرق میں تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت کو برداشت نہ کر سکا۔ دونوں ہی خود پرست تھے ان دونوں انا پرستوں کے درمیان ٹکر ہوئی۔ جیسا کہ منگول کہاوت ہے ''دنیا میں دو سورج بیک وقت نہیں رہ سکتے'' سرحدوں کے قبضہ نے جارحانہ اقدامات کے لئے راہ ہموار کر دی۔ بحر کیسپین کے قریب ابتدائی مہم میں طوقطمش کو شکست ہوئی۔ وہ دوسرے سال واپس پلٹا اور سرحدی علاقوں پر حملے کرنے لگا۔ اب کی بار تیمور نے دشمن کے علاقہ میں دور تک اسکا پیچھا کیا۔ وہ ہمیشہ نہایت سوچ سمجھ کر منصوبہ تیار کرتا اور شطرنج کے ماہر کھلاڑی کی طرح، شاندار انداز سے آگے بڑھتا۔ عظیم سپہ سالار اس لئے کامیاب ہوتے ہیں کہ وہ جنگ کو انتہائی مہارت سے ترتیب دیتے ہیں، باریک بینی کے ساتھ اسکے ایک ایک جز پر نظر رکھتے ہیں۔ تیمور نے اس عظیم پیش قدمی کے لئے جو ماہرانہ منصوبہ بندی کی تھی اس منصوبہ بندی نے چنگیز خان کی جنگی مہارت کی یاد تازہ کر دی جبکہ اس نے 1218ء تا 1219ء کے دوران صحرائے گوبی کو پار کر کے خراسان پر حملہ کیا تھا تو ایسی ہی مکمل اور ایک ایک حصہ کی منصوبہ بندی کی تھی۔ تیمور کی جانب سے ہر سپاہی کو ایک افزود گھوڑا دیا گیا۔ دفاعی جنگی ساز و سامان کے ساتھ تیر کمان، تلوار اور چھوٹے ہتھیار بھی دیئے گئے۔ اس کے ساتھ فرغانہ وادی کے نہ صرف تاتاری پیش قدمی کر رہے تھے بلکہ افغانی ترک اور ایرانی بھی ساتھ تھے، تیمور نے طوقطمش کا پیچھا روس کے اندر دو ہزار میل تک کیا۔ دریائے اورال اور دریائے اولگا کو پار کرتے ہوئے جدید قازان شہر سے گذرتے ہوئے ماسکو کے مضافات تک پہنچ گیا۔ جب تیمور کے مخبروں نے اسے جا گھیرا تو آخر کار طوقطمش کو لڑائی کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ وہ دو غیر معمولی طور پہادروں کی جنگ تھی

۔ تیمور کھلے میدانوں میں جنگی چالوں کا ماہر تھا۔ اسے فتح حاصل ہوئی۔ طوقطمش فرار ہونے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی بچی کچھی افواج کا پیچھا کر کے گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا گیا۔

سنہرے شہسواروں کی طاقت چکنا چور ہوگئی۔ مشرقی یوروپ کے تناظر میں پھر کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔ 1385ء میں یہ جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ایک سلطنت ختم ہوگئی اس کی جگہ ایک نئی سلطنت نے جنم لیا۔ وہ تیمور ہی تھا جس نے روسیوں کو تاتاریوں کے چنگل سے آزاد کروایا۔ 1385ء کے بعد فوراً ہی روس ایک یوروپی طاقت بن کے ابھرنے لگا۔ صدیوں کی کوششوں اور فتوحات کے بعد مشرقی یوروپ اور شمالی ایشیاء کے بیشتر علاقوں پر اس نے قبضہ کرلیا۔ بیسویں صدی عیسوی کے طویل عرصہ کے دوران یوروشیا کے بڑے حصہ پر سابق سویت یونین کی حیثیت سے روس نے اپنا دبدبہ برقرار رکھا۔

عظیم شخصیات ڈٹ جانے والی، نہ دبنے والی روح لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ سب کے آگے ابھرنے، غلبہ حاصل کرنے اور فتوحات حاصل کرنے کے لئے، شاید انہی فتوحات، انہی سربلندیوں کے ذریعہ بنی نوع انسان موت پر بھی فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک ایسی لڑائی جس میں ہمیشہ اس کی ہار ہوتی ہے۔ تیمور اسی مٹی کا بنا تھا جس مٹی کے سکندر چنگیز خان اور نپولین بنے تھے۔ وہ دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلا صرف اس لئے نہیں کہ اس نے اپنے آپ کو چنگیز خان کے عظیم سلطنت کا وارث سمجھا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ دنیا وہاں موجود تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ مرد وخواتین ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ وہاں موجود ہے۔ چین کو فتح کرنے کے ارادے سے جو وہ نکلا تو راستے میں ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے خواب کی مکمل تعبیر کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔

روس کی فتح کے بعد تیمور نے تاتاریوں کے امیر کی حیثیت سے اپنے مقام کو مضبوط بنالیا۔ وسطِ ایشیاء کی بلندیوں سے وہ دیکھ سکتا تھا۔ فارس، ہندوستان اور چین کی زوال پذیر حکومتوں کو جس طرح ایک طاقتور شیر زخمی بکریوں کے ریوڑ دیکھ کر جوش بھر سے اٹھتا ہے۔ وہی حالت تیمور کی بھی تھی۔ چنگیز خان کے وارث اِلخان ایران کی رعنائیوں میں کھوگئے اور گم ہوگئے۔ ان کی جگہ مظفریوں نے لی۔ یہ خاندان تاریخ میں اپنے

ہی آپسی جھگڑوں کے لئے مشہور ہے۔ جب ایران کے شاہ کا انتقال ہو گیا جو کہ تیمور کا حلیف تھا۔ اس کی جگہ زین العابدین تخت نشین ہوا۔ زین العابدین ایک کمزور بادشاہ تھا۔ وہ اپنی سلطنت کو متحد نہ رکھ سکا۔ جس کی وجہ سے زین العابدین کے خاندان کے مختلف افراد نے اقتدار سنبھالا۔ اور سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اسے چھوٹی ذیلی سرداروں کی ریاستوں میں تبدیل کر دیا جن پر خاندان کے مختلف افراد کی اپنی اپنی الگ الگ حکومت تھی۔ تبریز، ہیرات، شیزاز اور اصفہان پر مختلف بادشاہوں کی حکومت تھی۔

جنوبی سرحدوں پر غیر مستحکم ریاستوں کا قیام تیمور کو گوارہ نہ تھا۔ 1386ء میں اس نے ایک بار پھر پیش قدمی شروع کی۔ اس کی منزل تھی اصفہان، آج کی طرح اصفہان اس دور میں بھی اپنے حسن، عالیشان تاریخی یادگاروں اور صاحب علم وفن اصحاب کے لئے مشہور تھا۔ شہر والوں نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ اور دروازے کھول دیئے۔ تیمور نے وعدہ کیا کہ اگر مقررہ رقم بطور خراج ادا کی جائے تو شہر کو لوٹا نہیں جائے گا۔ شہر کے امراء اس رقم کو جٹانے میں لگ گئے۔ ایک دن تک سارا ماحول پرامن تھا۔ پھر رات کی تاریکی میں شہر کے کچھ لوگوں نے تیمور کے محافظوں پر حملہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا یہ کہنا مشکل ہے۔ ایک بات تو صاف ہے کہ یہ حملہ شہر کے لئے تباہیوں کا پیغام لے آیا۔ صبح ہوتے ہی تیمور نے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ شہر کے باشندوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا گیا۔ اہم بازار میں سروں کا ایک مینار سا بن گیا۔ یہ پہلا قتلِ عام تھا جو کہ تیمور نے کیا اس کے بعد لاہور، دہلی، دمشق کے علاوہ درجنوں دوسرے چھوٹے شہروں میں یہی ڈرامہ دہرایا گیا۔ تقریباً ایک لاکھ اصفہانی باشندے قتل ہوئے۔ ساری مزاحمت کا خاتمہ کرنے کے بعد اس شہر پر اپنا گورنر مقرر کیا۔ وہاں سے تیمور بحیرۂ فارس تک جا پہنچا۔ پھر پیچھے مڑ کر شمال کی جانب قوس کی شکل میں کوچ کرتے ہوئے راہ میں قندھار اور مغربی افغانستان کے قبائل کی سرکوبی کی۔ اس مہم کے دوران تیمور نے پہاڑوں کی کمین گاہوں میں چھپے فاطمی قاتلوں کا صفایا کیا۔ تیمور کے بعد یہ خوفناک قاتل پھر سر نہ اٹھا سکے جن کا سایہ عالم اسلام پر انتہائی خطرناک انداز سے چھایا ہوا تھا۔ تیمور سمرقند واپس ہوا تو اس کے ساتھ مختلف شہروں سے لوٹے گئے خزانے تھے۔ ایران کے مشہور معماروں، فن کاروں، دانشوروں کی ایک بڑی جمعیت بھی تھی۔ ان معماروں اور فنکاروں کو اس نے اپنے شہر کی تعمیر کرنے اور اسے سنوارنے میں لگا

دیا۔اس کا شہراس کی اپنی زندگی کے دوران ہی نیلے ٹائلوں سے بنے گنبدوں کا ایک حسین باغ بن گیا۔ اب تیمورروس، وسطِ ایشیاءاور فارس کا آقا بن چکا تھا۔

فارس کے تیمور کی فرمانروائی میں آ جانے سے، بغداد، قاہرہ اور انقرہ کی حکومتوں میں خطرہ کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بغداد کے شاہ احمد نے اپنی حفاظت کے لئے قاہرہ کے مملوک ترکوں کا سہارا لیااس دور میں قاہرہ اسلام کا مرکزی شہر تھا اور دارالخلافہ بھی تھا۔مملوک حکمران مصر، شام، عرب اور دریائے فرات کے مغرب کے سارے علاقہ پر اپنا اقتدار رکھتے تھے۔خلافت کے امین ہونے کے ناطےمملوک حکمرانوں پر بغداد کے سلطان کی مدد کرنے کی ذمہ داری آ پڑی تھی۔ بغداد کے سلطان احمد اور مصر کے مملوکوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔اس معاہدہ کے روسے سب سے پہلے اصفہان میں تیمور کے گورنر کو نکال کر اس کی جگہ بغداد کے نائب سلطنت منصور کو وہاں تخت نشیں کروادیا گیا۔اس عمل نے تیمور کے غصہ کو دعوت دی۔ اس نے دوسری مرتبہ ایران کی جانب کوچ کیا۔ بہت جلد مظفری سرداروں پر قابو پالیا گیا۔لیکن اسکا اصل نشانہ بغداد تھا۔ بغداد کا سلطان احمد تاتاریوں کی اصل طاقت کو اچھی طرح جانتا تھا۔اس نے جو غلطیاں کی تھیں ان کے خمیازہ بھگتنے کا خوف اس پر طاری ہوگیا۔وہ شام کی جانب بھاگا۔تیمور کے سپاہی انتہائی سرگرمی سے اس کا پیچھا کررہے تھے وہ بحفاظت دمشق پہنچ گیا۔لیکن وہ اپنے سارے خزانے اور اپنا مادروطن تاتاریوں کے ہاتھ ہار گیا۔ تیمور نے بغداد میں اپنا گورنر مقرر کیا اور وطن واپس لوٹ آیا۔اس نے مملوک سلطان کو ایک خط لکھا۔اسے امن، سلامتی اور تجارت کی ضمانت دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ وہ فارس اور بغداد کے معاملات میں ٹانگ اڑانا چھوڑ دے، مملوک سلطان نے یہ پیشکش ٹھکرادی، تیمور کے سفیر کو قتل کردیا۔ پھر دریائے فرات پار کر کے بغداد پہنچ گیا۔عباسی خلفاء کے پرانے شہر کے تخت پر ایک بار پھر سلطان احمد کو بٹھادیا۔چیلنج دیا جا چکا تھا، جنگ کا ماحول کامل طور سے تیار ہو چکا تھا۔مشرق کے آقا تیمور اور مملوکوں کے درمیان اب مقابلہ ناگزیر تھا۔ تیمور کو جلدی نہیں تھی وہ جانتا تھا کہ مغرب کی جانب پیش قدمی کی وجہ سے طاقتور عثمانیہ ترکوں کا بھی سامنا ہونے کا پورا امکان ہے۔وہ عالمی سطح کی سیاست پر پورا پورا عبور رکھتا تھا۔ ایک ماہر منصوبہ بند کی حیثیت سے سوچ بچار کرنے کے بعد آگے بڑھا۔سب سے پہلے ہندوکش کے

پہاڑوں سے گذرتا ہوا افغانستان اور کابل جا پہنچا۔ ایک اعلیٰ شطرنج کے کھلاڑی کی طرح مغرب کی طرف آگے بڑھنے سے پہلے انتہائی مہارت کے ساتھ اول تو وہ اپنے عقب کے خطرات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ علاوہ اس کے شام کی مہم کے لئے اسکو مالیات کی فراہمی کرنی بھی ضروری تھی۔ دہلی کے سلطان محمود کو ایک خط بھیجا گیا جس میں خود سپردگی کی مانگ کی گئی تھی۔ سلطان محمود زوال پذیر تغلق شاہی سلسلے کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ سپردگی کے لئے تیار نہ ہوا۔ تاتاری پنجاب سے ہوکر دہلی کی جانب کوچ کرنے لگے۔ محمود میدان جنگ میں تاتاریوں کا مقابلہ نہ کرسکا۔ وہ جنوبی گجرات کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ دہلی میں تیمور کا قیام، بارہ سال پہلے اصفہان میں اس کے قیام کی کہانی کو ایک بار پھر دہرا رہا تھا۔ یہ بہانہ بنا کر کہ شہر کے کچھ لوگوں نے اس کے سپاہیوں پر حملہ کیا۔ تیمور نے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ دیڑھ لاکھ سے زیادہ مرد اور خواتین بچے ذبح کردیئے گئے۔ دہلی کے بازار سروں کے مناروں سے ڈھک گئے۔ تیمور نے اپنے پوتے پیر محمد کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کیا۔ یہاں سے میرٹھ اور کشمیر کے راستے ہوتا ہوا اپنے ملک لوٹ گیا اس کے ساتھ ہندوستان میں لوٹی ہوئی بے شمار دولت بھی تھی خزانوں کے علاوہ ان گنت معماروں اور کاریگروں کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

تیمور کے قتلِ عام کا برِّصغیر پر بہت گہرا اثر پڑا کئی عظیم صوفیائے کرام اس پیش قدمی کرتی ہوئی تاتاری افواج سے بچنے کے لئے ادھر ادھر کے صوبہ جات میں بکھر گئے۔ ان میں چشتیہ سلسلہ کے شیخ گیسودراز ایک اہم شخصیت ہیں انہوں نے دکھن کا رخ کیا جہاں انہوں نے اپنا زاویہ قائم کیا اور اسلام کی اشاعت کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ دکھنی زبان میں کئی تصنیفات لکھنے والی شخصیت انہی کی تھی، دکھنی زبان اردو کی جنوبی شاخ ہے اردو کی ابتداء اسی دور میں ہوئی آگے چل کر اردو شمالی ہند میں خوب پھلی پھولی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں وہ عوامی جذبات کے اظہار کی ایک بہترین ذریعہ بن گئی۔ دکھن کے علاوہ بنگال، جونپور، گجرات کی جانب بھی بے شمار صوفیائے کرام اور علماء کرام نے ہجرت کی ان میں جونپور کے حضرت شیخ احمدؒ اور شیخ شہاب الدینؒ کے علاوہ ماہم جدید بمبئی کے شیخ علیؒ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ تقریباً اسی دور میں ملتان اور پنجاب میں سہروردی سلسلہ کے کئی صوفیائے کرام کی نئی نئی کھیپ آئی۔ ملتان میں سہروردی سلسلہ تیرہویں

صدی عیسوی کے ابتداء میں ہی قائم ہو چکا تھا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ جن کا انتقال 1262ء میں ہوا۔ ملتان میں اس سلسلہ کے اولین شیخ تھے۔

تیموری حملوں سے برّصغیر میں بڑی سیاسی ہل چل پیدا ہوئی یہ علاقہ صوبائی طاقتوں میں بٹ گیا۔ علاؤالدین خلجی اور ملک کافور نے 1300ء سے 1320ء کے دوران جو مرکزی اقتدار قائم کیا تھا وہ دن اب ختم ہو چکے تھے۔ محمد تغلق جو تیمور کے آنے سے پہلے ہی بھاگ کر گجرات میں پناہ لے چکا تھا۔ واپس آیا اور پھر سے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہا۔ لیکن اس کی سلطنت دہلی کے اطراف صرف چند میل تک ہی محدود تھی۔ بنگال آزاد ہو چکا تھا۔ 1538ء میں شیر شاہ سوری کے بنگال پر قبضہ کرنے تک وہ آزاد ہی رہا گجرات ترقی کرنے لگا اس کے ساتھ احمد آباد تہذیب وفنون کا مرکز بن گیا۔ یہی دور احمد آباد کا سنہرا دور ہے۔ دکن میں احمد نگر، بیجاپور، برار، بدر اور گولکنڈہ یعنی جدید حیدرآباد جیسی مقامی ریاستوں نے استحکام حاصل کرلیا تھا۔ تاتاریوں سے بھاگنے والے بے شمار صوفیائے کرام ان ریاستوں کی جانب راغب ہوئے۔ اور آگے جنوب میں وجیانگر کا خوشحال ہندو دربار بام عروج پر تھا۔ اس دور میں جب کہ دنیا بھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس ریاست نے انسانی توانائی کو پرجوش بنا کر ایک نادر مثال قائم کی تھی۔ مغرب کی جانب ملتان اور سندھ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ سارا برصغیر جو کہ پورے پچاس سالوں تک یعنی محمد بن تغلق کی 351ء میں موت تک ایک مرکزی اقتدار کے تابع رہا تھا۔ تیمور کے بعد عظیم مغلوں کے آنے تک جنگی حکومت 1520ء سے لے کر 707ء تک قائم رہی۔ یہ اتحاد پارہ پارہ ہی رہا۔

تیمور دہلی کو خاموش کرنے کے بعد وہاں سے لوٹتے ہوئے خزانے کے انبار ساتھ لیتا گیا۔ اپنے اگلے حملوں کے اخراجات کے لئے مالیات حاصل کرنے کے بعد وہ بغداد، دمشق اور انقرہ کی جانب متوجہ ہوا۔ اسلام کی ان طاقتور مغربی طاقتوں سے ٹکر لینے کے لئے اب وہ تیار تھا۔

چوالیسواں باب

انقرہ کی جنگ

تیمور نے ہندوستان سے واپس ہوکر اپنی توجہ بغداد کی جانب مبذول کی وہ سن 1400ء تھا اس کے سامنے دشمنوں کا ایک جم غفیر تھا یہ دشمن ایک قوس کی شکل میں عراق تا شام، ترکی و یوروپی نسل کے علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے، وہ عثمانیہ ترکوں کی طاقت سے بخوبی واقف تھا، اس لئے ابتداء میں وہ ان سے ٹکرانے سے کتراتا رہا، لیکن تاتاریوں کی مشرق کی جانب پیش قدمی لازمی طور پر اسی قدر وسیع حکومت کے فرمانروا طاقتور عثمانیوں کے خلاف ہی جاتی تھی۔ اس دوران تیمور کے کچھ دشمن بھاگ کر سلطنتِ عثمانیہ کے علاقہ میں پہنچ گئے۔ ترکوں نے اپنی روایت کے مطابق انہیں پناہ دے دی۔ دونوں حکومتوں کے درمیان جارحیت کی ابتداء یہیں سے ہوئی۔ تیمور نے عثمانیہ سلطان بایزید کو خط لکھا اور ان پناہ گزین افراد کو واپس کرنے کی مانگ کی، اس کا جواب نہ صرف انکار میں تھا بلکہ گستاخانہ بھی تھا۔ خط و کتابت پھر بھی جاری رہی۔ تیمور کی توہین کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آخرکار دونوں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اب ان طاقتور حریفوں کے درمیان طاقت آزمائی ناگزیر بن چکی تھی۔

تیمور بغداد پر آسانی کے ساتھ قبضہ کرسکتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ایک عظیم فاتح کی طرح اپنی ایک ایک

چال منصوبہ بندی اور ہوشیاری کے ساتھ چلتا تھا، سب سے پہلے اس نے اپنے دونوں بازوؤں کی طرف توجہ دی، اسے دشمنوں سے پاک کیا۔ دریائے دجلہ و دریائے فرات کے درمیان پانیوں سے گذرتا ہوا اس نے اہم شہر سواس پر قبضہ کرلیا۔ جو کہ جدید ترکی میں واقع ہے، اس کا دفاع کرنے والی ترک فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہاں تیمور نے اپنی فوج کو تقسیم، کیا اس کے ایک حصہ کو جارجیہ اور کیا کس کے پہاڑوں کی طرف بھیجا، ان افواج نے جارجیائی اور آرمینیائی صلیبیوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ صلیبی اس کے پچھلے علاقوں کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ یہاں سے وہ مغرب کی طرف مڑا اور شام کی طرف پیش قدمی کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عثمانیہ طاقت سے نبرد آزما ہونے سے پہلے مملوکوں کو غیر جانبدار بنا دیا جائے تا کہ اس کے بازوؤں کو قاہرہ کی جانب سے کسی خطرہ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مملوک افواج الپو میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ اس شہر کی دفاع بڑی مضبوط تھی۔ فیصل کی دیواریں کافی بلند تھیں۔ تاتاریوں نے مملوکوں کو باہر آ کر لڑنے پر مجبور کر دیا۔ بڑی بھیانک جنگ ہوئی، مملوک شکست کھا کر جنوب میں سینائی کی جانب بھاگے۔ تیمور نے الپو پر قبضہ کرلیا، یہاں سے وہ دمشق کی جانب بڑھا۔ 1401ء میں دمشق فتح ہو گیا۔ اب مملوکوں نے امن کی پیشکش کی۔ مملوکوں کی جانب سے خود سپردگی کے شرائط کی بات چیت عظیم مؤرخ ابن خلدون نے کی۔ جس نے ''مقدمہ'' تصنیف کیا ہے۔ اس دور میں ابن خلدون قاہرہ کے مملوک سلاطین کی ملازمت کر رہا تھا۔ دمشق کا بھی وہی انجام ہوا، جیسا کہ اصفہان، دہلی اور دوسرے کئی شہروں کا ہوا تھا۔ سارا شہر تباہ و تاراج کر کے اس میں آگ لگا دی گئی، اسے تقریباً خاتمے کے قریب پہنچا دیا گیا۔ تیمور نے معماروں اور کاریگروں کو گرفتار کر کے انہیں سمرقند بھیج دیا۔ وہاں کے کئی منصوبوں پر کام کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہیں تیمور نے ایک مسجد پر انار کی شکل کا گنبد بنا دیکھا۔ ایسی ہی شکل کے لیکن ان سے اعلیٰ طرز تعمیر کے بے شمار گنبد، سمرقند میں جگہ جگہ بنائے گئے۔ دو سو سال بعد تیمور کے وارثین ہند کے عظیم مغلوں نے گنبدوں کی تعمیر کے اس تصور کو اپنا کر تاج کے گنبد کی تعمیر میں انتہائی حسین ترین انداز سے اس فن کے جادو کو جگایا۔ اسے ایک دوامی صورت عطا کر دی۔

نقشہ

اپنے آس پاس کے علاقوں کو دشمنوں سے پاک کرنے کے بعد تیمور بغداد کی جانب چلا۔عثمانیہ ترک ابھی تک یوروپ میں ہی مشغول تھے۔ 1386ء میں عثمانیہ سلطنت کے طاقتور سلطان بایزید نے کوسووو کی جنگ میں سربیوں کو شکست دے دی اور بلغاریہ کے اندر داخل ہوکر دریائے ڈینوب سے آگے اس پار کے علاقوں کی طرف کوچ کرنے لگا۔ٹھیک اسی وقت کافی غور وخوض کے بعد تیمور نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ سلطان احمد شاہ ایک بار پھر بغداد سے بھاگ نکلا۔شہر کی ذمہ داری اپنے ساتھی نعیم الدین کے سپرد کی۔ اس نے بڑی بےجگری سے شہر کا دفاع کیا۔منگولوں کی تباہیوں کے باوجود شہر کی فوجی قوت قابل لحاظ تھی۔ ایک طرف دریائے دجلہ کا پانی اس کی حفاظت کررہا تھا تو دوسری جانب بلند وبالا پہاڑوں پر دور مار مورچہ بندی کی گئی تھی۔لیکن نعیم الدین تاتاریوں کے حملوں کو تاب نہ لاسکا۔اور شہر ہاتھ سے نکل گیا۔تیموریوں کی فتح کی روایت کے مطابق قتل عام شروع ہوگیا۔ وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ شہر میں سروں کے اکیس مینارے بنائے گئے۔سوائے مساجد اور صوفیائے کرام کے زاویوں کے ہر ایک عمارت کو ڈھادیا گیا۔ یہ

بغداد کی مکمل تباہیوں کی آخری کڑی تھی۔ وہ شہر جو دنیا کے شہروں کا تاج تھا آج مکمل کھنڈر بن چکا تھا۔ تیمور کے بعد بغداد صرف ایک صوبائی شہر بن کے رہ گیا۔ اس کی عالیشان عظمت کی داستان ادھر اُدھر ٹوٹ کر بکھرے پتھروں سے جھلکتی تھی جو کہ ان عالیشان یادگاروں کا ایک حصہ تھے۔

تیمور نے جارجیوں کو شکست دے دی، مملوکوں کو خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، عظیم شہر بغداد کو فتح کر لیا اور اب وہ عثمانیوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھا، ان دونوں بڑے فاتحین یعنی تاتاریوں کے تیمور اور عثمانیوں کے بایزید کے درمیان ہونے والی جدوجہد میں نمایاں فرق محسوس کر سکتے ہیں۔ ایک نے چالاکی کے ساتھ منصوبہ بندی کی ہوئی تھی تو دوسرا حد سے زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا تھا۔ تیمور کی ہر ایک بازی انتہائی ہوشیاری سے مربوط تھی، اپنے دشمن کے منصوبوں کے متعلق خفیہ معلومات حاصل کرتے ہوئے اور اپنی فوجی حالات کی پردہ پوشی کرتے ہوئے تیمور نے اپنی ایک ایک چال انتہائی ہوشیاری سے ترتیب دی تھی۔ سمرقند اور افغانستان دونوں سے تازہ فوجی کمک منگوائی، دوسری جانب بایزید اس قدر پر اعتماد تھا کہ اس کی عام ہوشمندی بھی اسکا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس نے سستی کے ساتھ ہنگیری کے میدانوں سے سفر کیا۔ بلقان اور باسفورس سے گذرتا ہوا۔ انقرہ میں اپنی چھاؤنی کی طرف آیا۔ یہاں سے اس نے ایک لاکھ فوج لے کر سواس کی جانب پیش قدمی کی۔ اس خیال سے کہ دشمن سے مقابلہ ہو جائیگا۔ لیکن تیمور ایک ماہر سپاہی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عثمانیوں کی اصلی طاقت ان کی پیدل فوج ہے جو انتہائی نظم کی پابند، بہترین اسلحہ سے مسلح اور دنیا کی مضبوط ترین فوج ہے۔ اس لئے پیش قدمی کرتی ہوئی ترک افواج کا راستہ کاٹ کر تیمور پیچھے سے انقرہ کی جانب چل پڑا۔ بایزید انقرہ سے کوئی سو میل کے فاصلے پر تھا جب اسے پتہ چلا کہ تیمور اس کے اپنے گھر کی بنیادی چھاؤنی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ وہ اپنی فوجی طاقت کے مرکز کو بچانے کے لئے مجبور ہو کر واپس چل پڑا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ تیمور انقرہ اور عثمانیہ کی مرکزی فوجی چھاؤنیوں پر کبھی کا قبضہ کر چکا تھا۔ علاوہ اس کے تاتاریوں نے دریائے انقرہ کا رخ بدل دیا اور تازہ پانی کے اصل سر چشمہ میں زہر ملا دیا۔ جب ترک واپس پہنچے تو وہ طویل سفر کی وجہ سے تھکے ماندے اور پیاسے تھے۔ ترکی کا سلطان گھیرے میں آ چکا تھا۔ پانی کی سربراہی بند ہو چکی تھی۔ اب بایزید کے سامنے حملہ کرنے کے سوائے

اور کوئی چارہ نہ تھا۔اس نے طاقتور رخ بدل بدل کر حملہ کرنے والے گھڑسوار فوج پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔لیکن جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہاری جا چکی تھی۔عثمانیہ پیدل فوج جو اس وقت تک نا قابل شکست رہی تھی تیز رفتار تیموری گھڑسوار فوج کا مقابلہ نہ کرسکی۔ جنگ شروع ہونے کے چند گھنٹوں کے اندر ہی پچاس ہزار ترک فوجی فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ بایزید بہادری سے لڑتا رہا،لیکن آخر کار گرفتار ہوگیا۔ اس کو پنجرہ میں بند کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔ وہاں طاقتور فاتح کے خیمہ میں اسکو انتہائی شرمناک صورت سے دور چار کیا گیا۔اس کے سامنے اس کی خواتین کو ننگا لایا گیا۔دل برداشتہ بایزید تین ماہ کے اندر ہی قید خانے میں انتقال کر گیا۔اس طرح ترکوں کے بہادر ترین سپاہیوں میں سے ایک کا خاتمہ ہوگیا۔ بے شک وہ ایک مشہور ترین فاتحین میں سے ایک تھا۔تیمور قسطنطنیہ جا پہنچا۔لیکن اس نے آبنائے کو پار کر کے یوروپ کی جانب رخ نہیں کیا۔عثمانیہ سلطنت جو تقریباً خاتمہ کے قریب آ گئی تھی۔آگے چل کر سلیمان کے ماتحت پھر سے سر اٹھانے لگی۔ وہ بایزید کا بہادر بیٹا تھا۔آگے آنے والی صدیوں میں پھر سے یہ دنیا کی طاقتور ترین سلطنت بن گئی۔

1402ء میں ہوئی انقرہ کی جنگ اسلامی تاریخ کا ایک سنگِ راہ ہے۔ وہ آخری بڑی جنگ تھی جو تیمور نے لڑی۔اس نے ہندوستان میں تغلق شہنشائیت کا خاتمہ کیا،سنہرے شہسواروں کو برباد کیا۔روسیوں کو ان کے چنگل سے آزاد کر دیا۔فارس کے مظفریوں کو حکومت سے محروم کیا۔فاطمی قاتلوں کو نیست و نابود کیا، بغداد کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔مصر کے مملوکوں کو شکست دی اور عثمانیہ سلطنت کو ختم کرنے کی حد تک پہنچ گیا اس نے پرانی دنیا کے تصور کو تباہ کر دیا۔اور نئی دنیا کا نیا نظریہ قائم کیا۔لیکن یہ عمر رسیدہ فاتح اس پر قانع نہیں تھا وہ ساری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔سمرقند کو واپس ہونے کے بعد اس نے چین کی جانب کوچ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔تین ماہ کے اندر ہی وہ ایک بار پھر تیار تھا۔اب کے وہ تین لاکھ تجربہ کار سپاہ کے ساتھ بیجنگ کی جانب چل کھڑا ہوا۔1405ء میں اس عظیم فاتح کو موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔اس وقت اس کی عمر انہتر (69) برس تھی۔اس طرح چین اس کی ان تباہیوں بربادیوں سے بچ گیا جنہیں ساری تہذیب یافتہ دنیا خوب جانتی تھی۔

تیمور نے اپنی مرضی اور خود اعتمادی کی طاقت سے ایک وسیع سلطنت کو باہم جوڑ دیا۔ چنگیز خان کے بعد آپس میں لڑنے جھگڑنے والے تاتاریوں کو متحد کر کے تیمور نے انہیں ایسی جنگجو قوت میں تبدیل کر دیا کہ جس سے سب خوف کھانے لگے۔ اس کی حکومت بزور شمشیر قائم کی ہوئی حکومت تھی۔ اس کے مرنے کے ساتھ ہی وہ بکھر گئی۔ تیموریہ حکومت کے دور دراز صوبے یکے بعد دیگرے آزاد ہونے لگے۔ صرف وسط ایشیاء اور فارس کے علاقے باقی رہ گئے۔ تیمور کا لائق فرزند شاہ رخ اس بکھری حکومت کا جانشین بنا۔

پینتالیسواں باب

تاتاریوں کے حملوں کے اثرات

افریقی، یوروپی وایشیائی خطۂ زمین کی اندورنی جغرافیائی وسیاسی آزادی کو تاریخ میں کوئی بھی فاتح عملی طور پر ثابت نہیں کر پایا تھا۔لیکن امیر تیمور لنگ اس سارے خطۂ ارض کے باطنی ارتباط کو اپنی فتح مندیوں کے ذریعہ جتلا دیا اس نے ثابت کردکھایا کہ مراقش سے لے کر چین تک وسیع سرزمین ایک طویل بساط کی طرح ہے جو کہ اندرونی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہے اسی لئے ایک علاقہ میں ہونے والے واقعات کا اثر لازمی طور پر ایک دوسرے پر پڑنا ضروری ہے۔

تیمور تاریخ کا پہلا فاتح تھا جس نے یوروپ وایشیاء کے کافی وسیع خطۂ زمین کو ایک فوجی مرکز اور سیاسی چھتری کے اندر متحد کیا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس کے الفاظ ہی اسکا قانون تھے جنھوں نے اسکی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا انہیں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔منگول، تاتار وترک رواج کی طرح تیمور نے بھی اپنے جانشین کے متعلق کوئی طریقۂ وضع نہیں کیا۔حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی شہادت کے بعد سے ہی جانشینی کے بارے میں اسلامی تاریخ میں کوئی رہنما اصول نہیں ملتے۔ وسیع معنوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں ان واضح خطوط کے نہ ہونے کی وجہ سے بار بار جانشینی کا پریشان کن سوال اٹھتا رہا۔شیعہ سنی تقسیم اسی لئے ہوئی کہ آیا آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی جانشین منتخب ہو یا مسلمانوں کے

عام اجماع سے حکمرانی کا فیصلہ ہو، الگ الگ رواج و روایتوں کو لے کر اسلام میں داخل ہونے والوں نے بھی جانشینی یا حکمرانی کے سوال پر ہونے والی بحث میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ منگول، تاتاری اور ترک کی روایات یہ تھیں کہ حکمران بادشاہ کی تمام اولاد کو تخت حاصل کرنے کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ جو شہزادہ اس حق کو چھین لیتا وہی سب سے زیادہ لائق مانا جاتا۔ اس عمل کے دوران تخت کے سارے دعویدار چاہے وہ بھائی ہی کیوں نہ ہو سب کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ سترہویں صدی عیسوی تک بھی عثمانیہ درباروں میں اسی طریقۂ کار کو استعمال میں لاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے کے دوران ایسا ہی خونیں ڈرامہ سترہویں صدی عیسوی میں دہرایا گیا۔

تیمور نے پرانی دنیا کے نظم وضبط کو برباد کر دیا اور نئے شاہی خاندانوں کے ابھرنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اس نے سنہرے شہسواروں کا خاتمہ کیا جنہوں نے روس کو دوسو سالوں تک اپنے انگوٹھے تلے داب رکھا تھا۔ اسی کے بعد ماسکو کے ڈیوکوں نے سیاسی استحکام کا طویل سفر طے کرنا شروع کیا۔ ہندوستان میں سلطان محمد تغلق جو تیمور کی فوجوں کی آمد سے پہلے دہلی چھوڑ کر گجرات کی جانب فرار ہو گیا تھا۔ جب وہ دہلی واپس آیا تو اس کی ساکھ ختم ہو چکی تھی اور تغلق شاہی سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے لئے سیدوں نے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سہارا لے کر دہلی کو قابو میں رکھا۔ لیکن وہ برصغیر میں پھیلی ہوئی بدنظمی پر قابو نہ پا سکے۔ انکا خاتمہ کر کے لودھیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ انکی حکومت 1451ء سے 526ء تک رہی۔ انہوں نے پنجاب اور دہلی کے اطراف واکناف کے علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

ہندوستان کی غیر یقینی صورتِ حال نے روحانی تحریکات میں دلچسپی پیدا کر دی۔ اسلام کی اشاعت باقاعدگی کے ساتھ ہوتی رہی۔ صوفیائے کرام نے اسے جنوب اور مشرق کی جانب پھیلا دیا۔ مشہور صوفی شاعر کبیر نے اسی دور میں شاعری کی۔ بھگتی تحریک جس کی ابتداء جنوبی ہند سے ہوئی پھیل کر شمال پہنچی اور ہندو طرز فکر کے ارتقاء کو متاثر کیا۔ اسلام اور ہندو مذاہب میں بیک وقت روحانیت کی ترقی کی وجہ سے ہندوستانی مذاہب میں اتحاد پسندانہ رجحانات کو ابھرآنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں سکھ مت کے بانی گرونانک نے پنجاب میں اس کی اشاعت کی۔ مذہبی جستجو سے نمو پانے والی ان تحریکوں نے آگے چل آنے والی صدیوں

کے دوران برصغیر ہند کی سیاست پر گہرا اثر چھوڑا اور آج بھی ہندوستان اور پاکستان کی سیاست پر ان کا اثر جاری ہے۔جن سلطنتوں کو تیمور نے برباد کیا ان میں صرف عثمانیہ حکومت باقی رہی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ تیمور نے آگے بڑھ کر اس سلطنت کے یوروپی علاقوں کی جانب پیش قدمی نہیں کی۔

تیمور کے بعد اس کی عظیم سلطنت انتشار کا شکار ہوگئی۔اس بکھری ہوئی حکومت کے ملبے سے دو طاقتور حکومتیں ابھریں۔شمال مشرقی ایران میں قرہ قونیوں نے اپنی حکومت کی بنا ڈالی۔ادھر اناطولیہ مین عق قویوں کی سلطنت کو عروج حاصل ہوا۔ایک ترکمان سردار قرہ یوسف نے تبریز پر 1410ء میں قبضہ کیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے آرمینیاء، قازوں، سلطانیہ، موصل اور بغداد پر بھی قبضہ کرلیا۔اس طرح اس نے ایک طاقتور قرہ قویوں کی فرمانروائی کی داغ بیل ڈالی۔ یہ حکومت بحیرۂ اسود سے لے کر بحیرۂ فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔قرہ یوسف اور اسکے بیٹے قرہ اسکندر نے تیموری شہزادے شاہ رخ کے بار بار کے حملوں کا سامنا کامیابی سے کیا۔ قرہ اسکندر کے بعد اس کے بھائی جہاں شاہ نے اس سلطنت کی سرحدیں ایران کے اکثر اور افغانستان کے کچھ حصوں تک وسیع کیں۔ جہاں شاہ ادب اور فنون کی سرپرستی کرنے والا بادشاہ تھا۔وہ خود بھی ایک اچھا لکھنے والا مصنف تھا۔ قرہ قویون خاندان کے لوگ اثنا عشری تھے۔عموماً عراق میں شیعہ مسلک کو جاری کرنے کا سہارا انہی کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس مسلک کو انہوں نے 1440ء درباری مسلک قرار دیا تھا۔

ادھر کچھ اور مغرب کی جانب عق قویون لو نے دیار بکر اور پرزوریم کے علاقوں کے آس پاس اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔قرہ قویون لو اور عق قویون لو کی ذیلی حکومتوں کے درمیان سرحدی تنازعات کو لے کر اکثر آپس میں جنگیں ہوا کرتی تھیں۔ابتداء میں قرہ قویون کو بالادستی حاصل رہی۔ لیکن 1467ء میں اوزان حسن کے ہاتھوں جہاں شاہ کو عبرت ناک شکست ہوئی۔عق قویون لو کے قائد کو قتل کردیا گیا۔ قرہ یوسف کے شہزادوں کا شہر در شہر پیچھا کیا گیا یا تو انہیں قتل کردیا گیا یا انہیں فرار ہونے پر مجبور کیا گیا۔ جہاں شاہ کے وارثین میں سے ایک قرہ قلی 1478ء میں ہندوستان کی جانب فرار ہوگیا یہاں اس نے گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ یہی جدید حیدرآباد بنا ہے اس سلطنت کے علاوہ دکن کی کچھ اور بہمنی

حکومتیں بھی شیعہ مسلک کی جانب میلان رکھتی تھیں۔ سترہویں صدی عیسوی میں اس شیعہ عنصر کی وجہ سے ہندوستان کے عظیم مغلوں اور ایران کے صفویوں کے درمیان رسہ کشی جاری رہی۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور میں جنوب پر مغلیہ افواج کے حملوں کے پیچھے کافی حد تک اسی شیعہ سنی کشمکش کا ہاتھ رہا۔

قرہ قویوں لو خاندان کی شکست کے بعد عق قویون لو کی سلطنت ترقی کرنے لگی۔ اوزان حسن ایک دوراندیش بادشاہ تھا۔ اس نے ایران میں مالیہ کا ایک نیا قانون رائج کیا جسے ''قانون نمائے حسن پادشاہ'' کہا جاتا ہے۔ چنگیز خان کی تباہیوں کے بعد اسی ایران اور مشرقی اناطولیہ کے کسانوں اور بیوپاریوں نے پہلی مرتبہ منصفانہ محصول کا تجربہ دیکھا۔ یہ تجربہ اوزان شاہ نے کیا اسی ایک اہم ترین سبب کے باعث اوزان شاہ کو ایران کی تاریخ میں ایک اہم اصلاح کرنے والے کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن سیاسی حیثیت سے مسلمان منصفوں نے اسے ایک غدار قرار دیا۔ اس لئے کہ اس نے عثمانیہ ترکوں کے خلاف لاطینی صلیبیوں کے ساتھ سازباز کی تھی۔

تیموری سلطنت کا صرف مرکزی حصہ ہی اس کے جانشینوں کے قبضے میں مضبوطی کے ساتھ رہا۔ تیموری شہزادوں کے درمیان سلطنت کے اس بچے کچھے حصوں کے لئے رسہ کشی ہوتی رہی۔ اس خانہ جنگی میں شاہ رخ کامیاب رہا۔ 1409ء میں اس نے سمرقند پر قبضہ جمالیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی حکومت کا صدر مقام حیرات ہی رہا۔ یہاں اس نے تیمور کے گورنر کی حیثیت سے اپنی نوجوانی گذاری تھی۔ دو دراز کے صوبوں میں بار بار بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ان بغاوتوں کو دبانے کے لئے شاہ رخ کو کئی حملے کرنے پڑے۔

فارس کی بغاوت 1414ء میں ختم کی گئی۔اس کے بعد 1416ء میں کرمان کی بغاوت کا خاتمہ ہوا۔ اس کامیابی کے فوراً بعد ازبکستان، شروان، گرم شہر، قندھار اور قزاقستان نے اطاعت قبول کرلی۔ 1420ءتک شاہ رخ نہ صرف فرغانہ کی خوبصورت وادی پر قابض تھا بلکہ خراسان،سیستان، کرمان، فارس اورخوارزم بھی اس کی سلطنت میں شامل ہو چکے تھے۔اس طرح تیموری شہنشاہیت کا مشرقی حصہ شاہ رخ کے زیرنگیں رہا۔شاہ رخ نے قرہ قویون لو کے خلاف تین مرتبہ حملے کئے اور تینوں مرتبہ وہ کامیاب رہا۔ پہلی مہم 1420ء میں ہوئی۔دوسری 1431ء میں تو تیسری اس کی حکومت کے آخری زمانہ یعنی 1434ء میں ۔ ہر بار شاہ رخ نے تبریز شہر پر قبضہ کیا لیکن تیموریوں کے واپس ہونے ہی قرہ قویوں لو ترک واپس شہر میں آجاتے۔ تیموریوں کو قرہ قویون لو کے اس چیلنج نے صفوی شاہی سلسلے کے عروج کے بیج بوئے اس خاندان نے اس صدی کے آخری حصہ میں عروج حاصل کیا۔عثمانیہ ترکوں اور صفویہ کے درمیان جنگ کا باعث بھی یہی چیلنج تھا۔

شاہ رخ کو ایک مخیّر بادشاہ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ تیموری سلطنت تیمور کے انتقال کے بعد جب انتشار کا شکار ہوگئی۔اس سلطنت کے ایک بڑے حصہ کو شاہ رخ نے سیاسی واقتصادی استحکام بخشا۔تو اس کارگذاری میں اس کے قابل وزیروں نے اسکا پورا پورا ساتھ دیا۔ان سب سے نمایاں وزیر مالیہ کی حیثیت سے امیر قوقلتش معتمد اعلیٰ کی حیثیت سے غیاث الدین پیرعلی اور وزیر دفاع کے منصب پر فائز جلال الدین تھے–شاہ رخ فنون ادب اور سائنس کا سر پرست تھا۔فن خطاطی، کوچک نقاشی یا چھوٹی تصویر کشی،شاعری،تاریخ،موسیقی اور فلکیات اس کے دور میں مائل بہ عروج تھے–

اس دور کے مشہورترین حساب دان اور ماہرین فلکیات میں سے ایک غیاث الدین جمشید تھا۔اور مشہور شعراء میں نمایاں شاہ نعمت اللہ ولی بھی۔فارسی درباروں اور عوام دونوں کی زبان تھی۔فارسی کے ساتھ ساتھ مشرقی ترکی زبان تھی۔عوامی زبان کی حیثیت سے فروغ پانے لگی۔یہ تقریباً وہی دور تھا جبکہ جنوبی ہند میں اردو کی ترویج ہونے لگی تھی۔ مدارس کی اچھی سرپرستی ہوتی تھی۔راستوں کی مرمت ہوئی،ہسپتال بنوائے گئے۔مذہبی معاملات میں شاہ رخ صحیح عقیدہ کا پکا تھا۔اس نے چنگیز خان کے عقائد کو ترک کرکے شریعت کو

نافذ کیا۔چین، ہندوستان اور مصر کے ساتھ تجارت کو فروغ دیا۔زراعت میں ترقی ہوئی حیرات اور سمرقند کے علاوہ اصفہان، شیراز اور تاشقند تہذیب وتمدن، شاعری، فنون اور ادب کے مراکز بن کے ابھرے۔

1434ء میں شاہ رخ کے انتقال کی وجہ سے تیموریہ خاندان کے اقتدار میں مزید کمی ہوتے دیکھی گئی۔شاہ رخ کی سلطنت تین حصوں میں بٹ گئی۔ایک سلطنت کی بنیاد فرغانہ تھا جہاں شاہ رخ کے بیٹے الغ بیگ کی فرمانروائی تھی۔دوسری حکومت خراسان کی جو عبدالقاسم کے ماتحت تھی۔تیسری علاؤالدین کے ماتحت افغانستان میں قائم ہوئی۔یہ بھی ایک تیموری شہزادہ تھا۔ایران کا وسطی حصہ محمود شاہ کے قبضہ میں آ گیا۔شمالی مغربی ایران اور مشرقی اناطولیہ تک قراقویوں سلسلے کے جہاں شاہ نے دھیرے دھیرے اپنی حکومت وسیع کی۔فرغانہ کے الغ بیگ کا دور حکومت 1434ء تا 1449ء تک تھا۔اس نے سائنس اور علم ریاضی کی جو سرپرستی کی اس کے لئے وہ تاریخ میں مشہور ہے۔اس سلطان کے دور میں سمرقند کی مشہور رصدگاہ تعمیر کی گئی۔مشہور ریاضی دان غیاث الدین جمشید، معین الدین کا شاتی، قاضی زادہ رومی اور صلاح الدین موسیٰ اسی رصدگاہ میں خدمات انجام دے رہے تھے۔فلکیاتی جدول ''زیجِ جدید سلطانی'' کے ایجاد کا سہرا اُلغ بیگ کے سر ہی باندھا جاتا ہے۔یہ جدول (Table) قرون وسطیٰ کے دوران ساری اسلامی دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا۔

الغ بیگ کے بعد ابوسعید نے 1450ء سے 1469ء تک حکومت کی اس نے تیموریہ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی کوشش کی۔لیکن قرہ قویولونیوں نے مشرقی ایرانی اور ناطولیہ کو اس سے چھین لیا۔ 1469ء میں قرہ قویولونیوں نے مشرقی ایران اور اناطولیہ کو اس سے چھین لیا۔1469ء میں قرہ خویولونیوں نے اسے گرفتار کر کے مروادیا۔اس کے بعد سلطنت کا شیرازہ تو تقریباً پورا بکھر گیا۔شمال سے منگولوں اور مشرق سے ازبکوں کا فوجی دباؤ بڑھ گیا۔عق قویونی شاہی سلسلے کے بادشاہ اوزون حسن اور اس کے بیٹے یعقوب نے 1478ء میں تبریز، شمالی مغربی ایران اور مشرقی ترکی پر قبضہ جمالیا۔یعقوب کی حکومت 1478ء سے لے کر 1494ء تک رہی تیمور کا پڑپوتا سلطان حسین بقارہ 1465ء سے لے کر 1494ء تک افغانستان اور حیرات پر حکومت کرتا رہا۔شاہ رخ کے بیٹے اور تیمور کے پڑپوتے شہزادہ احمد نے

1469ء سے لے کر 1494ء تک سمرقند کے اطراف کے علاقہ پر حکومت کی تھی۔شہزادہ احمد کا بھائی عمر شیخ فرغانہ پر حکومت کر رہا تھا- چنگیز خان کے خاندان کا ہی ایک فرد یونس خان ابوسعید کی افواج کا سپہ سالار تھا اس نے منگولوں پر قابو حاصل کرلیا۔

یونس خان کی بہن قتلوق نگار خانم عمر شیخ سے بیاہی گئی۔ان دونوں کے نکاح سے جس بچے نے جنم لیا وہ تھا ظہیر الدین محمد بابر جس نے ہندوستان میں مغل شاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔اس طرح بابر ماں کی جانب سے منگول تھا اور باپ کی طرف سے تاتار اور تیمور کا پوتا تھا۔وہ لوگ جو بابر کے نسب نامہ میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے بابر کا شجرہ یوں ہے۔ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ بن ابوسعید بن محمد بن میران شاہ بن تیمور۔بابر کے اس نسب سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مغلوں نے کس لئے سمرقند کو فتح کرنا انتہائی ضروری سمجھا۔ وہ تو ان کا آبائی وطن تھا۔بعد میں مغل شہنشاہ شاہجہاں نے جس نے ہندوستان پر 1628ء سے 1658 تک حکومت کی تھی۔اس نے ہندوستانی فوج کو فرغانہ اور سمرقند کی جانب روانہ کیا تھا۔اس طرح سلطنت تیموریہ کے بکھرنے کے بعد جو انتشار پھیل گیا تھا اسی بدامنی، بدنظمی اور بکھرے ہوئے دور سے صفویہ،عثمانیہ اور عظیم مغلیہ سلطنتوں نے جنم لیا۔

جزائر کے جھرمٹ میں اسلام

آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان تاجروں نے انڈونیشیاء، ملیشیاء اور مشرقی چین جیسے ممالک کو اسلام سے آشنا کرایا، ملاکا اور کنٹون میں خوشحال ومتمول تاجروں کی بڑی بڑی کالونیاں آباد ہوگئیں لیکن وہ تو تیرہویں صدی عیسوی کا زمانہ تھا جبکہ صوفیائے کرام کے کارواں یہاں اترے انہی کی کوششوں سے اسلام جزائر کے جھرمٹ میں اس کے اندرونی علاقوں میں بڑی طاقت کی حیثیت سے داخل ہو پایا۔ تیرہویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی میں مالے کے علماء وصوفیائے کرام کی محنتوں کی وجہ سے اسلام کی اشاعت تیزی سے ہونے لگی۔ جب اسلام عوام کے دلوں میں اتر گیا تو عوام کی نظروں میں اپنی حکومت کے جواز کو برقرار رکھنے کے لئے حکمرانوں نے اسلام قبول کیا۔ پندھوریں صدی عیسوی کے آخر تک جاوا کی طاقتور ''مجاپاہت'' حکومت اسلام میں داخل ہوچکی تھی۔ اسپینیوں کے آنے اور 1540ء میں منیلا پر انکے قابض ہوجانے کی وجہ سے شمال میں فلپائن اور ویتنام کے علاقوں میں اسلام کی اشاعت پر روک لگ گئی۔ اسپین کے حملہ آوروں نے مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے کے لئے ظلم وستم شروع کردیا۔ انہوں نے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ سرکار اور عدالتوں نے مسلمانوں کے خلاف تبدیلئ مذہب کے لئے کارروائی شروع کردی۔ ان کا مقصد یہاں سے اسلام کا خاتمہ کرنا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے اسلام کے ناموس کے لئے اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے اسپینیوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ ایک مسلح جدوجہد شروع ہوگئی یہ جدوجہد آج بھی منڈاناؤ جزائر میں جاری ہے۔

چھیالیسواں باب

انڈونیشیاء میں اسلام

انڈونیشاء میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی بستی ہے۔ملیشیاء،فلپائین کے جزائراورانڈونیشیاء کی مشترکہ مسلم آبادی دوسو پچاس ملین یعنی پچیس کڑوڑ سے زیادہ ہے۔تاریخی طور پراس علاقہ کومشرقی جزائرکہاجاتاہے۔لیکن اس کے لئے''جزائرکاجھرمٹ''لفظ استعمال کریں گے۔اس میں جدیدانڈونیشیاء ،ملیشیاءاور برونی شامل ہیں اور مجموعی طور پران تینوں ممالک کےعوام،وہاں کی زبان تہذیب وتمدن سب کے لئے کل ملاکر''مالے''لفظ استعمال کریں گے۔

جغرافیہ تاریخ کا فیصلہ کن عنصر ہے۔بنگال سے لےکرمراقش تک پھیلی ہوئی طویل سطح زمین اندرونی طور پرایک دوسرے جڑی ہوئی ہے۔ان میں باہمی ربط ہےلیکن ملائی جزیرۂ نما سے لےکر نیوگنی کا وسیع علاقہ اس سےمنسلک نہیں ہے۔بلکہ اس سےالگ سےاندرونی جغرافیائی ربط نے شمالی افریقہ،مصر،مشرق وسطیٰ، وسط ایشیاء اور ہندوستان کے درمیان سیاسی وفوجی باہمی اثراندازی کےعمل کو جاری رکھا۔لیکن جغرافیائی اعتبار سے جداگانہ حیثیت رکھنے والامشرق بعیدایشیاء کی سرزمین کےان اندرونی روابط سے بچ گیا۔ان دونوں حصوں کے درمیان بحرہنداورخلیج بنگال واقع ہے۔یہ ایشیاء،افریقہ اور یوروپی مسلم علاقوں سے بہت دوری پر واقع ہےاسی دوری کی وجہ سےمشرق بعید کے سیاسی وجغرافیائی حالات مسلم دنیا کے حالات سےایک گھیراؤ کی حدتک ہی متاثر ہوسکے۔یہ اثرصرف جذبات کی حدتک ہی رہا۔ملیشیاءاور انڈونیشیاءکواپنی تاریخ کی تعمیرآپ خودکرنی پڑی۔بقیہ اسلامی دنیا سےاس تاریخ کارشتہ صرف روحانی، ذہنی دانش وری اور مذہب کےرشتہ کی حدتک محدودرہا۔ایک دوسرے کےدرمیان سیاسی وفوجی روابط بس

سرسری سے رہے۔

اسلام کے آنے سے پہلے جزائر کے اس مجموعہ پر ہندو بادشاہ کی حکومت تھی یہاں عوامی مذہب بودھ مت تھا یہ ہندومت کی روحانیت کی ایک پرت سے ڈھکا ہوا ڈھانچہ تھا۔ ان جزائر میں ہندوستانی عنصر سب سے پہلے اشوکہ کے دور حکومت میں (262ء تا 269 ق م) کے دوران داخل ہوا۔ برصغیر کے کافی بڑے حصے پر اپنی حکمرانی کا سکہ رائج کرنے والا پہلا بادشاہ اشوک ہی تھا۔ اپنی حکمرانی کے ابتدائی دور میں مسلسل جنگوں میں مصروف رہا۔ اپنی حکومت کی سرحدوں کو اور زیادہ دور تک پھیلانے کے لئے وہ یہ جنگیں لڑتا رہا۔ لیکن 250ء ق م میں کلنگا کی جنگ کے بعد جب اس نے قتل عام اور تباہیوں کی داستان دیکھی تو ان بربادیوں سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے بودھ دھرم قبول کرلیا۔ اس کا صدر مقام پاٹلی پترا، یعنی جدید پٹنہ، بودھ مت کا مرکز بن گیا۔ اشوکہ نے آگے چل کر وہ فرمان جاری کئے جو اس مذہب کی تعلیمات کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان تعلیمات کو پتھروں پر کندہ کروایا۔ پھر انہیں سری لنکا، برما، افغانستان اور انڈونیشیاء کے جزائر کو بھیجا گیا۔

اس زمانے میں اشوکہ کا شاہی دربار دنیا بھر کی سفارتی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فارس کے اسیریا درباروں، مصر کے فرعونوں، مقدونیہ کے سکندر اول اور چین کے تانگ شاہی خاندان کے ساتھ اس کے سفارتی تعلقات قائم تھے۔ ہندوستان تجارت کے میدان کا بڑا ماہر تھا اس لئے کہ یہ چین اور بحیرۂ روم سے تجارتی روابط کا ایک اہم درمیانی مرکز بنا ہوا تھا اس لئے یہ بات قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ شہنشاہ کے سفیروں نے اس دور کی جانی پہچانی دنیا کے دور دراز کونوں تک اس کے پیغام کو پہنچایا ہوگا۔ لیکن بدھ مت کے اثر کا دائرہ ان جزائر اور چین میں دھیمی رفتار سے بڑھتا رہا اس کے کئی وجوہات ہیں۔ اول تو اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس دور میں سفر کرنا کس قدر دشوار گذار تھا۔ دوسری وجہ اس کا درگذر کر دینے والا معاف کر دینے والا اہنسا کا راستہ بھی ہے۔ لیکن تیسری اور چوتھی صدی عیسوی کے آتے آتے بدھ مت چین، جاپان، جزائر کے اس مجموعہ میں تیزی سے پھیلنے لگا۔

چوتھی صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان میں گپتا سلطنت نے اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے یہ

حکومت 320ء تا 467ء تک قائم رہی۔شہنشاہ چندر گپتہ دوم جس کا دور حکومت 375ء تا 415ء تک رہا اس نے فتح یابی، شادی اور سفارت کے ذریعہ برصغیر ہند کے بڑے حصہ تک اپنی سلطنت کی سرحدیں وسیع کردیں اس دور کے متعلق ہمیں چین کے سیاح فاہیون کی تحریروں سے بہت ساری معلومات مل جاتی ہیں۔ گپتا سلسلے کے اس دور میں ہندومت کو دوبارہ زندگی مل گئی۔ بدھ مت جو کہ اس وقت ہندوستان کا اکثریتی مذہب تھا اس پر ہندو مذہب غالب آ گیا۔مشہور شاعر کالیداس چندر گپتا کے دربار سے ہی وابستہ تھا شاہی دربار کی سرپرستی نے ہندو طرز فکر کو دور دراز کے علاقوں میں پھیلنے کا موقع دیا۔

لیکن جزائر کے جھرمٹ میں ہندومت کی اشاعت جنوبی ہند کے ذریعہ ہوئی۔ جغرافیائی اور سیاسی دونوں اعتبار سے جنوبی ہند کا پلڑا بھاری تھا۔ مانسون کے ہواؤں کا رخ سری لنکا اور تامل ناڈو کی سرزمین کو جزائر کے جھرمٹ کے سمندری راہوں سے جوڑتا ہے۔تجارت نے تمدنی مذہبی اور دیگر باہمی اثرات کو فروغ دیا۔ بدھ مت ایشیاء کا بین الاقوامی مذہب تھا۔لیکن سماٹرا، کمبوڈیا اور ویت نام کے درباروں نے ہندومت کو ترجیح دی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مشترکہ مذہبی روابط کی وجہ سے بھی تجارتی تعلقات کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان اور سری لنکا سے جزائر کے جھرمٹ اور چین کو روئی، ہاتھی دانت، پیتل کی کاریگری وغیرہ اشیاء درآمد کی جاتی تھیں۔ بدلے میں ان جزائر سے کافور اور مصالحہ جات آتے تو ادھر چین سے بھی سلک، تیل اور عنبر جیسی اشیاء یہاں پر آتی تھیں۔ ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک کی اشیاء ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے بحیرۂ روم میں واقع رومن سلطنت کو برآمد کی جاتی تھیں۔ان تجارتی رشتوں کی وجہ سے جنوبی ہند کی زبانوں اور سنسکرت کی نشو ونما جزائر کے جھرمٹ اور انڈوچائنا میں بھی ہوئی۔

جنوبی ہند کا اثر وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا۔چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے دوران پلّوا اور چولا بادشاہتیں برسراقتدار آئیں۔ یہ بادشاہتیں ہندوستان کے اس جنوب مشرقی حصے پر قائم تھیں جسے آج تملناڈو کہا جاتا ہے۔ دونوں ریاستیں قتل وغارتگری کی عادی تھیں۔اپنے پڑوس کے علاقوں میں لوٹ مار مچانے کے ذریعہ ان کی حکومتیں چلتی تھیں۔خصوصیت کے ساتھ چولاؤں نے ایک طاقت ور بحری بیڑا تعمیر کر رکھا تھا جس کے ذریعہ وہ جزائر کے جھرمٹ یعنی انڈونیشیاء جیسے دور دراز علاقوں تک بھی لوٹ مار کیا کرتے تھے۔

1025ء میں چولا کے بحری بیڑے نے سماترا اسطلنت کے سری وجے کے بیڑے کو شکست دے دی اس طرح گیارہویں صدی عیسوی کے پہلے پچاس سالہ دور میں ان کا بحری بیڑا خلیج بنگال کا طاقتور ترین بیڑا بن گیا تھا۔ ملبار کے باشندوں اور ہندوستان کے جنوبی کونے کی ریاست پلّوا کی متحدہ طاقت کے ساتھ چولا پلّوا جیسی طاقتوں کا مسکن جنوبی ہند کا یہ علاقہ رومن شہنشائیت، ہندوستان اور چین کے درمیان اہم ترین تجارتی کڑی بن گیا تھا۔ یکے بعد دیگرے حکومت کرنے والے خاندانوں کے ماتحت جنوبی ہندوستان خوشحال اور دولت مند بنتا رہا۔ یہ حالت ملک کافور کے آنے تک برقرار رہی۔ تقریباً 1300ء کے آس پاس ملک کافور جنوبی ہند میں علاؤالدین خلجی کی افواج کا سپہ سالار تھا۔ اسلام کے آنے سے پہلے تقریباً ایک ہزار سالوں کے دوران جزائر کے اس جھرمٹ کے ساتھ ہندوستان کے باہمی اثرات باہمی عمل درعمل کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی زمانہ میں کمبوڈیا میں تقریباً 1000ء کے آس پاس انگوٗ واٹ کے منادر کے تعمیر ہوئی اسی دور میں سماٹرا کی سری وجیہ اور جاوا کا ماجاپاہٹ کی ہندو حکومتوں نے ترقی بھی کی اور پھر زوال کا شکار ہوگئیں۔ ان حکومتوں نے ان جزائر پر اور انڈوچائنا کی زبان، معاشرت، فنون، اور فن تعمیرات پر انتہائی گہرا اثر چھوڑا جو کہ سنسکرت آمیز تھا۔

جزائر کے جھرمٹ میں اسلام کی آمد کو تین مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) اولین مرحلہ 622ء سے لے کر 1100ء تک (۲) دوسرا مرحلہ 1100ء سے لے کر 1500ء تک (۳) تیسرا 1500ء سے جدید دور تک کا ہے۔

پہلا مرحلہ بحر ہند کے جہاز راں علاقوں کے باہمی تجارتی روابط کا نتیجہ ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے ہی مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے درمیان تجارت جاری تھی۔ یمن اور خلیج فارس کے سوداگر مانسوں کا پیچھا کرتے ہوئے مالابار کے ساحلوں تک پہنچتے یہاں سے وہ سری لنکا، جاوا، سماٹرا کے جزائر جا پہنچتے۔ اسلام کی آمد کے ساتھ اس تجارت میں تیزی آ گئی۔ بغداد کے طاقتور عباسی خلفاء نے خصوصیت کے ساتھ عالمی تجارت کی ہمت افزائی کی۔ ادھر مغرب میں تجارتی کارواں صحرا سے گذرتے ہوئے مغربی افریقہ کی گہرائی تک جا پہنچتے جسے آج جدید دور میں گھانا اور نائیجریا کہا جاتا ہے مشرق میں چین کی جانب والی سلک شاہراہ

تجارتی سرگرمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ بحری تجارت بھی کچھ پیچھے نہیں تھی۔عرب اور ایران کے مسلمان تاجروں نے بحر ہند کو کھنگال ڈالا ،جس کی وجہ سے ہندوستان مشرقی افریقہ انڈونیشیاء اور چین کے ساتھ ہونے والی تجارت کا بڑا حصہ ان کے دامن میں آ گیا۔ ملبار، سری لنکا، سماٹرا، کیانٹوان اور مشرقی افریقہ کے سارے ساحلوں کے کنارے مسلمان تاجروں نے اپنی تجارتی بستیاں قائم کر لی تھیں۔المسعودی نے لکھا ہے کہ 877ء میں تانگ شاہی سلسلہ کے بادشاہ ہی ہیونگ کے دور حکومت میں چین کے کیانٹون شہر میں دولاکھ مسلمانوں کی آبادی تھی- 887ء میں کسانوں کی بغاوت نے ان مسلمانوں کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا وہاں سے فرار ہو کر یہ مسلمان ملایا کہ مغربی ساحل پر واقع کھیڈا میں آباد ہو گئے- 750ء اور 1100ء کے دوران بحر ہند کے دائرہ سے وابستہ تمام ساحلوں پر مسلمان تاجروں کی بے شمار بستیاں آباد تھیں۔ یہ مسلمان تاجر کافی متمول اور خوشحال تھے-

مسلمان تاجروں کی ایمانداری اور دیانتداری سے متاثر ہو کر بے شمار ملائی باشندوں نے اسلام قبول کرلیا- بین المذاہب شادیوں نے بھی اسلام کے پھیلانے میں کافی اہم رول ادا کیا جیسا کہ مالبار اور سماٹرا میں ہوا تھا ان ہجرت کرنے والوں نے مقامی آبادی پر اپنے معاشرتی اور تمدنی روایات کو زبردستی لاگو نہیں کیا اس کے بجائے انہوں نے بذاتِ خود مقامی معاشرہ کو قبول کرلیا اور اس معاشرت کو توحید اور شریعت کے ڈھانچہ میں ڈھال لیا- ملائی باشندوں کے درمیان عرب ہمیشہ اقلیت ہی رہے لیکن ان کو معاشرہ میں ایک باعزت اور باوقار مقام حاصل رہا۔ وہ قرآن کی زبان میں بات چیت کرتے تھے اپنی خداترسی اور امانت داری کی وجہ سے مشہور تھے- ان کے ان عادات اور خصائل کی وجہ سے ہر کوئی ان کے ساتھ اپنی بیٹی کو بیاہ کرنے کے لئے تیار رہتا تھا یہاں تک کے وہاں کے راجہ اور سلاطین بھی اپنے خاندان کے فرد کو کسی عرب کے ساتھ شادی کرنا انتہائی فخر اور شان کی بات سمجھتے تھے- عرب خون سے پیدا ہونے والے افراد کو سید کہہ کر یعنی پیغمبرؐ کے وارث کہہ کر عزت افزائی کی جاتی - یہ وہ دور تھا جبکہ کلاسیکل اسلام انتہائی عروج پر تھا۔ آٹھویں اور نویں عیسوی صدی کے دوران مدینہ اور کوفہ میں فقہ کے اہم ترین مسالک کی تدوین ہوئی۔عرب اور فارس کے وہ بیوپاری جوان علاقوں کی جانب گئے اور وہ جس اسلام کو اپنے ساتھ لے گئے وہ شریعت اور

فقہ کے رنگ میں بہت زیادہ ڈوبا ہوا تھا۔ انڈونیشیاء اور ملیشیاء میں اسلام کے ابتدائی دور میں جس طرز کا اسلام آیا وہ مشرق وسطیٰ کی دانش ورانہ رو کا مظہر تھا حالانکہ یہ علاقہ عباسی شہنشاہیت کے سیاسی وفوجی دائرہ سے باہر تھا- یہاں کے مذہبی ارتقاء میں حج نے انتہائی اہم رول ادا کیا۔ عربوں کی اکثریت شافعی اور مالکی مسالک پر چلتی تھی- یہ مسالک مدینہ اور دمشق کے غالب مسالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انڈونیشیائی اور ملیشیائی حجاج کرام حج سے واپس آئے تو فقہ کے ان مسالک کے طرز فکر کو اپنے دامن میں سمیٹ لائے تقریباً 1100ء کے آس پاس عالمِ اسلام ایک انتہائی گہرے تغیّر سے گذرا- امام الغزالیؒ (انتقال 1111ء) نے اپنے زور بیاں اور فصیح تحریروں سے فلاسفی کی تعلیم پر کاری ضرب لگائی اور اسلامی نظام تعلیم میں تصوف کو ایک باوقار مقام عطا کیا- 1100ء سے پہلے اسلامی تہذیب باطنی دنیا سے دور اور عقلیت پسندی سے قریب تھی اس کا اہم ترین زور شریعت اور فقہ پر تھا- 1100ء کے بعد اسلامی تہذیب نے باطن کی طرف رجوع کیا۔ فلاسفی اور طبعیاتی سائنس کے بجائے روحانیت کی جانب زیادہ زور دیا- اسی طرح تصوف اسلامی تعلیمات کا انتہائی اہم عنصر بن کر ابھرا- صوفی مسالک کے اہم ترین سلسلے ابھر آئے جنہوں نے آگے چل کر ایشیاء اور افریقہ کے سارے تناظر کے قلوب کو یکسر بدلا ڈالا- بغداد میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جن کا انتقال مبارک 1166ء میں ہوا- دہلی میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ قونیہ ترکی میں شیخ جلال الدین رومیؒ وفات 1273ء اور قاہرہ میں حضرت الشادولیؒ انتقال 1258ء میں ہوا یہ وہ زمانہ ساز ہستیاں تھیں جنہوں نے اپنی کاوشوں سے ان براعظموں کی کایہ پلٹ دی- اسلامی تہذیب کا طریقۂ کار اور عمل دخل دونوں کی ہیئت تبدیل کر کے رکھ دی- ہندوستان کی طرح جزائر کے اس جھرمٹ میں بھی اسلامی ہیئت کی اس تبدیلی یعنی باطن کی جانب اس کے جھکاؤ کے دباؤ کو محسوس کیا گیا- 1100ء تا 1500ء کا یہی وہ دور ہے جبکہ انڈونیشیاء اور ملایا میں اسلام کی اشاعت انتہائی تیزی سے ہوئی- ہندوستان کی طرح یہاں بھی روحانی اسلام نے ان جزائر کو اپنا گھر بنایا۔ وہ روحانی اسلام ظاہری آداب کا مجموعہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ اسلام جو باطن کی طرف زیادہ مرتکز تھا۔ ان جزائر کے مجموعہ میں اسلام کی اشاعت آنے والے چار سو سالوں تک یہاں کے جغرافیائی حالات کے انداز سے ہوئی۔ مختلف جزائر سے ہوتا ہوا یہ آگے بڑھتا رہا۔ 1100ء سے لے کر

1500ء کے دوران اس کی ابتداء سماٹرا سے ہوئی۔ اس کے بعد جاوا، ملایا، بورنیو، سولو یعنی منڈاناؤ، سلاویسی اورلوزون جسے منیلا کہا جاتا ہے میں اس کی اشاعت کی رفتار بڑھنے لگی۔

1100ء کے آس پاس عرب کے ایک عالم حضرت شیخ عبداللہ عارفؒ نے سماٹرا کو اسلام سے آشنا کرایا۔ ان کے شاگردوں میں سے ایک حضرت شیخ برہان شاہؒ نے دعوت کی اس تحریک کو شمالی سماٹرا تک پھیلایا۔ شمالی سماٹرا کا سربراہ چوبان شاہ 1200ء میں مسلمان ہوا اس علاقہ میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والا بادشاہ یہی تھا۔

لیکن 1297ء میں سلطان ملک الصالح کے دور حکومت میں اسلام کی زبردست سرپرستی حاصل ہوئی۔ پچھلی صدیوں کے دوران تجارتی روابط کی وجہ سے سماٹرا اور جاوا کے ساحلوں کے علاوہ ملایا کے مغربی ساحل اور ویت نام کے مشرقی ساحل اسلام آشنا ہو چکے تھے۔ پھر چودھویں صدی عیسوی کے دوران صوفی شیوخ آئے اور سارے سماٹرا میں اسلام کو پھیلا دیا۔ پسائی شہر علوم حاصل کرنے کا مرکز بن گیا۔ 1345ء میں ابن بطوطہ نے پسائی شہر کی سیاحت کی۔ اس نے وہاں کے حکمران ملک الظاہر کو خدا ترس علماء کی سرپرستی کرنے والا اور مذہب اسلام کی بڑی تندہی سے اشاعت کرنے والا پایا۔ ملک الظاہر ملک الصالح کا پڑپوتہ تھا۔ جاوا جزیرہ کا ایک شہزادہ ملا کا فرار ہوگیا۔ اس نے پاسی کے سلطان کی بیٹی سے بیاہ کیا۔ 1406ء میں اسلام قبول کیا اور اپنا نام سلطان اسکندر شاہ رکھا۔ یہی وہ شہزادہ تھا جس نے ملایا کو اسلام سے آشنا کروایا۔

پاسائی اور ملا کا تصوف کے مراکز بن گئے۔ روحانی تعلیمات اندرونی علاقوں کو منور کرنے لگیں۔ ملا کا اس علاقہ میں اسلام کی روشنی کا مینارہ بن گیا۔ 1474ء میں ایک بڑا تجارتی مرکز کیڈھا اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگیا۔ یہی وہ دور ہے یعنی تیرھویں اور چودھویں صدی، جبکہ اسلامی دنیا منگولوں کے حملوں سے تباہ و تاراج ہو رہی تھی۔ ان مظالم سے بچنے کے لئے بے شمار علماء صوفی شیوخ اور تاجروں نے دہلی میں پناہ لی۔ جب دہلی کے بادشاہ محمد بن تغلق نے 1335ء کے آس پاس صوفیائے کرام پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ تو کئی صوفیائے کرام نے ہجرت کرتے ہوئے آگے ان جزائر کے جھرمٹ میں پناہ لی۔ عالم

اسلام میں تصوف اس قدر پھیل چکا تھا کہ اکثر تاجر اور مسافر بھی اہل طریقت سے تھے۔اس ہجرت کی وجہ سے ان جزائر میں مذہبی تحریکیں زیادہ متحرک ہوگئیں۔اسی جوش و ہیجان نے خود ملائی باشندوں سے ہی کئی عظیم صوفی شیوخ کے ابھرنے کا راستہ صاف کر دیا۔انہوں نے اسلام کی تحریک کو آگے بڑھایا اپنے جزائر میں شدومد سے اس کی اشاعت کی۔

چودہویں اور پندرہویں صدی کے دوران جاوا پر ایک طاقتور ہندو شاہی خاندان مجاپاہت کی فرمانروائی تھی۔اس کا مرکز جکارتا شہر تھا۔اس حکومت کی آمدنی کا اہم ذریعہ تھا مصالحہ جات کی تجارت اور زراعت، مجاپاہت نسل کے باشندے جاوا جزیرہ پر اور اس کی تجارت پر مکمل طور سے حاوی تھے۔دوسری جانب چھوٹے چھوٹے راجا اور مقامی سردار، علاقائی بندرگاہوں پر قابض تھے۔یہ راجہ اور سردار مجاپاہت حکمرانوں کو خراج ادا کرنے پر مجبور تھے۔جزائر کے اس جھرمٹ اور مسلم دنیا کے درمیان جیسے جیسے تجارت زور پکڑنے لگی مقامی راجاؤں اور سرداروں نے مسلم ہندوستان اور مشرق وسطی سے نزدیکی تجارتی روابط کو بڑھانا بہتر جانا۔ مجاپاہت راجہ سے رابطہ برقرار رکھنے کی بہ نسبت انہیں اسلامی دنیا کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں زیادہ فائدہ نظر آیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی علاقوں کے تعلقات کمزور ہو گئے جس کی وجہ سے مرکزیت بھی زوال کا شکار ہوگئی۔اس طرح یہاں طاقت کا ایک خلاء پیدا ہو گیا۔مقامی راجہ اور سردار یکے بعد دیگرے اسلام قبول کرنے لگے۔تبدیلی مذہب کے ساتھ ہی انہیں احساس ہوا کہ اب وہ ایک بین الاقوامی برادری کی آغوش میں ہیں۔ان کی تجارت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔وقت کے ساتھ ساتھ مجاپاہت دربار بھی اسلامی اثر قبول کرنے لگا۔1450ء تک اسلام اس دربار کا غالب مذہب بن چکا تھا۔

1451ء میں ایک عارف حضرت شیخ رحمتؒ نے اپنا مرکز جدید شہر سرابایا کے قریب بنایا۔ان کی کوششوں سے مجاپاہت راجہ کرتو جیہ نے اسلام قبول کرلیا۔1475ء تک آتے آتے مجاپاہت شاہی سلسلے نے اپنے کردار کو مسلم سلاطین کے روپ میں مکمل طور سے ڈھال لیا۔یہ حکومت 1515ء تک برقرار رہی۔ اس طرح جاوا میں اسلام کی اشاعت کی تاریخ بالکل جداگانہ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ اس تاریخ کی عام ڈگر کی طرح نہیں ہے کہ جب کوئی طاقتور بادشاہ مذہب تبدیل کر لیتا تو اس کی وجہ سے رعایا کو بھی مجبوراً

اسی مذہب کی اطاعت قبول کرنی پڑتی۔ان جزائر میں سب سے پہلے تو عوام نے اسلام قبول کیا، حکمرانوں نے تو بعد میں اس راہ کو اختیار کیا۔ وہ صوفیائے کرام جنہوں نے جاوا کے باشندوں کی زندگی بدل دی اور جن کا وہاں کے لوگ بہت ہی ادب واحترام کرتے ہیں وہ ہیں پاسائی کے صوفی شیخ اسحاق ؒ، سونان بونانگ ؒ، سونان آمپل ؒ، سونان گری ؒ، سونان دری جات ؒ اور خلیفہ حسن ؒ.

اسلام کی تیزی کے ساتھ پھیلنے کا ایک اوراہم عنصر تھا، حکومت کرنے کا جواز۔تاریخ کے تمام ادوار میں مسلمانوں کے ایک طبقے کی بڑی اہم رائے یہ رہی کہ حکمران کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آل سے ہی ہونا چاہئے۔یہ رائے اسلامی دنیا کے اندر ایک زبردست روبن کر بہتی رہی۔ چودھویں صدی عیسوی تک اسلام جاوا اور سماٹرا میں پورے طور سے پھیل گیا تو اس یقین کو ملایا کے عوام نے قبول کر لیا کہ حکمرانی کرنے کا جواز صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو ہی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ اور مدینہ سے جو عربی النسل سید اور شریف ہجرت کر کے ان علاقوں میں آئے تھے ان کے ساتھ نومسلم مقامی راجاؤں نے شادی بیاہ کرنے کو فوقیت دی۔اسے ایک رواج کی شکل دے دی۔ان شادیوں سے وجود میں آنے والی نسل اپنا حسب ونسب بجاطور پر شاہی خاندان سے بھی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی جوڑ سکتی تھی۔مجاپاہت کے حکمران بھی جواز حاصل کرنے کی اس خواہش سے مبرّا نہیں تھے۔جب جاوا کے زیادہ سے زیادہ باشندوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو مجاپاہت راجاؤں کو بھی اپنی رعایا کی خواہش کے آگے سر جھکانا پڑا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔عوام کی مرضی کے مطابق حکمرانی کے جواز کو حاصل کرنے وہی عمل کیا جسے عوامی سند حاصل تھی۔یعنی عربی النسل لوگوں کے ساتھ اپنے ازدواجی رشتہ جوڑ لئے۔

حضرت شیخ اولیاء کریم المقدوم ؒ نے 1380ء میں ملاکا سے منڈناؤ کی جانب ہجرت کی۔سب سے پہلے آپ نے ہی فلپائن کو اسلام کی روشنی سے آشنا کروایا۔پھر آپ کے شاگرد سید ابوبکر ؒ نے اسی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔1475ء میں شریعت محمد کیونگسوان ؒ ملاکا سے منڈناؤ تشریف لائے اور اشاعت اسلام کے کام کو تندہی سے انجام دیا۔ادھر شمال کی جانب جدید منیلا کے آس پاس صوفی شیوخ دعوت اسلام دیتے رہے۔جب اسپینیوں نے اس علاقہ کو 1475ء میں فتح کیا تو انہوں نے یہاں کے عوام کو بزور طاقت عیسائیت قبول کرنے

پر مجبور کیا۔ پندرہویں صدی کے آخری حصہ میں سماٹرا کا جنوبی حصہ اسلام کی آغوش میں آ گیا۔ حضرت شیخ پوتاؒ کی جدوجہد سے سلیبیس کے جزائر اور نیوگنی کے مغربی حصہ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

اسلام ایک نور کی طرح پھیلتا رہا۔ پھیلتا رہا جزیرہ در جزیرہ تقریباً چار سو سالوں تک جب بھی ایک جزیرہ والے اسلام قبول کر لیتے وہ خود اسلام کی روشنی کے علمبردار بن جاتے، اور دوسروں تک اسے پہنچانے کی جدوجہد میں لگ جاتے۔ سولہویں صدی عیسوی میں یعنی 1512ء کے بعد جب پرتگالی یا اسپینی اس علاقے میں آئے تو یہاں کے تمام جزائر یا تو اسلام کے زیر اثر آ چکے تھے یا اسلام قبول کرنے کی منزل کے قریب تھے۔

اسلام صرف ایک عقیدہ اور مذہبی رسومات کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل عالمی نظریہ ہے جو عقل و دانش کے ساتھ روح کو بھی مکمل طور سے اپنی آغوش رحمت میں لے لیتا ہے۔ یہ ایک مکمل تبدیلی ہے جو افراد، معاشروں اور تہذیب و تمدنوں کی کایا پلٹ کے رکھ دیتا ہے۔ ان کے افق کو نیا روپ عطا کرتا ہے۔ ان کے قلب و ماہیت کو نئے سانچے میں ڈھال کر نئی ماہیت عطا کرتا ہے۔ ساری تبدیلیاں اسی عالم کے اندر وقوع پذیر ہوتی ہیں، اسی دنیا کے چوکھٹے کے اندر انسان کو روحانی، قلبی اور آفاقی تصور و تبدیلی کا فہم و ادراک دیتے ہیں۔

جزائر کے اس جھرمٹ میں تصوف کے تعارف سے ملایا میں دانشوارانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ بالکل اسی انداز سے جیسی کہ اس سے پہلے تصوف نے اور ممالک میں بھی پیدا کی تھی۔ وسطِ ایشیاء، فارس، ہندوستان، مصر اور شمالی افریقہ میں ہونے والی دانش ورانہ بیداری کے طرز پر ہی یہاں کے ماحول میں بھی تبدیلی آئی۔ تصوف پر بحث و مباحث کی وجہ سے مالے زبان میں جلال و جمال سے لبریز ایک بہترین شاعری کی تخلیق ہوئی۔ شیخ حمزہ المنصوریؒ اس دور کے صوفی شعراء میں سے مشہور ترین شاعر ہیں۔ 1589ء سے لے کر 1604ء تک یہاں ریات شاہ کی حکومت رہی اسی کے دورِ حکومت میں شمالی سماٹرا کے ''اچے'' نامی شہر میں القصوریؒ قیام پذیر تھے۔ اس وقت دنیا میں جاری مباحثوں کی طرح مالے کے لوگ بھی ''وحدت الوجود'' کے فلسفے میں پوری طرح غرق تھے۔ مالے زبان میں تصوف کے اس مسلک کی توجیہ کرنے والے اور اس کے شارح حضرت نور الدین الرمناریؒ تھے۔ آپ قادریہ مسلک سے تھے۔

آپ کا انتقال 1666ء میں ہوا۔

تقریباً اسی زمانے میں شطاریہ سلسلے کے شیخ عبدالرؤف السنکلیؒ نے مالے زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ان کا انتقال 1693ء میں ہوا۔ یہاں اس اہم بات کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ''اکھے'' یعنی شمالی سماٹرا نے 1641ء سے لے کر 1699ء تک یکے بعد دیگرے چار مسلم خواتین حکمرانوں کو جنم دیا۔سب سے پہلے تاج العام صفیہ الدین شاہ نے 1641ء سے لے کر 1675ء تک حکمرانی کی۔ان خواتین مطلق العنان حکمرانوں نے سماٹرا کے جزائر اور جاوا کے ایک حصہ پر بڑے شان اور دبدبے کے ساتھ فرمانروائی کی۔اپنی حکمرانی سے انہوں نے خواتین اسلام کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔اور انہیں عزت و شرف بخشا۔

اسلام کے داخلے کے دوسرے دور میں ہندوستان سے جزائر کے اس جھرمٹ کو کافی لوگ ترک وطن کر کے آنے لگے۔ ان تارکین وطن نے بحر ہند میں تجارت کے اضافے میں مدد دی۔اس تجارت میں گجرات، مالابار اور بنگال کا مرکزی کردار تھا۔ ہندوستان کے مسلمان بھی مشرقی ایشیاء کے ساتھ تجارت میں ایرانیوں اور عربوں کے شانہ بہ شانہ حصہ لینے لگے۔ دہلی کے شہنشاہ علاؤالدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے 1300ء سے لے کر 1320ء کے دوران دکن فتح کیا تو اسلام کا اثر و نفوذ ہندوستان کے دکنی سطح مرتفع پر ہونے لگا۔

نقشہ

اب جنوب سے زیادہ تعداد میں تامل مسلمان ترک وطن کرکے ملایا اور انڈونیشیاء جانے لگے۔ 1335ء کے بعد محمد بن تغلق کی بے سروپا مہم جوئیوں کی وجہ سے ہندوستان چھوٹے چھوٹے صوبوں میں تقسیم ہوگیا۔ ان تقسیم شدہ ریاستوں میں کچھ طاقت ور ریاستیں یہ تھیں گجرات 1335ء تا 1565ء، بنگال 1340ء تا 1525ء اور دکن کے سلاطین 1336ء تا 1650ء۔ گجرات، بنگال، بلوچستان کے مکران ساحل اور سطح مرتفع دکن سے بیوپاری، صوفی، شیوخ اور علماء کی ایک بڑی تعداد ترک وطن کرکے جزائر کے جھرمٹ میں پہنچی۔ انیسویں اور بیسوی صدی عیسوی میں جب ہندوستان اور ملایا دونوں پر برطانیہ عظمیٰ کا قبضہ تھا اس وقت کئی ہندوستانی مسلمان ملایا کو سپاہیوں اور پولیس والوں کی حیثیت سے گئے اس ترک وطن کے باوجود ملایا اور انڈونیشیاء میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد ایک چھوٹی سی اقلیت ہی رہی حالانکہ ''ہند'' و ''پاک'' کے کئی مسلمانوں نے ملایا کی خواتین سے شادیاں کیں اور اس طرح اسلام کے بین الاقوامی سیمابی مرکب کا ایک حصہ بن گئے۔

ان جزائر میں اسلام کا تیسرا دور 1500ء تا 1950ء تک قرار دیا جاسکتا ہے۔ دوسرے دور میں جہاں اسلام ان اندرونی علاقوں میں قوتِ نمو حاصل کرنے لگا تھا۔ تو اب تیسرے دور میں یہ ایک مکمل تناور درخت کی شکل اختیار کرگیا اور اپنی جڑیں پوری طرح سے مضبوط کرلیں۔ یہاں نہ صرف اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں کئی طاقتور تحریکیں ابھریں بلکہ اسلامی تہذیب وتمدن اور ادب کی نشوونما بھی ہوئی۔ مالے زبان پر اسلام کا بہت ہی گہرا اثر پڑا۔ ہندوستان اور پاکستان میں ترکوں کے تمدنی اثرات کی وجہ سے ایک نئی زبان اردو وجود میں آئی۔ اسی طرح انڈونیشیاء اور ملیشیاء میں صوفیاء کرام اور علمائے کرام کے زبردست اثرات کی وجہ سے مالے زبان کی ہیت بدل کے رہ گئی۔ قرآن کے تلفظ کو صحیح طور سے ادا کرنے کے لئے مالے زبان میں نئے حروف تہجی کو داخل کیا گیا۔ عربی اور فارسی الفاظ نے اس زبان کو مالا مال کردیا۔ اس کی پہنچ میں اضافہ ہوا۔ فلسفہ علم دینیات، علم مناظرہ، علم تفسیر اور علوم عقلیہ یا سائنس مالے زبان کا ایک ضروری حصہ بن گئے۔ ان اسباب کی بناء پر مالے کے مسلمانوں اور اسلام کے بین الاقوامی برادری کے درمیان تعلقات میں مضبوطی آئی۔ انسان کے بنائے ہوئے عبادتوں کے مجموعہ پر تعمیر کردہ پرانے

دنیاوی افکار کی جگہ ماورائے ادراک توحید نے لے لی۔ زبان کی کایا پلٹ گئی۔ اس طرح کہ اس میں ہستی مطلق اور بنی نوع انسان کے آفاقی ہونے کے تصورات رچ بس گئے۔ آفاقی نظریات اس میں سما گئے۔ سولہویں صدی عیسوی تک مالے زبان، انڈونیشیاء، ملیشیاء، اور فلپائن کے عوام کی عام بول چال کی زبان بن گئی۔ اس نے پرانی جاوانی زبان کی جگہ لے لی۔ اس طرح مالے زبان تمام جزائر میں اس نئے مذہب یعنی اسلام کی تبلیغ وترویج کا ذریعہ بن گئی۔

تیسرا دور اس علاقہ میں یوروپی اقوام کی آمد کا بھی ہے۔ سب سے پہلے پرتگالی آئے۔ 1512ء میں انہوں نے خلیج ملاکا پر بزور طاقت قبضہ کرلیا۔ یہ تجارتی طور پر انتہائی اہم علاقہ تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے جب ملاکا نکل گیا تو وہاں کے مقامی صاحب علم وکمال افراد نے دوسرے جزائر کا رخ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اسلام کی روشنی ان دوردراز جزائر میں بھی پہنچ گئی۔ یوروپی اقوام کے ساتھ جزائر کے اس جھرمٹ کا تجربہ بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ بربریت سے بھرپور بحر ہند کے ساحل پر واقع تمام ممالک کی طرح جن کا اپنا تجربہ بڑا ہی خون آشام تھا۔ ان یوروپی اقوام نے اس سارے علاقے میں وحشت ناک اثرات چھوڑے ہیں۔

پرتگالی افریقی ساحلوں کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچے۔ اور گوا میں اپنا مستقر قائم کیا۔ انہوں نے منصوبہ بند طریقوں سے مشرقی افریقہ، خلیج فارس، مغربی ہندوستان اور جزائر کے اس جھرمٹ کے اہم تجارتی مراکز کو تباہ وبرباد کرنا شروع کیا۔ لیکن بہت جلد یہ واضح ہوگیا کہ پرتگال کے پاس نہ تو اتنی فوجی طاقت تھی اور نہ ہی افرادی قوت کہ وہ بحر ہند پر غالب آسکتے۔ اس وقت طاقتور عثمانیہ ترکوں نے خلافت کا بار سنبھال لیا تھا۔ اب سارے عالم کے مسلمانوں کی مدد کرنا انکا فرض تھا۔ انہوں نے پرتگالیوں کی مزاحمت کی۔ ترکی کے بحری بیڑہ نے مشرقی افریقہ کے ساحلوں کے قریب پرتگالی بیڑہ کا مقابلہ کیا اور ان کی مزید پیش قدمی پر روک لگادی۔ 1550ء کے بعد پرتگال اور ایشیاء کی علاقائی طاقتوں کے درمیان طاقت کا توازن برابر رہا۔ یوروپی عیسائیوں کے حملوں کے خلاف مزاحمت کے جذبہ نے وہاں کے مسلمانوں کو اور زیادہ متحرک وسرگرم کردیا۔ وہ جزائر کے اس جھرمٹ میں اسلام کی اشاعت میں پہلے سے زیادہ تندہی سے جٹ گئے۔

اس منظر پر بعد میں وارد ہونے والے اسپینی تھے۔ وہ بڑے ظالم اور پرتگالیوں سے کافی زیادہ طاقتور

تھے۔ یہودیوں اور مسلمانوں کو 1492ء سے لے کر 1502ء کے دوران اسپین سے نکالنے اور امریکہ میں ازٹک، مایان، اور انکاس کی قدیم تہذیبوں کو برباد کرنے کے بعد اسپینی مشرقی ایشیاء پر وارد ہوئے۔ 1521ء میں میگالان یہاں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ابھی ابھی منیلا کے سلاطین نے اسلام قبول کیا تھا۔ نیا مذہب شمالی جزائر میں ابھی اپنی جڑیں مضبوط کرنے میں لگا ہوا تھا۔ 1564ء میں فلپائن پر اسپینیوں کا قبضہ ہوگیا۔ انہوں نے فوراً یہاں سرکاری عدالتیں قائم کر دیں اور جبراً تبدیلیٔ مذہب کا عمل شروع کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کی مزاحمت نے شمال کے لوزوں جزائر کی جانب اسپینیوں کی پیش قدمی روک دی۔

پرتگالیوں اور اسپینیوں کے حملوں کے باعث اس علاقہ کے شمال کی جانب اسلام کی اشاعت رک گئی۔ ویت نام وانڈوچائنا میں اس نئے مذہب کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ اسپینیوں اور ملایا کے لوگوں کے درمیان ایک لمبی اور طویل جدوجہد کی ابتدا ہوگئی جو آج بھی منڈوناؤ جزیرہ میں جاری ہے۔ سہولویں صدی عیسوی کے آتے آتے ایک جنگی تعطل پیدا ہوگیا۔ شمال میں اسپینیوں کا قبضہ رہا۔ جنوب میں مسلم مالے علاقوں اور اسپینوں کے درمیان منڈوناؤ جزیرہ ایک سرحد بن گیا۔

سترہویں صدی عیسوی میں مشرقِ بعید میں ایک نوآبادیاتی طاقت کی حیثیت سے ڈچ لوگوں نے پرتگالیوں کی جگہ لے لی۔ برطانیہ نے ہندوستان میں 1757ء تا 1806ء کے دوران اپنا مقام مستحکم کرنے کے بعد آگے بڑھ کر آبنائے ملاکا پر 1812 میں قبضہ کرلیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جزائر کے جھرمٹ ایک ایک کر کے برطانیہ اور ڈچ کے ہاتھوں شکست کھاتے گئے۔ آگے چل کر آزادی کی طویل جدوجہد شروع ہوئی۔ آزادی کی اس لڑائی میں جہاں ایک طرف مالے زبان، ملیشیاء اور انڈونیشیاء کے عوام کو متحد کرنے والی طاقت بنی رہی تو دوسری جانب اسلام یہاں کے عوام کی اس جدوجہد آزادی کو جوش و جذبہ سے بھرنے والا بنیادی عنصر بنا رہا۔ اس جہد مسلسل نے بذاتِ خود یہاں کے عوام کو یوں متحرک کر دیا کہ اس علاقہ میں اسلامی اثرات اور مضبوط ہوگئے۔ اسلام انتہائی تیز رفتاری سے پھیلنے لگا اور بیسوی صدی کے آتے آتے جزائر کا یہ سارا جھرمٹ اسلام کی آغوشِ رحمت میں آ گیا۔ سوائے جزیرہ بالی اور سنگاپور کے کچھ چھوٹے علاقوں کے۔

تیسرے دور کا ایک اور اہم پہلو تھا چینیوں کا ترک وطن کرکے آنا۔ اور جزائر کے اس جھرمٹ میں بس جانا۔ اسلام سے پہلے نشو ونما پانے والی دو تہذیبیں چین اور ہندوستان کی تھیں۔ چین کا سیاسی، فوجی ٹکنالوجی کا اثر مشرقِ بعید پر زیادہ تھا لیکن ہندوستان مذہبی و تہذیبی اثر اندازی میں چین سے آگے تھا۔ چین نے اپنی طاقت سے ساری پرانی دنیا کو ضیاء بار کیا۔ دہلی، سمرقند، یمن اور قاہرہ کے درباروں میں چین کے سفیروں کا باعزت استقبال کیا جاتا۔ 1406ء میں عظیم چینی ایڈمرل ژینگ ای نے اپنے طاقتور بحری بیڑے کے ساتھ کافی دور واقع جنوبی افریقہ کے کیمپ آف گڈ ہوپ تک سفر کیا۔ راستے میں جاوا سلطنت، سری لنکا، مالبار، یمن، اور زنجبار کے دارالسلام ہو کر وہ گذرا۔ مشرق بعید کے راجہ اور سلاطین تجارت کی راہوں کی محافظت کے لئے ہمیشہ چین کی جانب دیکھا کرتے۔ ان جزائر کی جانب چینیوں نے وسیع پیمانے پر ترکِ وطن کیا۔ یہ ترک وطن ابھی حال میں ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے دوران کئی چینیوں کو ملایا اور انڈونیشیاء کے باغات میں کام کرنے کے لئے لایا گیا۔ ان میں سے کئی یہیں بس گئے۔ انیسویں صدی تک چینی ملایا کی تیسری بڑی آبادی بن گئے۔ لیکن انڈونیشیاء میں چینی ایک چھوٹی سی لیکن بااثر اقلیت بنے رہے۔ جدید سنگاپور اور اس کے اطراف واکناف کے علاقہ میں چینی اکثریت میں آگئے۔ آج یہاں انہی کی غالب اکثریت ہے۔ یہاں آنے والے چینیوں کی اکثریت اسلام آشنا نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ملائی آبادی میں گھل مل نہ سکے۔ صرف ملایا اور انڈونیشیاء کے اندرونی علاقوں میں کچھ چینیوں نے اسلام قبول کیا اس کا ایک سبب انکا مسلمان خاندانوں سے بیاہ رچانا بھی تھا۔

وہ کونسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے اسلام ہندو اور بودھ مذاہب کے اس گہوارہ میں اس قدر قابلِ قبول بن گیا۔ جب کہ ادھر ہندوستان میں یہ جزوی طور پر ہی قابل قبول بن سکا۔ اس کی عدم مشابہت اور کمی بیشی کے لئے کئی اسباب پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اولین وجہ اس کی یہ ہے کہ ہندوستان اور جزائر کے جھرمٹ میں اسلام کی رونمائی کا عمل الگ الگ حالات میں پیش آیا۔ اسلام کی توسیع کے پہلے دور میں یعنی 622ء تا 1100ء کے دوران مغربی ایشیاء ہندوستان وانڈونیشیاء کے ساتھ تجارتی روابط میں بالکل یکسانیت تھی۔ جنوب مغربی ہندوستان اور جزائر میں اسلام کا داخلہ پرامن طریقہ سے ہوا۔ لیکن ہندوستان پر تقریباً 1000ء

کے آس پاس محمود غزنوی کے حملوں نے اس صورت حال کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔محمود کا خنجر ہندوستان میں کافی گہرائی تک اتر گیا جس نے نفرت کی ایک ایسی میراث اپنے پیچھے چھوڑی کہ آج بھی کڑواہٹ،نفرت کی وہ میراث اپنے پورے جنون کے ساتھ باقی ہے۔ افغانستان اور وسط ایشیاء کی جانب سے بعد میں جو حملے ہوئے وہ لوٹ مار کرنے کے لئے تھے۔ان حملوں نے نفرت کے ان جذبات کو اور ہوا دی۔ ہندوستان کے مسلم حکمران خاندان بنیادی طور پر ترک، افغان اور مغل تھے جو اپنے اصل سرچشمہ کے لئے ملک سے باہر دیکھا کرتے تھے۔1300ء کے آس پاس علاؤالدین خلجی کے دور حکومت کے ماسوا ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کو دلی کے درباروں میں انکا جائز مقام مل نہ سکا۔صرف بعد کے مغل درباروں میں سولھویں صدی عیسوی کے دوران ان کو جگہ دی گئی۔لیکن انڈونیشیاء میں ایسا نہ ہوا وہاں کے ہندو اور بودھ حکمرانوں نے بذاتِ خود اسلام قبول کیا اور اس نئے مذہب کے علمبردار بن گئے۔ یہ لوگ مالے کے ہی باشندے تھے ترک یا مغل نہیں تھے۔اپنے حکمرانوں سے لوگوں کی محبت ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ایسا ذریعہ جس کی وجہ سے نئے افکارات کو جلد از جلد پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ان جزائر میں اپنے داخلے کے اول دن سے ہی اسلام مقامی مذہب بن گیا جبکہ ہندوستان میں ایسا ہونے کے لئے تین سو سال کا عرصہ لگا۔برصغیر میں اسلام عظیم صوفی شیوخ کے ذریعہ پھیلا حالانکہ حکمرانوں نے اس کی اشاعت کی مخالفت کی اور بسااوقات حکمرانوں کے پروردہ سرکاری قاضیوں نے بھی حکومت کی اس مخالفانہ روش کا کھل کر ساتھ دیا۔مسلم حکمرانوں اور امراء نے اسلام کی اشاعت سے زیادہ ٹیکس وصول کرنے میں زیادہ دلچسپی دکھلائی تو قاضیوں نے حکمرانوں کے اقدامات کے حق میں فتوے دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

دوسری اہم وجہ تھی زبان، ہندوستان کے درباروں کی زبان فارسی تھی۔ جیسا کہ صفوی اور وسطی ایشیاء کے درباروں میں تھی۔ اردو اور ہندی مقامی زبانیں تھیں لیکن ان عوامی زبانوں کو ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کے درباروں میں رسائی حاصل نہیں ہوئی جبکہ جزائر کے جھرمٹ میں مالے سرکاری زبان بنی رہی اور ساتھ ہی عربی وفارسی زبانوں کے زیر اثر اس کی ہیت میں تبدیلی بھی آتی رہی۔اس کے باوجود یہ زبان بنیادی طور پر ان جزائر کی عوامی زبان ہی بنی رہی۔

تیسری وجہ ہندو اور بودھ تہذیب وتمدن کی رسائی تھی۔ساتویں صدی عیسوی کے دوران شنکر آچاریہ کی جدوجہد کی وجہ سے ہندومت بودھ مذہب پر غالب آ گیا۔اس طرح ہندومت کو پھر سے استحکام مل گیا۔ یہاں ذات پات کا نظام بھی انتہائی سخت تھا جسے توڑ نا تقریباً ناممکن تھا۔انڈونیشیاء اور انڈوچائنا میں ایسے کسی نظام کا تصور نہ تھا۔وہاں کی درباری شان وشوکت ہندوتہذیب کی ظاہری پرت سے لپٹی ہوئی تھی۔یہ ایک ایسا لیپ تھا جسے اوپر سے لادا گیا تھا۔ آبادی کا بڑا حصہ مظاہر پرست تھا۔ذات پات کی تفریق اوپر درباروں کے ایوانوں سے اتر کر نیچے عوامی سطح تک نہیں آپائی تھی۔ان علاقوں کا معاشرتی ماحول ہندوستان سے زیادہ مشرقی افریقہ کی روحانیت سے ملتا جلتا تھا۔اسلام جیسے آفاقی مذہب کے لئے ایسے لوگوں کا دنیاوی تصور بدلنا آسان تھا جو پیدائشی طور پر روحانیت پرست تھے اور کھلا دماغ رکھتے تھے مثال کے طور پر جزائر کے جھرمٹ کی حالت بھی ایسی ہی تھی ان جزائر کی بہ نسبت ہندوستان جیسے ملک کے لوگوں کے ذہنی تبدیلی آسان بات نہیں تھی جنہوں نے اپنے دل ودماغ کے دریچوں کو مقفل کرلیا تھا اور نسل درنسل سے ہی انتہائی کٹر ذات پات کے خانوں میں بند تھے،اپنے اطراف ایک دیوارسی تعمیر کرلی تھی تاکہ باہری افکار یہاں اندر نہ آسکیں۔

اس کی آخری توجیہ یہ ہے کہ ایک ہمہ رنگی سرزمین پر جو کہ پہلے سے ہی علاقائی،لسانی،تہذیبی اور ذات پات کے نام پر آپس میں منقسم تھی اس معاشرہ میں جزوی تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے تناؤ کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔اٹھارویں صدی عیسوی میں جب دہلی میں مسلم طاقت زوال پذیر ہوئی اور آخرکار اس کا خاتمہ ہوگیا تو یہ سیاسی وفوجی کشیدگی مکمل طور پر پھوٹ کر بہہ نکلی۔یوروپی اقوام نے اس کشمکش کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جب کہ جزائر کے جھرمٹ میں ایسی کشیدگی نہ تھی۔وہاں اسلام کو سبھوں نے قبول کرلیا۔چاہے وہ بادشاہ ہوں کہ عوام،انڈونیشیاء اور ملیشیاء کے مالے عوام نے اس نئے مذہب میں قومی اتحاد اور آفاقی رشتہ کو پالیا۔

سینتالیسواں باب

سلطان اسکندر شاہ کا قبول اسلام

آبنائے ملاکا سماٹرا کے جزیرہ اور مالے جزیرہ نما کے درمیان سمٹا ہوا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ چین، جاپان، ہندوستان، عربستان اور مشرقی افریقہ کے درمیان ایک تجارتی شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے دور میں بھی یہ آبنائے تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا، بالکل اسی طرح جیسے کہ آج ہے جنوری سے مئی تک مانسون کی ہواؤں کے رخ پر سفر کرتے کرتے سمندری جہاز چین کے کینٹون جیسے دور دراز علاقوں سے ملاکا آتے۔ جولائی کے بعد ان ہواؤں کا رخ بدل جاتا۔ ان بدلے ہوئے ہواؤں کے رخ کے سہارے یہ تجارتی جہاز ہندوستان اور سری لنکا واپس آجاتے۔ بحیرۂ عرب میں ہواؤں کا یہی انداز عدن اور مشرقی افریقہ سے گجرات اور مالابار کے ساحلوں کے درمیان جہاز رانی میں معاون ثابت ہوتا۔

مالے جزیرہ نما کا اندرونی علاقہ قدرت کی بیش بہا نعمتوں سے مالا مال ہے۔ گھنے جنگلات، ناریل کے باغات کے سلسلے، انتہائی زرخیز زمین، سیراب کرنے والی برساتیں، مستقل مزاج محنتی اور مہمان نواز آبادیاں اس سرزمین کو ایک مثالی، گرم، پرفضا سیاحتی علاقہ بنا دیتی ہیں۔ زمانہ دراز سے دور دور ممالک سے ہزاروں میل سفر کرتے ہوئے جہاز آتے اس جزیرۂ نما کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوتے اور کاروبار کرتے۔ اگر کوئی 1400ء کے آس یہاں آتا تو دیکھتا ایک ایسا منظر جہاں چینی، ہندی، اومانی، ایرانی اور

افریقی تاجر سماٹرا جاوا، بالی اور کینٹون کے تاجروں سے گھل مل جاتے، آپس میں تجارتی مال کا لین دین کرتے، بیوپار میں غرق ہوجاتے، تجارتی روابط اور زیادہ بڑھاتے۔چین اپنے یہاں سے دوسرے ممالک کوسلک، پارچہ بانی، چینی ساز و سامان اور عطریات بھیجتا۔ ہندوستان، سخت قسم کی عمارتی لکڑی منقش شدہ اشیاء، قیمتی پتھر، روئی، شکر، مویشی اور ہتھیار برآمد کرتا۔ٹن، کافور، آبنوس، اور سونا ملایا سے باہر جاتے، سماترا چاول، سونا، کالی مرچ اور جوتری جو کپڑے کے لئے مشہور جاوا رنگنے کے مسالحے، مسالحے اور عطریات کا مرکز تھا۔ ملاکا سے لونگ کی تجارت ہوتی اور رتمور سے صندل کی لکڑی آتی۔

یہ وہ دور تھا جبکہ مسلمان بین الاقوامی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔بحیرۂ عرب، بحیرۂ بنگال اور بحیرۂ مشرقی چین تک ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔واحد مذہب کے علاوہ ایک ایسی تجارتی دیانت داری جسکو توڑا نہیں جاسکتا تھا اور شریعت کی بنیاد پر بنائے جانے والے لین دین کے آفاقی قوانین کے سہارے مسلمانوں نے تجارت کا ایک جال سا بچھا دیا۔یہ جال مشرقی افریقہ جنوبی عرب خلیج فارس اور مالابار کے ساحلوں سے لے کر انڈونیشیاء کے جزائر اور چین کے جنوبی ساحلوں تک محیط تھا۔آٹھویں صدی عیسوی کے ابتداء ہی میں مسلمانوں نے چین کے کینٹون شہر میں اپنا تجارتی مرکز قائم کردیا تھا۔ ملایا کے ساحل اقوام عالم کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔مالابار، عربستان اور افریقہ کے بیوپاری یہاں بستے تھے اور مقامی مالے آبادیوں اور چین کے ملاحوں سے باہمی تجارتی روابط قائم کئے ہوئے تھے۔

یہی وہ تجارتی اور مذہبی آفاقی دور تھا جبکہ اسی زمانے میں جاوا کا ایک شہزادہ جس کا نام پرمیشور تھا اپنے وطن سے بھاگنے پر مجبور ہوگیا، وہ ملایا کے مشرقی ساحلوں پر اترا اس کے ساتھ ایک ہزار نوجوانوں پر مشتمل وفادار ساتھیوں کی ایک جماعت تھی۔اس نے بحری قزاقی کو اپنا پیشہ بنایا۔تقریباً دس سال تک اسی پیشہ سے وابستہ رہا اس دور میں سیام یعنی جدید تھائی لینڈ اس علاقہ کی زبردست شاہی طاقت تھا۔ 1403ء میں پرمیشور نے سیامیوں کو ساحلی علاقہ سے کو نکال باہر کرکے ملاکا شہر کی بنیاد ڈالی۔ملاکا عربی زبان کے لفظ ملکوت سے بنا ہے جس کا مطلب ہے ملکیت۔آٹھویں صدی عیسوی سے ہی عربوں نے اپنی ایک تجارتی نوآبادی اس شہر میں قائم کررکھی تھی۔

بحری قزاقی کو چھوڑ کر ایک بار آباد ہو جانے کے بعد شہزادے نے پر امن تجارت کو فروغ دیا۔ وقت کے ساتھ اس تجارتی بستی کی شہرت اور خوش قسمتی میں اضافہ ہونے لگا۔حتیٰ کہ بین الاقوامی تجارت کی توجہ ادھر ہونے لگی۔ بحر ہند کی تجارت پر مسلمان غالب تھے اس علاقہ میں عربی زبان تاجروں کی عوامی زبان بن گئی۔ انڈونیشیاء کے جزائر میں اسلام کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ آبنائے کے اس پار ملاکا کی طاقتور مسلم حکومت عروج حاصل کررہی تھی۔ مقامی لوک گیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ پر میشور کو پسائی دربار کی ایک شہزادی سے محبت ہوگئی اس نے اسلام قبول کرلیا۔ شہزادی سے نکاح کیا اور اپنا نام سلطان اسکندر شاہ رکھا۔

اس طرح ملایا میں اسلام کے داخل ہونے کا سبب عشق تھا۔ دلہن اپنے ساتھ ملاکا کے لئے خوش قسمتی بھی لے آئی۔ شادی کے دوسرے سال ہی چین کے شہنشاہ چیوتین جس نے 1403ء تا 1424ء تک حکومت کی تھی۔ اس نے اپنے بحری بیڑہ کے سالار ین چنگ کی سرکردگی میں سفارت روانہ کی۔ سلطان اسکندر شاہ کی جانب تجارت اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ شمال کی جانب سے سیامیوں کے بڑھتے فوجی خطرہ کے پیش نظر سلطان نے فوراً ہی اس تجویز کو بخوشی قبول کرلیا۔ مزید مذاکرات جاری رہے۔ 1409ء میں چینی بیڑہ کے سالار ایڈمرل ژینگ نے ملاکا کا سفر کیا، اسے عام طور سے ایڈمرل ہو کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے جہازوں پر مشتمل بحری بیڑہ تھا۔ ایڈمرل ژینگ پندرہویں صدی عیسوی کا عظیم ترین بحری شخص تھا اور مسلمان تھا۔ چین کے شہنشاہ نے بحر ہند کے علاقوں میں اسلام کی اہمیت کو محسوس کرلیا تھا۔ اسی لئے اس نے ایک مسلمان کو اس عظیم بحری سفر پر روانہ کیا تھا۔ ژینگ ای نے بحری بیڑہ کے ہمراہ اپنے سفر کو جاری رکھا۔ سری لنکا، کالی کٹ، بیجاپور، ہرمز، عدن، جدہ، زنج، یعنی مشرقی افریقہ، زنجبار، شفولہ کا سفر کرتے ہوئے وہ جنوب کی ان افریقی علاقوں کی جانب چلا۔ آج جسے کیپ آف گڈ ہوپ کہا جاتا ہے پھر اسے پار کرتے ہوئے افریقہ کے مغربی ساحلوں کی جانب آگے بڑھا۔ ایڈمرل ژینگ ای اپنے ساتھ سلطان اسکندر شاہ کے نام ایک دعوت نامہ بھی لے آیا تھا جس کے ذریعہ اسے پیکنگ آنے دعوت دی گئی۔

1412ء میں سلطان اسکندر شاہ نے چین کا دورہ کیا۔ جہاں اسکا پر جوش استقبال ہوا۔ سلک، ہیرے جواہرات، گھوڑے، سونا اور چاندی کی شکل میں اسے بے شمار تحائف دیئے گئے۔ ملا کو کو انتہائی اہم علاقہ کا درجہ دیا گیا۔ مالے جزیرہ نما میں تھائی لینڈ کی مزید دراندازی کو روکنے کے لئے دونوں حکومتوں کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ بھی عمل میں آیا۔ چین سے واپسی کے بعد سلطان اسکندر شاہ نے ایک رعایا پرور بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس نے مکہ جیسے دور دراز مقامات سے مسلم صاحب علم اصحاب کو دعوت دے کر بلوایا، ان کی عزت افزائی کی وہ اسلام کی اشاعت میں کوشاں رہا اس کی سرپرستی میں ملاکا نہ صرف بین الاقوامی تجارت کا سرگرم مرکز بن گیا بلکہ اُسے اسلامی تعلیم وتربیت کے اہم مقام کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔ اس کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ آنے والی صدیوں میں یوروپی اقوام نے اس پر قبضہ کرنے کے لئے کئی جنگیں لڑیں۔

1424ء میں سلطان اسکندر شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے کہ جب 1510ء میں پرتگالیوں نے ملاکا پر قبضہ کیا تو ملایا کے تمام سلاطین کے قبروں کو کھود ڈالا اور مقابر کو تباہ کر ڈالا لیکن سلطان اسکندر شاہ کی وراثت آج بھی باقی ہے۔ یہ وہ شہزادہ ہے جو ایک شہزادی کی محبت میں ڈوب کر ملایا کے لئے اسلام کا پیغام لے آیا۔ جس نے دنیاوی عشق کی خواہش میں عشق حقیقی کے رنگ سے ملاکا کو رنگ دیا۔

تاریخ وار واقعات

اہم واقعات:

570ء مکہ مکرمہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ

610ء قرآن شریف کی اولین آیات کا نزول

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

615ء حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

620ء مکہ میں مظالم سے بچنے کے لئے مسلمانوں کے ایک گروہ نے سیناء کی جانب ہجرت کی

622ء رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی جانب ہجرت کرتے ہیں

624ء جنگ بدر

625ء جنگ احد

626ء جنگ خندق

627ء اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں کے ساتھ صلح حدیبیہ کی تکمیل کرتے ہیں

628ء مسلمانوں کی مکہ پر فتح

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فارس کے خسرو بازنطینی سلطنت کے ہراکلیس، مصر کے مقاوقیس اور یمن کے بادشاہوں کو خطوط لکھتے ہیں اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔

632ء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع
قرآن شریف کی آخری آیات کا نزول۔
بازنطینیوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ تبوک کا برابری پر خاتمہ
اسلامی افواج کے سالار زید بن حارثؓ کا شہید ہونا۔
آقائے نامدار تاج دار مدینہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک
صحابہ کرامؓ خلافت کی ابتداء کرتے ہیں اور اسلام کے تاریخی سفر کو جاری رکھتے ہیں
حضرت ابوبکرؓ کا پہلے خلیفہ کی حیثیت سے انتخاب
آنحضور کی چہیتی بیٹی اور حضرت علیؓ کی زوجہ حضرۃ فاطمہ الزہراءؓ کا انتقال مبارک۔

633ء زکوٰۃ کی ادائیگی پر مجبور کرنے کیلئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مشرقی عرب کے قبائیل کے خلاف فوجی کاروائی
جھوٹے مدعیانِ نبوت کا عروج وزوال
مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ
حضرت ابوبکر صدیقؓ قرآن شریف کے یعنی مصحفِ صدیقی لکھنے کا حکم دیتے ہے۔

634ء جنگ اجنادین میں مسلمان فوجیں بازنطینی افواج کو شکست فاش دیتی ہیں
حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وصال مبارک
حضرت عمر بن الخطابؓ کا خلیفہ منتخب ہونا

635ء مشرقی روم اور فارس سلطنتوں کے خلاف فوج کشی، مسلمانوں نے دمشق پر قبضہ کرلیا

636ء قادسیہ کی جنگ میں ایرانی افواج کی شکست فاش
جنگ یرموک میں بازنطینیوں کی شکست
مسلم افواج نے یروشلم فتح کرلیا۔ عیسائیوں کو عبادت کرنے کی مکمل آزادی کی یقین دہانی۔

636ء فارس کی شہنشاہیت کے صدر مقام مدائن پر مسلم افواج کا قبضہ

640ء عمر بن العاصؓ کی مصر میں پیش قدمی

641ء خراسان، افغانستان اور سندھ کی جانب عرب افواج کی پیش قدمی

642ء مصر پر مکمل فتح

خلیفہ عمر بن الخطابؓ ایک وسیع سلطنت کے انتظامی امور کی جانب خصوصی توجہ دیتے ہیں، ان میں اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔

حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت علی ابن ابوطالبؓ نے جو عدالتی فیصلے دئے انہی کی بنیاد پر فقہ کے سائنس کی ابتداء۔

نہاوند کی جنگ میں ایرانی افواج کی شکست۔

643ء یروشلم میں الاقصیٰ مسجد کی پہلی مرتبہ تعمیر۔

644ء خلیفہ المسلمین حضرت عمر بن الخطابؓ کی شہادت

حضرت عثمان بن عفانؓ خلیفہ منتخب

649ء بازنطینیوں سے قبرص چھین لیا گیا۔

650ء قرآنی آیات کی تلاوت کا میعار قائم کیا گیا

652ء مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفی حضرت ابوذر غفاریؓ کا انتقال مبارک۔

656ء حضرت عثمان بن عفانؓ کو شہید کیا گیا۔

حضرت علی ابن ابوطالبؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔

خانہ جنگیوں کی ابتداء۔

جنگ جمل میں حضرت عائشہ بن ابوبکرؓ کے قیادت میں مخالفت کرنے والوں کو خلیفہ حضرت علی ابن ابوطالبؓ نے شکست دی۔

657ء شام کے گورنر حضرت معاویہ بن ابوسفیانؓ کا حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی فوجوں کے درمیان صفین کی جنگ

خارجیت کی ابتداء۔

658ء جنگ نہروان میں حضرت علی ابن ابو طالبؓ کے ہاتھوں خارجیوں کی شکست۔

دمشق میں حضرت معاویہؓ کی جانب سے ان کی خلافت کا اعلان۔

659ء امیر المومنین حضرت علی ابن ابو طالبؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگ بندی۔

661ء خلیفہ حضرت علی ابن ابو طالبؓ کو شہید کیا گیا۔

خلفائے راشدین کے دور کا خاتمہ۔

حضرت معاویہؓ خلافت پر اپنا حق جتاتے ہیں۔

بنوامیہ شاہی سلسلہ کی ابتداء۔

حضرت حسن ابن علیؓ سیاست سے کنارہ کش

665ء حضرت معاویہؓ بحری بیڑہ تیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

667ء اسلامی افواج کا خراسان پر قبضہ۔

669ء امام حسن ابن علیؓ کی وفات حسرت آیات۔

670ء عقبہ بن نافعؓ شمالی افریقہ میں فتوحات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔
شمالی افریقہ میں خیروان شہر کی بنیاد رکھی گئی۔

671ء روڈس جزائر پر اسلامی افواج کا قبضہ۔
قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی پہلی کوشش ناکام۔

678ء رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ بنت حضرت ابو بکرؓ، احادیث کا وہ سرچشمہ جن سے سب سے زیادہ احادیث مروی ہیں، ان کا انتقال پر ملال۔

680ء حضرت معاویہ ابن ابو سفیانؓ کا انتقال مبارک۔
حضرت معاویہؓ کا بیٹا یزید بنوامیہ کا بادشاہ بنا

کربلاء کا المیہ، آقائے نامدار تاجدار مدینہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے نواسے حضرت حسین

ابن علیؓ کوشہید کیا گیا۔

یوم عاشورہ کی ابتداء۔

683ء یزید کا مدینہ منورہ کو تاخت تاراج کرنا۔

عقبہ بن نافعؓ کا شمالی آفریقہ فتح کرنا۔

یزید کی موت، معاویہ دوم اسکا جانشین بنا۔

684ء مردان اول کا خلافت سنبھالنا۔

685ء عبدالما لک کا خلیفہ ہونا۔

یروشلم میں قبطہ السخر (Dome of Rock) کی تعمیر۔

مسلم فوجوں کی وسط ایشیاء میں پیش قدمی۔

690ء بنوامیہ کی افواج کا بحر اقیانوس تک پہنچنا۔

691ء یروشلم میں قبط السخر (Dome of Rock) مکمل

692ء اسلامی مملکت کے اولین سکّوں کا، عبدالما لک کی جانب سے ڈھالا جانا۔

693ء الحجاج جوحجاج ثقفی کے نام سے بھی مشہور ہے، اسکا عراق کا گورنر نامزد ہونا۔

694ء دمشق میں اموی مسجد کی تعمیر۔

699ء مشہور عقلیت پسند، فلسفی جوہانی کی موت۔

705ء ابوالولید اول کا خلیفہ ہونا، یہ اپنی سلطنت کی حدود کو بڑھانے کیلئے زبردست یورشیں کرتا ہے۔

711ء طارق بن زیادہ کا اندلس کی سرزمین پر اترنا۔ بوہیرہ کی جنگ میں روڈرگس کی سالاری میں لڑنے والی وسی گوتھ افواج کی شکست۔

محمد بن قاسم کا دیبل کی سرزمین پر اترنا، بلوچستان، سندھ، ملتان اور جنوبی پنجاب فتح کرنا۔

712ء موسیٰ بن نصر لیون، آسٹریا اور گیلی سیا میں آگے پیش قدمی کرتا ہے۔ اندلس میں مسلمانوں کی 780 سالہ دور حکوت کی ابتداء۔

اسپین میں یہودیوں کا سنہرا دور۔

امام زین العابدینؒ کی وفات۔

713ء حضرت زید بن زین العابدینؒ کی اموی حکومت کے خلاف مقابلہ کی تیاری۔

زیدی مسلک کی ابتداء۔

مسلم افواج کا فرانس کے اندر لیون پر قبضہ۔

714ء حجاج بن یوسف کا محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلا کر موت تک قید خانے میں ڈالے دینا۔

مسلمان فرانس میں نارمنڈی پر قبضہ کرتے ہیں۔

715ء سلیمان کا اموی خلافت کے تخت پر بیٹھنا۔

موسیٰ ابن نصیر کو خلیفہ سلیمان نے واپس بلایا، اسے تمام اختیارات سے محروم کر دیا اور صحراؤں میں جلاوطن کر دیا۔

717ء حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلافت سنبھالتے ہیں اور اسلامی قوم میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایران، مصر میں وہ کسانوں پر عاید کردہ ٹیکس میں کمی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی قسطنطنیہ پر قبضہ کی دوسری کوشش کو بازنطینی ناکام بناتے ہیں۔

ایران اور مصر میں اسلام کی اشاعت زور پکڑنے لگتی ہے۔

719ء حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو زہر دے دیا جاتا ہے۔

یزید دوم خلیفہ بنتا ہے۔

720ء مسلم افواج پیرنیس کو عبور کرتے ہیں اور جنوبی فرانس پر قبضہ کرتی ہیں۔

724ء ہشام خلافت کی کرسی سنبھالتا ہے۔

728ء مشہور صوفی شیخ حضرت حسن بصریؒ کا انتقال۔

731ء حضرت امام باقرؒ کا انتقال۔

732ء جنگ طورس میں چارلس مارٹل مسلم افواج کو شکست دے کر یوروپ میں ان کی پیش

قدمی روک دیتا ہے۔

735ء مسلم افواج جنوبی فرانس سے آگے بڑھتی ہے اور سوئٹزر لینڈ میں یہ پہاڑوں کے دروں پر قبضہ کرتی ہیں۔

740ء حضرت امام زید بن زین العابدین کا وصال۔

743 الولید دوم خلیفہ بنتا ہے۔

744 ابو مسلم کو خراسان کے اعلیٰ داعی کے حیثیت سے نامزد کیا جاتا ہے۔ یزید سوم، ابراہیم اور مروان دوم یکے بعد دیگر نہایت تیزی کے ساتھ خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔

745ء حضرت امام جعفر الصادقؒ اپنے علمی حلقہ میں فقہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں، حضرت امام ابو حنیفہؒ اُن علمی حلقوں میں حصہ لیتے ہیں اور ان سے فیض حاصل کرتے ہیں۔

746ء خراسان میں عباسی انقلاب کی ابتداء۔

747ء کوفہ عباسیوں کے قبضہ میں، ابو مسلم نے ابو عباس کو اولین عباسیہ خلیفہ نامزد کیا۔

750ء جنگ کشاف میں عباسی افواج خلیفہ مروان کو شکست دیتی ہیں۔ بنو امیہ کو اقتدار سے بے دخل کر کے انکا قتل عام کیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن اول اسپین کی جانب فرار ہو جاتا ہے۔ بغداد میں عباسیہ خلافت کی ابتداء، ابو عباس السفاح کا پہلے عباسی خلیفہ کی حیثیت سے اقتدار سنبھالنا۔

751ء جنگ طلاس-مسلم افواج تانگ شہنشاہیت پر فتح یاب ہوتی ہے۔ چین وسط ایشیاء پر خلافت کی بالادستی تسلیم کر لیتا ہے۔

754ء المنصور نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔ تانگ شہنشاہ ژونگ کی درخواست پر اس کی امداد کی لئے اپنی فوج چین روانہ کرتا ہے۔

755ء عبدالرحمٰن اول نے قرطبہ، اسپین میں امیہ امارت کی بنیاد رکھی۔

759ء فرانکی افواج نے مسلمانوں سے ناربونے واپس چھین لیا۔

760ء حضرت امام جعفر الصادقؒ کے فرزند حضرت امام اسماعیلؒ کی وفات ۔مسلمانوں میں فاطمیہ مسلک کی ابتداء۔

763ء بغداد خلافت کا مرکز ہوگیا۔اور اسلامی تہذیب کا گہوارا بن گیا۔

765ء حضرت امام جعفر الصادقؒ کی وفات، یہ فقہ کے اہم ترین سرچشموں میں سے ایک تھے۔
خلیفہ المنصور نے بغداد میں دوسرے علوم کا ترجمہ کرنے والے مدرسہ کی تعمیر کی۔
مسلمان یونانی،فلسفہ اور ہندوستانی ریاضیات (حساب) سے روشناس ہوتے ہیں۔

768ء حضرت امام ابوحنیفہؒ کی وفات انکے متعین کردہ فقہ کو "حنفی فقہ" کا نام دیا گیا۔
چارل مین 769ء تا 814ء فرانکی تخت کا وارث بنا-

775ء المھدی خلافت کے تخت پر بیٹھا۔

778ء فرانس کے بادشاہ چارل مین کے مسلم اسپین پر حملے۔

780ء چارل مین کا جرمن علاقوں پرحملہ اور جرمنی کے باشندوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کرنا۔

781ء ابن جابر کمیسٹری کے سائنس کی ایجاد کرتا ہے۔

785ء الہادی خلیفہ بنتا ہے۔

786ء ہارون الرشید خلافت کے تخت پر بیٹھتا ہے، بغداد کا سنہرا دور۔

788ء شمالی آفریقہ میں ادریسی دور حکومت کی ابتداء

790ء چینی ٹکنالوجی حاصل کر کے بغداد میں کاغذ سازی کے ابتداء

795ء حضرت امام مالک بن انسؒ کی وفات،جن کے نام سے مالکی مسلک فقہ منسوب ہے

799ء خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے حج کیا، دوران حج اس نے حجاج کرام کے لئے راہ میں کئی کاروان سرائے تعمیر کروائے۔
حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کا انتقال۔

800ء ہارون رشید اور چارل مین نے آپس میں ایک دوسرے کے درباروں سے سفیروں کا

تبادلہ کیا۔

801ء فیض شہر کی تعمیر۔

چارل مین مسلم اسپین پر حملے شروع کرتا ہے۔

802ء حضرت رابعہ الاداویہؒ کا وصال، یہ روحانی دنیا کے آسماں کا ایک چمکتا ہوا ستارہ تھیں اورانہوں نے کئی عظیم صوفیائے کرام تربیت کی۔

809ء ہارون الرشید کا انتقال، الامین کا خلافت نشین ہونا۔

813ء الامین کی جگہ المامون نے خلافت سنبھالی۔

814ء چارل مین کی موت، کرولین، شہنشاہیت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔

815ء الخوارزمی نے الجبراسائنس کی ایجاد کی اوراسی نے مُساوات (Eqnations) کو ترقی یافتہ شکل دی۔

وائیکنگ نسل کے باشندوں کا شمال کی جانب سے یوروپ پر حملہ کر کے یوروپ کو تباہ وبرباد کرنا عباسیہ شہنشاہیت کا دھیرے دھیرے زوال پذیر ہونا۔شمال میں ادریسی اورایران میں طاہری دونوں کی جانب سے آزادی کا اعلان۔

818ء حضرت امام علی الرضاؒ کی وفات۔

820ء حضرت امام الشافیؒ کا انتقال،شافعی مسلک کو جن کا نام دیا گیا۔شمالی افریقہ میں اغلبیوں کا عروج۔

822ء قرطبہ کے دربار میں موسیقار الزرحاب کی سرپرستی میں موسیقی کا عروج۔شمالی افریقہ سے اغلبی افواج کا سسلی پر حملہ کرنا۔

827ء خلیفہ المامون معتزلہ مسلک کو درباری سرپرستی عطاء کرتا ہے۔

ادریسی، کریٹ، سارڈینا، اور سسلی پر قبضہ کرتے ہیں۔

830ء خلیفہ المامون کا بغداد میں بیت الحکماو قائم کرنا، یونانی اور سنسکرت کتابوں کا عربی ترجمہ کیا جاتا ہے۔مسلمانوں نے ریاضی (حساب) میں اعشاریہ کے تصور کو ایجاد کیا۔

831ء مسلم افواج کا اٹلی میں پالیرمو پر قبضہ کرنا۔

833ء المامون کا انتقال، المعتصم نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی اور اس نے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔

835ء حضرت امام الجوادؓ کی وفات۔

835ء اسپین سے امیہ کی افواج کا مارسلے اور فرانس پر قبضہ کرنا۔

840ء مشہور ریاضی دان، صوفی شیخ الخوارزمیؒ کی وفات

842ء الوثیق خلیفہ بنتا ہے۔

846ء شمالی افریقہ کے اغلبوں کا پیسا پر قبضہ کرنا اور آگے بڑھ کر روم پر حملے کرنا۔

847ء المتوکل کا خلافت سنبھالنا۔ معتزلی عقائید سے دست برداری۔

850ء خلافت پر ترکوں کا زبردست اثر

855ء حضرت امام ابن حنبلؒ کی وفات جن کے نام سے حنبلی مسلک موسوم ہے۔

861ء خلیفہ المتوکل کا قتل کیا جانا، المنتصر کا خلافت نشیں ہونا۔

866ء المعز کا خلافت سنبھالنا

868ء طولونیوں کی سرپرستی میں مصر کی آزادی کا اعلان۔

سسلی میں پالیرمو اسلامی علوم فنون حاصل کرنے کا مرکز قرار پانا۔

حضرت امام الھادیؒ کی وفات۔

870ء مشرقی افریقہ سے آکر عراق میں کام کرنے والے زنج مزدوروں کا اعلان بغاوت

مشہور سائنس دانوں الفارابی اور القندی کا انتقال

مشہور زمانہ سائنس داں ال ترابی کا انتقال

مالٹا پر مسلمانوں کا قبضہ

بغداد میں المعتمد کا خلافت نشین ہونا

874ء احادیث کے جمع کرنے والے مشہور محدث حضرت ابوحسن مسلمؒ کی وفات۔
حضرت امام العسکریؒ کا انتقال
مشہور ریاضی داں و ماہر فلکیات القندی کی وفات
فلسفۂ "وحدت الوجود" کے مشہور شارح حضرت البسطامیؒ کا انتقال۔
875ء حمدان کرامت نے کرامتی تحریک کی ابتداء کی۔
بخارا میں سامانیوں کا اقتدار سنبھالنا۔
878ء بارھویں امام حضرت امام المنتظر کا روپوش ہونا۔
غائب امام پر یقین کی ابتداء۔
880ء اغلبیوں کا عیسائی افواج کے ہاتھوں جنوبی اٹلی گنوادینا
882ء عراق میں زنج قبائلی مزدوروں کی بغاوت کا کچل دیا جانا۔
885ء ظاہری مسلک فقہ کو پیش کرنے والے داؤد ابن خلاف کا انتقال
887ء چین میں بیرونی طاقتوں کے خلاف کسانوں کی بغاوت، کینٹون سے مسلمانوں کا نکالا جانا۔
889ء مشہور تاریخ دان ابن قیتبہ کی وفات۔
890ء اسپینی مسلمان جنوبی فرانس میں اپنے فوجی اڈہ قائم کرتے ہیں وہاں سے سوئزرلینڈ پر حملہ کیا جانا۔
892ء مشہور تاریخ دان محمد الترمذی کا انتقال۔
المعتمد کا خلیفہ ہونا
893ء کرامتی یمن پر قبضہ جماتے ہیں۔
898ء حضرت امام الهادی یحیٰؒ یمن میں زیدی ریاست کی تشکیل دیتے ہیں
900ء الف لیلیٰ کی داستان لکھی جاتی ہے
فلکیاتی لبیاریٹری کی تجدید ہوتی ہے، بہتری لائی جاتی ہے۔
شمالی افریقہ کے سجلماسہ میں خارجی اپنے شاہی سلسلہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔

901ء ایران کے خراساں میں سمینوں کا عروج۔

902ء المکتفی خلافت کے تخت پر بیٹھتا ہے۔

903ء کرامتی دمشق کو لوٹ لیتے ہیں

904ء مسلم افواج بازنطینوں سے سولانیکا چھین لیتے ہیں۔

907ء فاطمی قائدابوعبداللہ شمالی افریقہ کی جانب روانہ ہوتا ہے۔

908ء المقتدر بغداد میں خلافت نشیں ہوتا ہے۔

909ء بنوفاطمہ شمالی افریقہ میں اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب۔

عبداللہ المہدی پہلا فاطمی خلیفہ قرار پایا۔

910ء الرازی چھوٹی چیچک، باولے کتے کے کاٹے (Rabies) اور پلیگ جیسی متعدی بیماریوں کے بارے میں تحقیقات کرتا ہے۔

912ء اسپین میں عبدالرحمٰن سوم کی حکومت قرطبہ یوروپ کا بہترین شہر قرار پاتا ہے، اسپین کا سنہرا دور۔

914ء خراساں کا حکمران نصرالسعید عباسیوں پر فاطمیوں کو ترجیح دیتا ہے۔

915ء خارجی جنوبی مراقش میں اپنی بنیاد مضبوط کرتے ہیں۔

بنوفاطمہ کا مصر پر حملہ

922ء منصورالحلاّجؒ کو ان کے باطنی اور مخفی افکار کے لئے پھانسی۔

عراق میں طاہری شاہی سلسلہ کی ابتداء۔

923ء مشہور مفسر قرآن ابوطبریؒ کا انتقال۔

925ء طب کے ماہر رازی کا وصال۔

929ء بنوفاطمہ کی جانب سے خلافت پر حق جتائے جانے کے جواب میں اسپین میں عبدالرحمٰن سوم نے اپنی خلافت کا اعلان کیا اور شمالی افریقہ میں سنی مسلمانوں کی محافظت کی ذمہ اپنے ذمہ لے لی۔

930ء کرامتیوں نے مکہ پر حملہ کیا اور حجر اسود کو حرم شریف سے نکال کر اپنے ساتھ بحرین لے گئے۔

931ء عبدالرحمٰن سوم نے سیوٹا پر قبضہ کیا۔
بنو فاطمہ نے الجیریا پر قبضہ کرلیا۔
932ء بنو بویہ نے جنوبی عراق میں اپنا اقتدار جمایا۔
القاہر بغداد میں خلافت کی کرسی پر بیٹھا۔
933ء اشقدیوں نے مصر سے طولونیوں کو بے دخل کیا اور 969ء تک وہاں قابض رہے
934ء الرازی عباسی خلافت کے تخت پر بیٹھا۔
القاسم فاطمی خلافت پر مسند نشیں ہوا۔
936ء علم الکلام کا ماہر اشاری کا انتقال جس نے معتزلہ عقائد کو صحیح العقیدہ افکار پر ترجیح دی
939ء اسپین کے عبدالرحمٰن سوم نے فرانکس نیٹون، ولائس، جنیوا، طولون اور گریٹ، سینٹ برنارڈ پر قبضہ کیا۔
940ء عباسیوں نے ڈاک کا وسیع نظام قائم کیا۔
المتقی عباسی خلافت کے تخت پر بیٹھا۔
945ء بنو بویہ نے عارضی طور پر بغداد پر قبضہ کیا
949ء المطیع عباسی خلیفہ بنا۔
المنصور نے فاطمی خلافت کو سنبھالا
950ء مشہور صوفی شیخ حضرت الفارابیؒ کا انتقال۔
951ء عراق میں اخوان الصفہ نے علوم کے مختلف شعبہ جات پر مشتمل ایک انسائیکو پیڈیا مرتب کیا۔
953ء المعز شمالی افریقہ میں بنو فاطمہ کی خلافت کا بار سنبھالتا ہے
955ء اسپین کے ساحلوں پر عبدالرحمٰن سوم اور المعز کے بحری بیڑوں کے درمیان گھمسان کی معرکہ آرائی۔
957ء مورخ المسعودی کا انتقال۔

961ء عبدالرحمٰن سوم کی وفات

مرکزی ایشیاء کے ترک اوغور قبیلہ نے اسلام قبول کیا۔

962ء سلجوقی الپتگین نے افغانستان کے غزنی میں اپنا اقتدار قائم کیا۔

968ء بنوامیہ نے قرطبہ میں یونیورسٹی قائم کی۔

969ء بنوفاطمہ نے مصر فتح کیا اور قاہرہ شہر کی بنیاد رکھی

970ء فاطمیوں نے شام، مکہ اور مدینہ فتح کرنے کے بعد اسلامی دنیا کی قیادت کا دعویٰ کیا۔ جدید پاکستان کے ملتان پر فاطمی اقتدار قائم ہوا۔ مصر کے اسکندریہ اور اٹلی کے وینیس کے درمیان تجارت میں زبردست فروغ۔

971ء بنوفاطمہ نے قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔

974ء الطائع نے عباسیہ خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔

975ء مصر کے فاطمی خلیفہ المعز کا انتقال۔ العزیز فاطمی خلافت سنبھالتا ہے۔ مسلمان ماہرین فلکیات ایسی دستاویز شائع کرتے ہیں جس میں ستاروں کے جھرمٹ اور کہکشاؤں کے بارے میں تفصیلات دی جاتی ہیں۔

988ء قیوہ کا کاؤنٹ لاڈلمیر قدامت پرست عیسائیت قبول کرتا ہے۔

991ء القادر عباسی خلافت سنبھالتا ہے۔

996ء الحاکم بنوفاطمہ کی خلافت کے تخت پر بیٹھتا ہے۔

گیارھویں پوپ پائیس مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کا اعلان کرتا ہے۔

997ء محمود الپتگین کا وارث بنتا ہے اور مرکزی ایشیاء کے اقتدار اعلیٰ پر چھا جاتا ہے

997ء ترک بڑی تعداد میں مرکزی ایشیاء کو ترک وطن کرتے ہیں قرہ خانی ترک بخارا پر قبضہ کرتے ہیں محمود غزنوی خراستان پر فتح یاب ہوتا ہے

1000ء محمود غزنوی ہندوستان میں پشاور، بھیرہ ، ناگرکوٹ، ترائیں، تھانیسور، اور قنوج

پر قبضہ کے لئے حملے شروع کرتا ہے۔

1004ء سلطان محمود ملتان کے فاطمی حاکم داؤد کو شکست دیتا ہے

1016ء عیسائی سارڈینا کو پھر سے فتح کر لیتے ہیں۔

1017ء لبنان میں دروز فرقہ کی ابتداء۔

1020ء شاہ نامہ کے مصنف فردوسی کا ایران میں انتقال۔

فاطمی خلیفہ الحاکم کی موت جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔

1021ء الظاہری فاطمی خلافت سنبھالتا ہے۔

1024ء محمود غزنوی کی جانب سے ہندوستان میں گجرات کے سومناتھ مندر پر حملے

1025ء البرونی نے کتاب الہند شائع کی جو کہ ہندوستان کے عوام کا ایک گہرا مطالعہ ہے۔

1030ء محمود غزنی کا انتقال۔

1031ء قرطبہ کی اموی خلافت منتشر ہو جاتی ہے۔

اسپین چھوٹے چھوٹے حقیر امارتوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کیسٹلے لیون اور پرتگال کی اجتماعی عیسائی طاقتیں مسلمان علاقوں پر حملے کی تیاریاں کرتی ہیں۔

بغداد میں القائم عباسی خلافت کے تخت پر بیٹھتا ہے۔

1032ء کلیساء میں بت پرستی کے مسئلہ پر، قسطنطینہ کا کلیساء، کلیسائے روم سے الگ ہو جاتا ہے

1036ء طغرل بیگ سلجوقی سلطان بنتا ہے۔

المنتصر فاطمی خلافت سنبھالتا ہے

1037ء دنیا کے عظیم ترین طبیبوں میں سے ایک ابو علی ابن سیناء کا انتقال۔

کیسٹلے کا بادشاہ فرڈینانڈ اول لیون پر قبضہ کرتا ہے۔

1038ء مشہور ماہر طبعیات (Physicist) الحازن کا انتقال۔

1043ء فاطمی سلطنت انتشار کی جانب رواں دواں۔ مکہ، مدینہ، یمن اور شمالی افریقہ پر سے بنو

فاطمہ کے اقتدار کا خاتمہ۔

1048ء ’کتاب الہند‘ کے مصنف اور نامور مورخ البیرونی کا انتقال

1050ء عیسائی سسلی میں پیش قدمی کرتے ہیں۔

1051ء مغربی افریقہ میں مرابطون انقلاب کی ابتداء

1056ء سلجوقی طغرل بیگ اور بنو بویہ بسیری کے درمیان بغداد پر اقتدار اعلیٰ کے لئے کشمکش۔

1058ء عباسی خلافت کو بچانے میں جو کردار ادا کیا اس کے انعام کے طور پر عباسی خلافت نے طغرل بیگ کو "مشرق اور مغرب کے سلطان" کا خطاب دیا.

1060ء سلجوقی ترک، ایران، آذربائجان اور آرمینیا میں پیش قدمی کرتے ہیں۔صلیبوں کا شمالی آفریقہ پر حملے کرنا۔

1061ء طغرل بیگ کا بغیر اولاد کے انتقال پانا۔اس کے بھتیجے الپ ارسلان کا سلجوقی سلطان ہونا۔

1061ء مرابطون مراقش پر قبضہ کرتے ہیں۔

مراقش شہر کو مرابطون اپنا پائے تخت قرار دیتے ہیں۔

1068ء مغربی افریقہ میں سوننگھے شہنشاہیت کی ابتداء۔

1072ء " منزی کرٹ" کی جنگ،الپ ارسلان کی قیادت میں سلجوقی ترک بازطینی افواج کو شکست دیتے ہیں جس کے قیادت شہنشاہ رومانوس کر رہا تھا۔اس طرح ترک افواج ، اناطولیہ میں ترکوں کی آبادیاں بسانے کی راہیں ہموار کر دیتی ہیں۔

عیسائی سسلی میں پالیرمو شہر پر قبضہ کرتے ہیں۔

1075ء سلجوقی سلطان ملک شاہ فاطمیوں سے شام واپس چھین لیتا ہے۔المقتدی عباسی خلافت پر بیٹھتا ہے۔

1077ء عظیم صوفی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی پیدائش۔

1085ء اسپین میں وسی گوتھ شہنشاہیت کے پرانے پائے تخت طولیدو پر کیسٹلے کا بادشاہ الفانسو

اول قبضہ کرتا ہے۔طولیدہ کی عظیم لائبریریاں عیسائی یورپ کے قبضہ میں آ جاتی ہے۔

1086ء مرابطون امیر یوسف بن تاشفین ایک طاقتور افریقی فوج لے کر اسپین میں گھستا ہے۔

سلطان ملک شاہ کا وزیر اعظم نظام الملک بغداد میں نظامیہ کالج قائم کرتا ہے۔

1087ء سغراجاس کی جنگ یوسف بن تاشفیں الفا سو چہارم کو شکست دیتا ہے

صلیبی شمالی افریقہ میں مہدیہ شہر کو تباہ و تاراج کرتے ہیں۔

عراق اور شام میں فاطمی حشیشین قاتلوں کی دہشت کے سائے۔

1090ء نظامیہ کالج بغداد میں حضرت امام الغزالیؒ درس دیتے ہیں۔

مالٹا پر صلیبیوں کا قبضہ۔

قاتل حشیشین شمالی شام میں الاموت کے علاقہ پر قبضہ کر کے وہاں فدائین کے تربیتی کیمپ قائم کرتے ہیں۔

1094ء بغداد میں **المنتصر** کا عباسی خلیفہ ہونا۔

المستعدی نے قاہرہ میں بنو فاطمہ کی خلافت سنبھالی۔

1095ء پوپ اربن دوم یروشلم حاصل کرنے کے لئے صلیبی جنگ کا آغاز کرتا ہے۔

مصر میں بنو فاطمہ کا وزیر اعظم الافضال، شام کے ترک امیر دقوق کے قبضہ سے یروشلم واپس حاصل کرتا ہے۔

1096ء پہلی صلیبی جنگ کا آغاز۔

1097ء اناطولیہ میں قونیا سلجوقی ترکوں کا پائے تخت قرار پاتا ہے۔

پیش قدمی کرنے والے صلیبیوں کے مقابلے میں ترک پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مصر میں بنو فاطمہ صلیبیوں سے بات شروع کرتے ہیں تاکہ سلجوقی علاقوں کو آپ میں تقسیم کیا جا سکے۔

1098ء صلیبی انٹیوک پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

1099ء یروشلم پر صلیبیوں کا قبضہ، مسلمان اور یہودیوں کا قتل عام بالڈون یروشلم کا بادشاہ بنتا ہے۔

1100ء تصوراتی یا قیاسی فلسفہ کے خلاف حضرت امام الغزالیؒ نے تلخ وتند تنقید "
تحفظ الفلاسفہ" لکھی، احیاء العلوم" میں تصوف کو اسلامی سائنسی علوم میں ایک باوقار مقام دیا۔

1101ء حضرت شیخ عبداللہ عارفؒ نے انڈونیشیا کے سماٹرا میں پہلی مرتبہ اسلام کی اشاعت کی۔

1106ء مرابطون امیر یوسف بن تاشفیں کا انتقال

1111ء اسلام کے دانشورانہ چمن زاروں کا نقشہ بدلنے کے بعد حضرت ابوحمید الغزالیؒ کا انتقال۔

1113ء ایک سلجوقی عہدہ دار مودود نے یروشلم کے بادشاہ بالڈون کو شکست دی۔

1118ء بغداد میں المستر شد کا عباسی خلیفہ بننا۔

1123ء مشہور ریاضی دان اور عارف عمر خیام کا انتقال۔

1124 قاتلوں کے لیڈر حسن الصباح کی موت۔

1126ء طولیدو میں آرک بشپ ریمانڈ ایک اسکول قائم کرتا ہے، تاکہ عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا جائے۔

1127ء قاتل حشیشین ترک سردار مودود کو قتل کرتے ہیں۔

1130ء المحدیثن کے قائد ابنِ طومرط کا انتقال۔

1132ء سسلی کا بادشاہ روجر دوم مسلمان دانشوروں کو اسکے دربار میں کام کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

1139ء مشہور صوفی و عارف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی پیدائش

1141ء آمو دریا کے کنارے قرہ خطائی ترکمان سلجوقیوں کو شکست دیتے ہیں۔

1144ء زنگی کے زیر کمان، سلجوقی عدیسہ پر پھر سے قبضہ کرتے ہیں۔
پوپ یوگین دوسری صلیبی جنگ کا اعلان کرتا ہے۔

1145ء دوسری صلیبی جنگ کا زورانا طولیہ میں ٹوٹ جاتا ہے لیکن وہ پرتگال
میں لزبن پر دوبارہ قابض ہونے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اندلس میں مرابطون کے اقتدار کا خاتمہ۔

1149ء الطفیر فاطمی خلیفہ بنتا ہے۔

1150ء پیرس یونیورسٹی قائم ہوتی ہے۔

1151ء الادریس اس دور کی جانی پہچانی دنیا کا نقشہ تیار کرتا ہے۔

1154ء سلجوقیوں کی حکومت کی خدمت کرنے والا ایک سردار نورالدین دمشق پر قبضہ کرتا ہے۔

قاہرہ میں الفیض فاطمی خلافت سنبھالتا ہے۔

1153ء المحدیثن اندلس کو فتح کرتے ہیں۔

1160ء المستنجد بغداد میں عباسی خلافت کے تخت پر بیٹھتا ہے

آخری فاطمی سربراہ العدید قاہرہ میں خلافت نشیں ہوتا ہے۔

1163ء فاطمیہ مصر میں سلجوقیوں اور صلیبیوں کے درمیان اقتدار کے لئے کشمکش

1166ء حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی بغداد میں رحلت جنہیں شیخ المشرق کے نام یاد کیا جاتا ہے۔ جو قادریہ صوفیانہ مسلک کے بانی ہیں۔

مشہور جغرافیہ داں الادریس کا انتقال

1167ء انگلینڈ میں آکسفورڈ یونیورسٹی قائم ہوتی ہے۔

1170ء بنو فاطمی کو مصر سے بے دخل کر کے صلاح الدین کا مصر پر قبضہ جمانا۔

بغداد میں المستعد کا خلیفہ بننا۔

1171ء فاطمی دور کا خاتمہ، مصر ایک بار پھر عباسی خلافت کے زیر نظام۔

1173ء افغانستان میں غیاث الدین غزنوی سلطنت قائم کرتا ہے۔

1175ء صلاح الدین کا شام اور مصر پر اپنی گرفت مضبوط کرنا۔

رفاعیہ صوفی برادرانہ مسلک کی بنیاد رکھنے والے حضرت احمد الرفاعیؒ کا انتقال۔

1177ء محمد غوری ملتان، اوچ، ڈیرہ اسماعیل خان اور سندھ کو اپنی سلطنت میں صوبوں کی حیثیت سے شامل کرتا ہے۔

1179ء محمد غوری پشاور اور سیالکوٹ پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کشی کرتا ہے۔

1182ء حضرت خواجہ محمد غوث سندھیؒ، ہندوستان اور پاکستان کو قادریہ صوفی مسلک سے آشنا کرواتے ہیں۔

1187ء جنگ حطین، صلیبیون پر فتح یاب ہوکر صلاح الدین کا پھر سے یروشلم پر قبضہ کر لینا۔
محمد غوری کا لاہور پر قبضہ کرنا۔

1188ء پوپ کلیمنٹ سوم تیسری صلیبی جنگ شروع کرتا ہے۔

1189ء حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اجمیر ہندوستان میں قیام کرنا اور چشیہ مسلک کو قائم کرنا۔

1190ء انگلینڈ کا بادشاہ رچرڈ تجویز پیش کرتا ہے کہ اسکی بہن کی شادی صلاح الدین کے بھائی سیف الدین کے ساتھ کردی جائے اور دونوں مل کر یروشلم پر حکومت کریں۔صلیبیوں کی جانب سے اس تجویز کی سخت مخالفت کے باعث اس کو رد کر دیا جاتا ہے۔

1193ء سلطان صلاح الدین کی رحلت اور دمشق میں دفنایا جانا۔

1196ء محدثین امیر منصور الارکوس کی جنگ میں صلیبیوں کو شکست دیتا ہے۔

1198ء دنیا کے عظیم فلسفہ دانوں میں سے ایک ابن رشد کا انتقال

1199ء پوپ انوسینٹ سوم چوتھی صلیبی جنگ کا اعلان کرتا ہے۔

1200ء انڈونیشیا میں اسلام کی جڑیں پھیلنے لگتی ہیں۔
علاؤالدین محمد خوازم کا بادشاہ بنتا ہے۔
صلیبی ویالنسیا پر قبضہ کر لیتے ہیں۔
انگلینڈ میں کیمبرڈج یونیورسٹی قائم ہوتی ہے۔

1201ء اڈریاٹک کے کنارے آباد عیسائی شہر "زارا" کو لاطینی صلیبی تباہ وتاراج کر دیتے ہیں۔

1202ء دہلی میں سلاطینی سلسلہ کی ابتداء۔
سماٹرا کا باشاہ جوہان شاہ اسلام قبول کرتا ہے۔

1205ء ترکمان قرہ خطائی محمد غوری کو شکست دیتا ہے۔

1203ء مشہور فارسی شاعر نظامی کا انتقال۔

1204ء صلیبی، وینیس کے ڈان ڈولو کی سراہی میں قسطنطنیہ کو تاراج کرتے ہیں اور اس کے تمام خزانوں کو لوٹ لیتے ہیں۔

پنجاب کی بغاوت غوری کچل دیتے ہیں۔

1206ء چنگیز خان منگول قبائل کا اعلیٰ ترین حاکم بن جاتا ہے۔

حشیشین قاتل محمد غوری کا قتل کرتے ہیں۔

دہلی کے سلاطین بنگال کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں۔

1211ء التمش دہلی کے تحت پر بیٹھتا ہے۔

1212ء " لاس نواس ڈی طلوسا" کی جنگ میں صلیبی المحد ث کو شکست دیتے ہیں۔

1215ء چنگیز خان شمالی چین پر قبضہ کرتا ہے۔ چینیوں سے بارود کا استعمال سیکھتا ہے۔

1218ء پانچویں صلیبی جنگ کا نشانہ مصر کو بنایا جاتا ہے۔ مصری نیل کے سیلابی دروازوں کو کھول کر اس میں صلیبیوں کو ڈبو دیتے ہیں۔

1219ء چنگیز خان، خراسان کے شاہ محمد کے علاقوں پر حملہ کرتا ہے۔

1220ء چنگیز خان کا وسط ایشیاء کو تاخت و تاراج کرنا۔

1221ء چنگیز خان کا ایران اور افغانستان کو بتاہ و برباد کرنا۔

سندھ کی جنگ میں شہزادہ جلال الدین چنگیز خان کا کڑا مقابلہ کرتا ہے۔

1222ء چنگیز خان کا منگولیہ واپس لوٹنا۔

1223ء مشہور مورخ ابن الاثیر کا انتقال۔

1227ء چنگیز خان کی موت، منگول مغربی ایشیاء اور مشرقی یوروپ میں اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہیں

1228ء چھٹی صلیبی جنگ جرمنی کا بادشاہ فریڈریک دوم بذات خود صلیبی افواج کی سرابراہی کرتے ہوئے مصر پر حملہ آور ہوتا ہے، یہ حملہ ناکام ہوتا ہے۔

1230ء سندیاٹامالی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرتا ہے۔

1235ء لاہور کے حضرت بابا فریدؒ ہندوستان میں چشتیہ مسلک کی خلافت پاتے ہیں۔

1236ء مسلم اسپین کا صدر مقام قرطبہ صلیبیوں کے ہاتھ چلا جاتا ہے۔رضیہ ہندوستان کی سلطانہ بن کر حکومت کرتی ہے۔

ہندوستان کے عظیم ترین صوفی خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا وصال **المنتصر** بغداد میں خلیفہ بنتا ہے۔

1240ء مشہور صوفی شیخ حضرت ابن العربیؒ کی وفات۔

روجر بیکن انگلینڈ میں درس دیتا ہے۔

1242ء المستعصم بغداد میں عباسیہ کا آخری خلیفہ تخت نشین ہوتا ہے۔

1245ء سراہوں کی کونسل میں عیسائی یوروپ یہ قرارداد منظور کرتا ہے۔

مسلمانوں کے خلاف منگولوں سے مل کر ایک مشترکہ محاذ قائم کیا جائے فوجی امداد حاصل کرنے کیلئے ایک فرانسسکان پادری، جان ڈی پلانو کارپینی منگول دربار میں حاضر ہوتا ہے۔

1248ء اسپین میں سویلے عیسائیوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔

غرناطہ میں ابن احمر نصیریہ شاہی سلسلہ شروع کرتا ہے۔

1249ء ساتویں صلیبی جنگ جسکا نشانہ مصر تھا۔ ان صلیبی فرانکی افواج کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا جاتا ہے۔

1250 شجر الدر مصر کی ملکہ کی حیثیت سے حکومت کرتی ہے۔

1251ء ہلاکو خان وسط ایشیاء کا منگول سربراہ بنتا ہے۔

1256ء ہلاکو خان، حشیشین فدائی قاتلوں کو برباد کردیتا ہے۔

1257ء شیخ سعدیؒ کی وفات۔

دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کو چشتیہ خلافت ملتی ہے۔ ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگتا ہے۔

1258ء ہلاکو خان بغداد کو غارت کر دیتا ہے۔ بغداد میں عباسی خلافت کا خاتمہ۔ کلاسیکی اسلامی تہذیب پر پردہ گر جاتا ہے۔ خلیفہ مستعصم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

شاذولی مسلک کے بانی حضرت علی الشاذولیؒ کا انتقال۔

1260 قبلائی خان چین کے تخت پر بیٹھتا ہے۔ اعلیٰ قابلیتوں کے مالک کئی مسلمان اس عظیم خان کے دربار میں بڑے عہدوں سے سرفراز ہوتے ہیں۔ ہلاکو خان الپو پر حملہ کرتا ہے وہاں کے باشندوں کا قتل عام کرتا ہے۔

1261ء مصر کے مملوک المنتصر کو عباسی خلیفہ کی حیثیت سے مصر کا فرمانروا نامزد کرتے ہیں۔

1261ء عین جلوت کے جنگ میں مصر کا مملوک ظاہر بے برس منگولوں آرمینی اور صلیبیوں کی متحدہ افواج کو شکست دیتا ہے۔

1269ء الیعقوب کی مرینی افواج مراقش پر قبضہ جماتی ہیں۔

1273ء حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی وفات مثنوی کے مصنف، فارسی کے عظیم شعراء میں ایک ماولاویہ صوفی مسلک کے بانی حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی وفات۔

1274ء ماہر فلکیات اور دو محوری گمبال کے موجد الطّوسی کا انتقال۔

یسی جاہ کی جنگ میں میرینی امیر الیعقوب عیسائیوں کو شکست دیتا ہے۔

1277ء ابولستان کی جنگ میں سلطان بیبرس منگول افواج کو شکست فاش دیتا ہے۔

1278ء سلطان بیبرس کی وفات۔

1289ء شام میں صلیبیوں کے آخری مضبوط گڈھ عقرہ پر مملوک قبضہ کر لیتے ہیں

1290ء سماٹرا میں سلطان ملک شاہ کی فرمانروائی جاری۔

1291ء مشہور فارسی شاعر شیخ سعدیؒ کا انتقال

1294ء مشرق کے سفر سے مارکو پولواٹلی واپس پہنچتا ہے۔

1295ء دوسرا خان شہنشاہ غزان اعظم اسلام قبول کر لیتا ہے۔

1300ء برصغیر پر علاؤالدین خلجی اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرتا ہے۔ سپہ سالار ملک کافور جنوب میں پیش قدمی کرتا ہے۔

1301ء عثمانیہ سلطنت کا بانی عثمان غازی یکی شہر اور بُرس شہر کے آس اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے۔ ''یلاکووہ،، کی جنگ میں بازنطینیوں کو شکست دیتا ہے۔

''مرج السفر،، کی جنگ میں مملوک اِلخان کی افواج پر فتح یاب ہوتے ہیں۔

1307ء مانسا موسیٰ مالی ریاست کا شہنشاہ بنتا ہے۔

1316ء ہندوستان کے شہنشاہ علاؤالدین خلجی کی وفات۔

1320ء ہندوستان میں خلجی خاندان کو حکومت منتشر ہو جاتی ہے۔

تغلق خاندان کی حکومت کی ابتداء

1324ء بارہ ہزار مصاحبوں کے ساتھ مانسا موسیٰ کا حج کرنا۔

دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا وصال۔

1325ء ہندوستان کے مشہور صوفی شاعر حضرت امیر خسروؒ کا انتقال۔

ابن بطوطہ کا دنیا کے اطراف اپنے سفر کی ابتداء کرنا۔

1326ء عثمانیہ سلطنت کے معمار عثمان اول کی وفات۔ اس کے جانشین سلطان اُورخان کا بصرہ پر قبضہ کرنا۔ مشہور عالم ابن تیمیہؒ کی وفات۔

1333ء یوسف اول غرناطہ کا امیر بنتا ہے، کیسٹلے کے ساتھ تعلقات توڑ کر مراقش کے سلطان کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے اور اسپین کو عیسائیوں کے ہاتھ سے چھین لینے کی آخری کوشش کرتا ہے۔

1334ء ابن بطوطہ کی دہلی میں آمد۔

شیخ صفی الدین اسحاق کا انتقال۔ جن کے نام سے صفویہ شاہی سلسلہ چلا۔

1335ء الخان شہزادے ابوسعید کی وفات۔

1340ء چین کے یون شہنشاہ توغانہ تیمور، محمد بن تغلق کے دربار میں اپنا سفیر بھیجتا ہے۔

طارفہ کی جنگ میں میرینی، بحری بیڑہ، اسپینوں کو شکست دیتا ہے۔

1341ء مصر کے سلطان ابن قلاون کا انتقال۔

1345ء انڈونیشیاء میں پسائی کے سلطان مالک الظاہر کے دربار میں ابن بطوطہ کا پہنچنا۔

1346ء کالی پلیگ یوروپ کو برباد کردیتی ہے۔

1351ء ہندوستان کے محمد بن تغلق کی وفات، تغلق شہنشاہیت کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔

1350ء ابن بطوطہ مالی سلطنت کا سفر کرتا ہے۔

عثمانیہ ترک گیالی پولی اور انقرہ پر قبضہ کرتے ہیں۔

1355ء ابن بطوطہ تانجیر واپس ہوتا ہے۔میرینی سلطان ابوعنان ابن بطوطہ کی رحلہ لکھنے کا حکم دیتا ہے۔

جنیوا والے مختصر عرصہ کے لئے لبیا کے تریپولی پر قبضہ کرتے ہیں۔

1357ء عثمانیہ ترک یرڈیربن پر تسلط جماتے ہیں۔

1368ء امیر تیمور لنگ کو تاتاریوں کا قایدٗ منتخب کیا جاتا ہے۔وہ ازبکستان میں فرغانہ کی وادی پر اپنا اقتدار مضبوط کرتا ہے۔

1369ء ابن بطوطہ کی وفات۔

1375ء ماسکو کا بادشاہ کاؤنٹ ڈمی ٹرئیس تاتاری سنہرے شہسواروں پر فتح یاب ہوتا ہے۔

1376ء سنہرے شہسوار ماسکو جلا کر خاک کردیتے ہیں۔

1380ء تیمور لنگ اپنی فوج کشی کی ابتداء ایران سے کرتا ہے۔

حضرت شیخ اولیاء کریم المقدوم فلپائین کے منڈناؤ جزائر کو اسلام سے روشناس کراتے ہیں۔

ترک قبیلے قرہ قویوں لو کا سردار قرہ محمد موصل کے قریب اپنی حکومت قائم کرتا ہے۔

1381ء عثمانیہ ترک بلغایہ پر قبضہ کرتے ہیں۔

1385ء عثمانیہ ترک تھریس پر بھی قبضہ کرتے ہیں۔

1387ء تیمور لنگ روس پر حملہ کرتا ہے۔اور سنہرے شہزادوں کی طاقت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

روس اپنی سیاسی مرکزیت کے لمبے سفر کی ابتداء کرتے ہیں۔

1386ء بایزید اول عثمانیہ سلطان بنتا ہے۔کوسود کی جنگ میں سربیوں کو شکست دیتا ہے۔

فارسی کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک حافظؔ کا وصال۔

بخارا میں نقشبندی صوفی طریقہ کی بنیاد رکھنے والے حضرت بہاؤ الدین نقشبندیؒ کی وفات۔

1390ء تیونیسیہ میں مہدی پر فرانس اور جنیوا کی مشترکہ افواج حملہ کرتی ہیں

1391ء بایزید اول قسطنطینہ پر حملہ کرتا ہے۔

1396ء بایزید نکوپوس کی جنگ میں صلیبیوں کو شکست دیتا ہے۔

1398ء تیمور لنگ ایران میں اصفہان پر حملہ کر کے اس تاخت وتاراج کر دیتا ہے۔

1399ء تیمور کا ہندوستان پر حملہ دہلی کو برباد کر دینا۔

کیٹسلے مراقش میں ٹیٹواں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔

1400ء بایزید اول قسطنطیہ کا محاصرہ کرتا ہے۔

1401ء تیمور مصر کے مملوک پر فتح یاب ہوتا ہے۔

دمشق تاتاریوں کے سامنے سرنگوں ہوجاتا ہے۔

تیمور بغداد کو بتاہ کر دیتا ہے۔

1402ء انقرہ کی جنگ میں تیمور بایزید اول کو شکست دیتا ہے۔

سلیمان اول عثمانیہ کا سلطان بنتا ہے۔

سلطان اسکندر شاہ ملایا سے تھائی باشندوں کو نکال باہر کرتا ہے۔

1404ء تیمور لنگ چین کی مہم پر چل نکلتا ہے۔

1405ء تیمور لنگ چین پر فوج کشی کی راہ میں انتقال کر جاتا ہے۔اس کا بیٹا شاہ رخ تخت نشیں ہوتا ہے۔

نوٹ:1406ء سے 1924ء تک کے واقعات اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کئے گئے ہیں۔

پروفیسر نیاز عرفان کا تبصرہ

تاریخ اسلام، عالمی نقطۂ نظر کے آئینہ میں' دو حصوں میں لکھی گئی ہے-اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک کے تاریخی واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے- یہ کتاب بیک وقت تاریخ بھی ہے اور تاریخ کے فلسفہ کی بھی کتاب ہے-اس لئے کہ قاری جیسے جیسے اسے پڑھتا جاتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا جاتا ہے کہ اسلام کے آغاز سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک نہ صرف یہ سلسلہ وار واقعات کی ایک تاریخ ہے، بلکہ شاہی سلسلوں کی فتح یابیوں اور شکستوں اور اسلامی تاریخ میں تحریکوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ایک گہرا جائزہ یہاں لیا گیا ہے اور تہذیبوں کے عروج وزوال کے قوانین مرتب کئے گئے ہیں-

ڈاکٹر نذیر احمد تاریخ کے فلسفہ کے ماہرین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں- گزشتہ دو ہزار سالوں سے جن دو عظیم مؤرخین نے اپنے ہی ایک الگ طرز سے اس میدان میں اپنا ہی ایک الگ اعلیٰ مقام پیدا کیا اور اپنے اچھوتے خیالات سے اسے نوازا، وہ ہیں ابن خلدون اور ٹوائن بی- اپنی تصانیف میں انہوں نے تاریخ کی تعریف اور خلاصہ میں جو تھیوریاں پیش کی وہ اپنے آپ میں تاریخ نہیں ہیں- اس میں شک نہیں کہ اپنی اپنی تھیسیس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انہوں نے تاریخی واقعات کو استعمال کیا- ابن خلدون نے اپنے ''عصبیہ'' کے تصور کو ثابت کرنے کے لئے عربوں اور بربروں کے تاریخی پس منظر کو اپنے سامنے رکھا ہے- ٹوائن بی نے اپنے نظریہ 'چیلنج اور ردعمل'' کو صحیح قرار دینے کے لئے تاریخی مفروضات کو ہی سامنے رکھا تھا اور اسی پر تہذیبوں کی طاقت اور ان کے زوال کے اسباب کی نشاندہی کی تھی- جس کتاب پر میں تبصرہ کر رہا ہوں اس کے مصنف کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ انہوں نے قابل فہم اور مدلل اسلامی تاریخ لکھی ہے اور ہر ایک اہم ترین موقع پر، نازک موڑ پر انہوں نے ان اہم واقعات کے لئے وقوع پذیر ہونے کے اسباب کی تشخیص کی ہے، ایسے واقعات جو تاریخ ساز ثابت ہوئے اور جنہوں نے اسلامی تاریخ کا منہ موڑ دیا-

ڈاکٹر نذیر احمد ایک صاحب طرز مصنف ہیں- ابن خلدون اور ٹوائن بی نے تاریخ کے بارے میں جن نظریات کو پیش کیا اور جس طرح ان کی تشریح کی ڈاکٹر نذیر احمد نے ان نظریات وتشریحات سے صرف ہلکے طور سے استفادہ کیا ہے- مثلاً وہ ابن خلدون سے ایک بات پر اتفاق رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں: ''ترک عصبیہ کے اتحاد کو ہم سلطنت عثمانیہ کی ابتداء قرار دے سکتے ہیں، ابن خلدون نے اس استعارہ کو قبائلی اتحاد کے لئے استعمال کیا ہے ایک ایسی قوت جو کہ قبیلوں کے خونی رشتوں سے مضبوط ہوتی ہے، یہ ایک ایسی خاصیت ہے جو کہ صحراء کے لوگوں، بدوؤں اور خانہ بدوشوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے- جب وہ یہ لکھتے تو ٹوائن بی سے متفق نظر آتے ہیں، عظیم تہذیبیں چیلنجوں کا اسی شدت کے معیار سے کرتی ہیں اور ہر ایک چیلنج کے ساتھ وہ زیادہ مضبوط وتوانا ہو کر ابھرتی ہے- وہ خطرناک لمحات کو اچھے موقعوں کے طور پر استعمال کرتی ہے- تاریخ کے نازک لمحات وکٹھن آزمائش کی گھڑیاں انسانوں کی بلندیوں کو چھونے والی صفات کا امتحان لیتی ہے- عظیم مرد اور عورتیں تاریخ کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیتی ہے- جبکہ کمزور افراد کو وقت کا بھنور نگل لیتا ہے-''

ڈاکٹر نذیر احمد ایک صاحب طرز مؤرخ

ڈاکٹر نذیر احمد نے تاریخ کو پیش کرنے کے لئے اپنے ہی ایک الگ نظریہ کی تشریح وتوضیح کی ہے-اور وہ اصول ہے"از سرنو توانائی حاصل کرنا" یا از سرنو نمو پانا" ان کے مطابق اسلام از سرنو توانائی حاصل کرتا ہے، پھر سے نمو پالیتا ہے-ان مصلحین کے ذریعہ جو کہ مختلف دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں-صدی درصدی وہ لکھتے ہیں: مغرب کے المحدث سے لے کر نائجیریا کے عثمان دان فدوئی اور سوڈان کے مہدی تک ہر کوئی دیکھ سکتا ہے- مصلحین پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اسلام کو از سرنو توانائی وطاقت بخشتے رہتے ہیں-انہوں نے سرہند کے مجدد الف ثانی، دہلی کے شاہ ولی اللہ، اور لاہور کے ڈاکٹر محمد اقبال کو بھی اپنی کتاب میں مصلحین کا درجہ دیا ہے-ڈاکٹر نذیر احمد کے مطابق قبائلی عصبیہ نہیں بلکہ "توحید" ہی وہ قوت ہے جو مختلف رنگ ونسل اور قومیت کے لوگوں کو آپسی اتحاد کے رشتے میں باندھتی ہے-نظریات وسریش وسمینٹ وطاقت ہیں جو لوگوں کو آپس میں جوڑتے ہیں-اور تمام اسلامی نظریات کی بنیاد صرف اور صرف توحید پر مبنی ہوتی ہے -یہ ہمارا نظریہ ہے کہ مسلم معاشرے کے عروج وزوال کے اسباب قوم کے اپنے اندرونی مناظرے میں پائے جاتے ہیں-اسلامی تاریخ ایمان کے محور کے اطراف گھومتی ہے-

یہاں پر چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

حضرت عمرؓ کی شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں: "تاریخ انسان کی مرضی کے مطابق جھک جاتی ہے جب وہ مرضی ایمان اور راست بازی سے عمل پذیر ہوتی ہے-"

تہذیبوں کے زوال کے اسباب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "تہذیبیں اپنے آپ باطنی طور پر زوال پذیر ہوتی ہیں- بیرونی اسباب تو بس وہ مواقع ہوتے ہیں جو تہذیبوں کے اور ان کے اندرونی زوال کو ابھارتے ہیں-" محمود غزنوی کے باب کی ابتداء یوں کرتے ہیں: "تاریخ لامحدود طور پر لچکدار ہے-بسا اوقات کسی بھی زمانے میں ایک فرد کی کارروائیاں آگے آنے والے دور کے بہاؤ میں زبردست ارتعاش پیدا کرتے ہیں-"

وہ جو تاریخ کی شاندار عمارت تراشتے ہیں وہ اپنی ہی قوت سے کرتے ہیں-واقعات کو اپنے ہی مرضی کے مطابق موڑتے ہوئے اور اپنے پیچھے ایک چمکدار روشن راہ چھوڑ جاتے ہیں تاکہ دوسرے اس پر چل سکیں-عظیم تصورات تاریخ میں اسی طرح بازگشت کرتے چلے آتے ہیں جس طرح کے پہاڑوں کے سلسلے میں ڈھول کی آواز بار بار ابھرتی رہتی ہے-

ہندوستان کی حکمراں رضیہ سلطان کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: "وہ ایک تارے کی طرح ابھریں اور دمدار سیارے کی طرح بکھر گئیں -دنیا کو روشن کرتے ہوئے اپنی ترقی سے بھی اور اپنے زوال سے بھی-"

تصوف ایک عظیم دریا کی طرح ساری اسلامی تاریخ میں رواں دواں ہے-اس کے چار وں طرف دور دور تک پھیلے ہوئے مرغزاروں کو روحانیت سے سرسبز وشاداب کرتے ہوئے-"

ڈاکٹر نذیر احمد ایک عظیم سائنس داں اور ایک عظیم مؤرخ

یہ بڑی خوش گوار تعجب خیز بات ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد جیسی شخصیت نے تاریخ کے فلسفہ کے میدان میں اس قدر تخلیقی طبع زاد نظریات پیش کئے ہیں- یہ فلسفۂ تاریخ کے لئے ایک عظیم دین ہے- وہ تاریخ کے اس میدان سے سیدھے طور پر وابستہ ہیں- انہوں نے ریاست کرناٹک کی میسور یونیورسٹی سے ریاست بھر میں نمبر ایک پوزیشن میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی- کیلی فونیا انسٹی ٹیوٹ آف تکنالوجی سے ایم ایس اور اے ای کی ڈگریاں حاصل کی- کارنل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی- اور رائڈر یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا- انہوں نے خلائی پروگراموں کے لئے گراں قدر ریسرچ کیا- جن میں اپولو پروجیکٹ کی کامیاب اڑان شامل ہے جو چاند تک گئی تھی- چاند پر چلائی جانے والی پہلی چاند گاڑی (LunarLandRover) کی ایجاد کی- ہبل خلائی دوربین کی ایجاد کی جس کے ذریعے خلاؤں میں ہزاروں میل دور تک نظارہ کیا جاسکتا ہے- وہ ریاست کرناٹک انڈیا کی اسمبلی کے 1978ء میں اسمبلی کے منتخب شدہ ممبر رہے- ان کی کئی دوسری تخلیقات ہیں ”جدید انسان اور اسلام کے درمیان مکالمہ“ ”کون سی چیز ہمیں انسان بناتی ہے، ایک روحانی پہلو“-

ڈاکٹر نذیر احمد کے گہری روحانیت میں ڈوبے ہوئے دانشمندانہ اور فلسفیانہ افکار کی گہری جھلک اس کتاب کے ایک ایک صفحے سے دکھائی دیتی ہے- انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ابن خلدون کے مقدمے کو ان الفاظ سے خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے- یہ تخلیق معاشیات، سیاسیات اور علم کے بارے میں انتہائی دانشورانہ مشاہدات پر مبنی ہے- یہی خراج عقیدت یقینی طور پر ڈاکٹر نذیر احمد کی تصنیف ”تاریخ اسلام- تاریخ عالم کے آئینہ میں“ کے لئے بھی پیش کیا جاسکتا ہے- اس کتاب کے ہر صفحہ پر دانشمندی کے جواہرات بکھرے ہوئے ہیں جو اعلیٰ درجے کے ہیروں کی طرح چمکتے رہتے ہیں- حالانکہ انگریزی زبان ان کی مادری زبان نہیں ہے- لیکن انگریزی پر ان کا عبور الفاظ کے ایک وسیع ذخیرے کو سمیٹے ہوئے ہے- ان کا یہ انداز بیان بے شمار ایسے مشہور مصنفین سے جن کی مادری زبان انگریزی ہے ان تمام سے بالکل الگ انہیں ایک بلند اور اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے- اپنے خیالات کو کھول کر صاف صاف سیدھے سیدھے دلنشیں انداز بیان کرنے کا یہ طرز انہیں ٹوائن بی جیسے مصنفین سے بھی اعلیٰ تر درجے پر لے جاتا ہے- تصورات کے بہاؤ، خیالات کے خوبصورت انداز بیان کے باعث وہ اکثر جگہ کارلائل کی یاد دِلا جاتے ہیں- ان کی تصنیف کو ول ڈیورانٹ (WillDurant) کی (TheStoryofPhilosophy) فلسفے کی تاریخ کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے- انہوں نے تاریخ جیسے بنجر خشک موضوع کو ایسا دلچسپ اور جاندار بنا کر پیش کیا ہے کہ پڑھتے ہی بنتا ہے-

بے شک یہ کتاب اسی قدر ادب عالیہ ہے جتنی کہ ایک تاریخ بھی ہے اور فلسفۂ تاریخ بھی- کوئی بھی قاری پڑھتے ہوئے اس کتاب کے الفاظ کے سحر سے آزاد نہیں رہ سکتا- مسلمانوں میں تاریخ کے فلاسفر کی حیثیت سے میں بلاشبہ ڈاکٹر نذیر احمد کو ابن خلدون کے بعد ایک عظیم مؤرخ کا درجہ دیتا ہوں-

پروفیسر نیاز عرفان عالمی بینک کے تعلیمی اور امتحانات کے اصلاحات کے پروجیکٹ اور تیاریوں کے لیزن آفیسر ہیں-